خانہ جنگی

الیاس سیتاپوری



خانہ جنگی

الیاس سیتاپوری



ISBN- 81- 85738-23- 8
KHANA JUNGI
ILYAS SITAPURI
Rs. 45/-

نام ناول : خانہ جنگی
مصنف : الیاس سیتاپوری
سن اشاعت : ۱۹۹۳ء
قیمت مجلد : ۴۵/- روپے
قیمت رف ایڈیشن : ۲۵/- روپے
مطبوعہ : فائن آفسٹ پریس، شاہدرہ، دہلی ۳۲
ناشر : کتاب والا - ۲۷۹۴،
گلی جھوٹ والی، پہاڑی بھوجلہ دہلی ۶

فرزند سلطان نورالدین زنگی ملک الصالح اور صلاح الدین کی چشمک

حشیشین کا صلاح الدین پر قاتلانہ حملہ

موصل اور حلب کے لشکروں کی صلاح الدین کے ہاتھوں شکست

امیرزادہ فرخ شاہ اور المقدم کی حسین و جمیل دختر ارمغانہ کی دبی دبی محبت

تاریخ کے جھروکے سے ۔ جنگ و جدال اور حسن و محبت کی دلآویز داستان

سلطان صلاح الدین ایوبی کے سلسلہ کا
چوتھا اور آخری ناول

خانہ جنگی



وہ دمشق کے بڑے بازار سے ایک گلی میں گھومی تھی کہ کسی نے آواز دی۔

"ارمغانہ۔ ٹھہرو ارمغانہ!"

ارمغانہ نے پلٹ کر دیکھا۔ امیر صلاح الدین کا بھتیجا فرخ شاہ گھوڑا بڑھاتے اُس کی جانب آرہا تھا۔ یقیناً یہ آواز فرخ شاہ کی تھی۔ ارمغانہ کی فرخ شاہ سے صرف دو تین مختصر ملاقاتیں ہوئی تھیں پھر بھی وہ اُس کے چہرے مہرے اور آواز کو نہیں بھول سکی تھی۔ یہ یقین ہو جانے کے بعد کہ فرخ شاہ اُسے آواز دے رہا ہے۔ ارمغانہ بے تحاشا گلی میں بھاگنے لگی۔ وہ فرخ سے اب ملنا نہیں چاہتی تھی۔ دونوں کی آخری ملاقات شاہی محل میں ہوئی تھی جہاں فرخ شاہ نے اُسے امیر کے سامنے اس لیے پیش کیا تھا کہ ارمغانہ کے فرخ شاہ پر کیے ہوئے احسان کے بدلے شاید امیر صلاح الدین اُس کے باپ المقدم کا قصور معاف کر دے لیکن امیر نے اُسے رتی بھر اُمید کا بھی سہارا نہ دیا تھا اور وہ نہایت مغموم محل سے واپس ہوئی تھی۔

فرخ شاہ اُس سے پہلے محل چھوڑ کے باہر آگیا تھا تاکہ ارمغانہ سے اپنی صفائی پیش کر سکے۔ پھر اُس نے ایک موڑ پر اچانک سامنے آکر معذرت خواہانہ لہجے میں کہا تھا۔ "ارمغانہ میں تم سے شرمندہ ہوں کہ امیر نے ابنِ مقدم کی تقصیر معاف نہیں کی۔"

"آپ کیوں شرمندہ ہوتے ہیں امیر زادے۔" ارمغانہ نے بڑے دُکھ سے جواب دیا تھا۔ "دراصل بابا کی پیشانی پر غداری کا اتنا بڑا داغ ہے کہ میں اپنے احسان کے پانی سے اُسے دھو نہ سکی۔ میں خود اپنی جگہ شرمندہ ہوں کہ میں نے احسان کا اظہار کر کے احسان کی آبرو بھی خاک میں ملا دی اور اپنی اور آپ لوگوں کی نظروں میں گر گئی۔"

"یہ سب تقدیر کے کھیل ہیں ارمغانہ۔" فرخ شاہ نے بات کو ٹال دینے کی کوشش کی۔ "اگر اُس دن تم اپنی جان پر کھیل کر مجھے نہ بچاتیں تو آج میں تم سے ہم کلام کس طرح ہوتا؟"

اُس وقت اُن کے پاس سے ایک سوار دونوں کو گھورتا ہوا نکل گیا۔

"امیر زادے۔ مجھے جانے کی اجازت دیجیے۔" ارمغانہ نے گھبرائے ہوئے لہجے میں کہا۔ "یوں بھی سرِ راہ گفتگو کرنا شرافت کے خلاف ہے۔"

"ٹھیک کہہ رہی ہو ارمغانہ۔" فرخ شاہ نے تائید کی۔ "مجھے اپنے ساتھ چلنے کی اجازت دو۔ تمہارے گھر بیٹھ کے باتیں کریں گے۔"

"آپ کیا کہہ رہے ہیں امیر زادے؟" ارمغانہ نے قدرے برہمی کا اظہار کیا۔ "جب سے باپ کا دامن چھوٹا نہ میرا گھر ہے نہ در۔ آج اس سہیلی کے یہاں تو کل دوسری کے پاس۔"

"مجھے بہت افسوس ہے ارمغانہ۔" فرخ شاہ نے ہمدردی دکھائی۔ "میں تمہیں یوں بے سہارا بھی نہیں دیکھ سکتا۔"

"شکریہ امیر زادے۔" ارمغانہ نے قدم بڑھایا۔ "مجھے اُمید ہے کہ آپ نہ تو میری فکر کریں گے اور نہ کبھی مجھے یوں راہ چلتے پریشان کریں گے۔"

ارمغانہ آگے بڑھ گئی اور فرخ شاہ کا کچھ کہنے کو منہ کھلا ہی رہ گیا۔

اُس دن کے بعد آج اُسے ارمغانہ دکھائی دی تھی، وہ بھی بھرے بازار میں۔ فرخ شاہ نے اُس کے قریب پہنچنے کی بہت کوشش کی لیکن کامیاب نہ ہو سکا۔ اُس نے ارمغانہ کو گلی میں مڑتے دیکھا تھا لیکن جب وہ گلی میں داخل ہوا تو وہاں سناٹا چھایا ہوا تھا۔ وہ مجبور ہو کے لوٹ گیا۔ فرخ شاہ کے دل میں طرح طرح کے خیالات پیدا ہو رہے تھے۔ پچھلی اور آخری ملاقات میں ارمغانہ نے اُسے پیچھا کرنے سے روک دیا تھا۔ اگرچہ ارمغانہ کی یہ درخواست یا حکم فرخ شاہ کے لیے بڑا تکلیف دہ تھا لیکن اُس نے ارمغانہ کی اس خواہش کا احترام کیا اور اُس سے سامنا کرنے کی کوشش نہ کی۔ فرخ شاہ بہت دن تک دمشق میں مقیم رہا۔ ارمغانہ بھی اسی شہر میں تھی۔ فرخ شاہ کو وہ کئی بار نظر آئی لیکن اُس نے خود پر جبر کیا اور اُس سے ملاقات کی کوشش نہ کی لیکن اس طرح کے ہر موقع پر فرخ شاہ کی کچھ ایسی کیفیت ہوتی جیسے کسی زخمی کا کوئی پرانا زخم تکلیف دینے لگے۔

فرخ شاہ نے کئی بار اس بات کا تجزیہ کیا کہ آخر وہ ارمغانہ سے ملاقات کے لیے اس قدر بے چین کیوں ہے جبکہ ارمغانہ نہ صرف اُس سے گریز کرتی ہے بلکہ یہ بھی نہیں چاہتی کہ اُسے روکا ٹوکا جائے۔ اس تجزیے کے نتیجے میں اُس کے دل نے یہ طفل تسلی دی کہ ارمغانہ اُس کی محسن ہے اور محسن بھی ایسی کہ فرخ شاہ کی یہ زندگی اُس کی مرہونِ منت ہے۔ موت و زندگی اگرچہ خدا کے اختیار میں ہے مگر خدا ہی تو زندگی اور زندگی کے جواز پیدا کرتا ہے۔ قدرت کو فرخ شاہ کی زندگی عزیز تھی۔ اُس نے ارمغانہ جو کہ ابنِ مقدم کی بیٹی تھی۔۔۔ کے دل میں رحم کا جذبہ پیدا کیا اور ارمغانہ اپنے ساتھی دانیال کا ساتھ دینے کے بجائے اُس کی مخالف ہو گئی اور آخر ش دانیال کو تلوار کے وار سے ختم کر دیا۔

اس احسان کا بدلہ چکانے کے لیے فرخ شاہ ارمغانہ کو امیر صلاح الدین کے پاس لے گیا تھا لیکن امیر نے ارمغانہ کے احسان کا اعتراف کرنے کے باوجود اس کے باپ شمس الدین ابنِ مقدم کو معاف نہ کیا پھر جب امیر صلاح الدین پر قلعہ الموت کے حاکم شیخ الجبل کے حکم سے فدائین نے قاتلانہ حملہ کیا اور امیر قدرتِ خداوندی سے بچ گیا۔ اس کے فوراً بعد امیر صلاح الدین نے ابنِ مقدم کو نہ صرف معاف کر دیا بلکہ اُس سے اور اس کی بیٹی سے ملاقات کی خواہش کی۔ امیر صلاح الدین کے مزاج میں اس تبدیلی کی وجہ یہ بھی کہ اپنے قاتلانہ حملے کے دوسرے دن امیر کو ابنِ مقدم کا ایک خط ملا جس میں اس نے امیر کو حشیشین (فدائین) سے ہوشیار رہنے کی درخواست کی تھی۔ ابنِ مقدم نے یہ خط حملے سے ایک دن پہلے پہنچانے کی کوشش کی تھی مگر چونکہ وہ مقہور تھا اس لیے امیر کے پاس جانے کے بجائے اُس نے وہ خط کسی اور کے ذریعے سے امیر کو پہنچا دیا اور امیر نے اُسے ابنِ مقدم کی معافی کی درخواست تصور کرتے ہوئے پڑھنے کی بھی ضرورت محسوس نہ کی۔

لیکن امیر جب اپنی جان بچ جانے پر شکرانے کے نفل پڑھ رہا تھا تو ابنِ مقدم کا خط اتفاقاً اس کے ہاتھ لگ گیا جسے پڑھ کر امیر نے شمس الدین ابنِ مقدم کو فوراً معاف کر دیا اور فرخ شاہ کو حکم ہُوا کہ وہ دونوں کو پیش کرے تاکہ انہیں اُن کی خدمات کا صلہ دیا جا سکے۔ یہ واقعات حلب کے محاصرے کے دوران پیش آئے تھے۔ فرخ شاہ امیر کے ساتھ حلب آیا ہُوا تھا امیر کا حکم ہوتے ہی وہ دمشق روانہ ہو گیا تاکہ ارمغانہ اور اُس کے ذریعے ابنِ مقدم کو تلاش کر کے امیر کے سامنے پیش کرے لیکن اس کی پہلی کوشش ناکام ہو گئی۔ ارمغانہ گلیوں میں گم ہو گئی تھی جسے فرخ شاہ تلاش نہ کر سکا۔

فرخ شاہ نے عہد کر لیا تھا کہ وہ ارمغانہ سے اُس وقت تک ملاقات کی کوشش نہیں کرے گا جب تک ابنِ مقدم گرفتار ہو کر اپنے انجام کو نہیں پہنچتا۔ وہ اپنے عہد پر قائم تھا کہ امیر نے ابنِ مقدم کو معاف کر دیا اور فرخ شاہ جس کے سپرد ابنِ مقدم کی گرفتاری کی ذمے داری تھی اب اُسے حکم دیا گیا کہ ابنِ مقدم کو احترام کے ساتھ پیش کیا جائے۔ فرخ شاہ نے دمشق پہنچ کے ارمغانہ کی تلاش شروع کی۔۔۔ بدلے ہوئے حالات میں فرخ شاہ نے کوئی عہد شکنی نہ کی۔ وہ اب ارمغانہ سے اس لیے نہیں ملنا چاہتا تھا کہ اُس سے ملنے کو اس کا دل چاہتا تھا بلکہ اس دل کے چاہنے میں یہ مسرت بھی شامل ہو گئی تھی کہ امیر ارمغانہ کے باپ کو معافی کے ساتھ ساتھ انعام و اکرام سے بھی نوازنا چاہتے تھے لیکن وائے ناکامی کہ وہ ارمغانہ کو دیکھنے کے باوجود اُس تک نہیں پہنچ سکا۔

ارمغانہ فرخ شاہ سے جان بچا کر بھاگتے بھاگتے اُس گھر تک پہنچ گئی جہاں وہ عارضی طور پر مقیم تھی۔ یہ اُس کی گہری سہیلی حارثہ کا مکان تھا۔ پچھلے دو ہفتے سے وہ حارثہ کے پاس مقیم تھی اور اب وہاں سے بھی نقل مکانی کرنے والی تھی۔ وہ ایک جگہ جم کے نہیں رہ سکتی تھی کیونکہ اُسے خبر تھا کہ امیر صلاح الدین کے کارندے اُسے دیکھتے ہی گرفتار کر لیں گے اور اُس سے ابنِ مقدم کا پتا ٹھکانا معلوم کرنے کی کوشش کریں گے۔ ارمغانہ کو اپنے باپ کے متعلق کچھ بھی علم نہ تھا۔ ابنِ مقدم سے اُس کی آخری ملاقات اُس رات ہوئی تھی جب اُس کے باپ نے اُس سے فرخ شاہ کے قتل کے سلسلے میں دانیال سے تعاون کرنے کی درخواست کی تھی اور ارمغانہ کو با دلِ ناخواستہ محبتِ پدری سے مجبور ہو کر قتل جیسے گھناؤنے کام میں تعاون کا وعدہ کرنا پڑا تھا۔ اُس رات کے بعد اُس نے اپنے باپ کو نہیں دیکھا تھا۔ اُس کا گھر بار تو اُسی وقت لٹ گیا تھا جب لوگوں کو معلوم ہُوا کہ ابنِ مقدم، فرخ شاہ کو قتل کر کے قلعہ دمشق پر قبضہ کرنا چاہتا ہے۔ اس طرح ارمغانہ اُسی دن سے خانماں برباد ہو گئی تھی اور گرفتاری کے ڈر سے جگہ جگہ چھپتی پھر رہی تھی۔

حارثہ کے گھر پر دستک دے کر ارمغانہ گھر میں داخل ہوئی تو حارثہ اور اُس کی ماں دھک سے رہ گئیں۔ ارمغانہ کا رنگ فق تھا۔ سانس پھول رہی تھی اور ہاتھ پیر کانپ رہے تھے۔ حارثہ نے دوڑ کے پانی کا گلاس بھرا اور زبردستی ارمغانہ کے منہ سے لگا دیا۔ حلق سے پانی اُترا تو اُس کے ہوش ٹھکانے ہوئے مگر نظریں بہک رہی تھیں۔ وہ بار بار دروازے کی طرف دیکھ رہی تھی۔

حارثہ کی ماں ایک جہاندیدہ خاتون تھیں۔ اُنہوں نے ارمغانہ کی کیفیت کو بھانپتے ہوئے پوچھا۔ "ارمغانہ بیٹی۔ کیا کوئی غنڈہ تمہارا پیچھا کر رہا ہے!"

"ہاں خالہ جان۔ مگر نہیں نہیں وہ غنڈہ نہیں ہے۔" ارمغانہ گھبرا گئی۔

"اے بیٹی" حارثہ کی ماں کہتے کہتے رُک گئیں۔

حارثہ، ارمغانہ کی رازدار تھی۔ وہ فوراً بولی "اماں آپ دُوسرے کمرے میں جا کے آرام کیجیے۔ میں ارمغانہ سے بات کروں گی"

بے چاری بڑی بی کچھ سوچتی ہوئی سر ہلاتی دُوسرے کمرے میں چلی گئیں

"کون تھا وہ؟" حارثہ کھڑے ہوتے ہوئے بولی۔ "چل میرے ساتھ۔ میں مار مار کے اُس کا منہ نہ لال کر دوں تو میرا نام حارثہ نہیں۔" حارثہ نے ارمغانہ کا ہاتھ پکڑ لیا۔

"سنو تو حارثہ۔" ارمغانہ نے آہستہ سے ہاتھ چھڑا لیا۔ "غنڈہ وُنڈہ کوئی نہیں تھا۔"

"پھر تُو اس قدر گھبرائی ہوئی کیوں آئی تھی؟" حارثہ نے کریدا کی۔

"اری وہی تھا۔" ارمغانہ نے بتانا شروع کیا۔ "پہلے مجھے آواز دی۔ میں آواز فوراً پہچان گئی جب اُدھر دیکھا تو اُس نے اپنا گھوڑا میری طرف موڑ دیا پھر جو میں بھاگی ہوں تو تمہارے گھر ہی پہنچ کے سانس لی۔"

"ارمغانہ تُو بالکل پاگل ہے۔" حارثہ نے بے دھڑک کہا۔ "تُو تو کہہ رہی تھی کہ میں اُس سے ملنا نہیں چاہتی؟"

"اور کیا۔ بالکل ملنا نہیں چاہتی۔ اسی لیے تو بھاگ کھڑی ہوئی۔"

"کیوں مجھے بنانے چلی ہے؟ ابھی کہہ رہی تھی کہ اُس نے پہلے مجھے آواز دی تھی۔"

"ہاں ہاں دی تھی آواز۔" ارمغانہ نے مضبوط لہجے میں کہا۔ "میں انکار تھوڑی کرتی ہوں۔"

"ٹھیک ہے۔ تُو اُس سے ملنا نہیں چاہتی۔ ہے ناں؟" حارثہ نے جرح کی۔

"ہاں ہاں۔ کیا کروں اُس سے مل کے۔ وہ امیر صلاح الدین کا بھتیجا سہی لیکن اُس کی حیثیت ایک غلام سے زیادہ نہیں۔" ارمغانہ نے منہ بنا کے کہا۔

"کوئی حیثیت نہیں۔" حارثہ نے سر ہلایا۔ "مگر جب اُس کی آواز سُنی اور پہچان لی تو پھر پلٹ کے اُسے۔۔۔۔ کیوں دیکھا؟ اس کا جواب دے مجھے۔ تُو اُس سے ملنا نہیں چاہتی تھی تو اُس کی آواز پر کان کیوں دھرے؟"

"وہ۔ وہ۔" ارمغانہ کو کوئی جواب نہ سُوجھا۔

"دیکھ ارمغانہ۔ آج تجھے تسلیم کرنا پڑے گا کہ تیرے دل میں امیر زادے فرخ شاہ کے لیے کچھ جگہ ضرور ہے۔"

حارثہ نے اُسے اس طرح پکڑا تھا جیسے چور چوری کرتا پکڑا جائے۔ ارمغانہ کچھ دیر اُنگلیاں چٹخاتی رہی پھر حیا کے چند موتی اُس کے گلاب جیسے رخساروں پر پھسل پڑے۔

"حارثہ۔" ارمغانہ نے جیسے سسکی بھری۔ "دل جلا ہو تو ہر چیز جلتی لگتی ہے۔ میرا تو سب کچھ اُجڑ گیا لُٹ گیا۔ شکل یاد نہیں۔ باپ نے اگرچہ پورا پیار دیا لیکن اقتدار نے انہیں بہکا دیا۔ وہ خود ڈوبے اور مجھے بھی ڈبو دیا۔"

حارثہ بڑی تیز طرار تھی۔ کڑک کے بولی۔ "یہ سب جگہ مگر ماضی کا رونا کب تک روتی رہو گی؟ باپ نے ایک تو مجرم بنایا پھر اکیلا چھوڑ بھاگا۔ میں کہتی ہوں پچھلی باتوں پر مٹی ڈالو اور نئے سرے سے زندگی شروع کرو۔"

"مگر کس طرح؟ زندہ تو میں اب بھی ہوں اور کیا چاہیے" ارمغانہ کی افسردگی بڑھتی جا رہی تھی۔

"تم ایک بار اُس سے مل کے تو دیکھو۔" حارثہ نے اُس کی طرف جھکتے ہوئے مشورہ دیا۔

"کس سے؟ امیر زادے سے۔ نا بابا نا یہ نہ ہو گا مجھ سے۔" ارمغانہ نے جواب دیا۔

"آخر ڈرتی کیوں ہے؟ کیا وہ تجھے کھا جائے گا؟" حارثہ اُسے قائل کرنے لگی۔

"کیوں ملوں؟ میرا لگتا کون ہے؟" ارمغانہ نے منہ بنایا۔

"اس لیے ملو کہ وہ تم سے ملنا چاہتا ہے۔" حارثہ نے اُسے سمجھانے کی کوشش کی۔ "دیکھ ارمغانہ۔ میں اگلے مہینے پرائی ہو جاؤں گی، پھر تُو کہاں جائے گی؟ میرا یہ مطلب نہیں کہ اس گھر کے دروازے تیرے اُوپر بند ہو جائیں گے۔ ماں تجھے چاہتی ہے لیکن تجھے ماں کے کوٹھے سے الگ کر تو بیٹھنا ہے۔ تجھے تو گھر بسانا ہے اپنا"

"اچھا۔ اچھا سوچوں گی۔ بجائے تسلی دینے کے میرا سر کھانے لگی۔" ارمغانہ نے اُکتا کے کہا۔

دوسرے دن وہ پھر بازار گئی مگر ڈرتے ڈرتے۔ ذرا کھٹکا ہوتا تو کئی کئی بار مڑ کے پیچھے دیکھتی۔ اُدھر فرخ شاہ نے فیصلہ کر لیا تھا کہ ارمغانہ سے مل کے رہے گا۔ اب تو اس کی بھی صاف تھی۔ وہ امیر صلاح الدین کے پیامبر کے طور پر بھی ارمغانہ سے مل سکتا تھا۔ اُس نے پہلے ہی دن وہ گلی اور گھر کا نقشہ بھی ذہن نشین کر لیا تھا۔ دوسری صبح ہوتے ہی اُس نے بازار کا رُخ کیا اور ٹھیک اُس گلی کے سامنے جس میں ارمغانہ غائب ہوئی تھی، کھڑا ہو گیا۔ وہ آج گھوڑا ساتھ تو نہیں لایا تھا۔ اُسے یہ اطمینان تھا کہ اگر وہ ایک بار ارمغانہ کے سامنے پہنچ گیا تو پھر وہ گفتگو کرنے سے پرہیز نہیں کرے گی کیونکہ اُس کے باپ کا معافی نامہ فرخ شاہ کی زبان پر تھا۔

انتظار بڑا ظالم ہوتا ہے پھر محبوب کے انتظار کا عالم ہی کچھ اور ہوتا ہے۔ فرخ شاہ نے ارمغانہ سے اب تک محبت کی ایک بات بھی نہ کی تھی۔ اُسے موقع ہی کب ملا تھا؟ پھر اُن کے درمیان ابنِ مقدم کا مقدمہ بھی تو تھا۔ فرخ شاہ اُس کی گرفتاری پر مامور کیا گیا تھا۔ اس صُورتِ حال میں فرخ شاہ اُس سے کیا کہتا اور کہتا بھی تو اُسے کسی اُمید افزا جواب کی اُمید نہ ہو سکتی تھی۔ ارمغانہ کو بھی خیال ہوتا کہ فرخ شاہ اُس پر ناجائز دباؤ ڈال رہا ہے۔

یہ فرخ شاہ کی خوش قسمتی تھی کہ اُسے زیادہ انتظار نہ کرنا پڑا۔ شاید یہ حارثہ کی ڈانٹ پھٹکار اور اُسے سمجھانے بُجھانے کا اثر تھا کہ ارمغانہ صبح ہی صبح بغیر ضرورت گھر سے نکل پڑی۔ وہ پھُونک پھُونک کے قدم رکھ رہی تھی لیکن دل برابر دھڑکے جا رہا تھا۔ اگر فرخ شاہ کا آج سامنا ہو گیا تو کیا ہو گا؟ وہ اس کی بات کا جواب دے گی کہ نہیں؟ حارثہ بھی تو یہی کہتی ہے کہ مجھے اُس سے ملنا چاہیے۔ وہ میرا مخالف تو نہیں۔ وہ میری مدد کرنا چاہتا ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ اس کے سپرد اُس کے باپ کی گرفتاری کا کام ہے لیکن اُس نے اب تک اُس کے باپ کو گرفتار نہیں کیا۔ کیا پتا کہ فرخ شاہ نے اُس کے باپ کا پتا لگا لیا ہو اور اُسے گرفتار نہ کیا ہو۔ ارمغانہ سوچ رہی تھی کہ ایک تیز رفتار گھوڑا گلی میں داخل ہُوا۔ ارمغانہ ٹھٹک گئی۔ وہ سمجھی کہ یہ گھوڑا فرخ شاہ کا ہے لیکن وہ بے لگام گھوڑا تھا جس پر سوار قابو نہ پا رہا تھا۔

پھر ارمغانہ نے پلٹ کر سڑک کی طرف دیکھا۔ بازار میں ابھی بھیڑ نہ تھی۔ اکا دُکا لوگ چل پھر رہے تھے۔ اُس نے قدم اُٹھایا تھا کہ دل اس زور سے اُچھلا جیسے سینے سے نکل جائے گا۔ سڑک کے اُس پار فرخ شاہ سڑک کی لالٹین کے کھمبے کے ساتھ کھڑا تھا۔ اُس کی نظریں اِدھر ہی تھیں۔ اس طرح ارمغانہ اور فرخ شاہ کی نظروں میں زبردست تصادم ہُوا۔ ارمغانہ نے ارادہ کیا کہ بھاگ پڑے مگر زمین نے جیسے اُس کے پیر پکڑ لیے۔ حارثہ کی تمام ڈانٹ اُس کے سامنے آ گئی۔ وہ بھاگ کے کہاں جائے گی؟ گھر گئی تو حارثہ کو کیا جواب دے گی؟

ارمغانہ عام طور سے نصف نقاب میں رہتی تھی۔ فرخ شاہ نے اُسے اسی انداز میں دیکھا تھا۔ سوائے اُس دن کے جب ارمغانہ امیر صلاح الدین کے سامنے پیش ہُوئی تھی۔ امیر سے اُس نے پردہ نہ کیا تھا کیونکہ امیر صلاح الدین اُس وقت دمشق کا فاتح اور حاکمِ اعلیٰ تھا۔ ارمغانہ اور فرخ کی نظریں ایک بار ملیں تو پھر الگ نہ ہو سکیں۔ فرخ شاہ اُس کے پیکر کو آنکھوں کے ذریعے دل میں اُتار رہا تھا اور ارمغانہ اتنی دُور سے فرخ شاہ کے چہرے کے تاثرات پڑھنے کی کوشش کر رہی تھی۔ نظروں کا یہ تصادم کئی لمحے قائم رہا پھر ارمغانہ کو خیال آیا کہ وہ بازار میں کھڑی ہے۔ اُس نے جلدی سے نظریں نیچی کر لیں۔

فرخ شاہ کو بھی ہوش آ گیا۔ اس خیال سے کہ کہیں ارمغانہ پھر کہیں نہ غائب ہو جائے۔ فرخ شاہ تیز قدم اُٹھاتا سڑک پار پہنچ گیا۔ زمین اب تک ارمغانہ کے پیر پکڑے ہُوئی تھی۔

"ارمغانہ مبارک ہو، امیر شمس الدین ابنِ مقدم کی خطا معاف ہو گئی۔" فرخ شاہ نے بغیر ایک لمحہ ضائع کیے کہہ ڈالا۔

ارمغانہ نے حیران نظروں سے فرخ شاہ کو دیکھا۔ اُسے اپنے کانوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔

"امیر زادے۔" ارمغانہ نے بے یقینی کے انداز میں کہا۔ "آپ نے ابھی کیا کہا تھا؟ ایک بار پھر فرمائیے!"

فرخ شاہ نے مضبوط لہجے میں جواب دیا۔ "میں نے غلط نہیں کہا ارمغانہ۔ امیر صلاح الدین نے امیر ابنِ مقدم کی غلطی سے درگزر کیا ہے اور مجھے حکم ہُوا ہے کہ میں امیر موصوف اور اُن کی بیٹی ارمغانہ کو اُن کے سامنے پیش کروں تاکہ وہ دونوں کو انعامات سے نوازیں۔"

"امیر زادے۔ یہ حکم میرے لیے تو ہو سکتا ہے لیکن میرے باپ کے لیے کیسے ہو سکتا ہے جب کہ اُنہوں نے امیر صلاح الدین کی مخالفت کی اور آپ کے قتل کا منصوبہ بنایا؟" ارمغانہ کے انداز میں اب بھی بے یقینی تھی۔

"ارمغانہ۔ ابنِ مقدم نے ماضی میں جو کیا سو کیا لیکن حلب کے محاذ پر اُنہوں نے امیر صلاح الدین کی جان بچانے کی کوشش کی تھی۔" فرخ شاہ نے کہا۔ "میں تمہیں پوری تفصیل بتانے کو تیار ہوں مگر بہتر ہے کہ تم میرے ساتھ شاہی محل چلو یا پھر وہاں لے چلو جہاں تم مقیم ہو۔"

ارمغانہ کے دل و دماغ میں مسرت کی ایک زبردست لہر دوڑ گئی تھی۔ وہ تنہائی میں جب بھی اپنے باپ کے کردار پر غور کرتی تو اُسے ابنِ مقدم کے تمام کام شیطانی نظر آتے۔ وہ اس نتیجے پر پہنچی تھی کہ اُس کا باپ بدی کے راستے پر اتنی دُور جا چکا ہے جہاں سے اُس کی واپسی ممکن نہیں لیکن اس وقت فرخ شاہ نے نوید دے کر اُس کا دل باپ کی طرف سے صاف کر دیا۔

"کیا سوچ رہی ہو ارمغانہ؟" اُسے خیالات میں اُلجھا دیکھ کر فرخ شاہ نے پوچھا۔

"کچھ نہیں" ارمغانہ نے چونک کر جواب دیا۔ "آپ میرے ساتھ تشریف لائیے۔"

دونوں ساتھ چلنے لگے۔ اُن دنوں آج جیسا ماحول نہ تھا کہ لڑکی بس اسٹاپ پر کھڑی ہو تو بیس جوان اُس کا طواف کرنے لگتے ہیں۔ نہ عیاشی تھی نہ فحاشی۔ لوگ ایک دوسرے کے معاملات میں دخل نہ دیتے تھے۔ اپنے کام سے کام اور بس اللہ کا نام۔

دونوں خاموشی سے چلتے ہوئے حارثہ کے دروازے پر پہنچے۔ ارمغانہ نے قدرے ادب سے کہا۔ "آپ ذرا انتظار فرمائیے۔ میں اندر پردہ کرا کے بلاتی ہوں۔"

پردے کا اگرچہ عام رواج نہ تھا لیکن بڑی بوڑھیاں باپردہ رہنے کو شرافت کی نشانی سمجھتی تھیں۔ ارمغانہ پسینے میں ڈوبی اندر پہنچی۔ حارثہ کی نظر پڑی تو وہ گھبرا کے کھڑی ہو گئی۔

"کیا ہوا ارمغانہ۔ اتنی گھبرائی ہوئی کیوں ہو؟" حارثہ نے سوال کیا۔

ارمغانہ نے دروازے کی طرف اشارہ کیا۔ "وہ آگئے ہیں۔"

"وہ آگئے ہیں۔ کون آگئے ہیں؟" حارثہ گھبرا گئی۔

"ارے وہی۔ امیرزادے فرخ شاہ۔" ارمغانہ نے سنبھل کے کہا۔

"امیرزادے فرخ شاہ۔ وہی امیر صلاح الدین کے بھتیجے؟" حارثہ نے کریدی۔

"ہاں ہاں وہی اور کون ہو سکتا ہے؟" ارمغانہ کے لبوں پر ہلکی سی مسکراہٹ پھیل گئی۔ "تم ہی نے تو کہا تھا کہ اُن سے ملو۔ آج ذرا منہ لگایا اور وہ ساتھ لگے چلے آئے۔ مردوں کی یہی عادت تو بُری ہوتی ہے۔"

حارثہ گم صم کھڑی کچھ سوچ رہی تھی کہ اُس کا بھائی بھاگتا ہوا اندر آیا۔ "باجی۔ باجی۔ ایک خوب صورت سا آدمی باہر کھڑا ہے پتا نہیں کون ہے وہ۔ فوجی لگتا ہے۔"

حارثہ نے اُسے ڈانٹا۔ "چپ رہو۔ خبردار جو باہر گیا۔" پھر ارمغانہ سے بولی۔ ". . . . . . . ہائے اللہ وہ امیرزادے ہیں۔ اُنہیں کہاں بٹھاؤں؟ بیٹھک تو ہے نہیں۔ اس گھر میں۔ لے دے کے یہی دو کوٹھریاں ہیں۔"

اُسی وقت حارثہ کی ماں اور بوڑھا باپ دوسری کوٹھری سے برآمد ہوئے۔ ماں نے لڑکیوں کو حیران پریشان دیکھا تو پوچھا۔ "کیا ہوا ہے تم دونوں کو۔ کیوں پریشان کھڑی ہو؟"

"اماں وہ امیرزادے ہیں نا۔ صلاح الدین کے بھتیجے وہ آئے ہیں۔" حارثہ نے تفصیل بتائی۔

ارمغانہ اپنے تمام حالات سے حارثہ اور اُس کے والدین کو آگاہ کر چکی تھی۔ امیرزادے کے نام پر حارثہ کے باپ چونکے۔

"امیرزادے فرخ شاہ؟"

"جی ہاں خالو جان۔" ارمغانہ نے تائید کی۔ "امیر صلاح الدین نے ابا جان کی خطا معاف کر دی ہے۔ یہی خبر دینے آئے ہیں مجھے۔"

"مگر وہ ہیں کہاں؟" بڑے میاں نے گھبرا کے پوچھا۔

"دروازے پر کھڑے ہیں۔" ارمغانہ نے بے دھڑک کہہ دیا۔

"کمبختو۔ تم نے باہر کھڑا کیا ہے اُنہیں۔ اندر کیوں نہیں بلایا۔" یہ کہتے ہوئے بزرگ محترم دروازے کی طرف چلے۔

حارثہ نے جلدی سے ایک چارپائی پر صاف سی چادر بچھا دی۔ اُسی وقت حارثہ کے والد امیرزادے کو ساتھ لیے اندر آگئے۔

"بے تکلف تشریف لائیے۔ آپ سے کوئی پردہ نہیں کرتا۔" بزرگ نے بے تکلفی کا مزید اظہار کیا۔

فرخ شاہ مسکین صورت بنائے چارپائی پر بیٹھ گیا۔

"آپ نے بڑا کرم کیا امیرزادے۔" بزرگ بولے۔ "فرمائیے ہم غریب آپ کی کیا خدمت کر سکتے ہیں؟"

"بزرگ محترم۔" فرخ شاہ نے چپ کا روزہ توڑا۔ "دراصل امیر شمس الدین ابن مقدم کا قصور امیر صلاح الدین نے معاف کر دیا ہے بلکہ ابن مقدم کی ایک کارگزاری کے صلے میں اُنہیں انعام دینے کا بھی اعلان فرمایا ہے۔"

"سبحان اللہ۔ سبحان اللہ۔ امیر صلاح الدین بھی کیا خوبیوں کے مالک ہیں۔" بزرگ نے صلاح الدین کی تعریفیں شروع کر دیں۔ "بڑی نیک اور سنجیدہ طبیعت پائی ہے انہوں نے۔ میں نے برسوں امیر کو جامع دمشق میں درس و وعظ میں شریک دیکھا ہے۔ کون کہہ سکتا تھا کہ یہ خاموش طبیعت بچہ ایک دن مصر کا وزیر اعظم بنے گا؟"

"یہ سب آپ بزرگوں کی دعاؤں کا نتیجہ ہے بزرگ محترم۔" فرخ شاہ نے ہنس کر کہا۔

"امیرزادے ابھی آپ جوان ہیں۔ ممکن ہے آپ کی

نظر مستقبل پر نہ ہو لیکن یقین کیجیے کہ میری بوڑھی آنکھیں امیر صلاح الدین کے سر پر دمشق کا تاج دیکھ رہی ہیں۔" بزرگ نے ایسے واضح الفاظ میں پیشین گوئی کی کہ سب لوگ چونک پڑے۔

"آمین۔ ثم آمین۔" یہ آواز حارثہ کی والدہ کی تھی۔ انہوں نے فوراً شوہر کی تائید کی۔

فرخ شاہ کو بھی بولنا پڑا۔ "خدا کرے ایسا ہو۔ ہم صرف دعا ہی کر سکتے ہیں۔"

حارثہ نے دیکھا کہ یہ تو سیاست کی محفل جم رہی ہے۔ اس نے فوراً موضوع بدل لیا۔ "ابا جان۔ امیر زادے ارمغانہ اور خالو ابن مقدم کی تلاش میں یہاں تک پہنچے ہیں۔ ارمغانہ تو یہاں موجود ہے لیکن خالو ابن مقدم کو کیسے تلاش کیا جائے؟"

فرخ شاہ کے چہرے پر پہلی بار مسکراہٹ کھیلی۔ "چلیے ایک کام تو ہو گیا۔ ارمغانہ مل گئی ہیں تو اب ان کے والد بھی ضرور مل جائیں گے۔ جس شب امیر پر حشیش والوں نے قاتلانہ حملہ کیا تھا اس کے دوسرے ہی دن امیر نے شمس الدین ابن مقدم کی معافی کا اعلان کر دیا تھا۔ مجھے حکم دیا گیا تھا کہ میں ابن مقدم اور ان کی بیٹی ارمغانہ کو تلاش کر کے ان کے سامنے پیش کروں۔"

"سبحان اللہ۔ کیا طبیعت پائی ہے امیر صلاح الدین نے؟" بزرگ پھر شروع ہو گئے۔ "خوش ہوئے تو ایسے کہ باپ کے ساتھ بیٹی کو بھی طلب فرمایا۔ میرا خیال ہے کہ امیر بیٹی ارمغانہ کو بھی انعام دیں گے۔"

"خیال نہیں بلکہ یقیناً ایسا ہو گا۔" فرخ شاہ بولا۔ "اصل کارنامہ تو ارمغانہ ہی نے انجام دیا ہے اور سچ پوچھیے تو ابن مقدم کو معافی دلانے میں ارمغانہ کے کارنامے کا بڑا دخل ہے۔"

"کارنامہ؟" بزرگ نے اپنی بیٹی کی طرف دیکھا۔ "کیوں حارثہ تمہیں معلوم ہے کہ ارمغانہ نے کیا کارنامہ انجام دیا ہے؟ مجھے تو کسی نے بھی کچھ نہیں بتایا۔"

ارمغانہ نے تمام واقعات سے اپنی سہیلی حارثہ کو آگاہ کر دیا تھا اور اسے یہ بھی تاکید کی تھی کہ وہ اس بات کا ذکر اپنے گھر والوں سے نہ کرے۔ بات منہ سے نکلے تو پرائی ہو جاتی ہے اور ہر شخص اسے اپنے انداز میں سوچتا ہے۔ حارثہ نے اسی لیے اپنے باپ کو ارمغانہ کے بارے میں سوائے موٹی موٹی باتوں کے تفصیل سے کچھ نہ بتایا تھا۔

حارثہ نے فوراً بات سنبھال لی۔ "جی ہاں ابا جان۔ ارمغانہ نے بہت بڑا کام کیا ہے۔ آپ یوں سمجھیے کہ ارمغانہ کا کام ہی ہے جس نے امیر زادے کو ہم غریبوں کے گھر آنے پر مجبور کر دیا۔"

"بے شک بے شک۔" بزرگ بولے۔ "بڑوں کی یہی پہچان ہے کہ وہ چھوٹوں اور غریبوں کو حقیر نہ سمجھیں۔"

"بزرگ محترم! آپ کے گھر آنا تو میرے لیے فخر کا باعث ہے اس لیے کہ اس گھر میں میری محسنہ مقیم ہے۔ وہ ہستی جس نے مجھے نئی زندگی عطا کی ہے۔"

حارثہ کے والد نے پھر کان کھڑے کیے اور حارثہ نے دوبارہ بات سنبھالی۔ "ابا جان۔ امیر زادے صحیح فرما رہے ہیں۔ ارمغانہ نے بہت بڑا کام کیا ہے۔ میں آپ کو تفصیل سے بتاؤں گی۔"

"ٹھیک ہے ضرور کام کیا ہو گا۔" بزرگ خود کلامی کے انداز میں بولے پھر ارمغانہ سے مخاطب ہوئے۔ "کیوں بیٹی ارمغانہ اب تم کیا چاہتی ہو؟"

ارمغانہ چونک پڑی۔ "میں۔ خالو جان کیا چاہتی ہوں۔ امیر زادے سے دریافت کیجیے یہ کیوں آئے ہیں اور کیا چاہتے ہیں؟"

"یہ بھی ٹھیک ہے۔" اور بزرگ نے امیر زادے کو سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

"بزرگ محترم۔" امیر زادے نے مہذب طریقے سے جواب دیا۔ "میرے لیے امیر کا حکم ہے کہ میں امیر شمس الدین ابن مقدم اور ان کی صاحبزادی کو امیر صلاح الدین کے حضور میں پیش کروں۔ ایک ہفتے سے میں حلب کا محاذ چھوڑ کے یہاں آیا ہوں۔ آج خوش قسمتی سے ارمغانہ مجھے مل گئی ہیں۔ اب آپ جیسا فرمائیں؟"

"ہوں ہہ۔" کہہ کے بزرگ جیسے مراقبے میں چلے گئے لیکن چند ہی لمحوں بعد سر کو جھٹک کے بولے۔ "امیر زادے یہ تو فرمائیے کہ امیر صلاح الدین نے ابن مقدم کی معافی کا اعلان کرا دیا ہے کہ ابھی نہیں؟"

"جی۔ میں آپ کی بات نہیں سمجھ سکا۔" فرخ شاہ نے حیران نظروں سے بزرگ کو دیکھا۔ حارثہ اور ارمغانہ کی سمجھ میں بھی نہ آیا تھا کہ وہ کیا کہنا چاہتے ہیں؟

"دیکھیے امیر زادے۔" بزرگ نے بزرگانہ انداز میں کہا۔ "حاکموں اور بادشاہوں کا طریقہ ہے کہ جب وہ کسی ناموجود یا مفرور کے لیے سزا کا اعلان کرتے ہیں تو اس کا شہر شہر ڈھنڈورا پیٹا جاتا ہے۔ شاہی اعلانچی اور ڈھنڈورچی شہر شہر اور گلی گلی اعلان کرتے پھرتے ہیں کہ فلاں بن فلاں مردود ہوا اور اسے گرفتار کرنے والے کو یہ انعام دیا جائے گا۔ اسی طرح جب کسی

بڑے امیر یا وزیر جو زیرِ عتاب ہو اور اُسے معافی دے دی جائے تو بالکل اسی طرح معافی نامہ کا بھی اعلان کیا جاتا ہے۔ سمجھ گئے آپ امیر زادے؟"

"جی آپ درست فرما رہے ہیں۔ میں نے ایسا سُنا ہے۔" فرخ شاہ نے اتفاق کیا۔ "لیکن ابنِ مقدم کے معاملے میں امیر نے زبانی طور پر مجھ سے کہا اور اُنہیں پیش کرنے کا حکم دیا۔ انہوں نے حلب میں سرداروں کے سامنے بھی اس معافی کا اعلان کیا تھا مگر ڈھنڈورچی وغیرہ کے لیے حکم نہیں ہوا تھا۔"

"امیر معظم نے تو اعلان کر دیا اور محاذِ جنگ پر ہوتے ہوئے اتنا ہی کافی تھا۔" بزرگ نے مسئلے پر روشنی ڈالی۔ "اب اس معافی نامے کی تشہیر کا انتظام تو دمشق کے گورنر کو کرنا چاہیئے تھا۔ آخر گورنر ہی تو امیر صلاح الدین کے نائب ہیں۔ آپ اُن سے مل کے عام اعلان کرا دیجیے۔ ظاہر ہے ابنِ مقدم جان کے خوف سے کہیں پوشیدہ ہیں۔ ڈھنڈورچی کے ذریعے اعلان ہو گا تو یہ خبر اُن تک ضرور پہنچے گی اور وہ خود بخود امیر کے سامنے حاضر ہو جائیں گے۔"

"بزرگ محترم۔ میں آپ کا شکر گزار ہوں کہ آپ نے مجھے صحیح راستہ دکھایا۔" فرخ شاہ نے بڑی مسرت سے کہا۔ "دمشق کے گورنر میرے چچا سیف الاسلام طغرگین ہیں اُن سے مل چکا ہوں اور میں نے اُن سے اس معافی نامے کا تفصیلی ذکر بھی کیا تھا۔ اب میں اُن سے دوبارہ ملوں گا اور اعلانِ عام کے لیے کہوں گا۔"

"ہاں امیر زادے۔" بزرگ نے تائید کی۔ "اگر آپ اپنے طور پر ابنِ مقدم کو برسوں تلاش کرتے پھریں گے تو بھی وہ آپ کے ہاتھ نہیں آئیں گے کیونکہ وہ تو زیرِ عتاب ہیں۔ وہ اپنے کو کسی کے سامنے کیسے ظاہر کر سکتے ہیں؟"

❁

حارثہ کے بزرگ باپ کی بات بہت معقول تھی۔ امیر زادے فرخ شاہ نے ارمغانہ سے وعدہ لیا کہ وہ جب تک ابنِ مقدم کی تلاش میں کامیاب نہیں ہوتا اُس وقت تک وہ حارثہ کے گھر سے کہیں اور نہیں جائے گی۔ اس وعدہ وعید کے بعد فرخ شاہ گورنرِ دمشق سیف الاسلام طغرگین کے محل کی طرف روانہ ہوا۔

فرخ شاہ نے دمشق آتے ہی طغرگین کو بتا دیا تھا کہ امیر صلاح الدین نے شمس الدین ابنِ مقدم کو معاف کر دیا ہے اور یہ کہ وہ حلب سے ابنِ مقدم اور اُس کی بیٹی کی تلاش میں دمشق آیا ہے لیکن اس امر کی تشہیر کے لیے نہ فرخ شاہ نے گورنر پر زور دیا تھا اور نہ خود گورنر نے اس کی ضرورت محسوس کی تھی۔

گورنر سیف الاسلام طغرگین، فرخ شاہ کا چچا تھا لیکن شاہی آداب کے تحت وہ اُسے چچا کے بجائے دمشق کے نائب سلطنت کے لقب سے مخاطب کرتا تھا۔

"نائب سلطنت!" فرخ شاہ نے ادب سے کہا۔ "مجھے معلوم ہوا ہے کہ شاہی دستور کے مطابق جب مفرور مجرم کی سزا کا اعلان کیا جاتا ہے تو شاہِ وقت کا یہ اعلان شہر شہر اور گلی گلی ڈھنڈورچی پکارتا پھرتا ہے۔ یہی طریقہ کسی مجرم کے معافی نامے کے معاملے میں بھی اختیار کرتے ہیں۔ امیر صلاح الدین اگرچہ شاہِ وقت نہیں لیکن دار السلطنت پر اُن کا قبضہ ہے اور آپ اُن کے نائب ہیں۔ اس لیے میں چاہتا ہوں کہ امیر صلاح الدین نے شمس الدین ابنِ مقدم کی معافی کا جو اعلان کیا ہے اُس کی پوری تشہیر آپ کی طرف سے ہونی چاہیئے تاکہ یہ خبر ابنِ مقدم تک پہنچے اور وہ امیر کے سامنے پیش ہو کے اپنی نیکی کا صلہ پائے۔"

نائب سلطنت نے فرخ شاہ کی بات بڑے غور سے سُنی اور سوچ میں پڑ گیا۔ نجم الدین ایوب کا خاندان دراصل شمشیر زنوں اور بہادروں کا خاندان تھا۔ اُن کی زندگیاں میدانِ جنگ میں سرداری کرتے گزری تھیں۔ نجم الدین، اور اسد الدین شیرکوہ دونوں کی اولادیں سلطنتِ دمشق سے وابستہ تھیں اور سلطان نور الدین زنگی کے حکم کی تعمیل پر یہ لوگ جانیں نثار کرنے پر آمادہ ہوتے تھے پھر جب اسد الدین شیرکوہ کو مصر بھیجا گیا اور مصر کی وزارت کا قلمدان اُس کے حوالے ہوا تو امورِ سلطنت اور شاہی قانون اور دستور کے سمجھنے اور برتنے کا اُسے موقع ملا۔ شیرکوہ کے بعد یہ ذمے داری امیر صلاح الدین کو سونپی گئی۔ عجیب بات تھی کہ امیر صلاح الدین میں شجاعت اور شمشیر زنی کے ساتھ ساتھ امورِ سلطنت کی اہلیت پیدائشی طور پر موجود تھی اور اسی اہلیت کی بنا پر اُس نے ایک طرف تو عیسائیوں خصوصاً... شاہ یروشلم سے کئی بار معرکے کیے اور دوسری طرف مصر کے فاطمی سردار جو اپنی خودسری میں کسی کو کچھ نہ سمجھتے تھے انہیں امیر نے اس خوبی سے نیچا دکھا کر اپنا مطیع کیا کہ مصر اور دمشق میں اُس کی تعریف کے ترانے بجنے لگے۔

مگر امورِ سلطنت کی سوجھ بوجھ اور شاہانہ طور طریقوں سے صرف امیر صلاح الدین ہی واقف تھا۔ اُس کے بھتیجے اب تک محض سردارِ فوج اور میدانِ جنگ کے ماہر تھے۔ سلطنت کے اصولوں کا انہیں قطعی علم نہ تھا۔ امیر زادے فرخ شاہ کا بھی یہی

حال تھا۔ اگر عارشہ کے بزرگ باپ اُسے تشہیر کی بات نہ سمجھاتے تو وہ ابھی جانے کتنے سال تک ابنِ مقدم کو اِدھر اُدھر تلاش کرتا رہتا۔ یہی حال دمشق کے گورنر سیف الاسلام طغرگین کا تھا۔ وہ تلوار کے زور پر دمشق پر حکومت تو کر رہا تھا مگر قاعدے قانون کا اُسے کوئی پتا نہ تھا۔ پھر جب فرخ شاہ نے اُس کے کان میں بات ڈالی تو وہ فکر میں پڑ گیا۔

"فرخ شاہ!" گورنر سیف الاسلام نے فکر مند لہجے میں کہا۔ "تم اتنے روز سے دمشق آئے ہوئے ہو لیکن یہ بات تم نے مجھے آج بتائی ہے اگر پہلے کہا ہوتا تو اب تک میں کئی بار ڈھنڈورا پٹوا چکا ہوتا۔"

"نائب محترم!" فرخ شاہ نے بڑے انکسار سے کہا۔ "بات دراصل یہ ہے کہ یہ بات مجھے خود نہیں معلوم تھی۔ آج ایک بزرگ نے سمجھائی ہے تو میں آپ کے پاس آیا ہوں۔ آپ اس پر فوراً عمل کیجیے۔ اب دیر نہ ہونی چاہیے ورنہ امیر کے ناراض ہونے کا خدشہ ہے۔"

"ضرور ضرور۔ یہ کام ابھی اور اسی وقت ہوگا۔" گورنر سیف الاسلام طغرگین نے کہا۔ "لیکن یہ بتاؤ فرخ شاہ۔ کہیں امیر اس بات کی پوچھ گچھ تو نہیں کریں گے کہ ہم نے اُن کے اعلان کی فوراً تشہیر کیوں نہیں کی؟"

طغرگین، امیر صلاح الدین سے بہت ڈرتا تھا، وہی نہیں بلکہ صلاح الدین کے بڑے چھوٹے بھائی اُس سے خوف زدہ رہتے تھے۔ اُن سب نے اپنی قسمت صلاح الدین سے وابستہ کر دی تھی اور اُس کے حکم کو بالکل حکمِ خداوندی کی طرح مانتے تھے۔ فرخ شاہ سمجھ گیا کہ گورنر گھبرا گیا ہے اس نے انہیں مطمئن کرنے کے لیے کہا۔ "نائب محترم۔ آپ امیر کی فکر نہ کیجیے اگر ایسی ویسی پڑ گئی تو الزام میں اپنے سر لے لوں گا۔ آپ بس فوراً تشہیر شروع کرا دیجیے۔ میں اس قول کا قائل ہوں کہ دیر آید درست آید۔ اس کام میں اگرچہ ہماری ناقص معلومات کی وجہ سے کچھ دیر ضرور ہوئی ہے لیکن اس میں بھی کوئی اچھائی پوشیدہ ہے۔"

گورنر نے ایک لمحہ بھی ضائع نہیں کیا اور ناظمِ دربار کو بُلا کر حکم دیا۔ "شہر شہر اور گلی گلی اعلان کیا جائے کہ امیر صلاح الدین نے امیر شمس الدین ابنِ مقدم کا قصور معاف کر دیا ہے اور ابنِ مقدم اور اُس کی بیٹی کو حکم دیا جاتا ہے کہ وہ دونوں امیر کے سامنے پیش ہوں اور انعام حاصل کریں۔"

اِدھر گورنر کی زبان سے حکم نکلا اُدھر ڈھنڈورچی اور اعلانچی اُن تمام علاقوں میں پھیل گئے جہاں جہاں امیر صلاح الدین کا قبضہ تھا۔ اس طرح دو دن کے اندر ہر شخص کو معلوم ہو گیا کہ ابنِ مقدم نے جو کہ معتوب تھا کوئی ایسا کارنامہ انجام دیا ہے کہ امیر نے نہ صرف اُس کا قصور معاف کیا ہے بلکہ اُسے انعام بھی دیا جائے گا مگر اتنی تشہیر کے باوجود امیر شمس الدین ابنِ مقدم نہ معلوم کس جگہ چھپا ہوا تھا کہ اُسے کوئی خبر نہ ہو سکی۔ فرخ شاہ مزید ایک ہفتہ ابنِ مقدم کے انتظار میں دمشق میں ٹھہرا رہا لیکن سب بے سُود۔ پھر حلب سے اُس کا بلاوا آ گیا اور اُسے فوراً روانہ ہونا پڑا۔ چلتے وقت وہ ارمغانہ سے مل بھی نہ سکا۔

فرخ شاہ نے دمشق کے قیام کے دوران ایک بار ارمغانہ سے ملنے کی کوشش کی تھی لیکن ارمغانہ ٹال گئی تھی اور اُس نے عارشہ کے ذریعے کہلوا دیا کہ وہ گھر پر موجود نہیں اور اپنی خالہ کے گھر گئی ہوئی ہے۔ فرخ شاہ سمجھ گیا کہ ارمغانہ اُس سے ملنے سے گریز کر رہی ہے۔ اُس کا اقدام درست تھا اس لیے کہ اب تک ابنِ مقدم کا کچھ پتا نہ چلا تھا اور ارمغانہ باپ سے ملے بغیر اپنے مستقبل کے بارے میں کوئی فیصلہ کرنا نہیں چاہتی تھی جب روانگی سے پہلے بھی فرخ شاہ عارشہ کے گھر گیا تھا لیکن یہی بتایا گیا کہ ارمغانہ اب تک واپس نہیں آئی۔

حلب کے حالات اچانک بگڑ گئے تھے۔ گورنر گمشتگین نے دُہری چال چلی تھی۔ ایک طرف تو اُس نے قلعۂ الموت کے شیخ الجبل کے ذریعے امیر صلاح الدین کی زندگی کا چراغ گُل کرنے کی کوشش کی تھی پھر جب امیر صلاح الدین فدائیوں کے ہاتھوں بچ گیا اور کم و بیش ایک سو فدائی جو امیر کے لشکر میں شامل ہو گئے تھے گرفتار ہو کر قتل کر دیے گئے۔ اُس وقت گمشتگین نے عیسائیوں سے پھر رابطہ قائم کیا۔ یہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے کہ سلطان نور الدین کے دورِ حکومت میں ریمنڈ کاؤنٹ آف تریپولی جو جنگِ حارم میں گرفتار ہو کر حلب میں قید کر دیا گیا تھا۔ اُسے گمشتگین نے ایک بھاری رقم اور کچھ مسلمان قیدیوں کے بدلے میں رہا کرا دیا تھا۔ وہی ریمنڈ اس وقت نابالغ بالڈون چہارم کا سرپرست اور لاطینی سلطنت کا ولی عہد بنا ہوا تھا۔

گمشتگین کا گماشتہ ریمنڈ کے پاس طرابلس (تریپولی) پہنچا۔ کاؤنٹ آف طرابلس کی نظریں مسلمانوں کی خانہ جنگی پر لگی ہوئی تھیں اور وہ کسی بہتر موقع کی تلاش میں تھا۔ حلب سے وزیر و گورنر گمشتگین کے ہرکارے کی آمد ریمنڈ کے لیے ایک نوید مسرت تھی۔ اس نے گماشتے کو فوراً اپنے محل میں طلب کر لیا۔

حلب کے گماشتے نے کاؤنٹ کو کورنش پیش کیا تو کاؤنٹ

نے گفتگو میں خود ہی پہل کی۔ "ہم حلب کے گورنر سعد الدین گمشتگین کے خاص قاصد کو خوش آمدید کہتے ہیں۔ قبل اس کے کہ قاصد ہمیں حلب سے لایا ہوا پیغام پہنچائے ہم قاصد سے اپنے دیرینہ دوست کی خیریت معلوم کرنا چاہیں گے۔ ہم اپنے دوست کی خیریت معلوم کرنے کے لیے بہت بے چین تھے اور حلب کی طرف اپنا ہرکارہ بھیجنے کی فکر میں تھے کہ اُدھر سے تم آ گئے۔ ہمیں تفصیل سے بتاؤ کہ ہمارے دوست اور اُن کے اہل و عیال خیریت سے تو ہیں۔ انہیں مصری وزیر صلاح الدین کی طرف سے کوئی پریشانی تو نہیں؟ ہمیں معلوم ہوا تھا کہ صلاح الدین مصر سے دمشق پہنچ گیا ہے اور اُس نے کچھ علاقے بھی حاصل کر لیے ہیں۔ ہمیں یہ بھی بتایا جائے کہ ہمارے دوست گمشتگین اور وزیر صلاح الدین کے درمیان دوستی کے رشتے استوار ہیں کہ مخالفت کی دیوار اُٹھ گئی ہے۔"

کاؤنٹ آف طرابلس نے بڑی چالاکی سے گمشتگین کے نمائندے کو مرعوب کرنے کی کوشش کی تھی۔ اُسے تمام حالات کا علم تھا۔ حلب کے محاصرے کے بارے میں بھی وہ سب کچھ جانتا تھا مگر اپنی دوستی کے اظہار کے لیے قاصد کے سامنے بالکل انجان بن گیا تھا۔

"عالی جناب کاؤنٹ آف طرابلس نے میرے آقا کے ساتھ اپنی دوستی کا جس انداز سے ذکر کیا ہے۔ اُس کے لیے میں اپنے آقا کی طرف سے کاؤنٹ کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔" گمشتگین کا نمائندہ واقعی مرعوب ہو گیا تھا۔ "میرے آقا طرابلس کی طرف سے اس لیے فکر مند تھے کہ انہوں نے اس سے پہلے بھی آپ کے حضور ایک پیغام بھیجا تھا مگر اس پیغام کا انہیں کوئی واضح جواب نہیں ملا تھا۔ اب اس خادم کو آپ کے پاس اس لیے بھیجا گیا ہے کہ میں حلب کے محاصرے کی پوری تفصیل سے آپ کو آگاہ کروں اور آپ سے التماس کروں کہ اس مشکل وقت میں آپ میرے آقا جنہیں آپ دوست کے محبوب کے نام سے یاد کرتے ہیں، اُن کی نہ صرف زبانی بلکہ فوجی مدد فرمائیں۔"

"ضرور، ضرور۔ ہم اپنے دوست کے لیے اپنی جان تک لڑا دیں گے۔" کاؤنٹ نے جواب دیا۔ "ہمیں یاد پڑتا ہے کہ کچھ دن پیشتر امیر گمشتگین نے ہمیں مطلع کیا تھا کہ حلب پر صلاح الدین کے حملے کا شدید خطرہ ہے اس لیے اُنہیں فوجی مدد کی ضرورت پڑ سکتی ہے۔ قاصد سے ہم نے کہہ دیا تھا کہ گمشتگین جن کے ہم احسان مند بھی ہیں جب بھی ہمیں آواز دیں گے تو میدان میں ہم اُن کے پہلو بہ پہلو نظر آئیں گے۔"

"عالی جناب کاؤنٹ نے درست فرمایا۔" گمشتگین کے قاصد نے کہا۔ "اُس وقت حلب پر حملے کا امکان تھا لیکن اب امیر صلاح الدین نے حلب کا محاصرہ کر لیا ہے۔ میرے آقا نے حوصلہ کر کے محاصرہ توڑنے کی کوشش کی تھی اور حلب کی فوجیں قلعے کے دروازے کھول کر صلاح الدین کے لشکر پر ٹوٹ پڑی تھیں۔ تمام دن شدید جنگ ہوتی رہی لیکن فیصلہ نہ ہو سکا۔ شام کو مجبوراً حلب کی فوجوں کو قلعے میں واپس آنا پڑا۔ اُس کے بعد صلاح الدین کو مصر سے کمک پہنچ گئی اور حلب کی فوجیں دوبارہ میدانِ جنگ میں نہ نکل سکیں۔ اب اگر اس محاصرے کو جلد نہ توڑا گیا تو حلب ہمارے ہاتھ سے نکل جائے گا۔"

"یہ کیسے ہو سکتا ہے!" کاؤنٹ بڑے جوش سے بولا۔ "جب تک ہم زندہ ہیں حلب پر صلاح الدین قبضہ نہیں کر سکتا۔ تم امیر کو ہماری طرف سے اطمینان دلاؤ کہ وہ قطعی نہ گھبرائیں۔ ہم بہت جلد بجلی بن کر صلاح الدین پر گریں گے اور اُسے حلب کا محاصرہ ختم کرنے پر مجبور کر دیں گے۔"

گمشتگین کا گماشتہ خوش ہو گیا۔ کاؤنٹ نے صاف الفاظ میں فوجی مدد کا اعلان کیا تھا۔ "کاؤنٹ محترم۔ میرے پاس الفاظ نہیں ہیں کہ میں آپ کا شکریہ ادا کر سکوں۔ براہ کرم مجھے واپسی کی اجازت دی جائے۔ میرے آقا بے چینی سے منتظر ہیں۔"

"تم جا سکتے ہو قاصد۔" کاؤنٹ آف طرابلس نے فوراً اجازت دے دی۔ "لیکن اتنی بھی جلدی کیا ہے! تم ہمارے مہمان ہو۔ ابھی تم سے بہت سی باتیں کرنا ہیں اور کئی معاملات پر گفتگو ہونا ہے۔ آج رات کو تم ہمارے ساتھ کھانا کھاؤ گے۔ اُسی وقت تمام معاملات طے پا جائیں گے۔"

گماشتہ سمجھ گیا کہ کاؤنٹ محض دوستی کے ناتے گمشتگین کی مدد نہیں کرے گا بلکہ فوجی مدد کا پورا پورا معاوضہ طلب کرے گا۔ اس سلسلے میں گمشتگین کو کھلی چھٹی دے دی گئی تھی کہ وہ کاؤنٹ آف طرابلس کی ہر شرط تسلیم کر لے اور معاہدے پر اُس کی طرف سے دستخط کر دے۔ چنانچہ گمشتگین کا قاصد یا سفیر رُک گیا اور اُس نے واپسی پر زور نہ دیا۔

رات کے کھانے پر کاؤنٹ آف طرابلس نے اور زیادہ محتاط گفتگو کی۔ اُس کے پہلے ہی سوال پر گمشتگین کا قاصد چونک پڑا۔ کاؤنٹ نے اُس سے پوچھا تھا۔ "حلب کے قاصد۔ تم اپنے آقا کے یقیناً راز دار ہو گے؟"

قاصد انکار نہ کر سکا۔ "میں اپنے آقا کا راز دار تو نہیں لیکن یہ ضرور ہے کہ وہ مجھ پر پورا اعتماد کرتے ہیں اور اس کا

ثبوت یہ ہے کہ میں اپنے آقا کا پیغام لے کر آپ کے پاس تنہا آیا ہوں حالانکہ ایسے موقع پر پوری سفارت بھیجی جاتی ہے۔"

"تمہارا خیال ٹھیک ہے قاصد۔" کاؤنٹ نے سرسری انداز میں کہا۔ "ہمیں بھی امیر گمشتگین کی طرف سے ایک بھرپور سفارت کے آنے کی اُمید تھی مگر شاید امیر نے یہ مناسب نہ سمجھا اور تمہیں بھیج دیا۔ ظاہر ہے کہ امیر گمشتگین نے تمہیں بھی وہ اختیارات سونپے ہوں گے جو سفارت کو دیے جاتے ہیں؟"

قاصد کو پھر اقبال کرنا پڑا۔ "عالی مقام کاؤنٹ کا خیال درست ہے۔ آقائے محترم نے مجھے پورے اختیارات دے کر آپ کی خدمت میں بھیجا ہے۔"

"خیر یہ تو بات ہوگئی۔" کاؤنٹ نے اطمینان کا سانس لیا۔ "قبل اس کے کہ ہم گفتگو آگے بڑھائیں تم یہ بتاؤ کہ شیخ الجبل نے اپنے فدائین کے ذریعے امیر صلاح الدین پر جو قاتلانہ حملہ کرایا تھا وہ ناکام کیوں ہوگیا؟ اس سے قبل تو فدائین کبھی ناکام نہ ہوتے تھے؟"

"عالی مقام کاؤنٹ۔" قاصد نے سوچتے ہوئے کہا۔ "جہاں تک مجھے بتایا گیا ہے اُس سے تو یہ ظاہر ہوتا ہے کہ امیر صلاح الدین عین حملے کے وقت بیدار ہوگیا اور اُس نے حملہ آور کو پکڑ لیا اس کے بعد۔۔۔"

"ٹھہرو قاصد۔ ٹھہرو۔" کاؤنٹ نے اُسے ہاتھ کے اشارے سے بھی روکا۔ "پہلے یہ بتاؤ کہ صلاح الدین کے خیمے میں داخل ہونے والا حملہ آور اکیلا تھا یا اُس کے ساتھ کچھ اور فدائین بھی تھے؟"

"یقین سے کچھ نہیں کہا جا سکتا محترم کاؤنٹ۔" قاصد نے اٹکتے ہوئے کہا۔ "مشہور تو یہ ہے کہ چار حملہ آور صلاح الدین کے خیمے میں داخل ہوئے تھے جن میں سے ایک صلاح الدین کے ہاتھ سے مارا گیا اور باقی تین کو محافظوں کے سردار طغرل نے ختم کر دیا۔"

"میں نے اس سلسلے میں ایک بات اور سنی ہے۔ تم یقیناً اُسے جانتے ہو گے؟" کاؤنٹ نے جیسے رداروی میں کہا۔

"فرمائیے محترم کاؤنٹ۔" قاصد نے جواب دیا۔ "میرے علم میں ہوگا تو ضرور بتاؤں گا۔"

"میں نے سنا ہے کہ امیر گمشتگین نے شیخ الجبل کو اتنی رقم کی ادائیگی نہیں کی جس کا وعدہ کیا تھا۔ اس لیے شیخ الجبل کے فدائین نے قاتلانہ حملے کا صرف ناٹک کیا تھا۔"

"نہیں محترم کاؤنٹ۔" قاصد نے انکار میں سر ہلایا۔ "یہ تو میں نہیں کہہ سکتا کہ میرے آقا اور شیخ الجبل میں کیا معاہدہ طے پایا تھا لیکن یہ یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ آقا جو وعدہ کرتے ہیں وہ پورا ضرور کرتے ہیں۔ آپ کو اس سلسلے میں بالکل مطمئن رہنا چاہیے۔"

"مجھے تمہارا اعتبار ہے قاصد۔ صلاح الدین پر حملے کی بات تو میں نے برسبیل تذکرہ کہی تھی۔" کاؤنٹ بات کو ٹال گیا۔ "تم امیر گمشتگین کو پورا یقین دلا دینا کہ حلب کا محاصرہ ختم ہو جائے گا خواہ اس کے لیے ہمیں کچھ بھی کرنا پڑے لیکن انہیں پہلے اپنا وعدہ پورا کرنا ہوگا۔"

"محترم کاؤنٹ آپ کو میرا اعتبار کرنا ہوگا۔" قاصد نے جواب دیا۔ "ابھی کوئی وعدہ نہیں ہوا۔ آپ رقم مطلوبہ بیان فرمائیے۔ میں نہ صرف حلف پر وعدہ کروں گا بلکہ خود رقم لے کر آپ کی خدمت میں حاضر ہوں گا۔"

"ہاں۔ یہ ہوئی مردوں والی بات۔" کاؤنٹ خوش ہوگیا۔

اس کے بعد کاؤنٹ آف طرابلس اور گمشتگین کے گماشتے میں دیر تک گفتگو ہوتی رہی۔ یہ تو نہ معلوم ہو سکا کہ گمشتگین کی طرف سے کتنی رقم کی ادائیگی کا وعدہ کیا گیا لیکن معاہدہ طے پا گیا اور قاصد واپس چلا گیا۔ معلوم ہوتا ہے کہ وہ قاصد حسب وعدہ ایک بار پھر کاؤنٹ کے پاس واپس آیا جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ گمشتگین نے عہد نامے کی رقم کی ادائیگی کر دی تھی۔ اس کے ٹھیک دو ہفتے بعد یعنی یکم فروری ۱۱۷۵ء کو ریمنڈ کاؤنٹ آف طرابلس فوجیں لے کر حمص کی طرف روانہ ہوا۔ حمص اور حماۃ کا اس وقت تک امیر صلاح الدین کی فوجیں محاصرہ کیے ہوئے تھیں۔

عیسائیوں کے حمص کی طرف پیش قدمی کی خبر جب امیر صلاح الدین کو حلب پہنچی تو اس نے فوراً حلب کا محاصرہ اٹھایا اور بڑی تیز رفتاری سے حمص کی طرف روانہ ہوا۔ کاؤنٹ آف طرابلس اور گمشتگین میں یہی معاہدہ ہوا تھا کہ کاؤنٹ امیر صلاح الدین کو حلب کا محاصرہ ختم کرنے پر مجبور کر دے گا چنانچہ حمص پر حملے سے حلب کا محاصرہ ختم ہو گیا۔ اس طرح کاؤنٹ آف طرابلس نے اپنا وعدہ وفا کر دیا۔ وہ در اصل امیر صلاح الدین سے نہ تو جنگ کرنا چاہتا تھا اور نہ اُس میں اتنی طاقت تھی کہ امیر صلاح الدین جیسے دشمن کا تنہا مقابلہ کرے۔ چنانچہ جب صلاح الدین کی فوجوں نے دریائے ارنت کے کنارے مورچہ بندی کی تو کاؤنٹ آف

طرابلس پیٹھ دکھا گیا۔ اور بغیر مقابلے پر آئے اپنی فوج لے کر واپس چلا گیا۔

عیسائیوں کی واپسی پر امیر صلاح الدین نے آگے بڑھ کے پھر حمص کا محاصرہ کیا اور اُس وقت تک وہاں ٹھہرا رہا جب تک حمص نے ہتھیار نہیں ڈالے۔ بیس دن کے سخت محاصرے کے بعد حمص پر امیر صلاح الدین کا قبضہ ہو گیا۔ امیر صلاح الدین نے حمص کا دفاع مضبوط کیا پھر وہ بعلبک کی طرف چلا۔ بعلبک وہ پہلا قلعہ تھا جو صلاح الدین کے باپ نجم الدین ایوب کو امیر عماد الدین زنگی نے عطا کیا تھا۔ اُس وقت تک زنگی خاندان میں بادشاہت نہ آئی تھی اور یہ خاندان امیر کہلاتا تھا۔

قلعہ بعلبک کو امیر صلاح الدین کی زندگی میں بڑا دخل حاصل ہے اس لیے کہ صلاح الدین کے بچپن کے آٹھ نو سال یعنی ۱۱۴۶ء تک جب امیر عماد الدین زنگی قتل ہوا، بعلبک میں گزرے تھے۔ تاریخ میں اس دور کا کوئی تذکرہ نہیں ملتا۔ عام خیال یہی ہے کہ صلاح الدین نے بعلبک میں گزارے ہوئے بچپن کے زمانے میں عام مسلمانوں کی طرح دینیاوی تعلیم حاصل کی ہو گی۔ اس بات کا بھی امکان ہے کہ صلاح الدین کا باپ نجم الدین ایوب بعلبک کا گورنر تھا اس لیے صلاح الدین کو بہترین اُستادوں کی خدمات حاصل ہوئی ہوں گی لیکن یہ سب قیاس آرائیاں ہیں۔ اس میں شبہ نہیں کہ صلاح الدین کا باپ اپنے زمانے کا ایک بڑا دیندار حکمران تھا۔ نجم الدین ایوب نے تارک الدنیا صوفیوں کے لیے بعلبک میں ایک خانقاہ بنوائی تھی۔

بہر حال کچھ بھی ہو لیکن یہ حقیقت ہے کہ صلاح الدین نے تقریباً نو سال بعلبک میں گزارے تھے۔ اس لیے اُسے بعلبک سے ایک اُنس سا تھا۔ اُس نے کلام اللہ، صرف و نحو، دینیات، خطابت اور شاعری وغیرہ کی ابتدائی تعلیم اس مقام پر حاصل کی تھی۔ بارھویں صدی عیسوی میں اب حکمران خواہ کسی نسب سے تعلق رکھتے ہوں مگر اُن کی تعلیم کا معیار عربوں جیسا ہی ہوتا تھا۔ حدیث و قرآن کی تعلیم اور علم نحو کی باریکیاں اُس زمانے کے تعلیم یافتہ طبقے کا علمی مشغلہ ہوا کرتی تھیں۔ بعلبک وہ شہر تھا جہاں صلاح الدین کو یہ خبر ملی کہ اُس کے باپ نجم الدین ایوب کا مربی اور آقا قتل کر دیا گیا ہے۔ صلاح الدین نے اس اہم واقعے کا کیا تاثر لیا اس کا کوئی علم نہیں کیونکہ اُس وقت اُس کی عمر صرف نو سال تھی اور اس عمر کے بچے سے کسی تاثر کے اظہار کی توقع غلط معلوم ہوتی ہے۔

بعلبک کی فتح نے امیر صلاح الدین کو دمشق کے تقریباً تمام شمالی علاقے کا حاکم بنا دیا تھا۔ دمشق اُس کے پاس پہلے ہی تھا۔ حمص، حماۃ اور بعلبک اب فتح ہو چکے تھے۔ امیر صلاح الدین کی طاقت اس قدر بڑھ گئی تھی کہ حلب کا دفاع مشکل نظر آ رہا تھا۔ گمشتگین نے ملک الصالح کو اس بات پر آمادہ کیا کہ وہ اپنے چچازاد بھائی سیف الدین غازی سے مدد طلب کرے۔ ملک الصالح، سیف الدین غازی کے بہت خلاف تھا۔ اس لیے کہ سلطان نور الدین کے انتقال کرتے ہی سیف الدین غازی نے سلطنت دمشق کے یکے بعد دیگرے بہت سے علاقوں پر قبضہ کر لیا تھا۔ اُسے یہ بھی خیال نہ آیا کہ اس کا بھائی ابھی کمسن ہے۔ طمع نے اُسے اندھا کر دیا اور وہ سلطنت زنگی کا سب سے بڑا شہزادہ ہونے کی حیثیت سے اپنے دادا کی سلطنت پر اپنا زیادہ حق سمجھتا تھا۔

ملک الصالح کی طرف سے ایک سفارت دوبارہ موصل بھیجی گئی۔ سیف الدین غازی نے اُسے بڑی مشکل سے باریابی کی اجازت دی۔ اُس کا خیال تھا کہ ملک الصالح نے الجزیرہ کے وہ تمام علاقے جن پر سیف الدین غازی نے زبردستی قبضہ کر لیا ہے، واپس مانگنے کے لیے سفارت بھیجی ہے۔ پھر جب اُسے یقین دلایا گیا کہ سفارت کا مقصد کوئی علاقہ واپس لینا نہیں بلکہ فوجی کمک مانگنا ہے تب سیف الدین غازی نے سفارت کو محل میں طلب کیا۔

ناظم سفارت نے باریاب ہو کر عرض کیا: "پہلے میں ملک الصالح اسمٰعیل پسر سلطان دمشق نور الدین زنگی کی طرف سے آپ کے حضور جو کہ شاہی خاندان کے شہزادوں اور امیروں میں عمر کے لحاظ سے سب سے بڑے اور افضل ہیں، سلام پیش کرتا ہوں۔"

"گفتگو مختصر کی جائے۔" والی موصل سیف الدین غازی نے اُلجھتے ہوئے کہا۔ "ہمیں رشتے ناتے بتانے کی ضرورت نہیں۔ اگر ملک الصالح، سلطان دمشق کی اولاد ہے تو میں بھی امیر عماد الدین زنگی کا پوتا ہوں اور میرا بھی سلطنت دمشق پر اتنا ہی حق ہے جتنا کوئی جتلا سکتا ہے۔"

"امیر ذیشان!" ناظم سفارت نے ادب سے کہا۔ "ملک الصالح آپ کو اپنا بڑا بھائی اور سلطنت دمشق میں سب سے زیادہ طاقت ور عظیم امیر تسلیم کرتے ہیں۔ ملک الصالح کو آپ سے کوئی اختلاف یا شکوہ نہیں بلکہ وہ تو آپ کی امداد کے خواہاں ہیں۔ انہیں اُمید ہے کہ آپ اس پر آشوب زمانے

میں اُن کی اعانت فرما کر برادرِ بزرگ کا حق ادا کریں گے۔"

ناظمِ سفارت نے بات سنبھال لی ورنہ سیف الدین غازی تو بھڑکنے سے اکھڑ گیا تھا۔ کچھ دیر غور و فکر کے بعد اس نے جواب دیا۔ "صالح ہم سے کس قسم کی اعانت کا امیدوار ہے؟"

"اے والیِ موصل اور عزت و حرمتِ سلطنتِ دمشق۔" ناظمِ سفارت نے اُسے خوش کرنے کے لیے اور زیادہ خوشامدانہ طرز اختیار کیا۔ "اس وقت سلطنتِ دمشق پر غدار اور غاصب صلاح الدین نے جو وقت ڈال رکھا ہے اس سے صرف آپ ہی نپٹ سکتے ہیں۔ پہلے دمشق پر قبضہ پھر حمص، حماۃ اور بعلبک کی فتح۔ اُس نے پورا شمالی شام دبا لیا ہے۔ کہنے کو تو وہ خود کو الملک الصالح کا وفادار کہتا ہے لیکن انہیں حلب سے بھی نکالنے پر تلا ہوا ہے۔ ملک الصالح کی وفادار شاہی فوجوں، وزیر گمشتگین کی عقلمندی اور حکمتِ عملی اور پرجوش اہالیانِ حلب کی شجاعت نے حلب کو اب تک صلاح الدین کی دست برد سے بچائے رکھا ہے لیکن اب وہ حلب پر بہر صورت قبضہ کرنے کے لیے ایک طرف تو نیا لشکر تیار کر رہا ہے اور دوسری جانب مصر سے اُسے برابر فوجی کمک مل رہی ہے۔ ایسی صورت میں اگر اُسے حلب کے دوبارہ محاصرے سے نہ روکا گیا تو پھر حلب کی قسمت میں جو کچھ لکھا ہے وہ ظاہر ہے۔"

"صلاح الدین اس وقت کہاں ہے؟" سیف الدین غازی نے دریافت کیا۔

"صلاح الدین بعلبک میں نئی فوجی بھرتی کر رہا ہے۔" ناظمِ سفارت نے جواب دیا۔ "معلوم ہوا ہے کہ اُسے مصری کمک پہنچ چکی ہے اور اب وہ پوری طاقت سے حلب پر حملہ آور ہوگا۔"

"کاؤنٹ آف طرابلس نے مسلم علاقوں پر حملہ کیا تھا۔ اُس کا کیا انجام ہوا؟" تعجب ہے کہ سیف الدین غازی کی معلومات اس قدر ناقص تھیں کہ اُسے سوائے موصل کے کسی اور جگہ کے بارے میں کچھ بھی علم نہ تھا۔

"اے محترم و معظم والیِ موصل۔" ناظمِ سفارت نے جواب دیا۔ "ریمنڈ کاؤنٹ آف طرابلس اپنی فوجیں لے کر حمص کی طرف چلا تھا۔ اُس وقت صلاح الدین، حلب کا محاصرہ کیے ہوئے تھا۔ اُسے جیسے ہی اطلاع ہوئی وہ محاصرہ اٹھا کر کاؤنٹ کے مقابلے پر روانہ ہو گیا۔ قبل اس کے کہ کاؤنٹ اور صلاح الدین میں مقابلے کی نوبت آئے، کاؤنٹ جو حمص کے قریب پہنچ چکا تھا، چپ چاپ واپس ہو گیا۔ عظیم والیِ موصل۔ آپ اس بات سے اندازہ لگا سکتے ہیں کہ صلاح الدین کی طاقت کس قدر بڑھ چکی ہے۔ عیسائی سلطنتیں اس کے مقابلے پر آنے سے کتراتی ہیں۔ آپ نے شیخ الجبل کے فدائیوں کا انجام تو سنا ہوگا۔ انہوں نے ایک سو سے زیادہ فدائیوں کی مدد سے صلاح الدین پر حملہ کیا تھا لیکن صلاح الدین کا کچھ نہ بگاڑ سکے اور سب کے سب قتل کر دیے گئے۔"

"یہ بات حیرت انگیز ہے۔" سیف الدین غازی نے تبصرہ کیا۔ "بہرحال صلاح الدین کا کچھ نہ کچھ علاج کرنا ہوگا۔"

"والیِ موصل کی بڑا کرم نوازش ہوگی۔" ناظمِ سفارت نے فوراً کہا۔ "صلاح الدین صرف آپ سے خوف کھاتا ہے اس لیے اس نے آپ کے کسی علاقے پر ہاتھ نہیں ڈالا۔ دراصل وہ آپ کے مقابلے پر نہیں آنا چاہتا۔"

"وہ مقابلے پر نہیں آنا چاہتا تو ہم بھی اُسے آزاد چھوڑنا نہیں چاہتے۔" اس کے ساتھ ہی سیف الدین غازی نے اپنے درباریوں پر نظر ڈالی۔ اُس نے دربار میں ایک ایک سردار کو غور سے دیکھا۔ یہ تمام سردار زنگی خاندان کے مشہور شہسوار اور شمشیر زن تھے۔

سیف الدین نے ایک جگہ نظریں روک کر کہا۔ "زلقندار۔" زلقندار اپنی جگہ سے اُچھل کے ایک قدم آگے آیا۔ "حکم ہو آقائے محترم۔"

"کیا صلاح الدین میں جرأت ہے کہ ہمارے لشکر کے سامنے آئے؟" غازی نے زلقندار سے استفسار کیا۔

"ہرگز نہیں آقا۔" زلقندار نے جواب دیا۔ "صلاح الدین زنگی سلطان کے ٹکڑوں پر پلا ہوا محض ایک معمولی امیر ہے۔ اس کی رگوں میں زنگی خون کا ایک قطرہ بھی نہیں۔ اگر مقابلے پر آئے گا تو منہ کی کھائے گا۔ آپ کی عظمت تسلیم کرے گا تو فلاح پائے گا۔"

"صلاح الدین ہمارے بھائی ملک الصالح کو پریشان کر رہا ہے۔" سیف الدین غازی اب تک زلقندار سے مخاطب تھا۔ "ملک صالح نے اگرچہ ہم سے کوئی مشورہ نہیں کیا بلکہ اپنے اُمراء کے کہنے پر چلتا رہا مگر اس کی رگوں میں ہماری طرح زنگی خون ہے۔ اس نے ہمیں آواز دی ہے۔ ہم اُسے مایوس نہیں کریں گے۔"

"یہ میرے آقا کی اعلیٰ ظرفی ہے۔" زلقندار بولا۔ "میرے لیے کیا حکم ہے آقا؟"

"لشکر لے کر حلب جاؤ اور ملک الصالح کے فوجیوں کو شامل کر کے صلاح الدین کو اس کی غداری کی سزا دو۔" سیف الدین غازی نے فیصلہ کر دیا۔

والیٔ موصل کے اس فیصلے سے درباری سردار اور امراء بہت خوش ہوئے۔ انہوں نے برملا غازی کی تعریف کی۔

"شاباش!" ایک امیر بولا۔ "ہماری تلواریں صلاح الدین کو دغابازی کی سزا دینے کے لیے نیاموں میں بے چین ہیں۔ آپ نے فیصلہ کر کے ہمارے دل جیت لیے۔"

یہاں پر اس بات کی وضاحت ضروری ہے کہ جس وقت اسدالدین شیرکوہ اور صلاح الدین مصر بھیجے گئے تھے اس وقت مرحوم سلطان نورالدین زنگی نے امرائے نوریہ کی ایک جماعت اُن کے ساتھ کر دی تھی۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ اگر شیرکوہ یا صلاح الدین کوئی غلط قدم اٹھائیں تو امرائے نوریہ ٹوکیں اور انہیں سیدھا راستہ دکھائیں۔ بظاہر تو یہی مقصد تھا لیکن درپردہ سلطان نے اِن امراء کو اپنے خاص آدمیوں کی حیثیت سے لشکر کے ساتھ روانہ کیا تھا تاکہ وہ مصر میں ہونے والے واقعات کی تفصیل سلطانِ دمشق کو روانہ کرتے رہیں۔

مصر جانے والے امرائے نوریہ نے بلاشبہ ہر معرکہ میں دادِ شجاعت دی اور شیرکوہ اور شامی لشکر کے شانہ بشانہ لڑ کر مصر پر قبضے میں آسانیاں پیدا کیں لیکن جب اسدالدین شیرکوہ جو اس وقت تک مصر کا وزیرِ اعظم بن گیا تھا، کا انتقال ہوا اور اس کی جانشینی کا سوال پیدا ہوا تو امرائے نوریہ کا ہر امیر اپنے آپ کو قلمدانِ وزارت کا اہل سمجھتا تھا اور اس کی کوشش کی تھی کہ وہ شیرکوہ کا جانشین بنے۔ جہاں تک امرائے نوریہ کی شجاعت اور تاجِ دمشق سے وفاداری کا معاملہ تھا تو وہ بہادر بھی تھے اور وفادار بھی، اور وہ شیرکوہ کا جانشین ہونے کے اہل بھی تھے لیکن دمشق سے ہزاروں میل دور ایک غیر ملک میں اور ایک غیر مزاج رکھنے والی قوم کو قابو میں رکھنے کے لیے ایک نہایت اعلیٰ درجے کے دماغ اور سوجھ بوجھ کی ضرورت تھی اور یہی وجہ تھی فقیہ عیسیٰ ہکاری نے صلاح الدین کا نام وزارت کے لیے پیش کیا تھا۔ صلاح الدین اس وقت دوسرے امراء کے مقابلے میں عمر کے لحاظ سے چھوٹا تھا لیکن دوراندیشی اور جنگی مہارت میں دوسرے امراء اس سے کمتر تھے۔

جانشینی کے معاملے میں امرائے نوریہ میں اختلاف پیدا ہوا تھا اور صلاح الدین کے بحیثیت وزیرِ اعظم ہونے کے اس اختلاف میں اور شدت پیدا ہو گئی تھی۔ بعض امرائے نوریہ تو مصر چھوڑ کے دمشق واپس آ گئے تھے۔ مصر سے واپس آنے والے وہ امراء سلطان نورالدین سے صلاح الدین کی برائیاں کرتے رہتے تھے پھر سلطان نورالدین کا انتقال ہوا اور صلاح الدین دمشق واپس آیا تو دمشق اور اطراف میں صلاح الدین کے تمام مخالف امراء نے اس کی سخت مخالفت اور مزاحمت کی۔ سیف الدین غازی کے دربار میں بھی صلاح الدین کے مخالف امراء موجود تھے اور وہ اس بات کی کوشش کر رہے تھے کہ سیف الدین غازی اور صلاح الدین کی جنگ ہو اور وہ صلاح الدین سے میدان میں بدلے لے سکیں۔

زلقندار کا پورا نام عزالدین مسعود تھا اور یہ سیف الدین غازی کا بھائی تھا۔ یہ سالار عزالدین زلقندار والیٔ موصل کا حکم پاتے ہی ایک بڑے لشکر کے ساتھ حلب کی طرف روانہ ہوا۔ حلب کا شاہ ملک الصالح اور اس کا وزیر گمشتگین سخت پریشان تھے۔

امیر اُدھر سے جلدی ہی فارغ ہو گیا بلکہ اس یلغار میں اس نے بعلبک بھی فتح کر لیا جہاں اس کی زندگی کے پہلے نو سال گزرے تھے۔ اس طرح اب دمشق کے شمال میں تمام شاہی علاقے پر اس کا قبضہ ہو گیا۔ اس کے جاسوسوں نے اس تک یہ خبریں پہنچا دی تھیں کہ حلب کے وزیر گمشتگین نے کاؤنٹ آف طرابلس کو ایک بھاری رقم دے کر امیر صلاح الدین کے علاقے پر حملہ کرنے کے لیے آمادہ کیا تھا۔ چنانچہ امیر صلاح الدین نے فیصلہ کیا تھا کہ اب وہ حلب پر بھرپور حملہ کر کے اس کی اینٹ سے اینٹ بجا دے گا۔

صلاح الدین نے حلب پر حملے کے لیے مصر سے ایک لشکر بھی طلب کر لیا تھا جو قاہرہ سے دمشق روانہ ہو چکا تھا۔

اِدھر تو یہ انتظامات تھے اور اُدھر حلب والے بغلیں بجا رہے تھے کیونکہ انہیں معلوم ہو گیا تھا کہ موصل سے سیف الدین غازی نے ایک بڑا لشکر حلب کی طرف بھیج دیا تھا تاکہ ملک الصالح اپنے اور موصل کے لشکر کی مدد سے امیر صلاح الدین پر ایسی ضرب لگائے کہ اسے دمشق چھوڑ کر مصر کی طرف بھاگنا پڑے۔ حلب میں گھر گھر گھی کے چراغ جلائے جا رہے تھے کیونکہ موصل کا لشکر شام میں سب سے زیادہ طاقتور سمجھا جاتا تھا۔

شاہ حلب ملک الصالح نے اعلان کر دیا تھا کہ وہ اپنے تمام سردار، امراء اور معززین قلعہ کے ساتھ موصل سے آنے والے لشکر کا قلعے سے باہر نکل کے استقبال کرے گا۔ اس استقبال کی تیاریاں شروع ہو گئی تھیں۔ جگہ جگہ محرابیں بنائی جا رہی تھیں نیز شہر کو

حلب میں جشن جیسا سماں تھا۔ شاہ حلب نے اعلان سے زیادہ اہتمام کیا تھا اور جب موصل کا لشکر عزالدین زلقندار کی سپہ سالاری میں حلب میں داخل ہوا تو قلعے والوں نے واقعی آنکھیں فرش راہ کر دیں۔ لشکر پر اس قدر پھول برسائے گئے کہ راستہ پھولوں سے اَٹ گیا۔ شاہ ملک الصالح نے عزالدین کو گلے لگایا اور وہیں کھڑے کھڑے پہلے والیِ موصل کی خیریت معلوم کی پھر لشکر بڑی شان سے قلعے میں داخل ہوا۔

پھر جب دوسرے دن موصل اور حلب کے لشکر قلعے کے میدان میں شاہ ملک الصالح کے ملاحظہ کے لیے جمع ہوئے تو شاہ حلب کا سر فخر سے بلکہ غرور سے اکڑ گیا۔ بلاشبہ اتنا بڑا لشکر نہ صلاح الدین کے پاس تھا اور نہ وہ دمشق میں رہ کے اتنا عظیم لشکر اکٹھا کر سکتا تھا۔ صلاح الدین کے پاس اگرچہ بڑی آزمودہ کار فوج تھی۔ مصر سے بھی آنے والی فوجی کمک پہنچ چکی تھی۔ پھر بھی صلاح الدین پریشان ہو گیا تھا اور اس متحدہ لشکر سے ٹکرانے کے لیے کچھ وقت چاہتا تھا کیونکہ لڑائی کو کچھ دن ٹالے بغیر وہ پوری طرح تیار نہ ہو سکتا تھا۔

حلب میں موصل کے لشکر کو پہنچے ہوئے کئی دن ہو چکے تھے اور طے یہ ہوا تھا کہ مزید ایک دن آرام کے بعد حلب اور موصل کے لشکر صلاح الدین سے جنگ کے لیے روانہ ہوں گے۔ صلاح الدین اس وقت حماۃ کے نواح میں خیمے لیے پڑا تھا اور اس جنگ سے بچنے کے لیے تدبیریں سوچ رہا تھا۔ پھر آخری دن جب کہ دوسری صبح متحدہ لشکر کو کوچ کرنے والا تھا تو شاہ ملک الصالح کو اطلاع دی گئی کہ امیر صلاح الدین کی طرف سے گفتگو کے لیے ایک کوئی سفارت آئی ہے یعنی اس سفارت کا واحد رکن عزالدین فرخ شاہ تھا۔ یہ بھی عجیب اتفاق تھا کہ صلاح الدین کا سفیر بھی عزالدین تھا اور ملک الصالح کے متحدہ لشکر کے سپہ سالار کا نام بھی عزالدین زلقندار تھا۔

ملک الصالح نے اپنے وزیر گمشتگین اور موصل کے سپہ سالار عزالدین زلقندار سے مشورے کے بعد امیر صلاح الدین کے سفیر کو طلب کیا۔ فرخ شاہ ایک درباری غلام کی معیت میں حلب کے دربار پہنچا۔ گمشتگین اور زلقندار نے ملک الصالح کو سکھا دیا تھا کہ وہ سفیر سے گفتگو کرتے وقت اپنے شاہانہ وقار کو برقرار رکھے اور اپنی شان میں کسی قسم کی کوئی کمی نہ آنے دے۔

فرخ شاہ نے دربار میں داخل ہو کر سامنے کی طرف دیکھا۔ تخت شاہی پر شمکین شاہ ملک الصالح اپنے اوپر جاہ وجلال طاری کیے بیٹھا تھا۔ تخت کے ایک طرف وزیر گمشتگین اور دوسری جانب سپہ سالار زلقندار ہاتھ باندھے اور نظریں نیچی کیے کھڑے تھے۔ فرخ شاہ نے جھک کر کورنش پیش کی۔

"تمہارا نام؟" ملک الصالح نے بڑے رعب سے دریافت کیا۔

"عزالدین۔" فرخ شاہ کا اصل نام عزالدین تھا چونکہ وہ سفارت کے فرائض انجام دے رہا تھا اس لیے اس نے فرخ شاہ کے بجائے عزالدین نام بتایا۔

ملک الصالح اس نام پر چونکا اور اس کی نظریں بے ساختہ اپنے سپہ سالار عزالدین زلقندار کی طرف اٹھ گئیں۔ عزالدین زلقندار کو بھی اس بات پر حیرت ہوئی تھی اور وہ سفیر کو گھور کر دیکھ رہا تھا۔ ملک الصالح اور زلقندار کی طرح وزیر گمشتگین بھی سفیر کی زبان سے عزالدین کا نام سن کے پریشان سا ہو گیا تھا۔

ملک الصالح نے وزیر اور سپہ سالار سے نظریں گھما کر سفیر کو مخاطب کیا۔ "تمہیں صلاح الدین نے سفارتی گفتگو کے لیے بھیجا ہے یا محض مذاق کے لیے؟" ملک الصالح کے لہجے میں سختی آگئی۔

فرخ شاہ کو واقعی نہیں معلوم تھا کہ دربار میں اس وقت ایک اور عزالدین موجود ہے۔ اس لیے اسے شاہ حلب کے سخت لہجے پر تعجب سا ہوا۔ "اے شاہ ملک الصالح جگر گوشۂ مرحوم سلطان نورالدین زنگی۔ میں محض ایک پیامبر یا سفیر کی حیثیت سے آپ کے دربار میں حاضر ہوا ہوں۔ مجھے کیا حق یا ضرورت ہے کہ شاہِ حلب کی شان میں کسی قسم کی گستاخی کا تصور بھی کروں؟ آپ نے نام دریافت فرمایا اور میں نے عرض کر دیا۔"

"تم نے اپنے آپ کو عزالدین کیوں کہا؟ تمہیں اپنا نام بتانا چاہیے تھا۔" ملک الصالح کا غصہ کم نہ ہوا تھا بلکہ اس میں کچھ اور اضافہ ہو گیا تھا۔

فرخ شاہ چکرا گیا۔ "میں اپنی کم فہمی کی وجہ سے شاہ کی بات کا مطلب نہیں سمجھ سکا۔"

اس وقت گمشتگین نے دخل دیا۔ "سفیر کیا تمہارا نام صرف عزالدین ہے یا اس کے آگے پیچھے کچھ اور بھی ہے؟"

فرخ شاہ نے ایک لمحہ سوچنے کے بعد جواب دیا۔ "میرا پورا نام عزالدین فرخ شاہ بن نورالدولہ شاہان شاہ ہے۔ میرے والد شاہان شاہ امیر صلاح الدین کے سگے بھائی ہیں۔"

"اس کا مطلب ہے کہ عزالدین، صلاح الدین کا بھتیجا

ہے۔" گمشتگین مسکرانے لگا۔

"یہ ایک حقیقت ہے امیر محترم" فرخ شاہ نے اُلجھتے ہوئے کہا۔

"سفیر۔ کیا تمہیں یہ نہیں معلوم کہ اس دربار میں ایک اور عزالدین موجود ہیں؟" اس کے ساتھ ہی گمشتگین نے نگاہیں گھما کر عزالدین زلفندار کو دیکھا۔

فرخ شاہ کی سمجھ میں پوری بات آگئی۔ اس نے جواب دیا۔

"دربار میں شاہ ملک الصالح اور آپ کے سوا صرف ایک امیر اور موجود ہیں" اس کے ساتھ ہی اس نے زلفندار کی طرف دیکھا۔ "مجھے یقین ہے کہ دوسرے عزالدین یا آپ خود ہیں یا پھر وہ دوسرے امیر ہیں۔"

عزالدین زلفندار نے فرخ شاہ کو گھور کے دیکھا "ٹھیک ہے لیکن تمہارا نام صرف عزالدین ہے جب کہ میں عزالدین زلفندار ہوں اور اس فوج کا سپہ سالار ہوں جو امیر موصل اور میرے آقا سیف الدین غازی نے شاہ حلب ملک الصالح کی مدد کے لیے بھیجی ہے۔"

زلفندار نے فرخ شاہ کو مرعوب کرنے کے لیے زبردستی اپنا تعارف کرایا تھا۔

ملک الصالح، صلاح الدین کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کے لیے بے چین تھا، اس نے فرخ شاہ سے کہا۔ "ہمیں بتایا جائے کہ امیر صلاح الدین ہم سے کیا چاہتے ہیں؟"

"شاہا" فرخ شاہ نے سنبھل کے جواب دیا۔ "میرے آقا امیر صلاح الدین تاج دمشق اور آپ کے وفادار ہیں۔ وہ آپ سے جنگ کے بجائے صلح کے خواہش مند ہیں۔"

ملک الصالح نے تیوریوں پر بل ڈال کے کہا۔ "اگر امیر صلاح الدین ہمارے وفادار ہیں تو انہوں نے دمشق پر قبضہ کیوں کیا؟"

"عالی جاہ" فرخ شاہ نے ملک الصالح کا پورا وقار برقرار رکھتے ہوئے جواب دیا۔ "دمشق پر قبضہ اس لیے کیا گیا کہ شاہ وہاں موجود نہ تھے اور دارالسلطنت اپنے بادشاہ سے خالی تھا۔"

"مگر حلب میں تو ہم موجود ہیں پھر امیر صلاح الدین نے اس کا محاصرہ کیوں کیا؟" شاہ نے جرح کے انداز میں سوال کیا۔

"شاہ عالی مقام۔ حلب میں آپ کی موجودگی اور غیر موجودگی برابر ہے اس لیے کہ یہاں آپ کے بجائے آپ کے وزیر کا حکم چلتا ہے۔ میرے آقا چاہتے ہیں کہ شاہ معظم دمشق تشریف لائیں اور امیروں اور وزیروں سے بالاتر ہو کر حکومت فرمائیں۔"

"تم صرف ایک سفیر ہو" گمشتگین غصے سے پھنکار اٹھا۔ "تمہیں یہ حق کس نے دیا کہ شاہ کے امیروں اور وزیروں کی توہین کرو؟"

"امیر محترم نے درست فرمایا۔" فرخ شاہ نے آنکھیں ملا کے کہا۔ "میں صرف ایک سفیر ہوں مگر امیر محترم یہ بھول گئے کہ سفیر اپنے بھیجنے والے کا نمائندہ ہوتا ہے۔ میں نے جو کچھ کہا وہ میرے آقا کا کہا ہوا ہے اور آگے بھی جو کچھ کہوں گا وہ میرے آقا امیر صلاح الدین کی زبان سے کہا ہوا سمجھا جائے۔"

گمشتگین کو معقول اور سخت جواب ملا تھا۔ وہ صرف تلملا کر رہ گیا۔

"ہم دمشق نہیں جانا چاہتے بلکہ امیر صلاح الدین دمشق چھوڑ دیں۔" شاہ ملک الصالح کا لہجہ بہت نرم ہو گیا تھا۔

"اے شاہ ذیشان۔ میرے آقا دمشق پر آپ کے نام پر حاکم ہیں۔ تمام مفتوحہ علاقے میں سکہ آپ کے نام کا چلتا ہے۔ مساجد میں امام خطبے میں آپ ہی کا نام لیتے ہیں۔ میرے آقا نے اپنے نام کو تو کہیں پر استعمال نہیں کیا" فرخ شاہ نے ایک ایک لفظ پر زور دے کے کہا۔ فرخ شاہ بڑا خوب صورت جوان تھا۔ اس کے چہرے پر شجاعت اور ذہانت کی سرخی میں شوخی بھی گھلی معلوم ہوتی تھی لیکن اس وقت وہ جس سنجیدگی سے گفتگو کر رہا تھا اس سے ظاہر ہوتا تھا جیسے وہ ایک منجھا ہوا سیاست دان ہے۔

"ہوں" ملک الصالح نے ایک لمبی سانس لی۔ "اگر امیر صلاح الدین، دمشق پر ہمارے نام سے حکومت کر رہے ہیں تو انہوں نے حمص اور حماۃ پر کیوں قبضہ کیا؟"

فرخ شاہ نے قدرے حیرانگی سے ملک الصالح کی طرف دیکھا لیکن جواب دینے کے بجائے اس نے سر جھکا لیا جیسے وہ لاجواب ہو گیا ہو۔

"بولو۔ بولو سفیر۔ اب تم خاموش کیوں ہو گئے ہو۔۔۔؟"

ملک الصالح بہت خوش ہو رہا تھا شاید اس خیال سے کہ اس نے صلاح الدین کے سفیر کی زبان بند کر دی تھی۔ "شاید تمہارے پاس اس کا کوئی جواب نہیں؟"

"شاہ معظم" فرخ شاہ گمبھیر آواز میں بولا جیسے اُسے جواب دیتے تکلیف ہو رہی ہو۔ "اگر عالی جاہ کو حمص اور حماۃ پر امیر صلاح الدین کے قبضے پر اعتراض ہے تو دونوں قلعوں اور شہر کی چابیاں حضور

کے قدموں میں ڈال دی جائیں گی۔"

گمشتگین اور عزالدین زلفندار نے چونک کے اس طرح فرخ شاہ کو دیکھا جیسے انہیں اپنے کانوں پر اعتبار نہ ہو۔ ملک الصالح خود بھی اس جواب کی توقع نہیں کر رہا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ امیر صلاح الدین کی طرف سے اس کا سفیر حمص اور حماۃ پر قبضے کا بھی کوئی جواز پیدا کرے گا۔

"سفیر!" ملک الصالح نے رک رک کے کہا۔ "تم نے ابھی کیا جواب دیا؟ ایک بار پھر دہراؤ۔"

"شاہِ عالی مقام!" فرخ شاہ نے ٹھہرے لہجے میں کہا۔ "میرا جواب صاف اور واضح ہے کہ اگر شاہ حمص اور حماۃ پر امیر صلاح الدین کا قبضہ پسند نہیں فرماتے تو وہ دونوں شہر اور قلعے سلطنت حلب کے حوالے کر دیے جائیں گے۔"

"ہوں!" ملک الصالح نے دوبارہ ہنکاری بھری اور گمشتگین اور زلفندار کو اس طرح دیکھا جیسے کہہ رہا ہو کہ دیکھو میں نے اپنی باتوں کے طلسم میں صلاح الدین کے سفیر کو اس طرح الجھایا کہ وہ حمص اور حماۃ کے قلعے سلطنت حلب کے حوالے کرنے پر آمادہ ہو گیا۔ فرخ شاہ نے ایک دم ایسی بات کہہ دی تھی کہ وزیر گمشتگین اور سپہ سالار عزالدین زلفندار الجھ کے رہ گئے تھے۔

شاہ ملک الصالح نے دیکھا کہ دونوں ذمے دار ہستیاں بالکل خاموش ہیں تو اس نے زلفندار سے دریافت کیا۔ "کیا ہمارے سپہ سالار عزالدین زلفندار اس سلسلے میں کچھ کہنا پسند فرمائیں گے؟"

"شاہِ عالی شان!" زلفندار نے زبان کھولی۔ "امیر صلاح الدین کے سفیر نے صرف حمص اور حماۃ کا ذکر کیا ہے جب کہ صلاح الدین نے قلعہ بعلبک پر بھی قبضہ کر لیا ہے۔ اس سلسلے میں سفیر کا کیا جواب ہے؟"

"سپہ سالار محترم!" فرخ شاہ نے متانت سے کہا۔ "اگرچہ یہ ضروری نہیں ہے کہ میں سپہ سالار کے کسی سوال کا جواب دوں اس لیے کہ سفیر صرف حاکمِ اعلیٰ سے گفتگو کرتا ہے۔ دوسرے یہ کہ سپہ سالار جن کا کام میدانِ جنگ میں فوج کو لڑانا ہوتا ہے وہ سفارت کی ان باریک باتوں کو اچھی طرح نہیں سمجھ سکتے۔ ان دونوں باتوں کے باوجود چونکہ سپہ سالار کو شاہ حلب نے بولنے کی اجازت دی تھی اس لیے میں ان کے سوال کا بھی جواب دوں گا۔ سنیے سپہ سالار بہادر۔ میں نے حمص اور حماۃ کے قلعوں کی شاہ حلب کو پیش کش کی ہے۔ اب اگر سپہ سالار یہ ضروری سمجھتے ہیں میرے آقا امیر صلاح الدین، قلعہ بعلبک سے بھی ہاتھ اٹھا لیں اور آپ سے شاہ کی نذر فرمائیں تو ایسا بھی ہو جائے گا۔ صلح کی خاطر بعلبک بھی حلب کی سلطنت کے سپرد کر دیا جائے گا۔"

"ٹھیک ہے سفیر!" شاہ ملک الصالح صلح پر آمادہ ہو گیا۔ "لیکن سفیر کے پاس اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ اگر ہم صلح کے معاہدے پر آمادہ ہو جائیں تو حمص، حماۃ اور بعلبک ہمارے حوالے کر دیے جائیں گے؟"

"اے شاہِ حلب۔ ہر سفیر اپنے آقا یا حاکم کا نمائندہ ہوتا ہے اور نمائندگی کرتے وقت وہ جو بات طے کرتا ہے خواہ غلط ہی کیوں نہ ہو لیکن سفیر کی بات کا پاس کرنا اس کے آقا اور حاکم کا فرض بن جاتا ہے۔ شاہ اطمینان فرمائیں میں نے بحیثیت امیر صلاح الدین کے نمائندے کے جن قلعہ جات کو سلطنتِ حلب کے حوالے کرنے کا اعلان کیا ہے اس پر ضرور بالضرور عمل ہو گا۔"

ٹھیک اس وقت وزیر گمشتگین نے جھک کے شاہ ملک الصالح سے سرگوشی کی۔ پتا نہیں وہ کون سی بات تھی جسے سن کر شاہ کا چہرہ اتر گیا۔

شاہ نے بڑی بے دلی سے کہا۔ "اچھا ہم تمہاری پیش کش کا کل جواب دیں گے۔"

پھر شاہ نے اپنے حاجب کو حکم دیا کہ امیر صلاح الدین کے سفیر عزالدین فرخ شاہ کو شاہی مہمان خانے میں رکھا جائے اور اس کی خاطر داری اور عزت میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی جائے۔

فرخ شاہ ملک الصالح کو سلام کر کے باہر آ گیا۔

❖

فرخ شاہ کے رخصت ہونے کے بعد حلب کے شاہی محل میں بڑی ہنگامی صورتِ حال پیدا ہو گئی۔ ملک الصالح چاہتا تھا کہ امیر صلاح الدین سے جنگ کرنے کے بجائے صلح کر لی جائے مگر گمشتگین نے اسے صلح سے منع کیا تھا اور بات کل پر ٹالنے کی تاکید کی تھی۔

ملک الصالح کو اپنی بے بسی پر غصہ آ رہا تھا۔ اس نے غصے اور غم سے بھرے لہجے میں کہا۔ "کاش یہ مصالحت آج ہی ہو جاتی اور آج رات ہم لوگ سکھ اور آرام کی نیند سو سکتے لیکن ہمارے وزیر نے شاید اس میں کچھ مصلحت دیکھی اور آج معاہدہ نہ ہونے پایا۔"

سپہ سالار عزالدین زلقندار، شاہ ملک الصالح کا ہم خیال تھا۔ اُس نے ترش لہجے میں کہا "میں نہیں سمجھ سکا کہ کل پر بات ٹالنے میں کیا مصلحت ہو سکتی ہے جب صلاح الدین کا سفیر قلعہ حمص، حماۃ کے علاوہ بعلبک بھی ہمارے حوالے کرنے پر تیار ہو گیا تھا؟"

"اے حلب اور موصل کے لشکروں کے سپہ سالار" سعدالدین گمشتگین نے سر بلند کرتے ہوئے کہا "بے شک صلاح الدین کی طرف سے ہمیں بہترین پیشکش کی گئی ہے لیکن ہمیں پہلے یہ غور کرنا ہو گا کہ وہ کیا حالات اور واقعات ہیں جن سے مجبور ہو کر صلاح الدین نے تین اہم قلعے ہمیں طشتری میں رکھ کے پیش کیے ہیں۔ کہیں یہ فریب یا دھوکا تو نہیں"

"بے شک۔ بے شک" ملک الصالح بچوں کی طرح چیخا۔ "ہمارا وزیر کس قدر عقل مند ہے۔ ہم دھوکا نہیں کھانا چاہتے۔ ہر بات پر پوری توجہ دینی چاہیے"

گمشتگین کا سر غرور سے کچھ اور بلند ہو گیا "ایک بات اور بھی ہے سپہ سالار عزالدین زلقندار۔ امیر موصل سیف الدین غازی ہمارے حلیف اور کرم فرما ہیں۔ اگر ہم اُن سے مشورہ کیے بغیر کوئی معاہدہ کرتے ہیں تو انہیں اعتراض بھی ہو سکتا ہے"

امیر موصل کے نام پر عزالدین زلقندار بھی نرم پڑ گیا "وزیر حلب کی اس بات میں کافی وزن ہے۔ امیر موصل کو اطلاع دینا بہت ضروری ہے"

ملک الصالح نے ایک نیا نکتہ اُٹھایا "امیر موصل سے مشورہ ضرور کرنا چاہیے لیکن کل تو ہمیں سفیر کو جواب دینا ہے پھر یہ بھی خطرہ ہے کہ سفیر ہماری طرف سے مایوس ہو کر کہیں اپنی پیشکش واپس نہ لے لے"

"مجھے اس کی پیشکش کی پروا نہیں" گمشتگین نے زور دے کر کہا "جنگ کی تیاریاں بالکل مکمل ہیں اور یہ ہماری جنگی تیاریوں کا ہی فیض ہے کہ صلاح الدین نے گھبرا کے صلح کی بات شروع کی ہے"

"تو کیا ہم کل اُس سے کہہ دیں کہ ہم صلح نہیں کر سکتے اور میدان جنگ میں فیصلہ ہو گا؟" ملک الصالح کے چہرے پر گھبراہٹ کے آثار پیدا ہو گئے تھے۔

"صاف جواب دینے کی ضرورت نہیں۔ ہم کوئی بہانہ بھی کر سکتے ہیں" گمشتگین نے اس انداز سے کہا جیسے وہ ملک الصالح کو ڈانٹ رہا ہو۔

سپہ سالار زلقندار کو یہ بات پسند نہیں آئی "عالی جناب وزیر۔ ہم جنگی لوگوں کا طریقہ یہ ہے کہ جو ملتا ہے اُس پر فوراً قبضہ کرو۔ اس کے بعد آگے کی سوچو۔ میرا خیال تو یہ ہے کہ ہمیں حمص، حماۃ اور بعلبک جو بغیر لڑے بھڑے مل رہا ہے اُسے لے لینا چاہیے پھر باقی کے لیے جنگ کرنا چاہیے۔ کیوں عالی مقام وزیر آپ کا کیا خیال ہے؟"

گمشتگین اپنے سپہ سالار سے بگاڑنا نہیں چاہتا تھا۔ نرمی سے بولا "سپہ سالار زلقندار کی بات بہت معقول ہے۔۔۔ لیکن اس کے ساتھ یہ بھی مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہم کل اُس سفیر سے حمص، حماۃ، بعلبک کے ساتھ ساتھ دمشق کا مطالبہ بھی کریں۔ کیا عجب ہے کہ صلاح الدین جنگ سے جان بچانا چاہتا ہو اور دمشق بھی ہمارے حوالے کر کے مصر واپس چلا جائے"

ملک الصالح اور زلقندار دونوں نے اثبات میں سر ہلایا۔ پھر سپہ سالار بولا "عقل مند وزیر کی بات دل کو لگتی ہے جب امیر صلاح الدین حمص، حماۃ اور بعلبک سے دستبردار ہو سکتا ہے تو پھر دمشق بھی چھوڑ دے گا۔ ہمیں دمشق کا ضرور مطالبہ کرنا چاہیے"

آخر تھوڑی ردوکد کے بعد طے پایا کہ دوسرے دن سفیر سے دمشق کا بھی مطالبہ کیا جائے۔ وہ اگر رضامند ہوتا ہے تو معاہدہ کر لیا جائے ورنہ پھر جس کی لاٹھی اُس کی بھینس۔ گمشتگین نے ملک الصالح اور عزالدین زلقندار سے کہہ دیا کہ کل سفیر سے صرف وہ گفتگو کرے گا خود ہی جنگ یا صلح کا فیصلہ کرے گا۔

صبح کو امیر صلاح الدین کے سفیر کو بھرے دربار میں طلب کیا گیا۔ دراصل گمشتگین تمام اُمرا اور سرداروں کو یہ تاثر دینا چاہتا تھا صلاح الدین جنگ سے گھبرا رہا ہے اور کسی طرح عزت بچا کے مصر واپس جانا چاہتا ہے۔

گمشتگین نے دربار میں فرخ شاہ سفیر صلاح الدین سے بڑے سخت لہجے میں سوال کیا "سفیر، تمہیں کیا اُمید ہے۔ کیا ہم تمہاری پیشکش قبول کر لیں گے؟"

"وزیر اعظم" فرخ شاہ نے اُس کے تلخ لہجے کی پروا نہ کی "حکومت کا وہی وزیر سب سے زیادہ عقل مند ہوتا ہے جو جنگ سے گریز کرے اور شاہی خزانے کو رعایا کی فلاح و بہبود پر خرچ کرے۔ اس وقت جنگ کرنے یا نہ کرنے کا آپ کو اختیار ہے۔ جنگ نہ کرنے کی صورت میں سلطنت حلب کو دمشق کے

شمال میں تمام شامی قلعے اور شہر مفت مل جائیں گے۔ دوسری صورت جنگ کی ہے اور اُس کا انجام صرف اُوپر والا جانتا ہے۔ اُس کی پیشگوئی کوئی بھی نہیں کر سکتا۔"

"سفیر، زیادہ باتیں بنانے کی ضرورت نہیں۔" گمشتگین نے سفیر کو روک دیا۔ "ہمیں معلوم ہے کہ صلاح الدین ہمارے مشترکہ لشکر کے مقابلے پر نہیں ٹھہر سکتا۔ وہ اپنی عزت بچانا چاہتا ہے اس لیے وہ جنگ سے بھاگ رہا ہے لیکن ہم اسے ایسا نہیں کرنے دیں گے۔ ہم اسے جنگ میں گھسیٹیں گے اور یہ بتائیں گے کہ تاج دمشق سے غداری کی کیا سزا ہوتی ہے۔"

فرخ شاہ نے حیرت سے اُس کی طرف دیکھا۔ "میں سمجھ نہیں سکا کہ وزیر محترم کیا کہنا چاہتے ہیں؟"

"سنو اور غور سے سنو کہ ہم کیا کہنا چاہتے ہیں۔" گمشتگین غرایا۔ "صلاح الدین کی حکمتِ عملی یہ ہے کہ شمالی شام کے علاقے سلطنت حلب کو دے کر وہ جنگ کرنے کی بجائے چپ چاپ دمشق واپس چلا جائے اور ہم موصل اور حلب کے مشترکہ لشکر کو منتشر کر دیں پھر جب موصل کا لشکر واپس چلا جائے تو وہ حلب کو تنہا پا کر فوراً حملہ کر کے قبضہ کر لے لیکن ہم اس کی یہ تدبیر کامیاب نہیں ہونے دیں گے۔"

فرخ شاہ چڑ گیا۔ "وزیر محترم، میں جنگی حکمت عملی کا درس لینے نہیں آیا ہوں۔ میں نے صلح کی پیشکش کی اور اس کے صلے میں تین قلعے آپ کو دینے کا وعدہ کیا۔ اگر آپ کو یہ پیشکش منظور نہیں تو مجھے صاف الفاظ میں جواب دے دیجیے۔"

"صاف جواب یہ ہے۔" گمشتگین نے بڑے گھمنڈ سے کہا۔ "اگر صلاح الدین جنگ نہیں چاہتا تو وہ دمشق بھی ہمارے حوالے کر دے ورنہ ہم دمشق کا قبضہ بزورِ شمشیر حاصل کر لیں گے۔ اب بتاؤ تم کیا کہتے ہو۔ دمشق ہمارے حوالے کرتے ہو کہ نہیں؟"

"قابلِ احترام وزیر حلب۔" فرخ شاہ کے لہجے میں بھی تلخی آ گئی۔ "میں اس دربار میں ایک سفیر کی حیثیت سے پیش ہوا ہوں اس لیے آپ کو میرے سامنے میرے آقا امیر صلاح الدین کی توہین نہیں کرنی چاہیے۔ آپ کو یہ تسلیم کرنا ہوگا کہ میرے آقا صلاح الدین کا مرتبہ تمام اُمرائے نوریہ اور تمام سرداران شام سے بلند و بالا ہے۔ امیر صلاح الدین کو جہانگیری اور جہانداری کا جتنا عظیم تجربہ حاصل ہے اُس کی گرد تک بھی کوئی امیر نہیں پہنچ سکتا۔"

"رُک جاؤ سفیر۔" گمشتگین نے اُسے پھر روکا۔ "اگر تم صلاح الدین کی توہین نہیں برداشت کر سکتے تو ہم تمہارے منہ سے اپنی اور دوسرے اُمرا کی تذلیل بھی برداشت نہیں کر سکتے۔ فضول باتیں کرنے کی بجائے تم ہمارے سوال کا دو ٹوک جواب دو؟"

"کس سوال کا جواب وزیر محترم؟" فرخ شاہ چڑ گیا تھا۔

"یہی کہ حمص، حماۃ اور بعلبک کی طرح امیر صلاح الدین دمشق بھی ہمارے حوالے کر سکتے ہیں کہ نہیں؟" گمشتگین نے بالکل واضح سوال کیا۔

"وزیر محترم اگر میرے آقا دمشق بھی چھوڑ دیں تو پھر وہ کہاں رہیں گے اور کہاں جائیں گے؟" فرخ شاہ نے بھی اُس سے ایک سوال کیا۔

گمشتگین اس سوال کے لیے پہلے ہی تیار تھا۔ "صلاح الدین مصر سے آئے تھے اور انہیں مصر ہی واپس جانا چاہیے۔ ہم شام میں انہیں کہیں دیکھنا نہیں چاہتے۔ ہاں یہ ضرور وعدہ کرتے ہیں کہ اگر صلاح الدین مصر واپس جانا چاہیں تو انہیں راستے میں کوئی پریشان نہیں کرے گا۔ ہم انہیں بحفاظت مصر پہنچانے کا بھی انتظام کر سکتے ہیں۔"

"میں آپ کا مطلب پوری طرح سمجھ گیا ہوں وزیر محترم۔" فرخ شاہ نے کہا۔ "لیکن آپ کے مطالبے کو پورا کرنا میرے امکان میں نہیں۔ مجھے امیر نے جس قدر اختیارات دیے تھے میں انہیں استعمال کر چکا ہوں۔ رہا دمشق کا مطالبہ تو اس کا فیصلہ امیر صلاح الدین ہی کر سکتے ہیں۔ میں اس ناکام گفتگو کے بعد واپس جانے کی اجازت چاہتا ہوں۔"

"تم جا سکتے ہو سفیر۔ ہمارا پیغام صلاح الدین تک پہنچا دینا۔ جواب دینا نہ دینا اُن کا کام ہے۔" گمشتگین نے گفتگو کا خاتمہ کر دیا۔

فرخ شاہ نے شاہ ملک الصالح کو سلام کیا پھر پیٹھ موڑ کے چلا۔ ملک الصالح کا چہرہ دھواں دھواں ہو گیا تھا لیکن وہ گمشتگین کے سامنے بے بس تھا۔ درباریوں نے تمام گفتگو غور سے سنی تھی اور بیشتر کا یہ خیال تھا کہ گمشتگین کو صلاح الدین کی پیشکش قبول کر لینا چاہیے تھی۔

فرخ شاہ دربار کے قالین کے کونے پر پہنچ کے رُکا اور پلٹ کے بولا۔ "اے حلب کے بادشاہ اور درباریو، میں خدا کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ امیر صلاح الدین شاہ سے جنگ

نہیں چاہتے وہ اپنی پیشکش میں مخلص ہیں لیکن افسوس کہ ان کی پیش کش کو فوجی کمزوری سمجھا گیا۔ بہر حال آپ شاہد رہیے کہ امیر صلاح الدین کی طرف سے جنگ کو روکنے کی پوری کوشش کی گئی لیکن جنگ ناگزیر معلوم ہوتی ہے اور اس کا انجام صرف خلّاقِ عالم کے ہاتھ میں ہے۔"

جیسا کہ پہلے کہا گیا ہے کہ امیر صلاح ان دنوں حماۃ کے نواح میں تھا۔ فرخ شاہ نے اُدھر ہی کا رُخ کیا اور لشکر گاہ میں پہنچ کے امیر کو اپنے سفارت کی تمام گفتگو سے آگاہ کیا۔ فرخ شاہ نے آخر میں یہ بھی بتایا کہ ملک الصالح حمص اور حماۃ لینے پر آمادہ ہو گیا تھا لیکن گمشتگین نے اُسے سختی سے منع کیا اور خود دمشق کا مطالبہ پیش کر دیا۔ گمشتگین دراصل امیر صلاح الدین سے بے حد خائف تھا۔ اُسے اس بات کا خطرہ تھا کہ اگر ملک الصالح اور صلاح الدین میں میل ہو گیا تو ملک صالح جلد یا بدیر امیر صلاح الدین کو شام کا وزیر اعظم بنا دے گا اور اس صورت میں گمشتگین کے اقتدار کا خاتمہ ہو جانا ضروری تھا۔

بہر حال وزیر گمشتگین نے بظاہر اپنا اقتدار بچانے کی صورت پیدا کر لی تھی، اس لیے کہ صلاح الدین اور ملک الصالح کی صورت میں سب کچھ ہو سکتا تھا لیکن اُن دونوں میں پھر دوستی یا میل جول کا کوئی امکان باقی نہ رہ جاتا تھا۔ گمشتگین اس کوشش میں لگا تھا کہ صلاح الدین کو ہر قیمت پر ملک شام سے نکال دیا جائے تاکہ ہر وقت کا یہ دھڑکا ہمیشہ کے لیے ختم ہو جائے۔

صلاح الدین نے فرخ شاہ کی تمام باتیں بڑی توجہ سے سُنیں پھر اُس نے کہا "موت و زندگی اور فتح و شکست تو رب کعبہ کے ہاتھ میں ہیں لیکن گمشتگین جو چاہتا ہے اُسے میں نہ ہونے دوں گا۔ اگر میرا لشکر تباہ ہوا تو حلب و موصل کا مشترکہ لشکر اس قابل نہ رہ جائے گا کہ پھر کسی لڑائی میں حصّہ لے سکے۔ خدا کی قسم میرے فوجی دُشمن کے ہر لشکری کو ایسا زخم پہنچائیں گے وہ چلنے پھرنے کے بھی قابل نہ رہے گا۔"

"امیر معظم" فرخ شاہ نے کہا "موصل سے لشکر آ جانے کی وجہ سے گمشتگین اور ملک الصالح کا دماغ عرش پر پہنچ گیا ہے اور وہ سیدھے مُنہ بات بھی نہیں کرتے۔"

"ٹھیک ہے فرخ شاہ" صلاح الدین نے فیصلہ کن انداز میں کہا "اگر گمشتگین جنگ چاہتا ہے تو ہم پیچھے نہیں ہٹیں گے جاؤ اور لشکر کو تیاری کا حکم سناؤ۔"

فرخ شاہ اور اس کے دستے نے اعلانچی کا فرض ادا کیا اور چند ہی لمحے میں پورے لشکر کو معلوم ہو گیا کہ جنگ ہونے والی ہے۔ پس انہوں نے وہاں سے اپنے خیمے ڈیرے اکھاڑے اور امیر صلاح الدین کے ساتھ قرون حماۃ کی طرف چلے۔ صلاح الدین کو شاید علم ہو گیا تھا یا اُس نے اندازہ لگا لیا تھا کہ جنگ بہر صورت ہو گی اس لیے وہ چند دن پہلے دریائے ارنت کی ایک گھاٹی کو منتخب کر آیا تھا۔ اپنے تمام لشکر کے ساتھ جس میں دمشق کے صف شکن اور مصری فوج کے شمشیر زن موجود تھے۔ اُس گھاٹی میں پہنچ گئے۔ صلاح الدین نے وہیں خیمے لگوائے اور دُشمن کے آنے کا انتظار کرنے لگا۔

یہاں اِس بات کی وضاحت ضروری ہے کہ بعض مؤرخوں نے یہ لکھا ہے کہ صلاح الدین کا سفیر موصل کے والی سیف الدین غازی کے پاس صلح کا پیام لے کر پہنچا تھا اور سیف الدین غازی نے صلاح الدین کو حکم دیا تھا کہ وہ شام کے تمام علاقے چھوڑ کے مصر واپس چلا جائے لیکن زیادہ امکان یہ ہے کہ موصل کا لشکر حلب پہنچ چکا تھا اس لیے فرخ شاہ بجائے موصل کے حلب گیا تھا۔ ایک اور تاریخی غلطی کی دُرستی فرما لیجیے۔ کسی پچھلی قسط میں یہ لکھا گیا ہے کہ صلاح الدین پر حشیشین کے دو قاتلانہ حملے ہوئے لیکن دوسرے حملے کی کوئی سند نہیں ملتی۔ دوسرے حملے کی سند اور مفصل حالات بھی مل گئے ہیں جس کا تذکرہ آئندہ صفحات میں کیا جائے گا۔

حلب اور موصل کے لشکر کی مجموعی تعداد صلاح الدین کے لشکر سے اگر دُگنی نہیں تو ڈیڑھ گنی ضرور تھی۔ شاید اسی طاقت کے بل بوتے پر گمشتگین نے صلح کی بجائے جنگ کا راستہ اختیار کیا تھا۔ بس مشترکہ لشکر صلاح الدین کی خیمہ گاہ تک پہنچ گیا اور اس کے سامنے صفیں دُرست کرنا شروع کر دیں۔ صلاح الدین نے چونکہ اس پورے علاقے کا سروے پہلے ہی کر لیا تھا اس لیے اُس نے محل وقوع کے لحاظ سے اپنی فوجوں کی ترتیب بنائی تھی۔ پھر رجب ۲۳، اپریل ۱۱۷۵ء کو حلب اور موصل کے مشترکہ لشکر نے طاقت کے زعم میں امیر صلاح الدین کے خلاف جنگ شروع کی تو پہلے سے طے شدہ منصوبے کے تحت صلاح الدین کے لشکر کا ایک حصّہ بظاہر

پسپا ہو کر پیچھے کی طرف ہٹا۔ مشترکہ لشکر کے سپہ سالار زلفندار نے پسپا ہوتے ہوئے دشمن پر اور زیادہ دباؤ بڑھا دیا اور اُسے دُور تک دھکیلتے چلے گئے۔

صلاح الدین کا پسپا ہوتا ہوا لشکر بظاہر شکست کھا رہا تھا لیکن اصل میں وہ ایک تنگ نالے کے گرد اپنے نئے مورچے سنبھالنے کی کوشش میں تھا۔ چند گھنٹوں کی جنگ کے بعد حلب اور موصل کا لشکر گھاٹی کے ایک تنگ نالے میں اُتر گیا۔ ٹھیک اُسی وقت امیر صلاح الدین نے لشکر کو حکم دیا کہ وہ نالے میں اُترنے والے دشمن کے لشکر کو گھیر لے۔ اس طرح تنگ نالے میں گھرے ہوئے لشکر کو صلاح الدین کے فوجیوں نے ٹکڑے کر کے رکھ دیا۔ وہ بھاگنا چاہتے تھے لیکن انہیں بھاگنے کا راستہ نہ ملتا تھا۔ ایک تو امیر صلاح الدین کا آزمودہ کار لشکر دوسری اُس کی حکمت عملی کہ اُس نے دشمن کو ایک تنگ نالے میں گھیر لیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دشمن نے بڑی طرح شکست کھائی۔ صلاح الدین کے فوجیوں نے نہ صرف انہیں گھیر کے مارا بلکہ بھاگنے والوں کا حلب کے دروازے تک پیچھا کیا۔

اب گمشتگین کو اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ اُسے حمص، حماۃ اور بعلبک کے قلعے مفت میں مل رہے تھے لیکن اُس نے کفرانِ نعمت کیا اور اللہ کی اس کرم نوازی کو اپنے تکبر میں ٹھکرا دیا۔ حلب اور موصل کا لشکر منتشر ہو کر میدان سے بھاگا تھا۔ اس لیے وہ نصف کے قریب ہی حلب واپس آ سکا۔ باقی نصف لشکر یا تو میدانِ جنگ میں امیر صلاح الدین کے لشکر کے ہاتھوں مارا گیا یا پھر جس کا مُنہ جدھر اُٹھا اُدھر بھاگ نکلا۔ اس بھاگے ہوئے لشکر کا حلب آنا بھی مشکل تھا کیونکہ امیر صلاح الدین کا لشکر بھاگنے والوں کا پیچھا کرتا ہوا حلب پہنچ گیا تھا اور اس نے حلب کا سختی سے محاصرہ کر لیا تھا۔

حلب کے عوام نے ایک بار ملک الصالح کی مدد کر کے اُسے امیر صلاح الدین سے بچا لیا تھا لیکن اب وہ مدد کے لیے تیار نہ تھے۔ انہیں گمشتگین کے اقتدار سے بھی شکایت تھی کیونکہ وزیر موصوف ملک الصالح کے ساتھ تحقیر آمیز رویہ روا رکھتا تھا۔ بات بات پر اُسے ڈانٹتا اور قتل کرنے کی دھمکی دیتا تھا۔ یہ گمشتگین ہی تھا جس نے صلاح الدین سے جنگ کا مشورہ دیا تھا۔ ملک الصالح اور موصل کا سپہ سالار زلفندار دونوں ہی گمشتگین کے خلاف ہو گئے تھے لیکن اب وہ خود مجبور تھے۔ کچھ کر بھی نہ سکتے تھے۔ اس شکست کا یہ اثر ضرور ہوا کہ گمشتگین کا غرور خاک میں مل گیا اور اُس نے ملک الصالح کی باتوں میں دلچسپی لینا چھوڑ دی۔

حلب کے محاصرے کے تیسرے دن زلفندار نے ملک الصالح کے سامنے ایک جائزہ پیش کیا۔ "شاہ معظم۔ آپ کے وزیر گمشتگین کی ضد اور غرور نے ہمیں یہ دن دکھایا کہ ہم شکست کھا کر قلعے میں قید ہو گئے ہیں۔ حلب اور موصل کا لشکر نصف سے زیادہ تباہ ہو گیا۔ جو بچ بچا کر حلب پہنچا ہے اُس کے حوصلے بھی پست ہو گئے ہیں۔ حلب کے عوام آپ کا ساتھ دینے پر تیار نہیں۔ غنیمت ہے کہ امیر صلاح الدین نے ابھی صرف محاصرہ کیا ہے اگر اُس نے حملے شروع کر دیے تو عوام اور فوج دونوں میں بغاوت پیدا ہو سکتی ہے۔ کیا آپ کی نظر ان حالات پر نہیں ہے؟"

ملک الصالح نے افسردگی سے ایک ٹھنڈی سانس بھری "میں سب دیکھ رہا ہوں اور کچھ کرنا بھی چاہتا ہوں لیکن بے بس اور مجبور ہوں۔"

"شاہ۔ آپ نہ بے بس ہیں اور نہ مجبور۔" زلفندار نے شاہ حلب کو حوصلہ دیا۔ "آپ حلب کے سربراہ ہیں۔ گمشتگین اگرچہ گورنر اور وزیر ہے لیکن ہے تو آپ کا خادم اور غلام۔ آپ خود میں حوصلہ تو پیدا کیجیے۔ گمشتگین نے صلاح الدین کی پیشکش کو رَد کر کے جو سنگین غلطی کی ہے وہ اس پر یقیناً شرمندہ ہو گا۔ ہو سکتا ہے کہ اُسے اپنی غلطی کا احساس ہو گیا ہو۔"

"تم ہی بتاؤ سپہ سالار۔ میں کیا کروں؟" غم و ملال کی وجہ سے ملک الصالح کے مُنہ سے الفاظ بھی نہ نکلتے تھے۔ وہ بار بار ٹھنڈی سانسیں لیتا تھا۔

"آپ صرف اپنی مرضی کیجیے۔ حلب کا قلعہ کسی وقت بھی ہاتھ سے نکل سکتا ہے۔" زلفندار نے تو اُسے گمشتگین کے خلاف کھڑے ہونے کی طرف اشارہ کیا۔ "میں آپ کے ساتھ ہوں۔ اگر وہ سیدھی طرح نہ مانے گا تو میں اُسے گرفتار کر لوں گا۔"

"تم یہ کر سکتے ہو سپہ سالار۔" ملک الصالح بڑے دُکھ سے بولا۔ "لیکن گمشتگین کو گرفتار کرنے سے حلب بچ تو نہ جائے گا۔ صلاح الدین آج کل میں قلعے پر حملہ شروع کر دے گا پھر ہم کیا کریں گے۔"

"یہی تو میں بھی کہہ رہا ہوں شاہ معظم۔" زلفندار بولا۔

"قبل اس کے کہ قلعے پر حملے شروع ہوں۔ ہمیں حلب بچانے کی کوشش کرنا چاہیئے۔"

"مگر کس طرح؟" شاہ کی آواز لرز رہی تھی "میں تو اُس وقت سے ڈر رہا ہوں جب مجھے گرفتار کر کے صلاح الدین کے سامنے پیش کیا جائے گا۔ اُس سے پہلے میں خودکشی کر لوں گا۔"

"نہیں شاہ آپ ایسا نہیں کریں گے۔" زلقندار نے بڑے عزم سے کہا "میں آپ کو مشورہ دیتا ہوں کہ آپ صلاح الدین سے فوراً صلح کی گفتگو شروع کر دیجیے۔"

"لیکن۔ لیکن۔" شاہ اور کچھ نہ کہہ سکا۔ اُس کی آواز بھرا گئی اور گلا رندھ گیا۔

"آپ کے خیال میں صلح کی بات چیت کرنا کمزوری کی علامت اور شاہانہ وقار کی توہین ہے۔" زلقندار نے شاہ کی دُکھتی رگ پر ہاتھ رکھا۔ "یہ آپ کا وہم ہے شاہ معظم۔ جب صلاح الدین جیسا طاقتور امیر ہمارے پاس صلح کی سفارت بھیج سکتا ہے تو حلب کی طرف سے صلح کی سفارت کیوں نہیں جا سکتی۔ میرا خیال ہے کہ صلاح الدین آپ سے براہِ راست ٹکرانا نہیں چاہتا۔ وہ ضرور صلح پر آمادہ ہو جائے گا۔ آپ کوشش کر کے تو دیکھیے۔"

"مگر گمشتگین شاید اسے پسند نہ کرے۔" شاہ نے خیال ظاہر کیا۔

"جہنم میں جھونکیے گمشتگین کو۔ وہ گڑبڑ کرے گا تو میں اُسے گرفتار کر کے قید کر دوں گا۔" زلقندار کھل کے میدان میں آ گیا۔ "مجھے اطلاع ملی ہے کہ صلاح الدین نے اپنے مفتوحہ علاقوں میں اعلان کرا دیا ہے کہ جمعہ کے خطبے سے آپ کا نام خارج کر دیا جائے۔ اگر آپ نے جلد صلح نہ کی تو آپ کو اور زیادہ نقصان پہنچ سکتا ہے۔"

عزالدین زلقندار نے آخر شاہ ملک الصالح کو امیر صلاح الدین کے پاس سفارت بھیجنے پر آمادہ کر لیا۔ پھر وہ دونوں گمشتگین کے پاس پہنچے۔ اُن کے جانے سے پہلے زلقندار کے حکم سے اُس کے فوجی دستوں نے اُس علاقے کو گھیرے میں لے لیا تھا جہاں گمشتگین مقیم تھا۔ گمشتگین اس قدر خودسر اور مغرور تھا کہ وہ شاہ کو کبھی تعظیم نہیں پیش کرتا تھا لیکن اُس دن جب ملک الصالح زلقندار کے ساتھ اُس کے پاس پہنچا تو گمشتگین نے کھڑے ہو کے باقاعدہ شاہ کو سلام پیش کیا۔

"ہم صلاح الدین سے صلح کرنا چاہتے ہیں گمشتگین۔" شاہ نے بڑے وقار سے کہا۔

"شاہ معظم۔ مختار کل ہیں۔ جو چاہیں کر سکتے ہیں۔" گمشتگین پہلے ہی حواس باختہ ہو رہا تھا۔ اُس نے چپ چاپ اپنی شکست تسلیم کر لی اور شاہ کے راستے سے ہٹ گیا۔

"ہم امیر صلاح الدین کے پاس صلح کی بات چیت کے لیے ایک سفارت بھیجنا چاہتے ہیں۔" شاہ نے بغیر اُسے مخاطب کیے جیسے خود سے کلام کیا۔

"بہت مناسب خیال ہے شاہ معظم کا۔" گمشتگین نے اسی میں اپنی سلامتی دیکھی کہ وہ شاہ کی ہر بات پر 'ہاں' کرتا رہے۔

"اس سفارت پر ہم تمہیں مامور کرنا چاہتے ہیں؟" شاہ نے یہ اعلان کر کے گمشتگین کو لرزا دیا۔

"میں... میں..." گمشتگین نے بڑی مشکل سے تھوک نگلا "شاہ کے حکم پر جان حاضر ہے لیکن امیر صلاح الدین میرے بہت خلاف ہیں کہیں ایسا نہ ہو کہ مجھے دیکھ کر انہیں غصہ آ جائے اور صلح کی بات چیت میں کوئی رخنہ پڑ جائے۔"

"گھبراؤ نہیں گمشتگین۔" زلقندار کا انداز طنزیہ تھا "صلاح الدین تمہیں قتل نہیں کرائے گا۔ وہ ایک بہادر سردار اور حاکم ہے۔ ایک سفیر کو قتل کرا کے وہ اپنی شہرت کو داغدار نہیں کرے گا۔ اس کے باوجود میں تمہاری بات سے اتفاق کرتا ہوں۔ [illegible] بشر ہے۔ اُسے کسی وقت غصہ بھی آ سکتا ہے اس لیے میں [illegible] سے درخواست کروں گا کہ تمہارے بجائے وہ اس کام کے لیے کسی اور ذہین شخص کو نامزد فرمائیں۔"

"ٹھیک ہے ہم کسی اور کو بھیج دیں گے۔" شاہ ملک الصالح کو جیسے اپنی آزادی کا احساس ہو گیا تھا اس لیے وہ بڑی شان اور بڑے اطمینان سے گفتگو کر رہا تھا "مگر سفارت بہت جلد جانا چاہیے۔ ہمارا خیال ہے کہ کل کسی کو بھیج کر گفتگو کا آغاز کیا جائے۔"

موصل اور حلب کی متحدہ فوجوں نے اگرچہ میدانِ جنگ میں شکست کھائی لیکن یہ شکست شاہ ملک الصالح کے لیے فتح کا شاخسانہ بن گئی۔ وزیر گمشتگین کا منحوس سایہ ملک الصالح کے سر سے ہمیشہ کے لیے اُٹھ گیا اور شاہ نے سُکھ اور اطمینان کا سانس لیا۔ طے شدہ پروگرام کے مطابق دوسرے دن ایک رُکنی سفارت صلاح الدین کے پاس بھیجی گئی۔ صبح

ہوتے ہی قلعے پر سفید پھریرا لہرا دیا گیا۔ جس کا مطلب تھا کہ قلعے والے جنگ کی بجائے امن کے خواہش مند ہیں۔ امیر صلاح الدین کو اطلاع دی گئی کہ قلعے کے برج پر سفید پرچم اُڑ رہا ہے۔ امیر صلاح الدین نے اپنے خیمے سے نکل کے سفید جھنڈے کو دلچسپی سے دیکھا۔

اُسی وقت قلعے کا چھوٹا دروازہ کھلا۔ دروازے سے پہلے ایک شخص پھر اُس کا گھوڑا نکلا۔ وہ شخص گھوڑے پر سوار ہوا اور اُس نے اپنے نیزے پر سفید کپڑا باندھ لیا جو اس بات کی علامت تھی کہ امن کا سفیر گفتگو کے لیے آ رہا ہے۔ امیر صلاح الدین اپنے سرداروں کے ساتھ خیمے کی قطاروں سے آگے بڑھا اور اُس نے خود آنے والے کا استقبال کیا۔

"اے امن کے پیامبر تمہارا آنا مبارک ہو۔" امیر صلاح الدین نے اُسے خوش آمدید کہا۔

"امیر صلاح الدین کو دمشق مبارک ہو۔" سفیر نے پہلے ہی جملے میں صلاح الدین کو دمشق کا حاکم اور والی تسلیم کرنے کا اعلان کر دیا۔

امیر صلاح الدین کا چہرہ سپاٹ تھا لیکن اُس کے سردار ایک دوسرے کو آنکھوں ہی آنکھوں میں مبارک باد دے رہے تھے۔ امیر صلاح الدین نے پہلے سفیر سے ہاتھ ملایا پھر بغلگیر ہوا۔ سفیر امیر صلاح الدین کے اس مشفقانہ رویے سے بہت خوش ہوا۔ اُسے امید بندھ گئی کہ صلح کی بات چیت ضرور کامیاب ہو گی۔

صلح کی بات چیت امیر صلاح الدین کے خیمے میں شروع ہوئی۔ صلاح الدین کے علاوہ دو سردار اور بھی اس گفتگو میں شریک ہوئے۔ آغاز امیر صلاح الدین نے کیا۔ "ہمارے آقازادے ملک الصالح کے مزاج کیسے ہیں؟"

"الحمد للہ۔ شاہ بخیریت ہیں اور آپ کو سلام بھیجا ہے۔" سفیر نے خوش دلی سے کہا۔

"اللہ انہیں سلامت رکھے۔ میں اُن کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟" امیر صلاح الدین نے بڑے خلوص سے کہا۔

"شاہ معظم کی خواہش ہے کہ آپ حلب کا محاصرہ ختم کر کے دمشق واپس تشریف لے جائیں۔" سفیر نے وہ فرض ادا کیا جو اس کے سپرد کیا گیا تھا۔

امیر صلاح الدین نے چند لمحے توقف کیا پھر کہا۔ "شاہ ملک الصالح نے کوئی شرط تو نہیں رکھی ہے؟"

"بالکل نہیں۔" سفیر نے جواب دیا۔

"اُن کی کوئی خواہش تو نہیں؟" امیر صلاح الدین نے مزید دریافت کیا۔

"کوئی اور خواہش نہیں سوائے اس کے کہ آپ انہیں حلب کا حاکم اور بادشاہ تسلیم کیجیے۔" سفیر نے یہ کہہ کر امیر کی طرف غور سے دیکھا۔

"میرے آقازادے اس کے صلے میں مجھے کیا عنایت فرمائیں گے؟" امیر صلاح الدین نے سنجیدگی سے کہا۔ دراصل وہ چاہتا تھا جو بات طے ہونا ہے وہ اسی وقت اور اسی سفارت میں طے پا جائے۔

"شاہ معظم آپ کو دمشق کا والی تسلیم کرنے پر تیار ہیں۔" سفیر نے صاف لفظوں میں امیر صلاح الدین کی دمشق کی بادشاہت کرنے کا اعلان کیا۔

"ایک بات کی اور وضاحت چاہیے سفیر۔" امیر صلاح الدین نے سنبھل کے کہا۔ "میں نے حمص، حماۃ وغیرہ کے علاقے بزورِ شمشیر فتح کیے ہیں۔ اُن کا قبضہ کسی دوسرے کو نہیں دیا جا سکتا۔ شاہ کا اس بارے میں کیا خیال ہے؟"

"شاہ حلب آپ کو دمشق کے علاوہ شام کے تمام مفتوحہ علاقوں کا حاکم تسلیم کرتے ہیں۔" سفیر نے بے دھڑک کہہ دیا۔

امیر صلاح الدین کا چہرہ کھل اٹھا۔ اُس کی زبان سے بے ساختہ نکلا۔ "تمہاری زبان مبارک ہو سفیر۔ میں الملک الصالح اسمٰعیل کو حلب کا بادشاہ تسلیم کرنے کا اعلان کرتا ہوں۔"

سفیر نے بھی اعلان کیا۔ "میں شاہ حلب کی طرف سے امیر صلاح الدین ایوبی کو دمشق اور دمشق کے تمام شمالی شامی علاقوں کا حاکم تسلیم کرتا ہوں۔"

"مبارک، مبارک!" یہ دو آوازیں اُن سرداروں کی تھیں جو امیر صلاح الدین کے خیمے میں موجود تھے۔

امیر صلاح الدین نے اُسی وقت محاصرہ اُٹھانے کا اعلان کر دیا اور سفیر کو بڑی عزت و احترام سے رخصت کیا۔ صلاح الدین کی طرف سے شاہ ملک الصالح کی نذر کے لیے کچھ تحائف بھی بھیجے گئے۔ تحائف کے تھال کئی غلاموں کے سر پہ رکھ کر انہیں سفیر کے ساتھ کر دیا گیا۔ سفیر غلاموں کے ساتھ قلعے میں داخل ہوا تو وہاں خوشی کے شادیانے بجنے لگے۔ لوگ گلیوں اور بازاروں میں نکل آئے۔ ناچ گانے کی محفلیں جم گئیں۔ جنگ کے چھائے ہوئے بادل ہٹ گئے تھے۔ پھیکے اور افسردہ

چہروں پر رونق آگئی تھی۔ قلعے والے خوشی سے دیوانے ہوئے جا رہے تھے۔

قلعے کے باہر امیر صلاح الدین کا لشکر خیمے ڈیرے اکھاڑ رہا تھا۔ سامان باربرداری کے جانوروں پر بار کیا جا رہا تھا۔ لشکری بہت خوش تھے اس لیے نہیں کہ جنگ ختم ہوگئی تھی بلکہ اس لیے کہ امیر صلاح الدین دمشق کا حاکم یعنی بادشاہ بن گیا تھا۔ اُس کے تحت حمص، حماۃ، بعلبک، کفرتاب، بارین اور معرہ تک کا علاقہ آگیا تھا۔ صلاح الدین کے لشکر کی روانگی کے وقت شاہ حلب ملک الصالح نے بھی رواداری کا مظاہرہ کیا۔ وہ اپنے تمام اُمرا، وزرا اور عزالدین زلقندار کے ساتھ قلعے سے نکل کے امیر صلاح الدین کے پاس آیا۔ امیر صلاح الدین نے اُس کی پوری تعظیم کی۔ اس طرح دو دشمن دوست بن گئے اور صلاح الدین کا لشکر حلب سے واپس ہوگیا۔

شام کی خانہ جنگی بظاہر ختم ہوگئی تھی۔ چنانچہ فرخ شاہ نے دمشق جانے کی اجازت مانگی۔ اُسے معلوم ہوگیا تھا کہ امیر صلاح الدین اب حماۃ جائے گا اور حماۃ کے بعد کدھر کا رُخ ہو اس کا اسے کوئی علم نہ تھا۔ فرخ شاہ کو دراصل ارمغانہ کی یاد ستا رہی تھی۔ فرخ شاہ کی حد تک تو کہا جاسکتا تھا کہ اُسے ارمغانہ سے انسیت تھی جو اب محبت میں تبدیل ہوگئی تھی لیکن ارمغانہ کے بارے میں کچھ کہنا مشکل تھا۔ اُس کی آنکھوں میں محبت کی چمک تو دکھائی دیتی تھی لیکن حالات نے اُسے بے بس کے رکھ دیا تھا۔ اُس کے شگفتہ اور شاداب چہرے پر اُداسی چھائی رہتی تھی پھر جب فرخ شاہ نے اُس سے مل کے بتایا کہ امیر صلاح الدین نے اُس کے باپ شمس الدین ابن مقدم کو معاف کر دیا ہے اور اسے انعام و اکرام کے لیے طلب کیا ہے تو اُس کے چہرے کی رونق ایک بار پھر لوٹ آئی تھی۔ فرخ شاہ نے اُسے تاکید کر دی تھی کہ جب تک اُس کا باپ آ سے نہ ملے اُس وقت تک وہ اپنی سہیلی حارثہ کے گھر سے کہیں اور نہ جائے۔

امیر سے اجازت لے کر فرخ شاہ سیدھا دمشق پہنچا۔ وہ رات کے وقت دمشق پہنچا تھا ورنہ شاید وہ پہلے ارمغانہ کے پاس جاتا پھر کسی اور سے ملتا۔ رات اُسے قلعے میں گورنر طغرگین کے پاس گزارنی پڑی۔ طغرگین نے اُسے رات بھر سونے نہ دیا اور کرید کرید کے حمص، حماۃ، بعلبک اور حلب کے حالات دریافت کرتا رہا۔ فرخ شاہ لحاظ کے مارے کچھ نہ کہہ سکا اور اُس کے سوالات کے خندہ پیشانی سے جواب دیتا رہا۔ اس طرح تین چوتھائی سے زیادہ رات گزر گئی جب کہیں طغرگین نے اُس کی جان چھوڑی۔ فرخ شاہ کا تھکن سے جوڑ جوڑ دکھ رہا تھا۔ وہ ایسا گھوڑے بیچ کے سویا کہ اُس وقت تک اس کی آنکھ نہ کھلی جب تک سورج کی کرنوں نے اُسے پسینے میں شرابور نہ کر دیا۔

وہ جلدی جلدی نہایا دھویا پھر فوجی بیرک میں گیا۔ فرخ شاہ جب دمشق میں مقیم تھا تو اس کی اسی بیرک میں رہائش تھی اور اُس کا مختصر سامان اب بھی وہیں رکھا تھا۔ اُس نے لباس تبدیل کیا پھر ارمغانہ کی طرف جانے کے لیے تیار ہوا۔ وہ بیرک سے نکلا تھا کہ گورنر طغرگین کا خاص غلام اُس کے پاس بھاگتا ہوا آیا۔

"امیر زادے آپ کہاں چلے گئے تھے۔ میں نے پورا محل چھان مارا؟" غلام مسلسل ہانپے جا رہا تھا۔

فرخ شاہ اُس کی حالت دیکھ کر مسکرا دیا "اب تو معلوم ہوگیا کہ میں کہاں تھا۔"

"جی۔ وہ تو معلوم ہوگیا لیکن مجھے کیا پتا تھا۔ جلدی تشریف لے چلیے۔ گورنر بہادر آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔" اور غلام گھوم کر چلنے لگا۔

"ذرا ٹھہرو۔" فرخ شاہ نے اُسے روکا۔

غلام رُک کر اُس کے پاس واپس آگیا۔ فرخ شاہ بڑی اُلجھن میں تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اگر وہ گورنر کے پاس گیا تو وہ تین گھنٹوں سے پہلے اُس کا پیچھا نہ چھوڑے گا۔ ابھی وہ کوئی بہانہ سوچ بھی نہ پایا تھا کہ غلام گھبرائے لہجے میں بولا "امیر زادے۔ خدا کے لیے مجھ پر رحم کیجیے۔ جلدی چلیے ورنہ گورنر میری ملازمت ختم کر دیں گے۔"

"میں نہیں جاؤں گا اُن کے پاس۔" فرخ شاہ نے جی کڑا کر کے صاف انکار کر دیا۔

غلام کا حیرت سے مُنہ کھل گیا "جی آپ نہیں جائیں گے۔ مگر کیوں؟"

"تم پوچھنے والے کون ہوتے ہو۔ میں تمہارا یا گورنر کا نوکر نہیں ہوں۔" فرخ شاہ چڑچڑا ہوگیا تھا۔

"آپ غضب کرتے ہیں امیر زادے۔" غلام نے گھبرائے لہجے میں کہا "آپ کو مجھ پر اور میرے بچوں پر ذرا بھی ترس نہیں آتا۔ آپ ایسے تو نہیں تھے۔ میں نے سنا ہے کہ آپ بہت رحمدل ہیں۔"

"جاؤ۔ گورنر سے کہہ دو کہ فرخ شاہ چلا گیا۔" فرخ شاہ کو غصہ آ گیا۔ "وہ تمہارے بچوں کو سُولی پر تو نہیں چڑھوا دے گا۔"

"مگر امیر زادے، آپ یہاں موجود ہیں۔ پھر میں کیسے کہہ سکتا ہوں کہ آپ چلے گئے۔ یہ ٹھیک ہے گورنر مجھے سولی پر نہیں چڑھائیں گے مگر ملازمت سے تو جواب دے دیں گے۔ اس سے اچھا ہوتا کہ وہ سولی پر چڑھا دیتے۔" غلام نے رُک رُک کے افسردگی سے کہا۔ "پھر جھوٹ بولنے کی میری عادت بھی نہیں ہے۔ آپ اگر مجھ پر ترس کھا کر چند لمحوں کے لیے چلے چلیں تو میرے بچے آپ کو دعائیں دیں گے۔"

اب فرخ شاہ سے انکار نہ ہو سکا۔ وہ چپ چاپ اُس کے ساتھ چلتا ہوا گورنر کے کمرے میں پہنچ گیا۔ گورنر ظفر گین کھانے کے کمرے میں تھا۔ وہ غلام کے ساتھ وہاں پہنچ گیا۔ گورنر کھانے کے کمرے میں ٹہل رہا تھا۔ فرخ شاہ کو دیکھ کے تیزی سے اُس کی طرف بڑھا اور اُس کا ایک ہاتھ مضبوطی سے پکڑ لیا۔

"کمال کر دیا صاحبزادے۔ یہ بھی کوئی بات ہے۔" گورنر نے اُس کے ہاتھ پر اپنی گرفت اور مضبوط کرتے ہوئے کہا۔ "صبح سے ایک دانہ نہیں گیا منہ میں اور تم ہو کہ پتا نہیں کہاں گھومتے پھر رہے ہو؟"

"میں نے آپ کا دانہ پانی بند تو نہیں کیا محترم گورنر۔" فرخ شاہ چڑ گیا تھا۔ "چند لمحے پہلے کپڑے تبدیل کرنے گیا تھا کہ آپ اور آپ کے غلام نے پورا محل سر پر اُٹھا لیا۔"

"دیکھو فرخ۔" ظفر گین پیار سے بولا۔ "تم امیر صلاح الدین کے بھتیجے ہو۔ میرے بھی کچھ لگتے ہو پھر تمہارے بغیر میں دانہ منہ میں کیسے ڈال سکتا تھا۔ سمجھ گئے نا؟"

"جی بالکل سمجھ گیا۔" فرخ شاہ کو دیر ہو جانے کا خیال بار بار ستا رہا تھا۔ "مجھے ایک دوست سے ملاقات کرنا ہے۔ آپ مجھے جلدی چھوڑ دیں گے نا؟"

"لو جی۔ میں تمہیں چھوڑ کیسے دوں گا۔" گورنر نے اُس کا ہاتھ چھوڑ دیا۔ "آخر میری بھی کوئی ذمے داری ہے۔ خدانخواستہ تمہیں کچھ ہو گیا تو میں امیر کو کیا جواب دوں گا؟"

گورنر ظفر گین ناشتے کے دوران فضول سی باتیں کرتا رہا۔ فرخ شاہ کو جانے کی جلدی تھی اس لیے وہ بھی ہاں ہاں کرتا رہا۔ پھر درمیان ہی میں کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔ "گورنر بہادر۔ مجھے بھی امیر کو جواب دینا ہے اس لیے آپ مجھے جانے دیجیے۔"

فرخ شاہ نے یونہی کہہ دیا۔

امیر کا نام سُن کر ظفر گین نے بھی ناشتے سے ہاتھ کھینچ لیا۔ "یہ بات تم نے مجھے پہلے کیوں نہیں بتائی۔ جاؤ۔ جاؤ۔ جلدی جاؤ۔ امیر تم سے منٹ منٹ کا حساب لیں گے۔"

فرخ شاہ نے اُسے کوئی جواب نہ دیا اور محل سے نکل کے دم کے دم میں دمشق کے بازار میں پہنچ گیا۔ بازار ابھی پوری طرح نہ کھلا تھا مگر بھیڑ بھاڑ ابھی سے شروع ہو گئی تھی۔ اس بازار کے درمیان سے گلی حارثہ کے گھر کی طرف گھومتی تھی۔ وہ گلی میں داخل ہوا تو اُس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ پتا نہیں ارمغانہ ملے گی کہ نہیں۔ کہیں حارثہ نے گھر نہ بدل لیا ہو۔ فرخ شاہ کو طرح طرح کے وسوسے ستا رہے تھے۔

وہ خیالات میں اس قدر اُلجھا ہوا تھا کہ حارثہ کے گھر سے چار گھر آگے نکل گیا۔ پھر اُسے خود ہی خیال آیا کہ شاید وہ راستہ بھول گیا ہے۔ اُس نے کوئے یار کے ہر ہر گھر کو ذہن میں بٹھا لیا تھا مگر جس جگہ وہ پہنچا تھا وہاں کے گھر اور در و دیوار اُسے اجنبی لگ رہے تھے۔ اچانک اُسے دُور سے ایک دو منزلہ مکان دکھائی پڑا۔ وہ مکان حارثہ کے مکان کی خاص نشانی تھی۔ اُس سے تیسرا مکان حارثہ کا تھا جہاں ارمغانہ ٹھہری ہوئی تھی۔ فرخ شاہ واپس ہوا اور چند لمحوں میں حارثہ کے مکان پر پہنچ گیا۔

فرخ شاہ دروازے پر کھڑا تھا مگر اُس کا دل تھا کہ جیسے سینے سے نکلا جا رہا تھا۔ کہیں ایسا نہ ہو جائے کہیں ویسا نہ ہو جائے۔ اُس کا ہاتھ کسی صورت دروازے کی زنجیر تک نہیں پہنچ رہا تھا۔ پھر قدرت نے اُس کی خود مدد کی اور دروازہ خود بخود کھل گیا۔ فرخ شاہ نے چونک کے دیکھا۔ دروازے کے اندر حارثہ کھڑی تھی۔ وہ بھی حیرانی نظروں سے فرخ شاہ کو دیکھ رہی تھی۔

"کیا آپ۔ آپ امیر زادے فرخ شاہ ہیں نا؟" حارثہ نے بے یقینی کے انداز میں کہا۔

"ہاں حارثہ۔ میں فرخ شاہ ہی ہوں۔ وہ۔"

فرخ شاہ کچھ اور کہنا چاہتا تھا کہ حارثہ اُلٹے پیروں لوٹی اور "پھر ارمغانہ" کہتی اندر کی طرف بھاگی۔

فرخ شاہ کا دل ٹھہر گیا۔ ارمغانہ گھر میں موجود تھی۔

چند لمحوں بعد حارثہ ہنستی ہوئی واپس آئی۔

"تشریف لائیے امیر زادے۔" حارثہ نے اُسے بے تکلفی سے

اندر آنے کی دعوت دی۔
فرخ شاہ اس وقت تک پوری طرح حواسوں پر قابو پا چکا تھا۔ اُس نے قدم بڑھایا۔ مکان کتنا بڑا تھا صرف دو کمرے یا کوٹھریاں، حارثہ کے والدین صحن میں بیٹھے تھے۔
"خالہ جان، خالو جان السلام علیکم۔" امیرزادے فرخ نے انہیں جھٹ سے خالہ، خالو بنا لیا حالانکہ پہلی ملاقات میں انہیں "بزرگ محترم" تک محدود رکھا تھا۔
"جیتے رہو بیٹے!" بڑی بی نے دعا دی۔
"خدا عمر دراز کرے اور مرتبے بڑھائے"۔ خالو جان نے بھی دعا دی۔ "ادھر آؤ میرے پاس بیٹھو۔"
خالہ اٹھ کر کمرے میں چلی گئیں اور فرخ شاہ خالو کے سامنے چارپائی کے پائنتی بیٹھ گیا۔ حارثہ بھاگ کے دوسرے کمرے میں گھس گئی۔ فرخ شاہ نے اندازہ لگایا کہ ارمغانہ بھی اسی کمر[illegible]ں ہے۔
خالو نے رسمی گفتگو شروع کر دی۔ "بہت دنوں ب[illegible]ے امیرزادے۔ خیریت تو تھی۔ اس وقت کہاں سے آ رہے ہو۔ شاید کسی دوسرے شہر گئے تھے۔ دمشق میں ہوتے تو ضرور آتے۔"
بزرگ خالو نے ایک ساتھ بے شمار سوالات پوچھ ڈالے۔
فرخ شاہ گھبرایا ہوا اُن کا منہ دیکھ رہا تھا۔ اُسے خالو کا صرف آخری سوال یاد رہ گیا۔ اسی کا جواب فرخ شاہ نے دیا۔ "جی ہاں، میں دمشق میں نہیں تھا ورنہ ضرور آتا۔" فرخ شاہ جواب دے کر خاموش ہو گیا۔
"یہی تو میں بھی کہہ رہا ہوں۔ اچھا اتنے دن رہے کہاں؟" خالو پھر شروع ہوئے۔
فرخ شاہ کو یاد آیا کہ خالو نے ایک سوال یہ بھی کیا تھا۔ اُس نے بتایا "اتنے دنوں، میں حمص، حماۃ، بعلبک پھر حلب کے محاصرے میں مصروف رہا۔ پھر ایک بہت بڑی جنگ ہوئی۔ اس جنگ میں زنگی خاندان کی پوری فوج ایک طرف تھی اور میرے امیر صلاح الدین دوسری طرف تھے۔ یہ بڑی زبردست جنگ تھی لیکن ہمارے لشکر نے موصل اور حلب کے لشکروں کو کاٹ کے رکھ دیا۔"
"اچھا!" خالو نے حیرانی کا اظہار کیا۔ "پھر تو امیر صلاح الدین کا پوری سلطنت پر قبضہ ہو گیا ہوگا؟"
"بس یہی سمجھیے آپ" فرخ شاہ بات کو مختصر کرنا چاہتا تھا۔ "اب ہمارے امیر دمشق اور تمام شمالی شامی علاقوں کے بادشاہ ہیں۔ وہ کسی کے ماتحت نہیں۔ ان کا کوئی آقا نہیں۔"
فرخ شاہ باتیں کر رہا تھا مگر اُس کی نظریں بار بار اُس کمرے کی طرف اُٹھ رہی تھیں جہاں حارثہ گئی تھی۔ اُس وقت حارثہ اور ارمغانہ کمرے سے نکلیں۔
"بابا، آپ اندر چلے جائیے۔ یہاں دُھوپ آ رہی ہے۔" حارثہ نے باپ کے قریب پہنچ کے کہا۔
بزرگ خالو گفتگو ادھوری چھوڑ کے کمرے میں چلے گئے۔
حارثہ اور ارمغانہ، فرخ شاہ کے قریب کھڑی تھیں اور اُس کا دل دھک دھک کر رہا تھا۔ دل تو ارمغانہ کا بھی قابو میں نہ تھا مگر وہ حیا کی پتلی سر جھکائے خاموش، نیچی نظریں کیے ہوئے تھی۔
"امیرزادے کیا ارمغانہ کو بیٹھنے کے لیے بھی نہیں کہیے گا؟" حارثہ نے چمک کے کہا۔
"ہاں۔ ہاں۔ کیوں نہیں۔ مگر حارثہ یہ گھر تو تمہارا ہے۔" فرخ شاہ بوکھلا گیا تھا۔
"میں کب کہہ رہی ہوں کہ یہ آپ کا دولت کدہ ہے۔" حارثہ نے اُسے اور بوکھلا دیا۔

"بیٹھ جاؤ ارمغانہ" اور فرخ شاہ چارپائی سے اُٹھ کے کھڑا ہو گیا۔

ارمغانہ چارپائی پر ایک طرف بیٹھ گئی۔

"آپ بھی تشریف رکھیے امیر زادے" حارثہ نے شوخی سے کہا اور ایک طرف چلی۔

"تم کہاں جا رہی ہو حارثہ؟" ارمغانہ گھبرا گئی۔

"گھبراؤ نہیں۔ امیر زادے کھا نہیں جائیں گے" حارثہ ہنستی ہوئی چلی گئی۔

فرخ شاہ نے اِدھر اُدھر دیکھ کے کہا "تم گھبرا رہی ہو تو میں چلا جاؤں؟"

"نہیں نہیں۔ میں بالکل نہیں گھبراتی" ارمغانہ نے بڑے حوصلے سے کہا۔

"کچھ امیر المقدم کا پتا چلا؟" فرخ شاہ نے بات شروع کی۔

"جی وہ آئے تھے میرے پاس" ارمغانہ نے بتایا۔

"اچھا کب آئے تھے۔ کیا کہہ رہے تھے؟" فرخ شاہ نے دلچسپی سے پوچھا۔

"کئی بار آ چکے ہیں" ارمغانہ نے جواب دیا "انہیں اپنی معافی کا علم ہو گیا ہے لیکن وہ امیر کے سامنے جاتے ڈرتے ہیں"

"ڈرتے کیوں ہیں؟ اعلان کے بعد تو انہیں بے خوف امیر کے سامنے پیش ہو جانا چاہیے" فرخ شاہ نے بڑے جوش سے کہا "میں انہیں اپنے ساتھ لے جاؤں گا کہاں ہیں وہ؟"

"وہ یہاں نہیں ٹھہرے ہیں" ارمغانہ نے غم آلود لہجے میں کہا "پتا نہیں کس کے گھر ٹھہرے ہوئے ہیں" ارمغانہ کی آنکھیں بھر آئیں۔

"گھبراؤ نہیں ارمغانہ" فرخ شاہ نے تسلی دی "مصیبت کے دن تو ختم ہو گئے ہیں۔ اب انہیں ڈرنا نہیں چاہیے امیر انہیں کئی بار یاد کر چکے ہیں"

ارمغانہ کو کوئی اور بات سوجھ ہی نہ رہی تھی۔ فرخ شاہ نے بہت باتیں سوچ رکھی تھیں لیکن ارمغانہ کے سامنے وہ سب کچھ بھول گیا تھا۔ دونوں دیر تک خاموش بیٹھے رہے۔ حارثہ آئی۔ اس نے دونوں کو خاموش دیکھا تو بگڑ گئی۔

"چپ کا روزہ رکھا ہے کیا دونوں نے۔ امیر زادے آپ نے تو گھاٹ گھاٹ کا پانی پیا ہے۔ کچھ بولیے نا"

"میں تو بول رہا ہوں مگر ارمغانہ خاموش ہیں" فرخ شاہ نے ساری بلا ارمغانہ پر ڈال دی۔

"میں کب خاموش ہوں۔ ہر بات کا جواب دیا ہے میں نے یہ خود ہی خاموش ہو گئے تھے" ارمغانہ نے اپنا دفاع کیا۔

"اچھا اب زباں کھلی ہے تو چلتی رہنا چاہیے۔ میں جا رہی ہوں" اور حارثہ پھر غائب ہو گئی۔

"بڑی شوخ ہے تمہاری سہیلی" فرخ شاہ نے بات شروع کی۔

"جی ہاں۔ اس کی شوخ باتوں نے ہی مجھے زندہ رکھا ہے ورنہ میں تو غموں کے مارے کب کی مر چکی ہوتی" ارمغانہ نے بھی جواب دینے میں دیر نہ کی۔

"کاش امیر المقدم سے ملاقات ہو گئی ہوتی تو کتنا اچھا ہوتا" فرخ شاہ نے دوسرا موضوع شروع کر دیا۔

"میں اُن کے آنے کی دُعا ہی کر سکتی ہوں" ارمغانہ نے جواب دیا "بابا کو صدموں نے آدھا کر دیا ہے۔ اُن کی صحت بہت گر گئی ہے"

ارمغانہ نے معلوم نہیں کتنے خلوص سے دُعا کی تھی کہ اسی وقت دروازے پر دستک ہوئی حارثہ بھاگ کے دروازے پر پہنچ گئی۔

"کون ہے؟" حارثہ نے دروازے سے کان لگا دیے۔

"حارثہ بیٹی۔ میں ہوں تمہارا چچا شمس الدین" باہر سے آواز آئی۔

"چچا شمس الدین آ گئے" حارثہ نے وہیں سے آواز لگائی اور دروازہ کھول دیا۔

شمس الدین کی آواز سن کر فرخ شاہ اور ارمغانہ دروازے کی طرف لپکے۔ حارثہ کے والدین بھی کمرے سے نکل کر دروازے کے پاس پہنچ گئے۔ شمس الدین المقدم سر جھکائے گھر میں داخل ہوئے۔ وہ واقعی بہت مضمحل تھے۔ فرخ شاہ نے انہیں صرف ایک بار دیکھا تھا۔ اس حال میں دیکھ کے اُسے افسوس ہوا۔ قسمت بگڑے تو سب کچھ بگڑ جاتا ہے۔

ارمغانہ بابا کہہ کر شمس الدین سے لپٹ گئی۔ انہوں نے اُس کے سر پہ ہاتھ پھیرا۔ حارثہ کے والد نے انہیں سلام کیا۔ شمس الدین نے سلام کا جواب دیا۔ پھر فرخ شاہ نے انہیں بڑے ادب سے سلام کیا۔

"میں امیر شمس الدین محمد ابن مقدم کی خدمت میں سلام پیش کرتا ہوں"

شمس الدین المقدم نے سر اٹھا کر دھندلائی نظروں سے فرخ شاہ کو دیکھا "شاید آپ امیر زادے فرخ شاہ ہیں؟"

"جی۔ آپ نے درست فرمایا۔" فرخ شاہ نے جواب دیا۔

"امیر صلاح الدین آپ کے چچا ہیں؟" شمس الدین کی نحیف آواز میں ترشی آگئی تھی۔

اس ترشی کو سب ہی نے محسوس کیا۔ فرخ شاہ پریشان ہوگیا۔ "جی ہاں۔" سے آگے وہ کچھ اور نہ کہہ سکا۔

"امیر نے آپ کو میری گرفتاری پر مامور کیا ہے؟" شمس الدین المقدم کے اس سوال میں تلوار کی کاٹ والا طنز پنہاں تھا۔

فرخ شاہ نے فوراً جواب دیا۔ "جی ہاں یہ درست ہے لیکن۔"

"میں آپ کے سامنے حاضر ہوں۔" شمس الدین المقدم نے فرخ شاہ کو آگے نہ بولنے دیا۔

فرخ شاہ نے پھر وضاحت کرنا چاہی۔ "وہ حکم پرانا تھا اور اب۔"

"آپ مجھے گرفتار کر سکتے ہیں۔" المقدم نے دوبارہ قطع کلام کیا۔

فرخ شاہ پریشان ہوگیا۔ اس نے امداد طلب نظروں سے ارمغانہ کو دیکھا۔

"بابا!" ارمغانہ نے دخل دیا۔ "آپ پرانا ذکر کیوں چھیڑتے ہیں۔ امیر معظم نے وہ حکم منسوخ کر کے نیا فرمان جاری کیا ہے۔"

"نئے حکم سے میرے گناہ تو نہیں دُھل گئے۔ کیا کیا تکلیفیں اُٹھائی ہیں میں نے روپوشی کے دوران۔" امیر شمس الدین المقدم نے پرانی باتیں شروع کر دیں۔ "کبھی حلب میں تو کبھی موصل میں۔ آج شام میں ہوں تو کل مصر۔ زندگی کی اس لاش کو کیسے گھسیٹا ہے میں نے۔ یہ میرا دل ہی جانتا ہے۔ کسی دوست نے مجھے پناہ نہیں دی۔ جو میرا کھاتے تھے مجھے آنکھیں دکھانے لگے۔ دوسروں سے کیا شکایت خود اپنا خون اپنے خلاف ہوگیا۔"

"بابا۔ خدا کے لیے اس قصے کو نہ دہرایئے۔" ارمغانہ چیخ پڑی۔ "امیرزادے آپ کو لینے آئے ہیں۔ امیر معظم صلاح الدین آپ کو کئی بار یاد کر چکے ہیں۔ ان کے ساتھ جایئے آپ۔"

"اب کہاں جاؤں بیٹی۔ زندگی اس قدر بوڑھی ہوگئی ہے کہ اس کا بوجھ مجھ سے نہیں اُٹھتا۔" امیر شمس الدین المقدم کا لہجہ حد درجہ افسردہ اور مغموم ہوگیا تھا۔ وہ زندگی سے بیزار نظر آتے تھے۔

حارثہ کے بزرگ باپ جو اب تک بالکل خاموش تھے۔ انہوں نے المقدم کی باتیں سنیں تو جیسے انہیں اس بڑھاپے میں جلال آگیا۔ کڑک کے بولے۔ "امیر شمس الدین۔ آپ کیا دیوانوں کی سی باتیں کر رہے ہیں۔ زندگی کبھی بوڑھی نہیں ہوتی۔ صدمات انسان کا دل بوڑھا کر دیتے ہیں مگر یہ غبار صرف اس وقت تک رہتا ہے جب تک تقدیر پلٹا نہیں کھاتی۔ آپ نے جو کچھ بویا وہی کاٹا مگر اب اس کا ذکر بے کار ہے۔ حکومتوں اور اقتدار کے لیے تو یہ قول مشہور ہے کہ 'تخت یا تختہ' آپ کو تخت نہ ملا مگر قدرت نے آپ کو تختے سے بھی بچا لیا۔ اب امیر صلاح الدین نے آپ کو معاف کیا ہے اور دربار میں طلب فرمایا ہے۔ جایئے اور دیکھیے کہ پردۂ غیب سے کیا ظہور پذیر ہوتا ہے۔"

"تو تمہاری بھی یہی رائے ہے کہ دربار میں چلا جاؤں؟" شمس الدین المقدم کو ذرا حوصلہ ہوا۔

"ضرور جایئے امیر شمس الدین المقدم۔" حارثہ کے والد نے کہا۔ "آپ نے تو دنیا ہی چھوڑ دی تھی ورنہ اگر آپ امیر صلاح الدین کی قدم بقدم جدوجہد پر غور کرتے تو اس نتیجے پر ضرور پہنچتے کہ آج کا یہ امیر کل کیا بن جائے گا۔ اس کا اندازہ کرنا ہی مشکل ہے۔ آپ کو نہ صرف اپنے لیے زندہ رہنا ہے بلکہ ابھی بیٹی ارمغانہ کے فرض سے بھی فارغ ہونا ہے۔"

"ٹھیک کہہ رہے ہو تم۔" شمس الدین نے پہلی بار تائید کی۔ "لوگ دوسروں کے لیے بھی تو زندہ رہتے ہیں۔ میں اگر ارمغانہ کے لیے زندہ رہوں تو کوئی عجیب بات تو نہ ہوگی۔ رہا ارمغانہ کے فرض کی ادائیگی کا سوال تو اس کا حل میں نے پہلے ہی نکال لیا ہے۔"

"کیا؟" حارثہ کے باپ چونک کے بولے۔ "آپ نے ارمغانہ کا رشتہ کہیں طے کر لیا ہے؟"

"صرف ارمغانہ کا نہیں۔ میں نے تو حارثہ کے لیے بھی لڑکا پسند کر لیا ہے۔" پھر شمس الدین المقدم میں اچانک نوجوانوں جیسی چستی آگئی۔ "میں امیر کے سامنے ضرور جاؤں گا اور اگر امیر نے مجھے کچھ دیا تو پھر تم دیکھو گے کہ میں ارمغانہ اور حارثہ کی شادی کس دھوم دھام سے کرتا ہوں۔"

فرخ شاہ اور ارمغانہ آنکھیں پھاڑے ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے۔ ان کی سمجھ میں نہ آرہا تھا کہ شمس الدین المقدم کیا کہہ رہے ہیں۔

۱۱۷۵ء کا سال صلاح الدین کے لیے اور زیادہ کامیابی اور شادمانی لایا۔

۱۳ اپریل کو حلب اور موصل کے مشترکہ لشکر نے صلاح الدین پر حملہ کیا۔

صلاح الدین نے اپنی جنگی حکمتِ عملی سے متحدہ لشکر کو ایک تنگ ناکے میں بُری طرح گھیر لیا اور اُس کے تجربے کار لشکر نے متحدہ دُشمن کے سپاہیوں کو کاٹ کر رکھ دیا۔ پھر شاہ حلب ملک الصالح کے مشیر صُلح پر مجبور ہو گئے اور طے یہ پایا کہ جو علاقہ جس کے پاس ہے وہ اُس کے قبضے میں رہے گا۔

اس معاہدے نے صلاح الدین کو ملک الصالح کی اطاعت اور فرمانبرداری سے آزاد کر دیا۔ صلاح الدین نے حماۃ واپس پہنچ کر بے جھجک اپنی بادشاہی کا اعلان کر دیا۔ اس کے ساتھ ہی مصر اور شام کے مقبوضہ علاقوں میں الملک الصالح کے نام کا خطبہ بند کر دیا گیا۔ صلاح الدین نے مصری ٹکسال کو حکم بھیجا کہ اب مشترک سکے کی بجائے صرف اُس کے نام کے سکے ڈھالے جائیں۔ صلاح الدین نے دمشق پر قبضے کے بعد مصری ٹکسال سے دو سکے ڈھلوائے تھے۔ ان پر ملک الصالح اور صلاح الدین دونوں کے نام منسوب تھے۔ اب جو نیا سکہ ڈھل کے آیا اُس پر "الملک الناصر یوسف بن ایوب" لکھا گیا تھا۔ خیال رہے کہ صلاح الدین اگرچہ سلطان صلاح الدین ایوبی کے نام سے زیادہ مشہور ہُوا لیکن اُس کا اصل نام صلاح الدین یوسف تھا۔ ناصر کے معنی مددگار یا مدد کے لیے تیار رہنے والا ہیں اور اُس کا یہ لقب اُس کی زندگی کی تمام جدوجہد اور کارناموں کا... احاطہ کرتا ہے۔ صلاح الدین دینِ اسلام کی مدد کے لیے ہر وقت مستعد رہتا تھا۔ بلکہ اُس کی زندگی کے آخری تقریباً بیس سال تو خالص صلیبی جنگوں ہی میں گزرے تھے۔

اس عرصے میں صلاح الدین جو اب امیر صلاح الدین سے بادشاہ دمشق ہو گیا تھا کو اپنے بھتیجے عزالدین فرخ شاہ کی شدت سے ضرورت محسوس ہُوئی۔ فرخ شاہ اُس سے اجازت لے کر دمشق گیا ہُوا تھا۔ وہ امیر شمس الدین المقدم اور اُس کی بیٹی ارمغانہ کو دمشق لانے کی تیاریاں کر رہا تھا کہ صلاح الدین نے گورنر دمشق طغتگین کے ذریعے فوراً حماۃ پہنچنے کا حکم دیا۔ فرخ شاہ نے دل کا معاملہ تو درمیان ہی میں چھوڑا اور شاہ دمشق کا حکم پاتے ہی حماۃ جانے کے لیے تیار ہو گیا۔

"ارمغانہ! میں جلد ہی واپس آ کر تم دونوں کو دمشق لے جاؤں گا۔" فرخ نے اُسے بتایا۔ "میرا خیال ہے کہ امیر ابن مقدم، دمشق جانے میں کچھ تکلف محسوس کر رہے ہیں۔"

"میرا بھی یہی خیال ہے۔" ارمغانہ نے جواب دیا۔ "کاش آپ کچھ دن اور ٹھہر سکتے۔"

فرخ نے کہا۔ "شاید اس میں کچھ خدا کی مصلحت ہو۔ مَیں تو اُن کی ہچکچاہٹ کی وجہ نہیں سمجھ سکا۔ ممکن ہے کہ تمہیں کچھ بتائیں۔ بہرحال تم انہیں تیار کرنے کی کوشش کرتی رہنا۔"

حارثہ نے آ کر ایک اور خبر سُنائی۔ "مجھے تو چچا امیر کی مرضی کچھ اور معلوم ہوتی ہے۔"

فرخ اور ارمغانہ چونک پڑے۔ ارمغانہ زیادہ پریشان نظر آ رہی تھی۔

"وہ بابا سے باتیں کر رہے تھے۔ کہتے ہیں کہ وہ امیرزادے فرخ کا احسان نہیں لینا چاہتے۔" حارثہ نے آہستہ سے کہا کیونکہ امیر شمس الدین المقدم اور حارثہ کے والد سامنے کی کوٹھڑی میں گفتگو کر رہے تھے اور فرخ باہر جاتے جاتے رُک کر ارمغانہ سے گفتگو کرنے لگا تھا۔

"مَیں ان پر کیا احسان کر رہا ہوں؟" فرخ نے جیسے خود سے سوال کیا۔

حارثہ نے ذرا تفصیل سے بتایا۔ "چچا المقدم کا خیال ہے کہ آپ اُن پر احسان کر کے ارمغانہ کو حاصل کرنا چاہتے ہیں جبکہ انہوں نے ارمغانہ کے لیے کسی اور کو پسند کر لیا ہے۔"

فرخ اور ارمغانہ کو پہلے ہی شبہ تھا۔ امیر المقدم نے کچھ دن پہلے کہا تھا کہ مَیں حارثہ اور ارمغانہ کی شادی بہت دُھوم دھام سے کروں گا۔ اُسی وقت یہ دونوں چونک اُٹھے تھے اور اب حارثہ نے صاف الفاظ میں اُن کے شک کو یقین کو بدل دیا تھا۔

"مگر مَیں اُن پر کوئی احسان تو نہیں کر رہا۔" فرخ نے بے بسی سے کہا۔ "مجھے پہلے امیر المقدم کی گرفتاری پر مامور کیا گیا تھا اور اب میرے سپرد یہ کام ہے کہ انہیں شاہ دمشق کے سامنے پیش کروں تاکہ وہ اپنی خدمات کا صلہ حاصل کر سکیں۔ تمہارا کیا خیال ہے ارمغانہ؟"

"میرا خیال کس بارے میں؟" ارمغانہ پریشان ہو گئی۔

"یہی کہ مَیں نے اُن پر پہلے نہ احسان کیا اور نہ اب احسان کر رہا ہُوں۔" فرخ نے وضاحت کی۔

"بہرحال! احسان تو آپ کا ہے ہم پر۔ اس سے تو آپ انکار نہیں کر سکتے۔" ارمغانہ نے جواب دیا۔ "رہا میری شادی کا مسئلہ تو اُس کی مَیں ذمے دار ہُوں۔ اس میں اب مَیں کسی کے حکم کو تسلیم نہیں

کروں گی۔"

"یعنی اگر تمہارے والد کہیں اور شادی کرنا چاہیں تو تم انکار کر دو گی؟" حارثہ نے فوراً سوال کیا۔

"اس کا جواب میں اس وقت نہیں دے سکتی۔" ارمغانہ نے مستقل مزاجی سے جواب دیا۔ "مگر یہ بات طے ہے کہ میری شادی ... میری شادی ہے اور وہ میری مرضی سے ہو گی۔ ہاں یہ بات ضرور ہے کہ میں بابا کی مرضی کے بغیر شادی نہیں کروں گی۔"

حارثہ نے سر جھٹک کے کہا۔ "عجیب بات ہے، ایک طرف تم کہتی ہو کہ شادی اپنی مرضی سے کروں گی اور دوسری طرف یہ شرط ہے کہ جب تک تمہارے بابا تمہیں شادی کی اجازت نہ دیں گے تم شادی نہیں کرو گی؟"

"بالکل یہی بات ہے، اس میں الجھن کیا ہے؟" ارمغانہ نے سوالیہ انداز میں کہا۔

"الجھن یہ ہے کہ اگر تمہیں تمہاری مرضی کی شادی کی اجازت نہیں دی گئی تو کیا تم عمر بھر کنواری بیٹھی رہو گی؟"

"ہاں یہی ایسا ہی ہوگا۔" ارمغانہ نے صاف الفاظ میں کہا۔ "اس سے پہلے بابا نے مجھے دانیال کے ساتھ تعاون کرنے کو کہا تھا تو میں نے بڑے جبر کے ساتھ ان کی بات مانی تھی، لیکن جب انہوں نے کہا کہ دانیال کی کامیابی کی صورت میں وہ میری شادی دانیال سے کر دیں گے تو میں نے ان سے صاف الفاظ میں یہی کہا تھا کہ میری شادی، میری شادی ہے اور وہ صرف میری مرضی سے ہو گی۔"

حارثہ اور ارمغانہ کے باپ کمرے سے آنگن میں آ گئے تھے۔

فرخ نے اب وہاں ٹھہرنا مناسب نہ سمجھا اور ارمغانہ پر ایک ایسی نظر ڈالی جس میں ہزاروں سوالوں کے ساتھ ایک دبی دبی التجا کی آمیزش بھی تھی۔

*

قرون حماۃ پر صلاح الدین نے حلب اور موصل کی متحدہ فوجوں کو شکست دی تھی، شاید اسی وجہ سے انہوں نے حماۃ کو اپنا عارضی مرکز بنا لیا تھا۔ وہ گھوم پھر کر حماۃ آ جاتے۔ فرخ سیدھا ان کے پاس حماۃ پہنچا۔ صلاح الدین کچھ جلدی میں تھے۔ انہوں نے حکم دیا۔

"تمہیں آج ہی بغداد جانا ہے۔ باقی ہدایات فقیہہ عیسیٰ ہکاری سے حاصل کر لو۔" یہ حکم دے کر صلاح الدین اپنے نائب سے ہم گفتگو میں مصروف ہو گئے۔

فرخ خاموشی سے خیمے سے باہر آ گیا، پھر وہ فقیہہ عیسیٰ کے خیمے پر پہنچا، مگر فقیہہ عیسیٰ نے خیمہ بدل لیا تھا۔ ایک لشکری کے ساتھ وہ ان کے نئے خیمے پر گیا، وہاں معلوم ہوا کہ فقیہہ عیسیٰ شاہ دمشق صلاح الدین کے خیمے پر گئے ہوئے ہیں۔ فرخ کو ایک دم خیال آیا کہ اس نے فقیہہ عیسیٰ کو صلاح الدین کے خیمے میں دیکھا تھا۔ اسے اپنی بدحواسی پر افسوس ہوا۔

فرخ واپس ہونے والا تھا کہ سامنے سے فقیہہ عیسیٰ آتے دکھائی دیے۔ فرخ ادب سے کھڑا ہو گیا۔

"میرے ساتھ آیئے امیر زادے۔" فقیہہ عیسیٰ نے قریب پہنچ کے کہا۔

فرخ ان کے پیچھے خیمے میں داخل ہوا۔

"بیٹھیے، میں آپ کو تفصیل سمجھاتا ہوں۔" پھر فقیہہ نے ایک بند لفافہ اور ایک فہرست فرخ کی طرف بڑھائی۔ "یہ بند لفافہ خلیفۃ المسلمین ابو محمد حسن بن مستنجد الملقب بہ مستضی بامر اللہ کے دربار میں پیش ہو کے بدست حاجب یا خود خلیفہ بغداد کو دینا ہے۔"

امیر زادہ فرخ، خلیفہ بغداد کا نام سن کر پریشان ہو گیا۔ اس نے اس نام کو دہرانے اور یاد کرنے کی کوشش کی مگر قاصر رہا۔

فقیہہ عیسیٰ نے اس کی پریشانی محسوس کر لی۔ انہوں نے دریافت کیا۔ "امیر زادے! آپ پریشان ہو گئے، کیا بغداد جانے سے گھبرا رہے ہیں؟"

"جی نہیں فقیہہ محترم!" امیر زادہ فرخ فوراً بولا۔ "میں دراصل خلیفہ بغداد کا نام یاد نہ کر سکا۔ براہ کرم آپ ایک بار پھر ان کا نام لیجیے۔"

فقیہہ عیسیٰ ہکاری کے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ آئی، بولے۔ "میں نام دہرائے دیتا ہوں لیکن آپ کو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ پورا نام آپ کو کہیں نہیں دہرانا پڑے گا۔ آپ انہیں صرف خلیفۃ المسلمین اور امیر المومنین کے الفاظ سے مخاطب کر سکتے ہیں۔ اس سلسلے میں آپ کو یہ بتا دوں کہ بغداد ہمارے دمشق اور قاہرہ سے کہیں بڑا شہر ہے۔ ایک زمانے میں یہ شہر روئے زمین کا سب سے بڑا شہر تھا اور شہنشاہ روم کے قسطنطنیہ کی بھی اس کے مقابلے میں کوئی حقیقت نہ تھی۔ اس وقت اس کی رونق بہت کم ہو چکی ہے اور بغداد کے خلیفہ کی حکومت صرف دار الخلافہ کے ارد گرد اور چند قلعوں تک محدود ہو کر رہ گئی ہے۔ مگر بغداد کا خلیفہ آج بھی عالم اسلام کا خلیفہ ہے اور مسلمانوں کا کوئی بادشاہ و شہنشاہ اس وقت تک مستند نہیں سمجھا جاتا

جب تک بغداد کا خلیفہ اُسے خلعت اور بادشاہی کا فرمان نہ جاری کردے۔ آپ کے بغداد جانے کا مقصد یہی ہے کہ آپ شاہِ دمشق کی طرف سے خلیفہ کے حضور پیش ہو کے خلعت و فرمان حاصل کریں۔"

بغداد کا نام آیا ہے تو اس کا مختصر احوال دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔

تاریخ بتاتی ہے کہ جہاں آج کل بغداد آباد ہے، وہاں... خاندانِ ساسانیاں کے آخری دور میں ایک منڈی ہوا کرتی تھی، جہاں مہینے میں ایک بار بازار لگتا تھا۔ خلیفہ اول حضرت ابوبکر صدیقؓ کے عہدِ خلافت میں لشکرِ اسلام کے مشہور سپہ سالار حضرت خالد بن ولید نے انبار پر دریائے دجلہ کے کنارے خیمے استادہ کیے تھے۔ انہوں نے چند لشکریوں کے ساتھ اس منڈی کے موقع پر حملہ کیا تھا اور مالِ غنیمت حاصل کر کے واپس ہو گئے تھے۔ اس کے بعد تاریخ میں بغداد کا ذکر عباسی خلیفہ دوم کے زمانے میں ملتا ہے۔

کہتے ہیں عباسی خلیفہ دوم ابو جعفر منصور دارالخلافت کے لیے موزوں جگہ تلاش کرتا ہوا اس جگہ پہنچا۔ اس وقت یہاں پر عیسائیوں کے ایک فرقے نسطورا کے بہت سے گرجے تھے۔ راہبوں نے بتایا کہ دجلہ کی وہ تمام زمین جو اس دریا سے... سیراب ہوتی ہے، اس میں یہ جگہ سب سے بہتر ہے، نہ یہاں ٹڈیوں کا حملہ ہوتا ہے اور نہ مچھر ہوتے ہیں۔ گرمیاں، برسات اور سرمیاں خوش گوار ہوتی ہیں۔ بغداد کی حیثیت اس وقت ایک گاؤں سے زیادہ نہ تھی، خلیفہ نے اس جگہ کو پسند کیا۔

ابو جعفر محمد بن جریر طبری فرماتے ہیں کہ جس وقت خلیفہ منصور راہبوں سے بغداد کے حالات دریافت کر رہا تھا تو راہبوں میں سے ایک نے کہا، "ہماری پرانی کتابوں میں ایک پیش گوئی لکھی ہوئی ہے کہ کسی زمانے میں نہر فرات اور دریائے دجلہ کے درمیان ایک شخص جس کا نام مقلاص ہوگا، وہ ایک شہر آباد کرے گا۔"

خلیفہ منصور چونک پڑا۔ اس نے کہا "واللہ! مقلاص میں ہی ہوں۔"

پھر اس نے اظہار کیا کہ اس کی دایہ اُسے اس نام سے پکارا کرتی تھی۔ دراصل مقلاص نام کا ایک مشہور قزاق تھا، مگر منصور کا نام مقلاص اس وجہ سے پڑ گیا تھا کہ ایک دن اس نے دایہ کا کاتا ہوا دھاگہ چرا لیا اور اسے بیچ کر دوستوں کی دعوت کر دی۔ دایہ کو جب منصور کی چوری کا پتا لگا تو وہ اُسے محبت میں مقلاص کے نام سے پکارنے لگی۔

مختصر یہ کہ خلیفہ ابو جعفر منصور نے ۱۴۵ھ ہجری میں بغداد کی بنیاد رکھی اور ۱۴۹ھ ہجری میں اس کی تکمیل ہوئی۔ تکمیل سے مطلب یہ ہے کہ سرکاری دفتر یہاں آ گئے۔ اس کے بعد ہر عباسی خلیفہ نے اپنے مزاج کے مطابق اس شہرِ خوباں جسے خلیفہ منصور نے "مدینۃ الاسلام" کا نام دیا تھا، میں اضافہ کیا اور نئے نئے قصر تعمیر کیے۔ ان تمام تعمیرات کی تفصیل تو نہیں دی جا سکتی لیکن ان مشہور محلات کے نام آپ کی معلومات کے لیے درج کیے جاتے ہیں، ایک زمانہ تک یادگار رہے۔

پانچویں عباسی خلیفہ نے قصرِ جعفری تعمیر کرایا۔

ساتویں خلیفہ مامون رشید نے قصرِ جعفری میں اضافہ کیا اور اس کا نام قصرِ حسنی رکھ دیا۔ مامون رشید کی ملکہ بوران اسی قصرِ حسنی میں رہتی تھی۔

سولھویں خلیفہ المعتضد کے عہد میں خلافت مشرقی بغداد میں منتقل ہوئی اور خلیفہ نے تین قصر تعمیر کرائے جن کے نام قصرِ ثریا، قصرِ فردوس اور قصرِ تاج ہیں۔

اٹھارہویں خلیفہ المقتدر نے قصرِ الشجر اور دو چھوٹے قصر تعمیر کیے۔

تیئسویں خلیفہ ابوالقاسم المطیع ابن مقتدر نے قصرِ معز الدولہ، قصرِ طاؤس، قصرِ مثمن اور قصرِ مربع تعمیر کرائے۔

اٹھائیسویں خلیفہ ابوالعباس المستظہر باللہ ابن مقتدی نے ۴۹۸ھ مطابق ۱۱۰۵ء میں قصرِ ریحانین تعمیر کرایا۔ اسی قصر میں امیر زادہ فرخ خلیفہ المستغنی کے سامنے پیش ہوا تھا۔

اس کے بعد کوئی اور نیا قصر تعمیر نہیں ہوا سوائے ایک پرانے قصرِ تاج کے جو ۱۱۷۳ء (۵۶۹ھ) میں دجلہ کی طغیانی کی وجہ سے منہدم ہو گیا تھا جسے خلیفہ مستغنی نے از سرِ نو تعمیر کرایا۔

اگرچہ صلاح الدین ایوبی کا سلطنتِ عباسیہ سے براہِ راست کوئی تعلق نہیں لیکن ایوبی خاندان نے عباسی خلافت کے دوران ہی ترقی حاصل کی۔ پھر جب اس خاندان میں سلطانی آئی تو اس سلطانی کا پروانہ بھی عباسی خلیفہ کے دربار ہی سے جاری ہوا تھا۔ اس لیے خلافتِ عباسیہ کے بارے میں کچھ اور باتیں بھی یاد رکھنے کے قابل ہیں جسے قاری پسند کریں گے۔

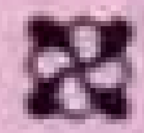
پہلی بات تو یہ کہ عباسی خلافت کا آغاز ۱۳۲ھ مطابق ۷۴۹ء میں ہوا۔ اس کا پہلا خلیفہ ابوالعباس عبداللہ بن محمد تھا مگر وہ اپنی سفاکی اور ظلم کی وجہ سے "سفاح" کے نام سے... مشہور ہوا۔

دوسری بات یہ کہ اس خلافت نے بڑا عروج پایا۔ اسی خلافت کے عظیم خلیفہ ہارون رشید اور مامون رشید تھے لیکن نظامِ فطرت ہے ہر کمالے را زوال۔ اس لیے جب اس خلافت نے جادۂ حق سے انحراف کیا اور لہو لعب میں گرفتار ہوئی تو ان کا زوال ہوا اور ۶۵۶ھ مطابق ۱۲۵۸ء میں بغداد کی اس عظیم خلافت کا خاتمہ منگول سردار ہلاکو خان کے ہاتھوں ہوا۔ اُس وقت عباسی خلیفہ مستعصم باللہ تختِ خلافتِ عباسیہ بغداد پر متمکن تھا جو اپنے وزیر ابنِ علقمی کی سازش کی وجہ سے منگول سردار ہلاکو خان کے سامنے پیش ہوا اور اُس کے حکم پر ہلاک کر دیا گیا۔

خلافتِ عباسیہ ۷۴۹ء سے ۱۲۵۸ء تک قائم رہی۔ یعنی مدتِ خلافت پانچ سو گیارہ سال ہوتی ہے۔

بغداد کی تباہی کے بعد عباسی خلافت ۱۲۶۲ء میں... از سرِ نو قاہرہ (مصر) میں قائم ہوئی۔ اگرچہ یہ خلافت برائے نام ہی تھی، پھر اس کے بھی اٹھارہ خلیفہ برسرِ اقتدار رہے۔ یہ خلافت ۱۵۱۸ء تک قائم رہی۔ اس طرح یہ مدتِ خلافت دو سو چھپن سال بنتی ہے۔ مصر کی عباسی خلافت کا پہلا خلیفہ مستنصر باللہ اور آخری خلیفہ متوکل علی اللہ ثالث تھا۔

یہاں بغداد اور بغداد کے مشہور محلات کا حال ضمناً لکھا گیا ہے، ورنہ دورِ عباسیہ کی تمدنی زندگی سے قطعِ نظر اگر صرف بغداد اُس کے محلوں، بازاروں اور تمام عمارتوں کا تفصیلی حال لکھا جائے تو اس کے لیے ایک پوری کتاب کی ضرورت ہوگی۔ اس سلسلے میں ایک کتاب بعنوان 'بغداد' مرتبہ خواجہ محمد عباد اللہ اختر بی اے امرتسری موجود ہے۔ اس کے مطالعہ سے اس کی تفصیل معلوم ہو سکتی ہے۔



فقیہہ عیسیٰ ہکاری نے امیر زادے فرخ کو خوب اچھی طرح سمجھا بجھا کے تیار کیا۔ فقیہہ نے یہ بھی بتایا کہ خلیفہ بغداد اب برائے نام خلیفہ ہیں مگر اُن کے ٹھاٹ باٹ پہلے ہی جیسے ہیں۔ وہی لونڈی غلاموں اور خواجہ سراؤں کی فوج اور وہی شاہی محلات کی چمک دمک۔

پھر فقیہہ عیسیٰ نے رازداری سے بتایا۔ "دیکھیے امیر زادے! خلیفہ بغداد کو کم عقل اور ضعیف العقیدہ لوگ بُت کی طرح پوجتے ہیں اور اُس کے آستانے پر سجدہ کرتے ہیں مگر خبردار رہیے کہ آپ شاہ بلکہ شہنشاہ دمشق صلاح الدین یوسف بن ایوب کی نیابت کر رہے ہیں، اس لیے کسی بدعت کا شکار ہونے کی ضرورت ہے اور نہ حاجب یا کسی عباسی وزیر کے رعب میں آیئے گا۔ ہمارے شاہ کا دُنیاوی مرتبہ خلیفہ سے بہت بڑا ہے مگر خلیفہ ہمارے مذہبی پیشوا ہیں، ہمیں صرف اُن کا احترام لازم ہے اس کے سوا اور کچھ نہیں۔"

امیر زادہ فرخ نے فقیہہ عیسیٰ کے اطمینان کے لیے کہا۔ "آپ فکر نہ کیجیے فقیہہ محترم! میں نے اگرچہ شاہوں کے دربار نہیں دیکھے اور نہ اُن کے آداب سے واقف ہوں، لیکن بچپن میں ایک بار میں شاہ صلاح الدین کے ساتھ سلطان نور الدین زنگی کے دربار میں گیا تھا۔ اس طرح میں نے اُس دربار کی شان و شوکت اور رُعب و داب کا صرف ایک نظارہ دیکھا تھا۔ مجھے اُمید ہے کہ خلیفہ بغداد کا دربار دمشق کے دربار سے زیادہ بڑا نہ ہوگا۔"

"اس کا اندازہ تو آپ کو بغداد جا کر ہی ہوگا۔" فقیہہ عیسیٰ نے جواب دیا۔ "مگر یہ ضرور ہے کہ بغداد وہ جگہ ہے جس کے دیکھنے کی ہر شخص کے دل میں آرزو ہوتی ہے۔"

"کیا آپ کا بھی بغداد جانے کو دل چاہتا ہے؟"

"کیوں نہیں امیر زادے!" فقیہہ عیسیٰ بولے۔ "امیر زادے آپ خوش قسمت ہیں کہ مدینۃ الاسلام تشریف لے جا رہے ہیں۔ باسلامت روی و باز آئی۔"

امیر زادے فرخ کو خلیفہ بغداد کے نام خط اور سامان کی ایک فہرست دی گئی تھی، جو خلیفہ بغداد کو نذرانے کے طور پر پیش کیا جانا تھا۔ ایک بیش قیمت جواہرات کا ہار، ایک زمرد کی تسبیح اور ایک کلامِ پاک رکھ کے پڑھنے کے لیے رحل تھی جو خالص سونے کی بنی تھی اور اس میں ہیرے جڑے ہوئے تھے۔ یہ سامان ایک صندوقچی میں رکھا تھا جسے زربفت کے کامدار غلاف میں لپیٹا گیا تھا۔ خلیفہ بغداد کو اگرچہ ہیرے جواہرات کی کوئی ضرورت نہ تھی۔ اس لیے کہ بغداد کے خزانے میں منوں کے وزن سے ہیرے جواہرات بھرے تھے، پھر بھی ہر بادشاہ جو خلیفہ سے اپنے لیے بادشاہت کا پروانہ حاصل کرتا وہ نذرانے کے طور پر کچھ نہ کچھ قیمتی چیز ضرور بھیجا کرتا تھا۔

فقیہہ عیسیٰ ہکاری نے امیر زادے فرخ کو اپنے ساتھ پچاس سوار لے جانے کی اجازت دی تھی لیکن امیر زادہ اپنے ساتھ صرف دس سوار لے کر عازمِ بغداد ہوا۔

بغداد میں مستضئی بامر اللہ عباسی کا دورِ خلافت تھا... یہ خلیفہ طبیعت کا نیک اور بڑا انصاف پسند تھا لیکن جن حالات

میں اُسے خلافت ملی تھی اُس کا ذکر بڑا دردناک ہے۔ بات یہ ہوئی کہ مستضئی کے والد مستنجد کے زمانے میں ابو جعفر بلدی وزیر سلطنت تھے۔ مستنجد اُس کی بڑی قدر کرتا تھا لیکن دربار خلافت کے دو امیر عضدالدین اور قطب الدین وزیر کے سخت خلاف تھے اور اُسے راستے سے ہٹانا چاہتے تھے۔

وزیر سلطنت ابو جعفر کو دونوں اُمراء کی سازش کا علم ہوگیا۔ اُس نے خلیفہ مستنجد سے دونوں امیروں کی شکایت کی۔ خلیفہ نے وزیر سلطنت کو حکم دے دیا کہ دونوں سازشی اُمراء کو گرفتار کر لیا جائے مگر وزیر سلطنت ابو جعفر بلدی کی قسمت خراب تھی۔ خلیفہ مستنجد اچانک بیمار ہوگیا اور بیمار بھی اتنا کہ بستر سے لگ گیا۔ اس طرح سازشی اُمراء کی گرفتاری کا معاملہ کھٹائی میں پڑ گیا۔

اُدھر عضدالدین اور قطب الدین کو اطلاع مل گئی کہ خلیفہ نے وزیر سلطنت ابو جعفر کو اُن کی گرفتاری کا حکم دیا ہے۔ اُن ... دونوں نے خلیفہ کے قتل کی سازش کی اور اس سازش میں خلیفہ کا طبیب بھی شامل ہوگیا۔ سازش کے تحت شاہی طبیب خلیفہ کے پاس حاضر ہوا۔ خلیفہ چلنے پھرنے کے بھی قابل نہ تھا مگر طبیب نے اُسے غسل کا مشورہ دیا۔ خلیفہ بستر سے اُتر بھی نہیں سکتا تھا لیکن طبیب، عضدالدین اور قطب الدین کی مدد سے خلیفہ کو حمام میں لے گیا اور دونوں امیروں نے اُسے حمام میں بند کر دیا جہاں وہ دم گھٹ جانے کی وجہ سے مر گیا۔

خلیفہ کے مرتے ہی دونوں امیر خلیفہ مستنجد کے بیٹے الحسن کے پاس پہنچے۔ مستضئی انہیں دیکھ کر گھبرا گیا کیونکہ وہ دونوں خلافت کے ستون سمجھے جاتے تھے، مگر جب انہوں نے گفتگو شروع کی تو اُن کا انداز بڑا دوستانہ تھا۔

عضدالدین نے مستضئی کو ادب سے سلام کرنے کے بعد کہا۔ "الحسن! آپ ولی عہد ہیں، پھر خلیفہ کو سمجھاتے کیوں نہیں کہ وزیر سلطنت ابو جعفر معقول آدمی نہیں اس لیے اُسے برخاست کر دیا جائے۔"

الحسن نے سہمے سہمے لہجے میں کہا۔ "معزز امیر! میں تو ولی عہد بھی نہیں ہوں، پھر آپ کیسے توقع کر سکتے ہیں کہ خلیفہ معظم میری بات مان لیں گے؟"

"نہیں الحسن! آپ ولی عہد ہیں، ہم آپ کو ولی عہد سمجھتے ہیں اور جسے ہم ولی عہد سمجھتے ہیں وہی خلیفہ ہوگا۔" عضدالدین نے زور دے کر کہا۔

الحسن بزدل نہیں تھا وہ سمجھ گیا کہ ان دونوں کی مخالفت اُسے مہنگی ثابت ہوگی۔ اس لیے اُس نے طے کر لیا کہ وہ اُن کی کسی بات کی مخالفت نہیں کرے گا۔

"پھر الحسن نے کیا سوچا؟" یہ سوال قطب الدین نے کیا، جس کا لہجہ اتنا سخت تھا کہ الحسن مستضئی گھبرا کر کھڑا ہوگیا۔ اُس نے لرزتے ہوئے کہا۔ "آپ دونوں جیسا کہیں گے میں ویسا ہی کروں گا۔"

"ہم چاہتے ہیں کہ آپ عضدالدین کو ابو جعفر کی جگہ وزیر مقرر کریں اور مجھے یعنی قطب الدین قائماز کو سپہ سالار کے عہدے پر فائز کر دیں۔" یہ کہتے ہوئے قائماز کا ہاتھ قبضہ شمشیر پر پہنچ گیا۔

"بالکل، بالکل ایسا ہی ہوگا جو آپ چاہتے ہیں میں ویسا ہی کروں گا۔" قائماز کا ہاتھ شمشیر پر دیکھ کر الحسن کو پسینے چھوٹ رہے تھے۔

"ہوگا نہیں، بلکہ آپ ابھی اعلان کیجیے۔" قطب الدین کی تلوار نصف سے زیادہ نیام سے باہر آگئی تھی۔

"ہاں، ہاں میں نے اعلان کر دیا۔" الحسن کا گلا خشک ہونے لگا تھا۔

"اس طرح نہیں۔" قطب الدین قائماز نے الحسن کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔ "یوں کہیے کہ میں ابو محمد حسن بن مستنجد اعلان کرتا ہوں کہ امیر عضدالدین میرے وزیر اور امیر قطب الدین قائماز سپہ سالار کے عہدے پر فائز کیے گئے ہیں۔"

الحسن گھبرا گیا۔

"مگر دیکھیے نا۔" اُس نے ہکلاتے ہوئے کہا۔ "میرے اعلان کرنے سے کیا ہوگا جب کہ..."

"سب کچھ ہوگا۔" اور قائماز کی تلوار نیام سے نکل کر بلند ہوگئی۔

الحسن نے فوراً اعلان کیا۔

"میں ابو محمد حسن نے امیر عضدالدین کو وزیر اور امیر قطب الدین قائماز کو سپہ سالار مقرر کیا۔"

"بس اب آپ اپنا دایاں ہاتھ بڑھائیے۔" قائماز نے حکم دیا۔

ابو محمد حسن نے سحر زدہ انسان کی طرح ہاتھ آگے کر دیا۔

"میں ابو محمد حسن بن مستنجد کے ہاتھ پر خلافت کی بیعت کرتا ہوں۔" پہلے قطب الدین قائماز نے بیعت کی۔

اس کے بعد عضدالدین نے بیعت کر کے ابو محمد حسن کی خلافت کی تصدیق کر دی۔

ابو محمد حسن کی یہ کیفیت تھی کہ وہ منہ کھولے کھڑا تھا اور کبھی عضد الدین اور قطب الدین کا منہ دیکھتا تھا۔

"دربار میں تشریف لے چلیے امیر المومنین! خلیفہ مستنجد کا انتقال ہو چکا ہے، دوسرے امراء دربار میں بیعت کے لیے حاضر ہیں...." عضد الدین نے مسکراتے ہوئے کہا۔

ابو محمد حسن کی سمجھ میں یہ معمہ اب آیا۔ پہلے دونوں امیروں نے اپنا اپنا عہدہ پختہ کیا، پھر ابو محمد حسن کو بغداد کا خلیفہ بنا دیا۔ ابو محمد حسن، مستضئ بامر اللہ کے لقب سے خلیفہ ہوا۔ یہ عباسی خلافت کا تینتیسواں خلیفہ تھا۔ یہ واقعہ ۵۶۶ھ ہجری کا ہے۔

بس جس وقت امیر زادہ فرخ بغداد میں داخل ہوا تو...

ابو محمد حسن المستضئ خلیفہ تھا لیکن خلافت کی باگ ڈور امیر عضد الدین اور امیر قطب الدین قایماز کے ہاتھ میں تھی جو بالترتیب خلیفہ کے وزیر اور سپہ سالار بن چکے تھے۔ ان دونوں امیروں کو چونکہ پہلے وزیر ابو جعفر بن بلدی سے پرخاش تھی اس لیے انھوں نے ابو جعفر کو بیعت کے بہانے قصرِ ریحانین میں بلوا کر قتل کر دیا تھا اور لاش دجلہ میں پھینکوا دی تھی۔

امیر زادہ فرخ کا یہ خیال غلط ثابت ہوا کہ بغداد، دمشق جیسا ہی شہر ہوگا۔ اس عظیم اور خوبصورت شہر کو دیکھ کر وہ حیران رہ گیا۔ بغداد دریائے دجلہ کے دونوں طرف آباد تھا۔ امیر زادہ فرخ اپنے سواروں کے ساتھ فصیلِ شہر میں داخل ہوا تو چاق و چوبند محافظوں میں سے ایک سوار اُن کے قریب آیا۔ امیر زادہ سب سے آگے تھا۔ اس لیے سوار نے اُسے مخاطب کیا۔ "مدینۃ المنصور اور شہروں کے سرتاج بغداد میں آپ کا آنا مبارک ہو.... مَیں خلیفۃ المسلمین امیر المومنین ابو محمد حسن مستضئ بامر اللہ کی طرف سے آپ کو خوش آمدید کہتا ہوں۔"

امیر زادہ فرخ اُس کے مہذب انداز سے بڑا متاثر ہوا۔ اُس نے جواب دیا۔ "مَیں علم و ادب، دولت و ثروت کے گہوارے اور تہذیب و تمدن کے مرکز کے محترم شہری کو سلام پیش کرتا ہوں۔"

سوار نے پہلے جیسے مہذب انداز میں سوال کیا۔ "مَیں فصیلِ شہر کے صدر دروازے کا ایک ادنیٰ خادم ہوں اور میرے فرائض میں یہ داخل ہے کہ مسافروں اور خصوصاً آپ جیسے صاحبِ علم غیر ملکیوں کے قیام و طعام کا انتظام کروں اور دفتری اندراج کے لیے یہ دریافت کروں کہ معزز مہمان کہاں سے تشریف لائے ہیں اور ناگوار نہ ہو تو یہ بتانا بھی پسند کریں تو یہ پوچھوں کہ اُن کے اس شہر میں قدم رنجہ فرمانے کا کیا مقصد ہے؟"

امیر زادے نے جواب میں کہا۔ "اگرچہ مجھے سوائے شاہی محل کے عمال یا حریمِ خلافت کے قابلِ احترام حاجب کے علاوہ کسی کو اپنی شناخت کرانے کا حکم نہیں لیکن یہ محسوس کرتے ہوئے کہ مجھ سے سوال کرنے والا سلطنت اور خلافت کا ایک ذمے دار رُکن ہے۔ اس لیے مَیں اپنا تعارف کراتا ہوں۔"

"بسم اللہ! محترم مہمان۔" سوار نے بات آگے بڑھائی۔

امیر زادے عز الدین فرخ نے کہنا شروع کیا۔ "میرا خیال ہے کہ دولتِ بغداد کے معزز رُکن دمشق اور ملکِ شام سے ضرور واقف ہوں گے۔ مَیں اُسی ملک اور اُسی شہر سے آ رہا ہوں۔ مجھے ملکِ شام اور ملکِ مصر کے بادشاہ اعلیٰ حضرت صلاح الدین ایوبی نے حکم دیا ہے کہ مَیں بغداد پہنچ کر امیر المومنین کے حضور اپنے شاہ کی طرف سے نذرِ عقیدت پیش کروں۔"

"سبحان اللہ.... زہے نصیب۔" یہ کہتے ہوئے سوار گھوڑے سے اُتر کر قدرے خم ہوا اور اُس نے امیر زادہ فرخ کو فوجی سلام پیش کیا، پھر بولا۔ "اے عالی مقام مہمان! مَیں بڑے ادب سے اپنی گستاخی کی معافی چاہتا ہوں کہ مَیں نے آپ کو اپنے سوالات کے جواب دینے کی زحمت دی۔ میری اب جرأت نہیں کہ آپ سے کسی قسم کی گفتگو یا سوال و جواب کروں۔ براہِ کرم مجھے اجازت دیجیے کہ مَیں آپ کی اُس مقام تک رہنمائی کروں جہاں تشریف لے جانا آپ کا مقصد ہے۔"

"اے تمیز دار محافظ! ہم تمہارے شکر گزار ہوں گے، اگر تم امیر المومنین تک پہنچنے میں ہماری رہنمائی کرو گے۔"

امیر زادہ فرخ کی بات ختم ہوتے ہی محافظ اپنے گھوڑے پر سوار ہوا اور مہمانوں کے آگے آگے چلنے لگا۔

بغداد کیا عجیب شہر تھا۔ نہایت خوشنما صاف ستھرا۔ فصیلِ شہر کے اندر ایک گہری خندق تھی، جو شفاف پانی سے بھری تھی۔ اُس خندق پر جگہ جگہ چوبی پُل پڑے تھے۔ ان میں رسّے اور زنجیریں لگی تھیں اور جب ضرورت ہوتی زنجیریں کھینچ کے پُل کو خندق سے الگ کر دیا جاتا۔ خندق کے دوسری جانب ایک اور فصیل تھی جو پہلے ہی جیسی مضبوط اور اُونچی تھی۔ اُس فصیل کے بڑے دروازے سے یہ لوگ اندر داخل ہوئے۔ وہاں بے شمار خوبصورت اور عالی شان محلّات تھے جو ایک دوسرے سے کافی فاصلے پر تھے۔ درمیان میں باغات تھے۔ ان باغات میں پھل اور پھول دار پودے اور درخت تھے جن کی ہریالی دیکھ کر آنکھوں میں تراوٹ آ جاتی تھی۔

جب یہ لوگ ایک عظیم الشان محل کے پاس پہنچے تو امیر زادہ

فرخ کو گمان ہُوا کہ یہی خلیفہ بغداد کا محل ہے۔ اُس نے سوار سے دریافت کیا: "اے برادر! کیا ہم منزلِ مقصود سے قریب ہیں؟"

وہ قدرے مسکرایا، بولا: "تحمل فرمایئے اور بغداد کی سیر... کرتے چلیے۔"

امیر زادے پر بغداد کا پہلے ہی رُعب پڑ چکا تھا۔ اب وہ یہ سوچنے پر مجبور ہو گیا کہ خلیفۂ وقت کا محل واقعی بہت بڑا ہو گا... محل کی قطاروں سے گزر کر وہ ایک میدان میں پہنچے۔ اس میدان کے چاروں طرف دُکانیں تھیں۔ دُکانوں کی ترتیب اس طرح تھی۔ اگر پارچہ جات کی دُکانیں شروع ہوتیں تو ان کے درمیان کوئی اور دکان نہ آتی۔ یہاں تک کہ یہ سلسلہ ختم ہوتا اور دوسرے سامان کی دکانوں کا سلسلہ شروع ہو جاتا۔ میدان کے درمیان میں ایک باغ تھا۔ محافظ سوار نے بتایا کہ اس باغ میں ایک باغِ وحش (چڑیا گھر) ہے جس میں پرندوں کے علاوہ مُلک مُلک کے جانور اور درندے موجود ہیں۔

امیر زادے نے سوال کرنے کا سلسلہ بند کر دیا تھا اور شاید محافظ سردار نے یہ ذمے داری از خود اختیار کر لی تھی۔ وہ جب کسی چیز کی وضاحت محسوس کرتا تو خود بیان کرنے لگتا۔ اس طرح وہ آگے بڑھتے رہے اور محافظ انہیں بغداد کی عجیب و غریب چیزوں کی تفصیل بتاتا رہا۔ وہ سب اب تک تین فصیلیں پار کر چکے تھے جن میں سے ہر فصیل قلعے کی فصیل سے کسی طرح کم نہ تھی۔ فصیلوں کے درمیان بڑے بڑے عالی شان محلات کی قطاریں تھیں۔ بعض محل تو اس قدر خوبصورت تھے کہ اُن پر آنکھ نہ ٹھہرتی تھی۔ امیر زادہ اور اُس کے ساتھ آنے والے یہ سوچ رہے تھے کہ جب یہ محلات باہر سے اس قدر خوبصورت ہیں تو اُن کی اندرونی... آرائش کا کیا حال ہو گا۔

اُن کے گھوڑوں کی رفتار کم تھی مگر ایک گھنٹہ گزرنے کے بعد بھی وہ اب تک قصرِ خلافت پر نہیں پہنچ سکے۔ پھر جب وہ ایک فصیل کے قریب پہنچے تو محافظ نے اشارہ کرتے ہوئے کہا: "معزز مہمان! ہم حریم تک آ پہنچے ہیں۔"

امیر زادے فرخ نے گھبرا کر سامنے کی طرف دیکھا، مگر اسے سوائے فصیل کے اور کچھ نہ دکھائی دیا۔ اس نے دریافت کیا۔

"شاید ہم حریمِ خلافت کے قریب پہنچ گئے ہیں؟"

"جی نہیں معزز مہمان!" محافظ نے جواب دیا: "ہم حریمِ خلافت سے ابھی دُور ہیں لیکن اس فصیل نما دیوار کا نام بھی حریم ہے۔ ہم بغداد والے حریم، اُس فصیل یا دیوار کو کہتے ہیں جو خلفاء عباسی کے محلات اور مقبروں کا احاطہ کرتی ہے۔ آپ ابھی دیکھیں گے کہ حریم کے اندر صرف محلات اور مقابر ہی نہیں بلکہ وہاں ایک پورا شہر آباد ہے اور یہ شہر ہی اصل میں بغداد کا دل ہے۔"

اس حریم یا فصیل میں ایک بہت عظیم دروازہ تھا۔ شاید اس وجہ سے اس کے اندر شاہی محلات تھے... اس دروازے سے گزر کر جب یہ لوگ اندر پہنچے تو امیر زادہ فرخ کا یہ خیال دُرست نکلا۔ حریم کے اندر ایک سے ایک خوبصورت اور عالی شان محل تھا۔ ہر محل کے سامنے یا تو میدان تھا یا ایک بڑا باغ تھا۔ حریم میں جو محل سب سے پہلے تعمیر ہُوا اُس کا نام قصرِ جعفری تھا۔ اس کی بنیاد پانچویں خلیفہ ہارون رشید بن مہدی کے زمانے میں رکھی گئی۔ الف لیلیٰ کی تمام کہانیاں اسی خلیفہ سے منسوب کی جاتی ہیں۔ پھر تو یہاں ہر خلیفہ نے قصر بنانے شروع کر دیے مگر یہ محلات عام طور سے خشتِ خام سے تیار کیے جاتے تھے اور یہ مٹی ایک صدی بعد عام طور پر اُسی مٹی میں مل جاتی تھی جس سے یہ اینٹیں بنائی گئی تھیں۔

محافظ نے اس عالی شان قصر کی سیڑھیوں کے پاس گھوڑا روکا۔ وہاں چاق و چوبند باوردی سوار اور پیادے پہرہ دے رہے تھے۔ امیر زادہ فرخ نے اطمینان کا سانس لیا کہ چلو سفر ختم ہُوا اور وہ اپنی منزل پر پہنچ گئے۔

احتیاط کے طور پر امیر زادے نے اپنے راہبر سے دریافت کیا: "میرا خیال ہے کہ ہم قصرِ خلافت کے بہت قریب ہیں۔"

راہبر نے مسکراتے ہوئے جواب دیا: "آپ یقیناً قصرِ خلافت کے قریب ہیں۔ امیر المومنین خلیفہ سے اب بھی آپ بہت دُور ہیں۔"

امیر زادہ فرخ نے اُسے بوکھلا کے دیکھا: "میں تمہارا مطلب نہیں سمجھ سکا محترم راہبر!"

راہبر نے جواب میں کہا: "میرا مطلب یہ ہے کہ قصرِ خلافت تک تو لوگ پہنچ جاتے ہیں لیکن خلیفہ کے حضور پیش ہونے میں انہیں وقت لگتا ہے۔"

"کتنا وقت لگ جاتا ہے خلیفہ سے ملاقات میں...؟"

امیر زادہ اور پریشان ہو گیا۔

"ایک ہفتہ... ایک مہینہ یا پھر ایک سال۔" راہبر نے جواب دیا: "اس عرصے کے گزر جانے کے باوجود بھی کوئی... یقین سے نہیں کہہ سکتا کہ اُسے کب دربارِ خلافت میں طلب کیا جائے گا۔"

یہ کہہ کر راہبر محل کی سیڑھیاں چڑھنے لگا۔
امیر زادے نے اُسے آواز دے کر روکا۔ "تم کب واپس آؤ گے، کب تک تمہارا انتظار کریں؟"
"آپ یہیں ٹھہریے، مَیں ابھی واپس آتا ہوں۔" اور وہ بھاگ بھاگ کے سیڑھیاں طے کرنے لگا۔
امیر زادہ فرخ کو وہاں کھڑا ہونا بہت شاق گزر رہا تھا۔ ہر راہ گیر اُنہیں مشکوک نظروں سے گھورتا ہُوا نکلتا تھا۔ اُسے زیادہ انتظار نہ کرنا پڑا۔ محافظ سردار جلدی ہی واپس آ کر بولا۔ "آپ میرے ساتھ چلیے، میرا کام یہیں تک ہے، آگے آپ کو دوسرے لوگ لے جائیں گے۔"
"مگر ہمارے گھوڑوں کا کیا بنے گا؟" امیر زادہ فرخ نے پوچھا۔
راہبر نے گھوم کے پیچھے دیکھا۔ اُس کی پُشت پر ایک درجن سے زیادہ غلام ہاتھ باندھے کھڑے تھے۔
راہبر بولا۔ "گھوڑے یہ سنبھالیں گے۔ آپ لوگ بے فکر ہو کر میرے ساتھ آیئے۔"
امیر زادہ فرخ اور اُس کے ساتھی سوار محافظ راہبر کے ساتھ چلنے لگے۔ ابھی وہ سیڑھیاں چڑھ کر اُوپر پہنچے ہی تھے، ایک شخص بھاگتا ہُوا محافظ راہبر کے پاس آیا۔
اُس نے پھُولی سانسوں میں کہا۔ "جلدی چلو، دمشق کے سفیر کی طلبی ہوگئی ہے۔"
راہبر نے حیران نظروں سے اُسے دیکھا۔ "اتنی جلدی طلبی ہوگئی ہے!"
"ہاں، ہاں، مَیں نے اندر اطلاع دی تھی کہ شاہ مصر و شام کا سفیر آیا ہے، اطلاع بھیجتے ہی اندر سے غلام خاص آ گیا... سفیر کا انتظار کیا جا رہا ہے۔"
محافظ نے امیر زادے فرخ کی طرف دیکھا۔ "مبارک ہو۔ آپ کی فوراً طلبی ہوگئی ورنہ یہاں تو لوگ مہینوں پڑے انتظار کرتے رہتے ہیں۔"
"ان میں سفیر کون ہے؟" آنے والے نے امیر زادے کی طرف دیکھ کر محافظ سے سوال کیا۔
"یہی سفیر ہیں۔" اور محافظ نے امیر زادے کا ہاتھ پکڑ کے اُس آدمی کے ہاتھ میں دے دیا۔ "اب یہ آپ کے سپرد ہیں۔ میں بری الذمہ ہُوا۔"
"ٹھیک ہے، تم جا سکتے ہو۔" اُس نے محافظ کو رخصت کر دیا۔
"آپ کو اندر طلب کیا گیا ہے، غلام خاص آپ کو لے جانے کے لیے میرے دفتر میں بیٹھا ہے۔" آنے والے نے کہا۔ "آپ کے ساتھی میرے دفتر میں بیٹھیں گے، صرف آپ اندر تشریف لے جائیں گے۔"
"مگر آپ... آپ کی تعریف؟" امیر زادہ فرخ نے متانت سے کہا۔
"مَیں استقبالیہ افسر ہُوں، آپ سے مل کر بہت خوشی ہُوئی۔" اُس نے لجاجت سے کہا۔
"مگر مجھے اُس وقت خوشی ہوگی، جب آپ مجھے اندر بھجوا دیں گے۔" امیر زادے نے خوش دلی سے کہا۔
"حضور، حضور... آپ ابھی اندر جائیں گے، بے فکر رہیے ہم آپ کے خادم ہیں۔"
استقبالیہ افسر سب کو اپنے دفتر میں لے گیا۔ وہاں ایک زرّیں کمر غلام بیٹھا تھا۔ وہ استقبالیہ افسر کو دیکھ کر کھڑا ہوگیا۔
"کیا سفیر تشریف لے آئے؟" غلام نے پوچھا۔
"ہاں آ گئے ہیں۔ وہ سفیر صاحب ہیں۔" افسر استقبالیہ نے فرخ کی طرف اشارہ کیا۔
غلام نے آگے بڑھ کر امیر زادہ فرخ کو ادب سے سلام کیا۔ "آپ میرے ساتھ تشریف لے چلیے، اندر آپ کو یاد کیا گیا ہے۔"
فرخ نے سلام کا جواب دیا اور اُس زرّیں کمر غلام کے ساتھ ہو لیا۔
یہ قصر اندر سے بہت بڑا تھا۔ امیر زادہ ایک راہداری میں داخل ہُوا تو وہ ختم ہونے کا نام ہی نہ لیتی تھی۔ محل میں بے شمار کمرے تھے اور اس راہداری کے علاوہ دوسری راہداریاں بھی تھیں۔ پھر اُس کے دائیں جانب ایک باغ شروع ہوگیا۔ خوبصورت کیاریاں اور روشوں کے کنارے پھُولوں کی اس طرح قطاریں تھیں جیسے گل فروشوں نے دکانیں لگائی ہوں۔
یہ سب کچھ تھا، وسیع دالانیں، طویل راہداریاں، باغ اور روشیں مگر امیر زادہ کچھ حیران حیران تھا۔ آخر وہ زرّیں کمر غلام سے سوال کر ہی بیٹھا۔ "کیوں بھائی! کیا خلیفہ بہت سادگی پسند ہیں؟"
غلام اُس کی آواز یا سوال پر ٹھٹک کر کھڑا ہوگیا۔ اُس نے ادب سے کہا۔ "سفیر محترم نے یہ اندازہ کس بات سے لگایا؟"
غلام نے اُس سے اُلٹا سوال کر دیا، وہ پریشان ہوگیا۔

اُس نے جواب دیا: "بھائی! یہ عالی شان محل، لمبی لمبی راہداریاں، بڑے بڑے دالان، باغ باغیچے، سب کچھ تو ہے اس محل میں لیکن لونڈی غلاموں کا کوئی پتا نہیں۔ میں نے دمشق کے سلطان کا محل دیکھا ہے، کیا شان ہے اس کی۔ جگہ جگہ چوکی پہرہ، کہیں غلام چُپ چاپ بُت بنے کھڑے ہیں تو کہیں متحرک جیسے گشت پر ہوں مگر تمہارے خلیفہ کے محل میں کوئی رونق نہیں، کوئی شان نہیں، باہر سے آنے والوں پر کیا اثر پڑتا ہوگا اس ویرانی کا؟"

یہ سُن کر غلام بڑی دلچسپی یا حیرانی سے امیر زادے کا مُنہ دیکھ رہا تھا۔ امیر زادے کا تبصرہ ختم ہُوا تو غلام نے کہا: "آپ مجھے بڑی زبردست غلط فہمی میں مبتلا نظر آتے ہیں؟"

امیر زادے نے جواب دیا: "کیوں بھائی! کیا میں نے کوئی بات غلط کہی؟"

"اچھا، پہلے آپ یہ فرمایئے کہ آپ نے یہ کیسے اندازہ لگایا کہ یہ محل، قصرِ خلافت ہے؟" غلام نے مُسکراتے ہُوئے مگر کچھ طنزیہ انداز میں امیر زادے سے سوال کیا۔

غلام کے سوال پر جیسے امیر زادے کی آنکھوں پر سے پردہ اُٹھ گیا۔ پہلے غلام کا کہنا کہ وہ کسی غلط فہمی میں مبتلا ہے، پھر یہ سوال کہ کس نے بتایا ہے کہ یہ قصرِ خلافت ہے؟ امیر زادہ واقعی غلط فہمی میں مبتلا تھا اور اُس نے اس کا برملا اعتراف کیا۔

"تم نے ٹھیک کہا بھائی! میں واقعی غلطی سے اسے قصرِ خلافت سمجھ بیٹھا تھا۔ کیوں یہی بات ہے ناں؟"

"آپ بہت ذہین ہیں سفیرِ محترم!" غلام نے جواب دیا، پھر خود ہی تفصیل بتانے لگا: "یہ محل دراصل امیر المومنین کے وزیرِ اعظم امیر عضد الدین کا ہے، میرے آقا امیر عضد الدین بغداد کے سب سے زیادہ عقل مند آدمی ہیں، بڑے رُعب دار اور ٹھاٹ باٹ کے مالک ہیں۔ آپ اُن سے مل کے ضرور خوش ہوں گے۔"

امیر زادے کا ذہن اُلجھ کر رہ گیا تھا۔ اُس نے اسی اُلجھن میں سوال کیا: "لیکن مجھے وزیرِ اعظم کے سامنے کیوں پیش کیا جا رہا ہے جبکہ میں اپنے شاہ دمشق و مصر کا نامہ امیر المومنین اور خلیفۃ المسلمین کے نام لایا ہُوں اور مجھے اُنہی کے حضور پیش ہونا ہے۔"

"قابلِ احترام سفیر!" غلام نے ادب سے جواب دیا... "بڑے لوگوں کی باتیں بھی بڑی باتیں ہوتی ہیں۔ وزیرِ اعظم نے مجھے حکم دیا کہ محترم سفیر کو احترام کے ساتھ لے آؤ۔ سو میں آپ کے پاس حاضر ہو گیا۔ اب رہا یہ سوال کہ آپ کو کس سے ملنا ہے اور کس کے حضور پیش ہونا ہے، یہ آپ وزیرِ اعظم سے دریافت کیجیے گا۔ حکم ہو تو میں آگے بڑھوں۔"

امیر زادے نے غلام کو گھور کر دیکھا۔ وہ سمجھ گیا کہ قاضی کے گھر کے چوہے سیانے، یہ غلام اپنے آقا سے بھی تیز معلوم ہوتا ہے۔ اُس نے کس خوبصورتی سے بات ٹال دی تھی۔

"چلو، مجھے جلد وزیرِ اعظم کے سامنے پیش کر دو۔" یہ کہہ کے امیر زادہ غلام کے ساتھ چلنے لگا۔

آگے بڑھے تو راہداریوں میں کچھ لوگ چلتے پھرتے نظر پڑے۔ وہ جتنا آگے بڑھتے گئے اُسی اعتبار سے راہداریوں میں لوگوں کی تعداد بھی بڑھتی گئی، یہاں تک کہ غلام ایک کمرے کے سامنے رُک گیا۔ اس کمرے پر چار نیزہ بردار محافظوں کا پہرہ تھا اور سوائے دائیں جانب کی راہداری کے اس کمرے کے آس پاس کوئی آدمی نہ تھا۔

غلام، امیر زادے کو باہر کھڑا کر کے کمرے میں چلا گیا، پھر فوراً ہی واپس آیا اور امیر زادے کو اندر آنے کا اشارہ کیا۔ امیر زادے نے اندر داخل ہو کر دیکھا کہ ایک ادھیڑ عمر شخص فائلوں پر جھکا ہُوا ہے۔ یہ کمرہ نوادرات سے سجا ہُوا تھا اور وزیرِ اعظم کے عہدے کے مطابق سے اسے آراستہ کیا گیا تھا۔

"السلام علیکم!" امیر زادے فرخ نے مسلمانوں کی طرح سلام کیا۔

"بیٹھ جاؤ۔" سلام کا جواب دینے کی بجائے وزیرِ اعظم نے اُسے بیٹھنے کے لیے کہا۔

امیر زادہ جوان تھا اور جوانی کا خون اُس کی رگوں میں دوڑ رہا تھا۔ اُسے خلیفہ کے وزیرِ اعظم کی یہ تمکنت جو اُس کے خیال میں نخوت تھی، پسند نہ آئی۔ وہ چڑچڑایا بیٹھا تھا کہ وزیر نے سوال کر دیا: "شاہ دمشق نے تمہیں کیوں بھیجا ہے؟"

سوال بڑا کھُردرا سا تھا۔ امیر زادہ فرخ پہلے ہی چڑا ہُوا تھا۔ اُس نے بھی کھُردرا سا جواب دیا: "شاہ دمشق و مصر نے مجھے امیر المومنین کے حضور پیش ہونے کا حکم دیا ہے۔"

"لیکن شاہ دمشق نے پیغام کیا بھیجا ہے؟" وزیرِ اعظم نے پہلی مرتبہ سر اُٹھا کر امیر زادے کو دیکھا۔

"قابلِ احترام وزیرِ اعظم!" امیر زادہ فرخ سنبھل کر بولا۔ "میرے آقا شاہ صلاح الدین یوسف بن نجم الدین ایوب صرف دمشق کے بادشاہ نہیں بلکہ اُن کے قبضہ اقتدار میں مصر

جیسا عظیم ملک بھی ہے۔"

وزیرِ اعظم نے ترچھی نظروں سے امیرزادے کو دیکھا۔ "نام کیا ہے تمہارا؟"

"نام امیرزادہ عزالدین فرخ شاہ بن نور الدولہ شاہان شاہ۔ خاندانی امیر ہوں۔ شاہ دمشق و مصر اعلیٰ حضرت صلاح الدین یوسف میرے سگے چچا ہیں۔" فرخ شاہ بڑی تمکنت سے اپنا تعارف کرایا۔

"ایک بادشاہ کے بھتیجے ہونے پر بہت غرور ہے؟" وزیرِ اعظم نے جل کے کہا۔

فرخ شاہ نے فوراً جواب دیا۔ "غرور نہیں فخر ہے۔ شاہ صلاح الدین یوسف کا غلام بھی اپنے اوپر فخر کرتا ہے۔" امیر زادے فرخ شاہ نے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔

"اچھا چھوڑو ان باتوں کو۔ یہ بتاؤ تمہارے شاہ نے کیا پیغام بھیجا ہے؟" وزیرِ اعظم سیدھا ہو کے بیٹھ گیا۔

"پیغام ایک بند لفافے میں ہے اور وہ لفافہ خلیفہ محترم و معظم کے نام ہے۔ فرخ شاہ پورے وقار سے گفتگو کر رہا تھا۔

"وہ لفافہ پیش کرو۔" وزیرِ اعظم کا انداز تحکمانہ ہو گیا تھا۔

"مجھے لفافہ امیر المومنین کو پیش کرنے کا حکم ہے۔" فرخ شاہ اکڑ گیا۔

"مگر یہاں میرا حکم چلتا ہے۔ میں وزیرِ اعظم ہوں۔ میرے حکم کے بغیر تم خلیفہ بغداد سے ملاقات نہیں کر سکتے۔" وزیرِ اعظم نے رُعب ڈالا۔

"اگر امیر المومنین سے ملاقات نہیں ہو سکتی تو کوئی بات نہیں۔ میں دمشق کا راستہ جانتا ہوں۔ واپس چلا جاؤں گا مگر وہ امانت جو مجھے امیر المومنین خلیفہ بغداد کو پیش کرنا ہے اُسے کسی اور کے ہاتھ میں نہیں دیا جا سکتا۔"

امیرزادہ فرخ شاہ نے اتنی مستقل مزاجی سے جواب دیا کہ وزیرِ اعظم بغداد حیران رہ گیا پھر جب امیرزادہ نے اپنی نشست سے اُٹھتے ہوئے کہا۔ "مجھے دمشق واپس جانے کی اجازت دی جائے۔"

تو وزیرِ اعظم بغداد کا حیرانی سے منہ کھل گیا۔ اُس وقت دربارِ خلافت کے دو ہی مردِ آہن تھے۔ ایک وزیرِ اعظم عضدالدین اور دوسرا سپہ سالار قطب الدین قائماز۔ ان دونوں کے سامنے بغداد کے عوام تو ایک طرف رہے کوئی امیر بھی دم نہیں مار سکتا تھا۔ امیرزادہ فرخ شاہ کے کھرے کھرے جوابوں سے وزیرِ اعظم کا منہ پھر گیا۔ آخر نرم پڑتے ہوئے کہا۔ "دمشق کے جوان بہت تیز طبیعت ہوتے ہیں۔"

"عالی مقام وزیرِ اعظم۔" امیرزادے فرخ شاہ نے بھی نرم لہجہ اختیار کیا۔ "میں دمشق واپس جا رہا ہوں۔ اگر کوئی بات ناگوار گزری ہو تو معاف کر دیجیے گا۔"

"کہاں جا رہے ہو؟" وزیرِ اعظم عضدالدین اپنی جگہ سے اُٹھ کے فرخ شاہ کے پاس آ گیا۔

"اب تم میرے ساتھ امیر المومنین کے پاس چلو گے۔"

یہ کہہ کے وزیرِ اعظم نے فرخ شاہ کا ہاتھ پکڑا اور اُسے لیے ہوئے راہداری میں آ گیا۔

عضدالدین بڑا مغرور تھا۔ بڑے بڑوں کو منہ نہ لگاتا مگر امیرزادہ فرخ شاہ نے اُسے ایسا آڑے ہاتھوں لیا کہ اُس کا دماغ ٹھکانے آ گیا۔ باہر ان دونوں کو جس نے دیکھا حیران رہ گیا۔ دوسری طرف راہداری میں جو لوگ کھڑے تھے، وہ وزیرِ اعظم سے ملاقات کے لیے دور دور سے آئے تھے۔ اُن کو آئے ہوئے بھی کئی کئی دن ہو گئے تھے۔ اُن کی اب تک طلبی نہیں ہوئی تھی۔

وزیرِ اعظم کے ساتھ چلتے ہوئے امیرزادہ فرخ شاہ کو

"تم نے پولیس والے کی بے عزتی کی ہے۔" سارجنٹ نے غصے سے ملزم کو دیکھا اور پوچھا۔ "کیا تم نے اُسے جھوٹا کہا تھا؟"

ملزم نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔

"جی ہاں۔"

"تم نے اُسے چھچھورا کہا تھا؟"

"جی ہاں۔"

"تم نے اُسے بھینگا... لنگڑا... احمق اور ناکارہ بھی کہا تھا؟"

"جی نہیں۔" ملزم نے سادگی سے جواب دیا۔ "جناب یہ باتیں تو اس وقت مجھے یاد ہی نہیں آئی تھیں۔"

محسوس ہوا وہ واقعی محلات کی راہداریوں اور رستوں سے گزر رہا ہے۔ وزیر اعظم کا محل اگرچہ طویل و عریض تھا مگر اس میں زیادہ سجاوٹ نہ تھی مگر فرخ شاہ اب جن راستوں سے گزر رہا تھا وہاں سے اُسے اپنے دونوں طرف محلات ہی محلات دکھائی دے رہے تھے۔ ایک سے ایک خوب صورت محل۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے پودے زمین سے اُگتے ہیں۔ اسی طرح یہ محلات بھی اس زمین پر اُگ آئے تھے۔

"کیا قصرِ خلافت ابھی دُور ہے؟" امیرزادہ فرخ شاہ نے چلتے چلتے پوچھا۔

"ہم قصرِ خلافت کے سامنے ہیں۔" وزیر اعظم عضد الدین نے قدم روک کے کہا۔ "بتاؤ کہ قصرِ خلافت کون سا ہے؟"

امیرزادہ نے رُک کر اپنے سامنے اور دائیں بائیں دیکھا۔ دو قصر سامنے۔ دو دائیں اور دو ہی بائیں جانب تھے۔ اس نے ایک لمحہ سوچ کے کہا۔ "سامنے کے دونوں قصر باقی محلوں سے زیادہ خوب صورت ہیں۔ میرا خیال ہے کہ سامنے کے دونوں قصروں میں سے ایک قصر، قصرِ خلافت ہے۔"

"تم ذہین بھی ہو نوجوان۔" عضد الدین نے اس کی ذہانت کی داد دی۔ "سامنے کے دونوں قصر امیر المؤمنین کے ہیں۔ ایک قصر میں وہ دربار لگاتے ہیں۔ دُوسرے میں حرم سرا اور شاہی خواب گاہ ہے۔"

خلیفہ مستضئ قصرِ دار الریحانیین میں رہتا تھا۔ عباسیوں کو حکومت کرتے چار سو سال سے زیادہ ہو چکے تھے۔ اس دوران اُنہوں نے بڑے عالیشان محلات تعمیر کیے مگر وقت کے ساتھ ساتھ وہ منہدم اور معدوم ہوتے گئے۔ قصر دار الریحانیین کو عباسی خلیفہ مستظہر نے تعمیر کرایا تھا۔ اس نے سوق الریحانیین کا اکثر حصّہ اور دارِ خاتون اور دارِ سیدہ کو مسمار کرا کے ان کی جگہ قصرِ دار الریحانیین بنوایا تھا۔ اس میں ایک میدان تھا جو کہ مربع تھا۔ وسط میں ایک باغ تھا۔ قصر میں تیس سے زیادہ کشادہ کمرے تھے۔ اس میں درگاہ خاتون بھی ایک قصر تھا۔ یہ باب نوبیہ کے متصل تھا۔ اس قصر میں شہزادی فاطمہ رہا کرتی تھی جو ملک شاہ سلجوقی کی پوتی اور خلیفہ مستضئ کی بیوی تھی۔

شہزادی فاطمہ کا نکاح خلیفہ مستضئ کے ساتھ ۱۱۲۳ء میں ہوا تھا۔ ملکہ فاطمہ کی علمی قابلیت کی مورخین بہت تعریف کرتے ہیں۔ شہزادی کا انتقال قصرِ درگاہ خاتون میں ۱۱۲۶ء میں ہوا تھا۔ دار الریحانیین کی تعمیر کے پچاس سال بعد مستظہر کے پوتے مستنجد باللہ نے ۱۱۶۲ء میں اس قصر میں ایک جھروکہ (جسے منظر کہتے تھے) بنوایا تھا۔ عباسی خلیفہ اپنے محلات سے بہت کم باہر نکلتے تھے۔ عوام کے اصرار پر وہ ہفتے میں ایک بار اس جھروکے میں بیٹھ جاتے اور عوام اس جھروکے کے سامنے سے گزرتے ہوئے خلیفہ کا دیدار کرتے تھے۔ دیدار کا بس نام ہی تھا۔ اتنی دُور اور بلندی سے کیا خاک دکھائی دیتا ہوگا۔ عوام کو صرف جھروکہ نظر آتا تھا جسے دیکھ کر وہ تصور کر لیتے تھے کہ انہوں نے خلیفہ کا دیدار کیا ہے۔

وزیر اعظم کے اچانک قصرِ خلافت پہنچنے سے قصر کے پہریداروں، کنیزوں، اور غلاموں میں کھلبلی مچ گئی کیونکہ وزیر اعظم ہی دراصل سلطنتِ عباسیہ کا مالک تھا۔ خلیفہ تو بس برائے نام ہوتے۔ ان کے صرف دو کام تھے۔ پہلا کام بادشاہوں کو شاہی سند روانہ کرنا، دوسرا کام مذہبی تھا۔

جب کوئی بڑا عالم، مفتی یا فقیہہ بغداد میں آتا اُسے خلیفہ کی طرف سے وعظ کی دعوت دی جاتی۔ واعظ اس جھروکے کے نیچے میدان میں وعظ دیتا اور خلیفہ اس جھروکے میں بیٹھ کے وعظ سنتا تھا۔ ایسے موقع پر خلیفہ کی بیگمات اور لڑکے لڑکیاں بھی خلیفہ کے ساتھ وعظ سننے میں شریک ہوتے۔ ان کے لیے اوپر کی راہداری میں چلمنیں ڈال دی جاتی تھیں۔ عام سننے والوں کے لیے میدان میں فرش بچھایا جاتا تھا اور عوام کے داخلے کے لیے قصر کا ایک دروازہ کھول دیا جاتا تھا۔

خلیفہ مستضئ اگرچہ دیندار آدمی تھا لیکن اس کے دورِ خلافت میں وعظ کی کسی ایسی محفل کا ذکر نہیں ملتا۔ لیکن اس کے بیٹے ناصر الدین اللہ کے زمانہ میں ایک عظیم الشان محفلِ وعظ منعقد ہوئی تھی۔ اس وعظ میں ابنِ جبیر خود موجود تھا۔ اس نے اس کی تفصیل لکھی ہے۔ وہ لکھتا ہے:۔

"بابِ بدر کے قریب خلیفہ کے محل کے اندر ایک میدان میں شیخ جمال الدین ابی الفضل بن علی الجوزی کی مجلسِ وعظ منعقد ہوئی۔ مجلس کے ایک طرف خلیفہ ناصر الدین اللہ، ان کی والدہ، بیبیاں، بیٹے اور دیگر رشتہ دار جھروکوں میں بیٹھے ہوئے وعظ سن رہے تھے اور دوسری طرف مخلوق کے واسطے ایک دروازہ کھول دیا۔ پورے میدان میں فرش بچھا ہوا تھا۔" ابنِ جبیر نے اس مجلس کی تاریخ ۵۱، ماہ صفر ۵۸۰ ہجری لکھا ہے۔

وزیر اعظم بغداد کو خلیفہ بغداد سے ملاقات کے لیے اجازت لینے کی ضرورت نہ تھی۔ وہ جس وقت چاہتے خلیفہ کے

پاس چلے جاتے۔ انہیں روکنے کی کسی میں ہمت نہ تھی۔ مگر وزیرِ اعظم کو آتے دیکھ کر چند غلام اور کنیزیں بھاگ کے خلیفہ کے پاس پہنچیں اور اُنہیں وزیرِ اعظم عضد الدین کے آنے کی خبر کی۔ خلیفہ نے اپنی محفل اسی وقت برخاست کر دی۔ خلیفہ وزیرِ اعظم کی بہت قدر اور عزت بھی کرتے تھے۔

وزیرِ اعظم امیر زادہ فرخ شاہ کو ساتھ لیے ہوئے سیدھے خلیفہ مستضئی کے پاس پہنچے۔ وزیرِ اعظم نے قدرے خم ہو کر خلیفہ کو سلام پیش کیا۔ امیر زادے نے بھی ان کی تقلید میں سلام کیا۔ خلیفہ نے اپنا دایاں ہاتھ وزیرِ اعظم کی طرف لمبا کر دیا۔ وزیرِ اعظم عضد الدین نے خلیفہ کے ہاتھ کو آنکھوں سے لگا کر بوسہ دیا۔ امیر زادہ فرخ شاہ نے وزیرِ اعظم کی پیروی کی۔

وزیرِ اعظم عضد الدین نے بڑے فخر کے ساتھ کہا۔ "میں امیر المومنین کے حضور میں اُس شخص کو بڑے فخر کے ساتھ پیش کر رہا ہوں جس کی آمد کا دربارِ خلافت میں بہت دن سے انتظار ہو رہا تھا۔"

"عضد الدین" خلیفہ نے امیر زادہ فرخ شاہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "شاید تمہارا اشارہ اس جوان کی طرف ہے۔"

"میں امیر المومنین کے اندازے کی داد دیتا ہوں۔" عضد الدین نے خوشامدانہ لہجے میں کہا۔

"مگر اس جوان کا لباس چغلی کھا رہا ہے کہ بغدادی نہیں؟" خلیفہ کا انداز سوالیہ تھا۔

عضد الدین نے جواب دیا۔ "جی ہاں امیر المومنین۔ صرف یہی نہیں کہ یہ کسی دوسرے ملک سے آیا ہے بلکہ اس شخص نے بغداد کو آج پہلی مرتبہ دیکھا ہے۔"

"جلد بتاؤ یہ کون ہے؟ ہمارے صبر کا امتحان نہ لو عضد الدین" خلیفہ بے چین ہو گیا تھا۔

"امیر المومنین۔ یہ جوان شاہِ مصر جو اب شاہِ دمشق بھی ہیں یعنی شاہ صلاح الدین یوسف ایوبی کا سفیر ہے اور حضورِ خلیفہ میں اپنے آقا کا ایک خط پیش کرنا چاہتا ہے۔"

خلیفہ مستضئی شاہ صلاح الدین کا نام سُن کر حیرت سے کھڑا ہو گیا۔ "ارے۔ تم۔ تم صلاح الدین کے سفیر ہو۔ کیسا ہے ہمارا بیٹا۔ ہم تو اُسے بہت یاد کرتے ہیں۔" خلیفہ ایک ہی سانس میں نہ جانے کیا کیا کہہ گیا۔

خلیفہ چُپ ہوا تو امیر زادے فرخ شاہ نے ادب سے کہا۔ "شاہ صلاح الدین یوسف بالکل صحیح و سلامت ہیں۔ امیر المومنین۔ وہ اور اہلِ دمشق اور اہلِ مصر آپ کی درازیٔ عمر کی دعا کرتے ہیں۔"

"خدا اُسے سلامت رکھے۔" خلیفہ مستضئی نے خلوصِ دل سے دعا دی۔ "سلطان نور الدین زنگی کے انتقال سے ہم بہت پریشان تھے۔ ہمیں معلوم ہوا تھا۔ سلطان کے انتقال کے بعد اُمرائے نوریہ نے سلطنتِ دمشق کی بندربانٹ شروع کر دی ہے۔ مگر جب ہمیں صلاح الدین کے مصر سے آنے کی اطلاع ملی تو ہمیں اطمینان ہو گیا۔ ہمیں امید تھی کہ صلاح الدین یوسف، سلطانِ دمشق کا صحیح جانشین ثابت ہو گا۔ پس یہ اُمید پوری ہوئی۔ تمہیں عضد الدین نے بتایا ہو گا کہ جب صلاح الدین نے حماۃ میں دونوں کے متحدہ لشکر کو شکست دی اُس وقت پورے بغداد میں چراغاں ہوا تھا اور صلاح الدین کی سلامتی کی دعائیں مانگی گئی تھیں۔"

"میں شاہ دمشق کی طرف سے آپ کے خلوص کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ دمشق پہنچ کے میں اُنہیں بتاؤں گا کہ امیر المومنین اور دربارِ خلافت کے متعلقین کے دل میں صلاح الدین کے لیے کس قدر پیار اور محبت ہے۔" امیر زادہ فرخ شاہ نے بھی سفارت کا حق ادا کیا۔

پھر امیر زادے نے وہ زرنگار صندوقچی اور صلاح الدین کا خط خلیفہ کو پیش کیا۔ صندوقچی تو خلیفہ کے برابر کھڑے ہوئے حاجب نے سنبھال لی اور خط کے لیے خلیفہ نے عضد الدین کی طرف اشارہ کیا۔ "عضد الدین پڑھو کہ ہمارے بیٹے نے ہمیں کیا لکھا ہے؟"

عضد الدین نے لفافہ چاک کیا پھر خط پڑھا۔ لکھا تھا:

امیر المومنین خلیفۃ المسلمین ابو محمد حسن بن مستنجد الملقب بہ مستضئی بامر اللہ کے حضور حقیر و نیاز مند صلاح الدین یوسف بن ایوب کی عرضداشت شروع کرتا ہوں۔ اُس ذاتِ پاک کے نام سے جس کی تعریف لکھنے کے لیے دنیا کے تمام سمندروں کے برابر روشنائی ناکافی ہے اور بعد اس نبی پاک کی مدحت اور ثنا کے کہ جس نے معراج کا اعلیٰ ترین اعزاز پایا۔ یہ بندۂ ناچیز عرض پرداز ہے کہ حماۃ میں موصل اور حلب کے مشترکہ لشکر کو شکست دینے کے بعد نہ صرف ملکِ شام کے عوام اور خواص بلکہ شہزادہ الصالح جو اپنی کمسنی اور ناسمجھی کے باعث اُمراء کے بہکانے سے میرے خلاف کھڑا ہوا تھا اس نے بھی مجھے ملکِ شام اور ملکِ مصر کا نگراں

تسلیم کر لیا ہے۔ آپ کی ذات والا صفات سے امید ہے کہ اس بندۂ ناچیز کو دمشق اور قاہرہ کی مسندِ شاہی کی سند عطا فرمائیں گے۔

امیر المومنین صلاح الدین کو ہر موقع پر اپنی خدمت پر مستعد اور تیار پائیں گے۔

نیاز مند: حقیر و ناچیز صلاح الدین یوسف ایوبی۔

"وزیر اعظم عضد الدین کے خاموش ہوتے ہی خلیفہ مستضئی پکار اٹھا۔ "بے شک۔ بے شک۔ سلطان نور الدین زنگی کے تم ہی جانشین۔ صلاح الدین تم پر اللہ کی برکتیں نازل ہوں۔ ہماری دعا ہے کہ دمشق اور مصر کے درمیان نصرانیت کی جو خس و خاشاک پھیلی ہوئی ہے اُسے تم صاف کرو۔"

امیر زادے فرخ شاہ نے گرہ لگائی۔

"امیر المومنین۔ میرے آقا شاہ دمشق نے جس طرح خارجنگی کا خاتمہ کیا ہے اسی طرح وہ یروشلم کی عیسائی حکومت جو آئے دن مسلم علاقوں میں لوٹ مار کرتی رہتی ہے۔ اُس سے بھی ایک فیصلہ کُن جنگ کی تیاری کر رہے ہیں۔"

"سبحان اللہ۔ سبحان اللہ۔ اللہ اُس کے ارادوں میں استقامت پیدا کرے۔" خلیفہ نے صلاح الدین کو دوبارہ دُعا دی پھر حاجب کو حکم دیا۔ "صلاح الدین کے لیے خلعتِ فاخرہ پیش کی جائے اور ہاں عضد الدین تم شاہی کاتب سے سندِ شاہی لکھوا کر ابھی پیش کرو۔ ہم صلاح الدین کو نور الدین زنگی کی طرح "سلطان کا لقب عطا کرتے ہیں۔"

امیر زادہ فرخ شاہ جلدی سے بولا۔ "میں امیر المومنین کا ایک بار پھر شکریہ ادا کرتا ہوں۔"

وزیر اعظم عضد الدین جو کاتب سے سند لکھوانے جا رہا تھا اس نے پلٹ کر خلیفہ سے عرض کیا۔ "امیر المومنین۔ سلطان صلاح الدین یوسف ایوبی کا قاصد سلطان کا سگا بھتیجا ہے۔ یہ بھی خلیفہ کی عنایت کا حقدار ہے۔"

"بہت خوب۔ کیا نام ہے تمہارا؟" خلیفہ نے مسرت سے کہا۔

"غلام کا نام عز الدین فرخ شاہ ہے امیر المومنین۔" فرخ شاہ نے فخر سے کہا۔

خلیفہ نے حاجب سے کہا۔ "سلطان کے بھتیجے کے لیے بھی ایک خلعت پیش کی جائے۔"

جیسا کہ پہلے کہا گیا ہے کہ خلیفہ بغداد کا کام مذہبی مجالس میں شرکت اور بادشاہوں کو سند اور خلعت بانٹنا رہ گیا تھا۔ اس کے توشہ خانہ میں تیار شدہ خلعتوں کے انبار لگے رہتے تھے۔ ان میں خلعت فاخرہ بھی تھیں جو خاص خاص لوگوں کو دی جاتی تھیں اور عام خلعتیں بھی تھیں۔ بہر حال خلعت فاخرہ ہو یا عام، خلعت جب کسی کو دی جاتی تھی تو نہ صرف اُس کا اپنے ہم چشموں میں مرتبہ بڑھ جاتا تھا بلکہ وہ خود صاحبِ خلعت ہونے پر فخر کرتا تھا۔

خلیفہ کے حکم کی دیر تھی کہ دونوں خلعتیں دربار میں آگئیں۔ دونوں خلعتیں دو الگ الگ سونے کے خوانوں میں رکھی تھیں جن پر زر نگار خوان پوش ڈھکے ہوئے تھے۔ ان خوانوں کو چاندی کی ایک چوکی پر جو مسندِ خلافت کے قریب رکھی تھی پر رکھا گیا اور اوپر سے خوان پوش ہٹا دیے گئے۔

اس دوران وزیر اعظم عضد الدین نے امیر زادہ فرخ شاہ کو خلعت وصول کرنے کے طریقے سمجھا دیے تھے چنانچہ جب حاجب نے سفیرِ دمشق کا نام بلند آواز سے پکارا تو امیر زادہ فرخ شاہ آہستہ قدم اُٹھاتا ہوا مسندِ خلافت کے سامنے پہنچا۔ حاجب نے امیر زادے والا خوان چوکی سے اُٹھا کر خلیفہ مستضئی کے سامنے کیا۔ خلیفہ نے اس پر ہاتھ رکھا۔ یہ اس بات کی اجازت تھی کہ خلعت حقدار کو دی جائے۔

خلیفہ نے خوان سے ہاتھ کھینچا تو حاجب نے امیر زادے کی طرف کر دیا۔ امیر زادے نے خوان میں رکھی ہوئی خلعت جس کے گرد ریشم کے فیتے بندھے تھے، اُٹھائی پھر وہ اُلٹے پیروں اپنی جگہ واپس چلا گیا۔ وزیر اعظم نے ایک غلام کو قریب بلا لیا تھا۔ امیر زادہ نے اپنی خلعت اُس غلام کے حوالے کر دی۔ پھر حاجب نے یہ آواز بلند کہا۔

"امیر المومنین خلیفۃ المسلمین ابو محمد حسن بن مستنجد الملقب بہ مستضئی بامر اللہ، سلطان مصر و شام صلاح الدین یوسف ایوبی کو خلعتِ فاخرہ مع کلاہ، گلوبند اور پارچہ جات سے نوازتے ہیں۔ سفیرِ دمشق اس عظیم تحفے کو قبول کرے۔"

اس آواز پر امیر زادہ فرخ شاہ نے ایک بار پھر حرکت کی اور مسندِ خلافت کے سامنے پہنچا۔ حاجب نے خوان خلیفہ کے سامنے کیا۔ خلیفہ نے اس پر ہاتھ رکھ کر اجازت دی۔ چونکہ خوان بھاری تھا اس لیے حاجب خود اس خوان کو فرخ شاہ کے کھڑے ہونے کی جگہ تک لے گیا۔ وزیر اعظم نے حاجب کو یہ کہہ کر واپس بھیج دیا کہ خوان بعد میں قصرِ خلافت بھیج دیا جائے گا۔

اب مسئلہ فرمانِ خلافت یعنی صلاح الدین کو "سندِ سلطانی"

باقی تھا۔ اس کے لیے حاجب نے پھر سفیرِ دمشق کو آواز دی۔ فرخ شاہ نے مسندِ خلافت کے سامنے پہنچ کر سندِ سلطانی کا لفافہ وصول کیا۔ اُسے آنکھوں سے لگایا اور سر پر رکھے ہوئے اُلٹے پیروں اپنی جگہ واپس آگیا۔

اس پُروقار تقریب میں سوائے وزیرِ اعظم بغداد کے اور کوئی عمالِ خلافت موجود نہ تھا۔ خلیفہ مستضئی نے وزیرِ اعظم کو تاکید کی کہ شامی سفیر کو وہ شام کے کھانے پر اپنے ساتھ لائے۔ چنانچہ رات کو امیر زادہ فرخ شاہ نے خلیفہ اور وزیرِ اعظم کے ساتھ کھانا کھایا۔ وہاں سپہ سالار افواجِ بغداد قطب الدین قائماز سے بھی امیر زادہ کی ملاقات ہوئی۔ سپہ سالار کو پیغام بھیج کے خلیفہ نے بلوا لیا تھا۔

کھانے کے بعد خلیفہ نے وزیرِ اعظم کو حکم دیا کہ شامی سفیر کو تین روز تک عروس البلاد بغداد میں ٹھہرایا جائے اور اُسے پورے بغداد کی سیر کرائی جائے۔ اس طرح امیر زادے فرخ شاہ کو شرقی اور غربی دونوں طرف پھیلے ہوئے بغداد کی خوب سیر کرائی گئی۔ اگرچہ عباسی خلافت زوال پذیر تھی، اور اُس کے بیشتر علاقے بھی چھن گئے تھے مگر بغداد کی رونق اب بھی قائم تھی۔ اس شہر میں بڑی دولت تھی۔ لوگ مطمئن اور بے فکر تھے۔ خلافت کے خزانے ہیرے جواہرات سے بھرے تھے مگر خلافتِ بغداد کی عسکری طاقت روز بروز کمزور ہوتی جا رہی تھی۔ خلافت کے کسی حصّے میں بھی خلفشار نہ تھا۔ اس لیے فوج کی طرف خلیفہ کی توجہ کم رہتی تھی۔

حلب سے واپسی پر صلاح الدین کچھ روز حماۃ میں ٹھہرا اور پھر فوج لے کر بعوص کی طرف کوچ کیا۔ وہ شام کے اُن تمام مقامات کو واپس لینا چاہتا تھا جن پر سلطان نور الدین کا قبضہ تھا اور اُن کے انتقال پر یا تو وہ باغی ہو کر آزاد ہو گئے تھے یا پھر سلطان مرحوم کے کمسن شہزادے الملک الصالح کی کمزوری سے فائدہ اُٹھا کر صالح کے چچا زاد بھائی سیف الدین کے قبضے میں چلے گئے تھے۔ سیف الدین غازی نے سلطان کی آنکھ بند ہوتے ہی اُس کے علاقوں پر زبردستی قبضہ شروع کر دیا تھا۔ وہ تو خیر ہوئی کہ دمشق کے بعض عقلمند امراء نے مصر سے امیر صلاح الدین کو بلا لیا جس نے آتے ہی مُنہ زور اور مفاد پرست اُمرائے نوریہ کو سیدھا کرنا شروع کر دیا۔

بعوص بھی ان علاقوں میں سے ایک تھا جس کا حاکم سلطان کی وفات پر خود مختار ہو گیا تھا۔ اُس نے صلاح الدین کے لشکر کے آنے کی خبر سُنی تو فوراً ہتھیار ڈال دیے اور صلاح الدین کا بعوص پر بغیر جنگ کے قبضہ ہو گیا۔ وہاں سے صلاح الدین پھر اپنے عارضی مرکز یعنی حماۃ واپس آیا۔ صلاح الدین کی بعوص سے واپسی کے دوسرے ہفتے امیر زادہ فرخ شاہ دربارِ خلافت سے واپس آیا۔ اُس کے ساتھ خلیفہ بغداد کا خادمِ خاص آیا تھا تاکہ وہ تصدیق کرے کہ امیر زادہ فرخ شاہ جو سندِ سلطانی لایا ہے وہ دربارِ خلافت سے جاری ہوئی؟

صلاح الدین کے سامنے جب امیر زادہ نے سندِ سلطانی، خلعتِ فاخرہ، کلاہ، گلوبند اور ریشمی پارچہ جات پیش کیے تو صلاح الدین مسرّت سے بے قابو ہو گیا اور اُس نے امیر زادہ فرخ شاہ کو گلے لگا لیا۔ حماۃ، حمص، بعلبک، دمشق اور شام کے تمام مقبوضات میں جشنِ شادمانی منانے کے احکامات جاری ہوئے اور غرباء اور مساکین میں نقد رقم اور کھانے کا سامان تقسیم کرنے کا حکم دیا گیا۔ اُس ہفتے امیر صلاح الدین نے حماۃ میں دربارِ خاص لگایا جس میں تمام علاقوں کے حکمراں اور گورنر شریک ہوئے۔

اس دربار میں صلاح الدین نے مقبوضہ علاقوں پر حاکم مقرر کیے۔ اُس نے حماۃ اپنے ماموں شہاب الدین محمود کو دیا۔ حمص کا حاکم ناصر الدولہ بن شیر کوہ کو مقرر کیا گیا۔ اسی دربار میں امیر زادہ فرخ شاہ نے دربارِ خلافت کے تمام واقعات سب کے روبرو بیان کیے۔ صلاح الدین نے یہ بھی اعلان کیا کہ وہ دمشق پہنچ کے جامع دمشق میں خلیفہ مستضئی کی عطا کی ہوئی خلعت فاخرہ، گلوبند اور کلاہ پہنے گا اور اُس وقت وہ خلیفہ کا دیا ہوا خطاب یعنی سلطان ہونے کا اعلان کرے گا۔

دربار کے بعد صلاح الدین نے خلیفہ کے غلام خاص کو جوڑا، گھوڑا اور معقول رقم دے کر بغداد رخصت کیا اور اس کو بخیریت پہنچانے کے لیے پچاس سواروں کا دستہ ساتھ کر دیا۔ پھر صلاح الدین نے امیر زادے کو بُلا کر حکم دیا کہ امیر شمس الدین المقدم کو دمشق میں اُس کے سامنے پیش کیا جائے کیونکہ اُس نے المقدم کو بعلبک کا عامل مقرر کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔

امیر زادہ فرخ شاہ اُسی دن دمشق روانہ ہو گیا تاکہ صلاح الدین کے دمشق واپس آنے پر اُس کے استقبال کے انتظامات کرائے نیز امیر شمس الدین المقدم کو تلاش کر کے شاہ صلاح الدین کے سامنے پیش کرے۔ یہ اور بات ہے کہ اب دمشق جانے کی سب سے زیادہ خوشی اس وجہ سے تھی کہ وہاں اُسے ارمغانہ سے ملاقات کی پوری امید تھی۔

دمشق پہنچ کے امیر زادہ فرخ شاہ نے سب سے پہلے گورنر دمشق طغرگین (اسے بعض تواریخ میں طغتگین لکھا گیا ہے) سے ملاقات کی اور اطلاع دی۔

"سلطان سلطنت مصر و شام صلاح الدین یوسف ایوبی

دمشق تشریف لا رہے ہیں۔"

گورنر دمشق طغتگین نے فرخ شاہ کو حیران نظروں سے دیکھا۔

"آپ کی حیرانی بجا ہے چچا طغتگین۔" فرخ شاہ نے مسکرا کے کہا۔ "قبل اس کے کہ آپ مجھ سے اس بارے میں کوئی سوال کریں۔ میں خود اس اجمال کی تفصیل بیان کرتا ہوں۔ ٹھیک ہے ناں؟"

"فرخ شاہ۔ تم اب کچھ زیادہ ہی عقلمند ہوتے جا رہے ہو اور اس کے ساتھ شوخ بھی۔" گورنر دمشق نے بڑے پیار سے اپنے بھتیجے کو دیکھا۔

"حاکم دمشق نے درست فرمایا۔" فرخ شاہ کی طبیعت میں نہ جانے کیوں جولانی آگئی تھی۔ "میری شوخی ہو یا عقلمندی یہ سب اس ہستی کا فیض ہے جس کی خدمت پر میں مامور ہوں۔ اب آپ کی اطلاع کے لیے عرض کرتا ہوں کہ عباسی خلیفہ بغداد مستضی نے ہمارے آقا اور چچا جان امیر صلاح الدین کو "سلطان مصر و شام" کی سند عطا فرمائی ہے اور انہیں خلعت فاخرہ۔ گلوبند اور کلاہ سے بھی نوازا گیا ہے۔"

"سبحان اللہ کیا مسرت آمیز خبر سنائی ہے تم نے۔ دل باغ باغ ہو گیا۔" طغتگین واقعی بہت خوش ہوا۔ دراصل سلطان صلاح الدین کے تمام بھائی بھتیجے نہ صرف اس سے محبت کرتے تھے بلکہ اس کے وفادار بھی تھے۔ سلطان نے بھی اپنے ہر عزیز کی حوصلہ افزائی کی اور اس کی اہلیت کے مطابق عہدے عطا کیے تھے۔

فرخ شاہ نے پھر شوخی دکھائی۔ "یہ خبر تو نوید مسرت تھی اب ایک اہم خبر یہ ہے کہ سلطان صلاح الدین، خلیفہ بغداد کے عطا کیے ہوئے لقب کا جامعہ دمشق میں اعلان فرمائیں گے۔ وہیں ان کی دستار بندی ہو گی اور وہ خلعت فاخرہ زیب تن کریں گے۔ اس عظیم تقریب جس میں سلطنت دمشق و مصر کے تمام بڑے بڑے حاکم شریک ہوں گے، کا انتظام آپ کے سپرد کیا گیا ہے۔ سلطان نے اس سلسلے میں کسی شان و شوکت کے اظہار کا حکم تو نہیں دیا لیکن یہ تقریب سلطان کے شایان شان ہونی چاہیے۔"

"انشاء اللہ۔" حاکم دمشق نے بڑے استقلال سے کہا۔ "سلطان عالی مقام کی خدمت کا یہ پہلا موقع ہے۔ میں انتظامات میں کوئی دقیقہ نہ اٹھا رکھوں گا۔"

فرخ شاہ ابھی گورنر دمشق کے پاس تھا کہ حماۃ سے ایک تیز رفتار قاصد پہنچا اور اس نے گورنر دمشق کو جشن شادمانی کی اطلاع دی۔ قاصد بہت جلدی میں تھا۔ وہ اطلاع دے کر آگے چلا گیا۔ اس اطلاع کی وضاحت امیر زادہ فرخ شاہ نے کی۔

"سلطان نے یہ حکم بھی دیا ہے کہ خلیفہ بغداد کی سند اور خلعت عطا کرنے کے سلسلے میں پوری مملکت میں جشن شادمانی منایا جائے اور غربا اور مساکین میں کپڑے، نقد رقم اور کھانے کی اجناس تقسیم کی جائیں۔"

گورنر سے گفتگو کے بعد امیر زادہ فرخ نے اس طرف کا رخ کیا جدھر اس کا دل کھنچا چلا جا رہا تھا۔ فرخ شاہ کی یہ خوش قسمتی تھی کہ جب وہ ارمغانہ کی سہیلی حارثہ کے گھر پہنچا تو وہاں ارمغانہ اور اس کے والد شمس الدین المقدم موجود تھے۔ فرخ شاہ کا دل خوشی سے باغ باغ ہو گیا۔ اس نے امیر المقدم اور حارثہ کے والد کو ادب سے سلام کیا اور ادب سے بیٹھ گیا۔ فرخ شاہ کو وہاں بیٹھتے ہی اندازہ ہوا کہ گھر میں بے انتہا سنجیدگی طاری ہے۔ تمام چہرے چپ چپ اور گمبھیر سے ہیں۔

فرخ شاہ گفتگو کا آغاز کرنے کے بارے میں سوچ رہا تھا کہ شمس الدین المقدم نے خود ہی پہل کر دی۔ "امیر زادے آپ شاید مجھے امیر صلاح الدین کے پاس لے چلنے کے لیے آئے ہیں؟"

"جی ہاں۔ میں کسی حد تک اس سلسلے میں حاضر ہوا ہوں۔" فرخ شاہ نے مختصر سا جواب دیا۔ اس نے المقدم کی گفتگو کی تلخی اور ایک قسم کی بیزاری محسوس کر لی تھی۔ اس لیے وہ چاہتا تھا کہ وہ ان سے کوئی سوال نہ کرے بلکہ انہیں کھلنے دے۔

اور آخر المقدم خود ہی کھلنا شروع ہوئے۔

"امیر زادے۔ آپ میرے لیے کس قدر پریشان ہو رہے ہیں۔ آپ کی کوششوں سے مجھے معافی ملی اور آپ ہی کی کوشش سے شاید مجھے اپنی خدمت کا کچھ صلہ بھی مل جائے، لیکن آپ کی اس تمام تگ و دو کا میں شکریہ تو ادا کر سکتا ہوں۔ اس کے سوا میرے پاس آپ کے لیے کچھ اور نہیں۔"

شمس الدین المقدم نے ٹھہر ٹھہر کے الفاظ ادا کیے اور فرخ شاہ اس کے الفاظ کی تلخی کو محسوس کرتا اور دل ہی دل میں کڑھتا رہا۔ المقدم خاموش ہوئے تو فرخ شاہ نے کہا۔ "بزرگ و محترم امیر۔ میں معافی کے ساتھ آپ سے اختلاف کی جرأت کر رہا ہوں۔ بصد ادب عرض ہے کہ آپ کی معافی یا آپ کو صلہ دیے جانے کے سلسلے میں میری کوشش کو ذرہ برابر دخل نہیں کیونکہ کوئی ایسی شخصیت نہیں جو سلطان صلاح الدین کے کسی فیصلے پر اثر انداز ہو سکے۔ سلطان کا ہر فیصلہ اپنا ہوتا ہے خواہ وہ معاملہ انعام کا ہو یا تعزیر کا۔ براہ کرم آپ اس خیال کو ذہن سے نکال

دیجیے کہ میں نے آپ کے لیے کوئی کوشش کی ہے اس لیے میں آپ سے کسی صلے کی خواہش بھی نہیں رکھتا۔"

فرخ شاہ کے لہجے میں بھی ذرا سی تلخی آگئی تھی۔ المقدم نے جواب دیا۔ "امیرزادے۔ میں نے صرف اپنا خیال ظاہر کیا تھا۔ اگر اس سے آپ کی دل آزاری ہوئی تو میں معذرت چاہتا ہوں۔ جہاں تک امیر صلاح الدین کا۔۔۔"

"قطع کلام کی معافی چاہتا ہوں امیر محترم۔" فرخ شاہ نے اُس کی بات کاٹ دی۔ "آپ کو شاید علم نہیں کہ حماۃ کی جنگ میں سلطان صلاح الدین نے موصل اور حلب کے مشترکہ لشکر کو شکستِ فاش سے دوچار کیا تھا اور شکست خوردہ لشکر کا تعاقب حلب تک کیا گیا تھا۔ پھر حلب نے خود مصالحت کی کوشش کی اور اُس معاہدے کے نتیجے میں حاکم حلب الملک الصالح پسر سلطان نورالدین زنگی نے امیر صلاح الدین بن یوسف کو ملکِ مصر اور ملکِ شام کا بادشاہ تسلیم کر لیا۔ اس طرح امیر صلاح الدین اب شاہ مصر و شام ہو چکے ہیں۔ اس لیے انہیں محض "امیر" کہنا اُن کی توہین کے مترادف ہے۔ پھر ایسی صورت میں جب کہ اُنہیں خلیفہ بغداد نے سلطان مصر و شام کا لقب عطا کیا ہے۔"

"اچھا۔ یہ کب ہوا؟" المقدم نے گھبرا کے پوچھا۔ ارمغانہ، حارثہ و تیر کو بھی اس انکشاف پر حیرانی تھی۔

"یہ نوید مسرت اس ہفتے میں موصول ہوئی ہے۔" فرخ شاہ نے جواب دیا۔ "اس سلسلے میں بہت جلد ایک عظیم تقریب سلطانی اور کلاہ بندی ہونے والی ہے۔ اس کی اطلاع گورنر دمشق تک پہنچ چکی ہے اور اس کا اعلان آج ہی متوقع ہے۔"

فرخ شاہ کی گفتگو یہاں تک پہنچی تھی کہ ڈھنڈورچی کے ڈھنڈورہ پیٹنے کی آواز سُنائی دی۔

"سنیے۔ وہ اعلان ہو رہا ہے جس کا میں نے ابھی ذکر کیا ہے۔" فرخ شاہ نے اُنہیں مخاطب کیا۔

شمس الدین المقدم بظاہر مضمحل نظر آ رہا تھا مگر ڈھنڈورچی کی آواز سُن کر اُٹھ کھڑا ہوا۔ "چلو۔ ہم سب باہر چل کے سنتے ہیں کہ کیا اعلان ہو رہا ہے؟"

شمس الدین المقدم کو شاید فرخ شاہ کی بات کا اعتبار نہ آیا تھا۔ اس لیے وہ اپنے کانوں سے اعلان سُننا چاہتا تھا۔۔۔ شمس الدین المقدم، حارثہ کے والد اور امیرزادہ فرخ شاہ باہر چلے گئے اور حارثہ اور ارمغانہ باہر کے دروازے سے لگ کر کھڑی ہو گئیں۔

اعلانچی نے اعلان کیا۔ "مُلک خدا کا، حکومت سلطان صلاح الدین الیوبی کی۔ اعلان کیا جاتا ہے کہ خلیفہ بغداد المستضئ بامراللہ نے ملک مصر و شام کے بادشاہ کو "سلطان" کا لقب اختیار کرنے کی سند عطا کی ہے۔ اس سلسلے میں عوام و خواص کو ایک ہفتہ تک جشنِ شادمانی منانے کا حکم دیا جاتا ہے۔ صاحبِ ثروت لوگوں سے امید ہے کہ وہ غربا و مساکین میں نقد اور جنس کی صورت میں خیرات تقسیم کر کے اُنہیں بھی اس خوشی میں شریک کریں گے۔"

دوسرا اعلان یہ ہے کہ سلطان عالی مقام صلاح الدین یوسف الیوبی بہت جلد دمشق میں نزول فرمائیں گے اور جامع دمشق میں ان کی کلاہ بندی ہو گی اور وہ خلیفہ بغداد کی عطا کی ہوئی خلعت فاخرہ کو زیب تن فرمائیں گے۔ اس تقریب میں ہر خاص و عام کو شرکت کی دعوت دی جاتی ہے۔"

اعلان ختم ہوا تو شمس الدین المقدم نے سوکھا مُنہ بنا کر کہا۔ "اچھا تو امیر صلاح الدین اب سلطان صلاح الدین یوسف الیوبی کے نام سے پکارے جائیں گے؟"

المقدم کے کہنے کا انداز سوالیہ تھا۔ جیسے اُسے اب بھی اعتبار نہ آیا ہو۔

امیرزادہ فرخ شاہ نے ایسے بے اعتباری کے عالم میں شمس الدین المقدم پر ایک اور انکشاف کیا۔ "بزرگ امیر۔ اس اعلان کے بعد میں سلطان صلاح الدین کا حکم آپ تک پہنچا تا ہوں۔ سلطان نے میرے ذریعے آپ کو حکم دیا ہے کہ آپ اور آپ کی بیٹی ارمغانہ بنت شمس الدین المقدم جامع دمشق کی اُس تقریب میں شریک ہوں جو سلطان کی کلاہ بندی اور خلعتِ فاخرہ کو پہننے کے سلسلے میں برپا ہونے والی ہے۔ اسی تقریب میں امیر شمس الدین المقدم کو بعلبک کی حکمرانی کا پروانہ عطا کیا جائے گا اور ارمغانہ کو سلطان معظم اپنے دستِ مبارک سے انعام عطا فرمائیں گے۔ فرمایئے بزرگ محترم۔ اب آپ کا کیا خیال ہے؟"

"اس کا مطلب ہے کہ امیرزادے آپ کی تمام کوششیں بار آور ہوئیں۔" امیر المقدم نے اُس کھُردرے لہجے میں کہا۔ "رہا میرا مسئلہ تو میں سلطان کے حکم کی تعمیل کے لیے تقریب میں ضرور شرکت کروں گا۔ اگر ارمغانہ کی اُس وقت تک رُخصتی نہ

ہوئی تو یہ بھی میرے ساتھ آئے گی۔"

امیر زادے کے پیروں کے نیچے سے زمین نکل گئی۔ اُسے آج اندازہ ہوا کہ امیر شمس الدین المقدم کس قدر کینہ اور سفاک ہے۔ اس کا جی چاہا کہ وہ سلطان صلاح الدین کو کم از کم اس بات سے ضرور آگاہ کر دے۔ امیر شمس الدین کے دل میں اس قدر کدورت بھری ہے کہ وہ کسی وقت دغا بازی کر سکتا ہے۔

امیر زادہ کے دل میں اس طرح کے خیالات پیدا ہو رہے تھے کہ المقدم نے اُس پر ایک اور ظلم کیا۔ اُس نے بڑی سرد مہری سے کہا۔ "امیر زادے۔ آپ نے سلطان کا حکم مجھ تک پہنچا دیا جس کا جواب میں آپ کو دے چکا ہوں۔ اب اگر کوئی مزید حکم بھیجیں تو آپ براہِ کرم اُسے بیٹی حارثہ کو پہنچا دیجیے۔ میں اور ارمغانہ آج اس گھر سے چلے جائیں گے۔"

امیر المقدم نے امیر زادہ کا راستہ ہی بند کر دیا۔ اُس کی اس بات سے صاف ظاہر ہو گیا کہ وہ نہیں چاہتا کہ امیر زادے اور ارمغانہ کی ملاقات ہو اور یہ کہ اُس نے ارمغانہ کی کسی دُوسری جگہ شادی طے کر دی ہے۔ اس سلسلے میں ارمغانہ کا کیا ردِ عمل تھا اس کا پتا امیر زادے کو مشکل ہی سے چل سکتا تھا کیونکہ امیر المقدم نے ایک طرح سے اُسے منع کر دیا تھا کہ وہ حارثہ کے گھر مت جائے۔

امیر زادے فرخ شاہ نے اب وہاں ٹھہرنا مناسب نہ خیال کیا اور انہیں سلام کر کے جدا ہو گیا۔ آج جس تلخ تجربے سے اُس کا سابقہ پڑا تھا۔ اُس نے اس کا دل توڑ کے رکھ دیا تھا۔ آیا تو وہ بہت خوش خوش تھا لیکن واپسی پر اُسے اپنے قدم من من بھر کے محسوس ہو رہے تھے۔ امیر زادہ اپنے چچا طغتگین حاکم دمشق کے ساتھ ٹھہرنا چاہتا تھا لیکن اُس کی حالت ایسی غیر ہو رہی تھی کہ وہ سیدھا دمشق کے قلعے میں پہنچا اور چچا سے سر درد کا بہانہ کر کے ایک کمرے میں جا کے پڑ رہا۔

اُدھر شہر اور قلعے میں عید جیسا سماں تھا۔ جشنِ شادمانی کا اعلان ہو چکا تھا اور لوگوں نے اس جشن میں بھرپور حصہ لینا شروع کر دیا تھا۔ کہیں ڈھول تاشے بج رہے تھے تو کہیں موسیقی کی محفلیں سجی تھیں۔ حلوائیوں کی دُکان پر تازہ مٹھائیاں تیار ہو رہی تھیں۔ بازاروں کی رونق بڑھ گئی تھی۔ بچے گلیوں اور بازاروں میں رنگین جھنڈیاں لیے گھوم رہے تھے۔ لوگ ٹولیوں میں گھوم رہے تھے اور سلطان صلاح الدین ایوبی کے نعرے لگا رہے تھے۔

امیر زادے فرخ شاہ کی شام کو کچھ طبیعت ٹھہری تو وہ فصیلِ قلعہ پر چڑھ گیا۔ ابھی مغرب کی اذان نہ ہوئی تھی لیکن گھر گھر روشنی ہو رہی تھی اور چراغاں کا سماں پیدا ہو گیا تھا۔ امیر زادہ آج بہت افسردہ تھا۔ دل بہلانے کے لیے وہ چچا کے دفتر میں چلا گیا لیکن معلوم ہوا کہ گورنر طغتگین کو دو گھنٹے پہلے انتظامات کے سلسلے میں شہر گئے ہوئے ہیں اور اب تک قلعہ واپس نہیں آئے۔ شہر کے نام پر اس کے دل میں ہوک سی اٹھی۔ اُس نے چاہا کہ حارثہ کے گھر جا کر ارمغانہ کے بارے میں معلومات حاصل کرے مگر اُس نے اس ارادے کو فوری رد کر دیا۔ اس لیے کہ وہاں امیر شمس الدین المقدم سے بھی ملاقات ہو سکتی تھی جس نے اُسے وہاں آنے سے منع کر دیا تھا۔

شمس الدین المقدم کی ذہنی کیفیت کے بارے میں وہ جس قدر غور کرتا اسی قدر اُلجھتا چلا جاتا۔ جس وقت صلاح الدین قاہرہ میں تھا اسی وقت یہ امیر دربارِ دمشق میں امراء کی اُس جماعت میں شامل تھا جو صلاح الدین کی ہمدرد تھی۔ پھر جب سلطان نورالدین زنگی کے انتقال پر صلاح الدین کو دمشق آ کے کاروبارِ سلطنت چلانے کے لیے دعوت دی گئی تو وہ اس میں بھی پیش پیش تھا لیکن جب صلاح الدین دمشق پہنچ گیا تو خدا معلوم اُسے کیا ہوا کہ وہ باغی ہو گیا اور درپردہ امیر زادہ فرخ شاہ کو قتل کرا کے دمشق پر قبضہ کا پروگرام بنا بیٹھا۔

امیر زادہ فرخ شاہ کے دل میں ارمغانہ کے لیے جو جگہ پیدا ہوئی تھی پہلے وہ محبت نہ تھی بلکہ ارمغانہ کا وہ جرات مندانہ قدم تھا جس کے ذریعے اُس نے امیر زادہ فرخ شاہ کو موت کے گڑھے میں جانے سے بچا لیا تھا۔ یہ بھی عجیب بات تھی کہ باپ نے فرخ شاہ کو ارمغانہ کے ذریعے قتل کرانے کی کوشش کی اور ارمغانہ باپ کا ساتھ دینے کی بجائے فرخ شاہ کو بچانے پر تیار ہوئی اور دانیال کو قتل کر کے فرخ شاہ کو بچا لیا۔

ارمغانہ کا یہ اقدام تھا جس نے امیر المقدم کو ارمغانہ اور فرخ شاہ دونوں کا مخالف بنا دیا پھر سلطان صلاح الدین نے فرخ شاہ ہی کو المقدم کی گرفتاری پر مامور کیا۔ المقدم رُوپوش ہو گیا تھا لیکن اُسے معلوم ہو گیا کہ اس کی گرفتاری پر اس شخص کو مامور کیا گیا ہے جسے اُس کی بیٹی ارمغانہ نے بچایا تھا اس لیے المقدم کی فرخ شاہ کے خلاف نفرت میں اور اضافہ ہو گیا۔ اُس کے اس نئے اقدام سے کہ وہ ارمغانہ کی کسی دُوسری جگہ شادی کر رہا ہے۔ یہ ظاہر ہوتا تھا کہ وہ صرف فرخ شاہ سے نہیں بلکہ اپنی بیٹی سے بھی بدلے رہا تھا حالانکہ اب حالات تبدیل ہو گئے تھے اور سلطان، اس

مخالف امیر کو بعلبک کی حکمرانی بخش رہا تھا۔

کہتے ہیں کہ کسی کی فطرت اور طینت نہیں بدلتی۔ دوسرے ہی ہفتے سلطان صلاح الدین کی جامعہ دمشق میں بڑی دھوم دھام سے کلاہ پوشی ہوئی۔ مصر اور شام کا کوئی ایسا امیر نہ تھا جس نے اس تقریب میں شرکت نہ کی ہو۔ معززین شہر اور قلعہ نے بھی تقریب میں بھرپور حصہ لیا۔ امیر زادہ فرخ اگرچہ اس تقریب میں بحیثیت ایک کارکن کے پیش پیش تھا لیکن اُس کا دل امیر المقدم کی باتوں سے بہت دکھا تھا۔

پھر اس وقت تو وہ اور زیادہ افسردہ ہُوا جب اُس نے اس تقریب میں شمس الدین المقدم کو تنہا شریک ہوتے دیکھا۔ شمس الدین المقدم کو وہاں بھی امیر زادے فرخ شاہ کا سہارا لینا پڑا اس لیے کہ گورنر کے دُوسرے کارکن شمس الدین المقدم کو نہیں پہچانتے تھے اور وہ امیر جو اس محفل میں شریک ہوئے تھے وہ المقدم کی حرکتوں کی وجہ سے اُس سے کترا کے نکل جاتے تھے اگر امیر زادہ فرخ شاہ اُس کی مدد نہ کرتا تو وہ نہ تو سلطان تک پہنچ سکتا اور نہ بعلبک کی گورنری حاصل کر سکتا۔

شمس الدین المقدم کو اگرچہ معاف کیا جا چکا تھا اور اس کا علم تمام اُمرائے نوریہ کو ہو چکا تھا لیکن جب امیر المقدم جامعہ دمشق پہنچا تو وہ ہر شخص کے لیے اجنبی تھا۔ پہچاننے والوں نے بھی اُسے پہچاننے کی کوشش نہ کی۔ وہ دیر تک اِدھر اُدھر جھجکتا رہا۔ کسی نے اُس سے سیدھے مُنہ بات نہ کی۔ وہ تو اتفاق تھا کہ امیر زادہ فرخ شاہ کی اُس پر نظر پڑ گئی۔ المقدم کو اکیلا دیکھ کر اُسے اگرچہ افسوس ہُوا تھا اور شاید غصہ بھی آیا تھا لیکن اُس نے شرافت کا دامن نہ چھوڑا۔ پھر ایک کارکن کی حیثیت سے المقدم کا استقبال اُس کا فرض تھا۔

فرخ شاہ تیز قدموں سے اُس کے پاس پہنچا۔

"خوش آمدید امیر شمس الدین المقدم" فرخ شاہ نے پُرجوش انداز میں اُس کا استقبال کیا۔

"ہاں امیر زادے۔ میں سلطان صلاح الدین کے حکم سے کیسے سرتابی کر سکتا تھا" المقدم نے رُک رُک کر کہا۔ "پھر آپ نے بھی تو تاکید کی تھی مجھے"

امیر زادہ فرخ شاہ اُس کے کھُردرے اندازِ گفتگو سے بہت چڑا لیکن اُس نے ضبط سے کام لیا۔

"تشریف لے چلیے امیر محترم" فرخ شاہ نے مہذب طریقے سے کہا۔ "میں آپ کو صحیح مقام پر پہنچا دوں گا"

فرخ شاہ کی اس پیش کش پر بھی اُس نے کسی خوشی کا اظہار نہ کیا۔

"امیر زادے۔ آپ زیادہ تکلیف نہ فرمایے۔" المقدم کا وہی کھُردرا انداز تھا۔ "آپ بس مجھے جلدی فارغ کر دیجیے"

فرخ شاہ نے اُسے حیران نظروں سے دیکھا۔ اُس نے پوچھا۔ "میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا امیر محترم۔ آپ تقریب میں تشریف لائے ہیں کیا اندر تشریف نہیں لے چلیں گے؟"

"کیا بعلبک کی سندِ حکمرانی مجھے آپ یہیں پہنچا دیجیے تو آپ کا احسان ہو گا" امیر المقدم نے بڑی بیگانگی سے کہا۔

"امیر محترم۔ آپ کیا فرما رہے ہیں، سندِ حکمرانی آپ کو سلطان مرحمت فرمائیں گے۔ میں اُس میں کس طرح دخل دے سکتا ہوں؟" فرخ شاہ اُس کے انداز سے اُلجھنے لگا۔

"خیر کوئی بات نہیں۔ میں اُس وقت تک ٹھہرا رہوں گا۔" المقدم نے بے دلی سے کہا۔

فرخ شاہ اُسے اپنے ساتھ لے گیا اور اُمرائے نوریہ کے ساتھ کھڑا رہا۔ اُس نے محسوس کیا کہ اُمرائے نوریہ میں سے کسی نے بھی اُس سے صاحب سلامت نہیں کی۔ امراء دراصل المقدم کی تلون مزاجی سے واقف تھے، اور تلون مزاج انسان کسی کا وفادار نہیں رہ سکتا۔ بعض امیروں نے تو اُس کی طرف سے مُنہ پھیر لیا تھا۔

مگر صلاح الدین کو اپنی بات کا کس قدر خیال تھا؛ وہ جامعہ دمشق آیا تو اُمراء نے اُسے باری باری سلام پیش کیا۔ جب المقدم کی باری آئی تو سلطان نے فرمایا۔

"امیر المقدم۔ ہم نے آپ کو بعلبک عطا کیا۔ اس وقت سند دینے کا موقع نہیں۔ کل فرمان آپ کے گھر پہنچ جائے گا" پھر جیسے سلطان کو کچھ یاد آ گیا۔ وہ بولا۔ "تمہاری بچی کہاں ہے؟"

"بدقسمتی سے وہ بیمار ہو گئی ہے سلطان المعظم" امیر المقدم نے جواب دیا اور فرخ شاہ کو یوں محسوس ہُوا جیسے وہ صاف جھوٹ بول رہا تھا۔

سلطان، فرخ شاہ سے مخاطب ہُوا۔ "امیر زادے۔ تم سندِ حکمرانی اور ان کی بچی کا انعام اِن کے گھر پہنچا دینا۔"

فرخ شاہ نے اطاعت میں سر جھکا دیا۔

سلطان صلاح الدین اور فرخ شاہ تقریب کے ہنگاموں میں لگ گئے۔ قاضی شہر اور جامعہ دمشق کے پیش امام نے سلطان کو خلیفہ مستضئ کی بھیجی ہوئی خلعت فاخرہ پہنائی۔ گلو بند زیب گلو کیا اور کلاہ بندی کی رسم ادا کی گئی۔ عوام کو اگرچہ اس تقریب میں

دعو نہیں کیا گیا تھا لیکن وہ اپنے محبوب سلطان کو ایک نظر دیکھنے کے لیے جامعہ دمشق کے گرد دور دور تک جمع ہو گئے تھے سلطان نے اُنہیں مایوس نہیں کیا اور رسوم کی ادائیگی کے بعد وہ جامعہ دمشق کے اُس اونچے چبوترے پر کھڑا ہو گیا جہاں سے مؤذن اذان دیتا تھا۔

عوام نے اپنے نئے سلطان کو دیکھا تو نعرہ ہائے مسرت بلند کیے۔ اُنہیں یوں محسوس ہوا جیسے خدا نے اُنہیں صلاح الدین کی صورت میں پھر سلطان نورالدین دے دیا ہے۔ عوام کا یہ احساس ایک ایسی حقیقت بنا جسے دُنیا نے تسلیم کیا اور اپنے اور پرائے سب ہی یہ پکار اُٹھے کہ جس پودے کی نورالدین نے آبیاری کی تھی وہ مستقبل میں ایک تناور درخت کی صورت میں بلند ہوا۔

شادیوں میں، عام طور سے دُلھا کے ساتھ شہ بالا ہوتا ہے تو اس تقریب میں اگر سلطان صلاح الدین کو دُلہا تصور کیا جائے تو شہ بالا کا رُوپ فرخ شاہ نے دھارا تھا۔ امیر زادہ فرخ شاہ کو بھی خلیفۂ بغداد نے خلعت عطا کی تھی اور وہ اس تقریب میں خلعت زیب تن کر کے آئے تھے پھر چونکہ وہ اور گورنر دمشق طغتگین اس تقریب کے کرتا دھرتا تھے اس لیے فرخ شاہ ایک شہ بالا کے انداز میں سلطان صلاح الدین کے گرد گھوم پھر رہا تھا۔

خدا خدا کر کے یہ عظیم تقریب بخیر و خوبی انجام پذیر ہوئی۔

دُوسری صبح سلطان نے دربارِ خاص منعقد کیا۔ اس دربار میں سلطان نے اپنے اُمراء اور بعض فوجی سرداروں کو اُن کی خدمات کے صلے میں انعام و اکرام، مرتبہ اور خطاب اور جاگیروں سے نوازا۔ اسی دربار میں امیر شمس الدین المقدم کو حاکمِ بعلبک بنائے جانے کا اعلان ہوا۔ امیر المقدم چونکہ دربار میں موجود نہ تھا اس لیے اس کی سندِ حکمرانی امیر زادہ فرخ شاہ نے وصول کی۔

پھر جب امیر زادہ فرخ شاہ، امیر شمس الدین المقدم کی بیٹی کا نقد انعام اور المقدم کی سند لے کر حارثہ کے گھر پہنچا تو گھر پر سوائے المقدم کے اور کوئی موجود نہ تھا۔ گھر کے خالی ہونے کی وجہ نہ تو امیر زادے نے دریافت کی اور نہ شمس الدین المقدم نے یہ ضرورت محسوس کی، وہ اس کی وضاحت کرے۔ اس طرح فرخ شاہ کو یہ علم ہی نہیں ہو سکا کہ ارمغانہ کہاں اور کس حالت میں ہے!

کئی دن کے بعد سلطان صلاح الدین نے فرخ شاہ کو بتایا کہ امیر شمس الدین المقدم اپنا نیا عہدہ سنبھالنے کے لیے بعلبک روانہ ہو چکا ہے اور یہ کہ امیر شمس الدین اور اس کی بیٹی بعلبک کو روانگی سے پہلے سلطان کی سلامی کو حاضر ہوئے تھے ان حالات میں امیر زادہ فرخ شاہ نے یہی مناسب سمجھا کہ فی الحال ارمغانہ کا خیال چھوڑ کے اپنی ذمے داریوں کی ادائیگی میں خلوصِ دل سے لگ جائے اور نصیب سے بہتر حالات پیدا ہونے کی اُمید رکھے۔

قرونِ حماۃ پر ۱۳ اپریل ۱۱۷۵ھ کو امیر صلاح الدین نے موصل اور حلب کی متحدہ فوجوں کو شکست دی اور شاہ حلب ملک الصالح نے صلاح الدین سے صلح کر کے اُسے دمشق اور شام کے تمام مقبوضہ علاقوں کا خود مختار بادشاہ تسلیم کر لیا پھر ۱۱ مئی ۱۱۷۵ء کو خلیفۂ بغداد المستضئی کی طرف سے اُسے مصر و شام کے سلطان ہونے کی سند موصول ہوئی جس کا جشن سلطان نے جامعہ دمشق میں منایا۔ اس کے بعد اس سال کوئی اور واقعہ پیش نہ آیا سوائے اس کے کہ الملک صالح کا نام شام و مصر کے خطبا اور سکے سے خارج کر دیا گیا اور اُن دونوں ملکوں کی تمام مساجد میں سلطان صلاح الدین ایوبی کے لیے خود مختار حکمراں کی حیثیت سے خصوصی دعائیں مانگی گئیں۔

جشن سلطانی منانے کے دن ہی سے شام اور مصر کی مساجد میں الصالح کے بجائے سلطان صلاح الدین کا نام خطبے میں شامل کیا گیا۔ جہاں تک سکوں کا تعلق ہے اُس سلسلے میں یہ وضاحت ضروری ہے کہ صلاح الدین کے مصر سے دمشق آنے کے بعد کچھ عرصے تک سکہ "الصالح" کے نام چلتا رہا۔ پھر سکے میں الصالح کے نام کے ساتھ صلاح الدین کا نام بھی شامل ہو گیا۔ یہ سکے غالباً صلاح الدین کے دمشق پر قبضے کے بعد دمشق کی ٹکسال سے جاری ہوئے تھے۔ ان دونوں کے ناموں کے سکے آج بھی برٹش میوزیم میں موجود ہیں۔ پھر ملک الصالح اور صلاح الدین کے معاہدے کے بعد جس میں صلاح الدین کو مصر اور شام کے تمام مقبوضہ علاقوں کا بادشاہ تسلیم کیا گیا تھا، مصر کی ٹکسال سے جو سکے جاری ہوئے اُن پر "الملک الناصر یوسف بن ایوب" درج کیا گیا

عام خیال یہ تھا کہ قرونِ حماۃ پر موصل اور حلب کی مشترکہ فوجوں کو جو شکست ہوئی اُس کے بعد زنگی خاندان اور ایوبی خاندان کی جنگوں کا خاتمہ ہو گیا لیکن ایسا نہیں ہوا۔ سلطان صلاح الدین اگرچہ سال کے باقی دنوں میں بظاہر ملکی انتظام میں مصروف رہا مگر درپردہ وہ نئی فوج بھرتی کرتا رہا تھا۔ اُس کے ساتھ اُس نے مصر سے بھی آزمودہ کار فوجی دستوں کو منگوا کر دمشق کے لشکر میں شامل کر دیا تھا دوسری طرف زنگی خاندان کا شاہ الصالح تو خاموش ہو گیا

تھا لیکن اُس کا سب سے بڑا ہمدرد والی موصل سیف الدین غازی اپنی شکست کے زخم چاٹ رہا تھا۔ قرون حماۃ کی جنگ میں وہ بذاتِ خود شریک نہیں ہوا تھا بلکہ موصل کے لشکر کی سپہ سالاری اُس کے بھائی عزالدین زلفندار نے کی تھی اور اُس کی ماتحتی میں حلب اور موصل کی مشترکہ فوجوں نے قرونِ حماۃ پر شکست کھائی تھی۔ اپنے بھائی کی اس شکست پر سیف الدین نے غم کے آنسو بہائے مگر صلاح الدین کو ملک شام کا سلطان تسلیم نہ کیا اور بدلہ لینے کی کوششیں کرتا رہا۔

والی موصل سیف الدین نے دیارِ بکر اور الجزیرہ جیسی چھوٹی چھوٹی جاگیروں سے نئی فوج بھرتی کی۔ اس طرح اُس کے پاس چھ ہزار کا لشکر ہو گیا۔ اُس کے خیال میں یہ لشکر ابھی ناکافی تھا۔ اِس لیے وہ مزید لشکر حاصل کرنے کے لیے حلب پہنچا۔ حلب میں سیف الدین کا بھائی عزالدین زلفندار پہلے سے موجود تھا۔ اس کے علاوہ امیر سعدالدین گمشتگین بھی حلب ہی میں تھا۔ زلفندار اور گمشتگین دونوں نے اُس معاہدے کی مخالفت کی تھی جس میں الصالح نے صلاح الدین کو مصر اور شام کے مقبوضات کا بادشاہ تسلیم کر لیا تھا۔

سیف الدین کے اچانک معہ چھ ہزار کا لشکر لے کر حلب پہنچ جانے سے الصالح پریشان ہو گیا۔ اُس نے صلاح الدین کے ساتھ معاہدے پر دستخط کر دیے تھے۔ صلاح الدین نے اُسے زبانی طور پہ یہ اطمینان دلا دیا تھا کہ یہ اس کا وفادار رہے گا۔ اس کے ساتھ ہی صلاح الدین نے یہ بھی کہہ دیا تھا کہ اس وفاداری اور اطاعت گزاری کے باوجود دمشق کے قریب کسی قسم کی شورش برداشت نہیں کرے گا۔ چنانچہ اس مسئلے پر الصالح اور سیف الدین میں کچھ نرم گرمی بھی ہوئی تھی۔

سیف الدین نے کہا تھا: ”تم ابھی بچے ہو۔ صلاح الدین کی چالوں کو نہیں سمجھ سکتے جس نے دمشق پہ قبضہ کر لیا وہ تمہارا وفادار کس طرح رہ سکتا ہے؟“

الملک الصالح، سیف الدین سے چھوٹا تھا اور اُسے ”بڑے بھائی“ کہہ کر مخاطب کرتا تھا چنانچہ ملک الصالح نے جواب دیا۔ ”معاہدے کو ابھی سال بھی نہیں گزرا۔ ہم کس طرح اس معاہدے کو توڑ سکتے ہیں؟“

سیف الدین بگڑ گیا۔ ”ملک الصالح اُس وقت کو یاد کرو جب تم پہ وقت پڑا تھا اور تم نے مجھ سے مدد طلب کی تھی۔ میں تمہیں صاف جواب دے کے صلاح الدین سے صلح کر سکتا تھا لیکن میں نے ایسا نہیں کیا اور ایک معقول فوج اپنے بھائی کی سالاری میں تمہاری مدد کو روانہ کر دی۔ کیا اُس کا یہی مطلب ہے کہ تم مجھ سے انکار کر دو؟“

”مگر بڑے بھائی!“ الصالح نے پھر اپنی بات دہرائی۔ ”صلاح الدین نے ہمیں وفاداری اور اطاعت گزاری کا یقین دلایا ہے۔ پھر ہم اُس کے خلاف کیسے جنگ کر سکتے ہیں؟“

”ملک الصالح!“ سیف الدین نے بڑی حقارت سے کہا۔ ”تمہاری حیثیت ہی کیا ہے؟ تم حلب کے ایک کٹھ پتلی بادشاہ ہو۔ وہ بھی میری وجہ سے۔ اگر تمہارے امراء کو میرا خوف نہ ہو تو وہ تمہیں تخت سے اتار کر اپنی بادشاہی کا اعلان کر دیں۔“

ملک الصالح کو والی موصل کی یہ بات بہت ناگوار گزری مگر وہ کچھ نہ کر سکا۔ اُس کی حیثیت واقعی نہ ہونے کے برابر تھی پس وہ اپنی ذلت کو پی گیا اور اُس نے بات گمشتگین پہ ڈال دی۔ اُس نے سیف الدین کو جواب دیا۔

”بڑے بھائی۔ آپ نے جو فرمایا میں اُسے درست تسلیم کرتا ہوں لیکن میرے انکار یا اقرار سے حلب کے لشکر پہ کوئی اثر نہ پڑے گا۔ دراصل فوج پوری طرح امیر سعدالدین گمشتگین کے کہنے میں ہے اگر امیر اجازت دیتے ہیں تو مجھے کوئی انکار نہیں۔“

امیر گمشتگین تو صلاح الدین سے اُدھار کھائے بیٹھا تھا۔ وہ تو صلاح الدین کی شکست یا اُن کی موت کے دن میں بھی خواب دیکھا کرتا تھا۔ سیف الدین کے حلب لشکر لے کے آنے سے اُسے امید بندھی تھی کہ شاید اب صلاح الدین کو شکست ہو جائے۔ اُس نے سیف الدین کو اپنے پورے تعاون کا یقین دلا دیا تھا۔ اس یقین کے تحت ہی سیف الدین نے ملک الصالح کو کٹھ پتلی بادشاہ کہا تھا۔

ملک الصالح نے بات گمشتگین پہ ڈالی تو سیف الدین نے ہنس کے کہا: ”ملک الصالح۔ شکر کرو کہ تمہارا وزیر امیر گمشتگین تم سے زیادہ عقلمند ہے۔ اس وقت صلاح الدین کی بڑھتی ہوئی طاقت پر ایک کاری ضرب لگا کر اُسے ہمیشہ کے لیے ختم کیا جا سکتا ہے۔ وہ ابھی صرف نام کا سلطان بنا ہے اگر واقعی ہم نے اُسے سلطان بننے کا موقع دیا تو پھر موصل اور حلب بھی اُس کی طاقت کے سامنے بند نہیں باندھ سکیں گے۔ کیوں امیر گمشتگین تمہارا کیا خیال ہے؟“

امیر گمشتگین اور عزالدین زلفندار دونوں اس گفتگو میں شریک تھے۔

امیر گمشتگین نے فوراً جواب دیا۔ ”والی موصل کا خیال

بالکل درست ہے۔ ہمیں چاہیے کہ صلاح الدین کی طاقت کے اُس پودے کو جس نے ابھی زمین سے سر نکالنا شروع کیا ہے فوراً جڑ سے اکھاڑ کے پھینک دیں۔"

"ملک الصالح اب فیصلہ ہوگیا۔" سیف الدین نے بات مختصر کرتے ہوئے کہا۔ "تمہارا امیر میری طرفداری کر رہا ہے۔ اس لیے حلب کا لشکر امیر گمشتگین کی سرداری میں میرے ساتھ جائے گا اور جب ہم کامیاب و کامراں لوٹیں گے تو تم حلب کی سرحد پر ہمارا استقبال کرنا۔"

اُدھر دمشق کے قلعے میں ایک شب شام کے مشرقی علاقے سے آنے والے ایک جاسوس نے سلطان صلاح الدین سے فوری طور پر ملنے کی درخواست کی۔ سلطان پر حشیشین کا ایک فدائی حملہ کر چکا تھا۔ اس لیے سلطان نے رات کے وقت ملاقات پر پابندی عائد کر دی تھی۔ شاہی محلات کے ناظم نے جاسوس کو ملنے سے روک دیا۔ اور صبح تک انتظار کرنے کا حکم دیا۔ جاسوس اکڑ گیا اور اُس نے غصے سے کہا۔ "ناظم محترم۔ اگر آپ نے مجھے سلطان تک پہنچنے سے روکا تو میں محل کی دیواریں پھاند کر اُن تک پہنچ جاؤں گا۔ اس لیے کہ میں سلطان کو جو اطلاعات پہنچانا چاہتا ہوں اُن کا تعلق سلطنتِ دمشق کی سلامتی سے ہے اور میں اس کے لیے اپنی جان تک دے سکتا ہوں۔"

بے چارہ ناظم پریشان ہوگیا۔ جاسوس کو باہر ہی چھوڑ کے وہ سلطان کو اطلاع دینے پہنچا۔

"سلطانِ معظم۔ ایک جاسوس شام کے مشرقی علاقے سے آیا ہے اور حضورِ عالی میں فوراً پیش ہونا چاہتا ہے۔ میں نے اُسے صبح تک انتظار کرنے کو کہا تو وہ بھڑک اٹھا اور بولا کہ وہ جو اطلاع سلطان تک پہنچانا چاہتا ہے اُس کا تعلق سلطنتِ دمشق کی سلامتی سے ہے اور اگر اُسے اندر جانے کی اجازت نہیں دی گئی تو وہ اپنی جان کی پروا نہ کرتے ہوئے ہر صورت میں آپ تک پہنچے گا۔"

سلطان صلاح الدین کو یہاں تک اطلاع مل چکی تھی کہ والیٔ موصل دیارِ بکر اور الجزیرہ سے فوج بھرتی کر رہا ہے مگر اُس کے آئندہ کے ارادے کا کوئی علم نہیں تھا۔ اس جاسوس کے آنے سے سلطان کا ماتھا ٹھنکا۔ ہر چند کہ وہ رات میں بہت کم کسی سے ملاقات کرتا تھا پھر بھی وہ جاسوس کو نظر انداز نہ کر سکا۔

سلطان نے قدرے توقف کے بعد فرمایا۔ "جاسوس کی شناخت کے بعد اُسے پیش کیا جائے۔"

وہ ایک پرانا جاسوس تھا۔ اُسے سب ہی پہچانتے تھے۔ خود ناظم محلات نے اُس کی شناخت کی اور غلام کے ساتھ جاسوس کو حضورِ عالی میں بھیج دیا۔ سلطان کچھ کاغذات کا مطالعہ کر رہا تھا۔ اُسے چھوڑ کر وہ جاسوس سے مخاطب ہوا۔

"مخبر۔ وہ کون سی خبر ہے جس نے تمہیں مجبور کیا کہ تم اس وقت ہمارے پاس آنے کے لیے بضد ہوئے جب کہ تمہیں معلوم ہے کہ ہم رات کے وقت اہم کاغذات کا مطالعہ کرتے ہیں اور اُس میں کسی کی مداخلت پسند نہیں کرتے؟"

مخبر کو شاید اپنے اُوپر بڑا اعتماد تھا۔ اسی لیے وہ بڑے اعتماد لہجے میں بولا۔ "غلام کی خبر کا تعلق والیٔ موصل سیف الدین کے اُن اقدامات کے بارے میں ہے جو سلطنتِ دمشق کے لیے مشکلات پیدا کر سکتے ہیں۔"

مخبر نے رُک کر سلطان کی طرف دیکھا۔ وہ سلطان کے چہرے پر اپنی بات کا تاثر دیکھنا چاہتا تھا مگر سلطان کا چہرہ بے تاثر تھا اُس میں کوئی فرق نہ آیا۔ مخبر کو تعجب ہوا مگر اُس کا یہ تعجب سلطان نے خود ہی دُور کر دیا۔ "اگر تم یہ کہنا چاہتے ہو کہ سیف الدین نے دیارِ بکر اور الجزیرہ سے نئی فوج بھرتی کر کے اپنے لشکر کو دُگنا کر لیا ہے تو ہمارے لیے یہ خبر نئی نہیں کیونکہ دیارِ بکر اور الجزیرہ سے یہ اطلاعات ہمیں پہلے ہی موصول ہو چکی ہیں۔"

"سلطانِ معظم۔" مخبر نے پہلے جیسے اعتماد سے کہا۔ "اگرچہ میری اطلاع کا تعلق اسی سلسلے سے ہے لیکن میری خبر کا آغاز سیف الدین کے حلب پہنچنے اور وہاں رونما ہونے والے واقعات سے ہے۔ اگر عالیجاہ کو ان باتوں کی اطلاع بھی مل چکی ہے تو غلام اپنی کم فہمی کی معافی کا خواستگار ہے۔"

مخبر نے کنکھیوں سے دیکھا کہ سلطان اُس کی بات سے چونک پڑا تھا۔

"مخبر۔ جلد کہو کہ تم کیا خبر لائے ہو؟" سلطان نے بڑی بے چینی سے دریافت کیا۔

مخبر کا چہرہ دمک اُٹھا۔ اُس نے بڑے اطمینان اور سکون سے کہنا شروع کیا۔ "عالی جاہ۔ والیٔ دمشق کے پاس اپنا چھ ہزار کا لشکر تھا۔ اُس نے دیارِ بکر اور دوسرے مقامات سے بھی اتنا ہی لشکر اور بھرتی کیا لیکن وہ خود کو سلطانِ دمشق کے مقابلے پر آنے کے لیے مطمئن نہ کر سکا۔ پھر اُس نے حلب کا رُخ کیا وہاں

والیٔ موصل کا بھائی زلفندار جو قرونِ حماۃ میں میدان چھوڑ بھاگا تھا، حلب میں موجود تھا۔"

مخبر نے رُک کر سانس لی پھر بولا۔ "سیف الدین نے ملک صالح سے حلب کا لشکر طلب کیا تاکہ وہ اُسے آپ کے خلاف استعمال کر سکے لیکن غلام کی اطلاع کے مطابق ملک صالح نے انکار کر دیا۔ پھر شاید ملک صالح کو شمشیر کی نوک پر رضامند کر لیا گیا اور حلب کا لشکر دغا باز گمشتگین کی سالاری میں سیف الدین کے ساتھ حلب چھوڑ چکا ہے۔ اس سے آگے کا حال میں بیان نہیں کر سکتا اس لیے کہ میں حلب چھوڑ کر اُس وقت دمشق روانہ ہو گیا تھا۔"

سلطان صلاح الدین نے شاید اطمینان کا سانس لیا۔

"ہمیں تمہاری کارگزاری سے مسرت ہوئی مخبر۔ تم اپنے کام پر واپس جا سکتے ہو۔"

ابنِ خلدون کے مطابق سیف الدین غازی ۵۷۱ھ ہجری (۱۱۷۶ء) میں سلطان صلاح الدین سے اپنے لشکر کی شکست کا بدلہ لینے موصل سے روانہ ہوا۔ اُس نے کیفا اور ماردین کے حکام کو ملا کر چھ ہزار کے لشکر کے ساتھ کوچ کیا۔ اور ماہ ربیع الاوّل میں نصیبین پہنچا۔ وہاں اُس نے موسم سرما گزارا۔ جب غازی کا لشکر وہاں زیادہ دن تک رہنے سے گھبرا گیا تو اُس نے حلب کی طرف کوچ کیا۔ وہاں اُس کے ساتھ ملک الصالح کا لشکر گمشتگین خادم کی قیادت میں شامل ہو گیا۔

"واقعات کچھ بھی ہوں لیکن اس بات پر سب متفق ہیں کہ والیٔ موصل کے لشکر کے ساتھ حلب کا بھی لشکر تھا جس کی قیادت گمشتگین کے سپرد تھی اور یہ بھی سب تسلیم کرتے ہیں یہ مشترکہ لشکر اس بار بھی صلاح الدین کے لشکر سے دُوگنا سے کم نہ تھا۔ سلطان صلاح الدین اپنے لشکر کے ساتھ دمشق سے بڑی تیزی سے روانہ ہوا۔ روایت ہے کہ ۱۱ اپریل ۱۱۷۶ء کو جب سلطان نے دریائے ارنت عبور کیا تو اتنا زبردست سورج گرہن پڑا کہ زمین پر اندھیرا چھا گیا اور دوپہر میں آسمان پر تارے چمکنے لگے۔ لیکن سلطان اس بدشگونی کے باوجود آگے ہی بڑھتا رہا۔ حالانکہ اُس کے کئی سرداروں نے اُسے گرہن کے دوران لشکر کو کوچ سے باز رکھنے کی کوشش کی۔

سلطان صلاح الدین، حماۃ سے کچھ آگے بڑھا تھا کہ وہ ایک حادثے سے بال بال بچ گیا۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ جس وقت سلطان کے سپاہی الترکمان پر اپنے گھوڑوں کو اِدھر اُدھر پانی پلاتے پھر رہے تھے کہ والیٔ موصل سیف الدین کا لشکر اچانک اُس کے سر پر پہنچ گیا۔ سیف الدین کے لیے یہ بہترین موقع تھا کہ وہ سلطان کے منتشر لشکر پر حملہ کر دے۔ اُس صورت میں اُس کی کامیابی کے بہت امکانات تھے لیکن سیف الدین خود جھجک گیا اور فوجوں کو ترتیب دے کر جنگ کا فیصلہ کیا۔ پھر جب دوسرے دن مقابلے پر آیا تو اُس نے سُلطان کو اپنے مقابلے پر تیار پایا۔

یہ جنگ جس مقام پر لڑی گئی اُس کا نام تل سُلطان MOUNT OF SULTAN تھا۔ یہ جگہ حلب سے صرف پندرہ میل کے فاصلے پر تھی۔ یہ دست بدست جنگ بڑی خونریز تھی۔ ایک طرف خاندانِ زنگی کے تمام خانوادے ایک عظیم لشکر کے ساتھ لڑ رہے تھے تو دوسری طرف خود سلطان صلاح الدین ایوبی اپنے بہت سے رشتے داروں اور دمشق اور مصر کے آزمودہ کار سپاہیوں کے ساتھ دادِ شجاعت دے رہا تھا۔ جنگ میں ایک وقت ایسا آیا کہ سیف الدین کے حلیف اربل کے حکمراں نے اپنے دوستوں کے ساتھ صلاح الدین کے میسرہ پر اتنا دباؤ

ڈالا کر وہ پسپائی پر مجبور ہو گیا۔ سلطان صلاح الدین قلب میں لڑ رہا تھا کہ اُسے میسرہ کے پیچھے ہٹنے کی خبر ملی۔ سلطان نے فوراً اپنے حفاظتی دستے کو ساتھ لیا اور آندھی اور طوفان کی طرح اربل کے حکمراں کے دستوں پر جا پڑا۔

سلطان صلاح الدین کے اس حملے نے جنگ کا نقشہ بدل دیا۔ کہاں تو اُس کا میسرہ پسپا ہو کر پیچھے ہٹ رہا تھا اور کہاں یہ حالت ہوئی کہ شکست کھاتے ہوئے بازو نے پلٹ کر حملہ کر دیا۔ اُدھر سلطان کے محافظ دستے نے اربل کے دستوں کو حواس باختہ کر دیا تھا۔ اس دُہری مار سے وہ ایسے گھبرائے کہ اُن کے قدم اُکھڑ گئے اور جس کا جدھر منہ اُٹھا بھاگ پڑا۔

اربل والوں کے بھاگتے ہی سیف الدین کا باقی لشکر بھی بدحواس ہو کر میدان چھوڑ بھاگا۔ اتابیگ یعنی خاندان زنگی کے کئی بڑے بڑے افسر اس جنگ میں کام آئے۔ کیمپ اور گھوڑے، خیمے اور سامانِ جنگ سب کچھ فاتح افواج کے ہاتھ لگے۔

تل سلطان کی جنگ نے سلطان صلاح الدین کی قائدانہ اہلیت اور جنگی مہارت کا ثبوت مہیا کر دیا۔ بے شمار قیدی اور زخمی ہاتھ آئے جن میں بڑے بڑے افسر بھی تھے۔ سلطان نے تمام قیدیوں کو رہا کر دیا۔ اُن پر نہ کوئی سختی کی اور نہ جرمانہ۔ زخمیوں کا اس نے خود علاج کرایا، اور انہیں آزادی دے دی کہ وہ تندرست ہونے کے بعد جہاں جی چاہے جا سکتے ہیں۔ اس طرح دشمن کے سپاہیوں کے دل میں اپنے لیے جگہ پیدا کر لی۔ بہت سے سپاہیوں نے سلطان کے لشکر میں ملازمت کی خواہش کی جنہیں سلطان نے فوراً ملازم رکھ لیا۔

زخمی تو سلطان کے حُسنِ سلوک سے اس قدر متاثر تھے کہ تندرست ہونے کے بعد اُن میں سے ایک بھی واپس نہیں گیا اور سب نے لشکر سلطانی میں ملازمت اختیار کر لی۔ زنگی خاندان کے جو افسر گرفتار ہوئے تھے انہیں سلطان نے نہ صرف رہا کر دیا بلکہ انہیں تحفے تحائف دے کر رخصت کیا۔ وہ لوگ جب موصل پہنچے تو سلطان کی تعریف کرتے کرتے اُن کے مُنہ نہ تھکتے تھے۔

سلطان نے شکست خوردہ لشکریوں کے ساتھ تو ایسا سلوک کیا کہ وہ سلطان کے گرویدہ ہو گئے مگر اس نے اپنے لشکریوں کے ساتھ اس سے بھی بڑھ کر سلوک کیا کیونکہ اسی لشکر کے زور پر سلطان نے تل سلطان کا معرکہ سر کیا تھا۔ سلطان نے حکم دیا کہ میدانِ جنگ میں جس قدر بھی مالِ غنیمت حاصل ہوا ہے وہ تمام کا تمام لشکریوں میں تقسیم کر دیا جائے۔ اس طرح سلطان کے لشکریوں کو اس قدر مالِ غنیمت ملا کہ وہ سلطان کی کمان میں ہر جگہ لڑنے پر آمادہ ہو گئے۔

سلطان صلاح الدین کے لشکر نے تل سلطان کے معرکہ میں بڑی جانفشانی دکھائی تھی مگر سلطان نے لشکر کو مالِ غنیمت دے کر خوش کر دیا تھا اور وہ مطمئن ہو کر دوسرے معرکے کے لیے تیار تھے پھر سلطان نے اُنہیں چند دن آرام دیا۔ پھر نبزہ یا مراغہ کی طرف کوچ کیا۔ یہ مقام تل سلطان سے ایک دن کی مسافت پر تھا۔ سلطانی لشکر کی کامیابی کی خبر دُور دُور تک پھیل گئی تھی اس لیے حاکم نبزہ نے بغیر مقابلے کے قلعہ سلطان کے حوالے کر دیا۔

سلطان صلاح الدین فوجی حکمتِ عملی میں ید طولیٰ رکھتا تھا۔ اُس کو احساس تھا کہ لشکر مزید فتوحات کا خواہاں ہے۔ اس لیے اُس نے صرف ایک دن کے پڑاؤ کے بعد مَن بَج کی طرف کوچ کیا۔ مَن بَج کے قریب ہی تھا۔ وہاں کا حاکم قطب الدین نیال بن المَن بَج تھا۔ وہ اپنے ظلم و ستم کی وجہ سے بہت بدنام تھا۔ سلطان کی آمد سُن کر وہ موصل بھاگ گیا۔ والیٔ موصل سیف الدین غازی شکست کھانے کے بعد اپنے دارالسلطنت موصل پہنچ گیا تھا۔ اُس نے اپنے بھائی عزالدین زلفندار کو بچے کھچے سپاہیوں کے ساتھ حلب بھیج دیا تھا۔ سیف الدین غازی شاید پھر صلاح الدین سے کسی مقابلے کی تیاری کر رہا تھا۔ اس لیے اُس نے حاکم مَن بَج قطب الدین نیال کو خوش آمدید کہا اور اُسے رقہ کا حاکم بنا دیا۔

اُدھر سلطان صلاح الدین ایوبی نصرت اور کامرانی کے جھنڈے اُڑاتا قلعہ اعزاز پہنچا۔ یہ مشہور اور مضبوط قلعہ مَن بَج سے مغرب کی جانب واقع تھا۔ سلطان نے وہاں پہنچتے ہی قلعے کا سختی سے محاصرہ کر لیا۔

وجہ

افضل صاحب اونچے درجے کی ایک ہیئر ڈریسر شاپ میں بال کٹوانے پہنچے تو یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ ہیئر ڈریسر کے ہاتھ بہت گندے تھے۔

"بھئی تمہارے ہاتھ اتنے گندے کیوں ہیں؟" انہوں نے پوچھا۔

"سر! دراصل ابھی تک کوئی شیمپو کرانے والا گاہک نہیں آیا" ہیئر ڈریسر نے سادگی سے جواب دیا۔

قلعہ اعزاز بڑا مضبوط قلعہ تھا۔ سلطان صلاح الدین نے اس کا زبردست محاصرہ کیا تھا لیکن ایک ہفتہ گزر جانے کے باوجود قلعے کی طرف سے صلح کا کوئی پیغام نہیں آیا۔ سلطان پر حشیشین کی طرف سے ایک حملہ ہو چکا تھا اور سلطان نے فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ خانہ جنگی سے فارغ ہونے پر ان کرائے کے قاتلوں کا ضرور کچھ بندوبست کرے گا لیکن خانہ جنگی کا سلسلہ ختم ہونے ہی میں نہیں آ رہا تھا۔

۱۵ مئی ۱۱۷۶ء ہجری کو محاصرہ شروع ہوا تھا کہ اس کے ساتویں دن حشیشین کے ایک فدائی نے سلطان پر پھر قاتلانہ حملہ کیا۔ سلطان پہلے ہی حملے سے محتاط ہو گیا تھا اور لڑائی کے محاذ پر اور زیادہ محتاط رہتا تھا اس شب سلطان اپنے ایک افسر کے خیمے میں آرام کر رہا تھا کہ اچانک ایک فدائی خیمے میں گھس آیا۔ ان لوگوں نے کس طرح پتا لگایا تھا کہ سلطان اس رات کس سردار کے خیمے میں آرام کرے گا۔

جس وقت سلطان پر حملہ ہوا سلطان نیم دراز تھا۔ اس نے خود کے نیچے کا رومال سر پر ڈال رکھا تھا۔ قاتل نے سلطان کی گردن پر وار کیا اور خنجر خود سے ٹکرا کر رہ گیا پھر اس نے دوسرا وار گردن پر کیا۔ سلطان چونکہ بیٹھا تھا اس لیے وہ پوری طرح مدافعت نہ کر سکا اور فدائی کا خنجر سلطان کی گردن تک پہنچ گیا لیکن خنجر اس جالی میں الجھ گیا جو سلطان گردن کے گرد باندھتا تھا اس لیے اس کا وار گردن کو زخم نہ پہنچا سکا۔

سلطان نے اس کی کلائی پکڑ لی اور جھٹکا دے کر خنجر چھیننے کی کوشش کی مگر خنجر اس کے ہاتھ میں اس قدر جما ہوا تھا کہ نہ چھٹ سکا۔ سلطان نے فوراً اپنا خنجر نکال کے فدائی کے سینے میں اتار دیا۔ قاتل زمین پر گر گیا لیکن خنجر اب تک اس کی انگلیوں میں چپکا ہوا تھا۔

سلطان ابھی سنبھلنے بھی نہ پایا تھا کہ ایک اور فدائی تیزی سے خیمے میں داخل ہوا اور اس نے سلطان پر بھرپور وار کیا لیکن سلطان اب کھڑا ہو چکا تھا۔ اس نے ایک ہاتھ سے قاتل کے خنجر والے ہاتھ کو پکڑ لیا اور دوسرے ہاتھ سے اس کی گردن پکڑ کے اس زور سے مروڑی کہ وہ زمین پر ڈھیر ہو گیا۔ اس وقت سلطان نے پہرے کے محافظ کو آواز دی۔

محافظ اس تیسرے فدائی سے الجھا ہوا تھا۔ آخر تھوڑی جدوجہد کے بعد محافظ نے اس فدائی کو بھی جہنم بھیج دیا۔ اس وقت تک لشکر بیدار ہو چکا تھا اور بہت سے لشکری وہاں جمع ہو گئے تھے جہاں تیسرا فدائی مارا گیا تھا۔ سلطان صلاح الدین بھی خیمے کے باہر آ گیا۔ اس نے حکم دیا کہ خیموں کے گرد سخت پہرہ لگا دیا جائے اور ہر اجنبی کو گرفتار کیا جائے اگر کوئی بھاگے تو اسے تیروں سے چھلنی کر دیا جائے۔

رات بھر لشکر میں پھیلے ہوئے فدائی گرفتار ہوتے رہے۔ ان سے پتا چلا کہ درجنوں فدائی لشکر میں ملازم ہو چکے ہیں اور یہ تینوں فدائی جو اس وقت مارے گئے ہیں سلطان کے محافظ دستے میں شامل ہونے کی کوشش کر رہے تھے۔ سلطان صلاح الدین نے تمام گرفتار فدائین کے اسی وقت سر قلم کرا دیے۔

صبح کو سلطان نے قلعہ اعزاز پر چاروں طرف سے حملہ کیا۔ اس حملے سے قلعہ اعزاز کو نقصان تو پہنچا لیکن وہ فتح نہ ہو پایا۔ آخر سلطان نے اعلان کر دیا کہ جب تک قلعہ اعزاز فتح نہیں ہو گا لشکر کسی طرف نہیں جائے گا اور یہیں خیمے لگے رہیں گے۔ قلعے پر روز بروز دباؤ بڑھتا جا رہا تھا۔ محاصرہ اس قدر سخت تھا کہ کوئی باہر سے اندر جا سکتا تھا اور نہ اندر سے باہر آ سکتا تھا۔ قلعے میں آہستہ آہستہ سامان رسد ختم ہونا شروع ہوا۔ آخر اڑتیس یا چالیس دن کے بعد قلعے والوں نے اپنی شکست تسلیم کر لی اور معمولی مراعات کے بدلے میں قلعہ سلطان صلاح الدین کے حوالے کر دیا۔

اس محاصرے کے دوران ہی سلطان صلاح الدین کو پتا چل گیا کہ حلب کے امیر گمشتگین نے فدائین سے دوسری مرتبہ سلطان پر قاتلانہ حملہ کرایا تھا۔ پہلے حملے کے پیچھے بھی گمشتگین نے فدائین کے سردار اعلیٰ

شیخ الجبیل کو ایک خطیر رقم ادا کی تھی سلطان صلاح الدین امیر گمشتگین سے اس قدر برگشتہ خاطر ہو گیا تھا کہ قلعہ اعزاز سے فارغ ہوتے ہی اس نے لشکر کا رخ حلب کی طرف کر دیا اور وہاں پہنچ کے حلب کا تیسری بار محاصرہ کر لیا۔

حلب میں اس وقت والی موصل سیف الدین غازی کا بھائی زلقندار بھی موجود تھا۔ سلطان نے محاصرہ کر کے قلعے پر حملے شروع کر دیے لیکن جیسا کہ پہلے بیان کیا گیا ہے کہ اہل حلب سلطان نور الدین زنگی مرحوم کے بیٹے الملک الصالح سے بہت محبت کرتے تھے اس لیے وہ ہر موقع پر جان توڑ کے لڑنے تاکہ ملک الصالح کے پاس کم از کم ایک علاقہ تو باقی رہے اس دفعہ بھی حلب والوں نے اس قدر زبردست مدافعت کی کہ سلطان قلعہ فتح نہ کر سکا جب زیادہ دن گزر گئے تو پھر صلح کی بات چیت شروع ہوئی۔ ادھر سے ادھر اور ادھر سے ادھر سفارتیں آتی جاتی رہیں۔ اہل حلب نے صرف یہ مطالبہ تھا کہ الملک الصالح کے لیے حلب کو چھوڑ دیا جائے اس کے بدلے میں سلطان جو شرط رکھیں وہ قبول کر لی جائے گی۔

آخر سلطان صلاح الدین کو اہل حلب کا مطالبہ تسلیم کرنا پڑا۔ اس سلسلے میں ایک عام سا معاہدہ لکھا گیا جس میں سلطان نے الصالح کی حلب کی ریاست کو تسلیم کر لیا۔ اس کے جواب میں ملک الصالح نے سلطان صلاح الدین کے تمام شامی مقبوضہ علاقوں پر سلطان کی بادشاہی تسلیم کی۔ اس معاہدے کی ایک خاص بات یہ تھی کہ اس پر حلب کے علاوہ کیفا، ماردین اور موصل کے نمائندوں نے بھی دستخط کیے۔ سلطان نے اسی وقت محاصرہ اٹھا لیا اور اس کا لشکر خیمہ گاہ میں واپس آ گیا۔

سلطان صلاح الدین دوسرے دن دمشق واپس جانے کا ارادہ کر رہا تھا کہ اسے قلعہ حلب کی طرف سے ایک درخواست موصول ہوئی۔ قلعہ کا خاص ہرکارہ الملک الصالح کا پیغام لے کے آیا تھا جس میں سلطان صلاح الدین سے درخواست کی گئی تھی کہ الملک الصالح کی چھوٹی بہن یعنی شہزادی حلب کو اپنے حضور میں باریابی کی اجازت دے۔ سلطان صلاح الدین نے اس پر مسرت کا اظہار کیا اور شہزادی کو پیغام بھیجا کہ اگر انہیں خیمہ گاہ میں آنے میں کوئی تکلف ہو تو سلطان صلاح الدین ان سے ملاقات کے لیے قلعہ حلب میں آنے کے لیے تیار ہے۔

القصہ شہزادی، سلطان صلاح الدین کی خیمہ گاہ میں کنیزوں اور غلاموں کے جلوس میں آئی۔ سلطان صلاح الدین نے خیمے سے نکل کر شہزادی کا استقبال کیا اور بڑی عزت سے اسے خیمے میں اپنی جگہ پر بٹھایا اور خود دوسری نشست پر بیٹھا۔

سلطان صلاح الدین، حلب کی شہزادی کا اس قدر احترام کر رہا تھا جیسے وہ شہزادی نہیں بلکہ سلطان صلاح الدین کا آقا نورالدین زنگی ہے۔

صلاح الدین نے بڑے ادب کے ساتھ شہزادی سے کہا۔ "میری آقازادی! شہزادی حلب نے خیمہ گاہ میں آنے کی کیوں تکلیف گوارا کی جبکہ میں نے قاصد سے کہہ دیا تھا کہ شہزادی مجھے قلعے میں بلوائیں تو سر کے بل ان کی خدمت میں حاضر ہو جاؤں گا۔"

شہزادی اگرچہ بالکل کمسن تھی لیکن اس کی بہترین تربیت ہوئی تھی۔ اس نے جواب دیا۔ "سلطان میری جو عزت افزائی فرما رہے ہیں اس کے لیے میں ان کی شکر گزار ہوں لیکن ان حالات میں سلطان کو نہیں بلکہ مجھے سلطان کے پاس آنا تھا۔"

"حالات خواہ کچھ بھی ہو جائیں لیکن آقازادی پر تو اس کا کوئی اثر نہیں ہونا چاہیے۔" سلطان کا لہجہ اور انداز عجب بھی مؤدبانہ تھا۔ "فرمائیے میں شہزادی کی کیا خدمت کر سکتا ہوں۔"

شہزادی نے معصومیت سے کہا۔ "سلطان میں آپ کے پاس ایک درخواست لے کر آئی ہوں۔"

"آقازادی آپ مجھے شرمندہ نہ کیجیے۔ آپ مجھے حکم دے سکتی ہیں۔" سلطان نے ادب ملحوظ رکھتے ہوئے اسی نرمی سے کہا۔

"سلطان وعدہ فرمائیے کہ میں جو سوال کروں گی اسے آپ نامنظور نہیں کریں گے۔" شہزادی کو جس طرح ہو سکا بہ ظاہر بھیجا گیا تھا اس کے مطابق شہزادی گفتگو کر رہی تھی۔ گمشتگین اور ملک الصالح نے اسے سمجھا دیا تھا کہ سلطان سے اس وقت تک سوال نہ کرنا جب تک وہ پورا کرنے کا وعدہ نہ کریں۔

سلطان نے لجاجت سے کہا۔ "آقازادی۔ سوال کر کے مجھے شرمندہ نہ کیجیے آپ حکم دے کے دیکھیے۔"

شہزادی نے تکرار کی۔ "آپ وعدہ کرتے ہیں کہ میرا سوال ٹالیں گے نہیں۔"

"نہیں آقازادی۔ ہرگز نہیں۔" سلطان نے زور دے کے کہا۔ "میں آپ کے کسی حکم سے انکار کر ہی نہیں سکتا۔"

"یعنی آپ نے وعدہ کر لیا؟" شہزادی پکا وعدہ لینا چاہتی تھی۔

"جی آقازادی۔ میں نے وعدہ کیا آپ فرمائیے۔" سلطان نے شہزادی کو یقین دلایا۔

"میں سلطان سے چاہتی ہوں کہ وہ مجھے قلعہ اعزاز عطا فرما دیں۔" شہزادی نے سہمے سہمے انداز میں کہا۔

اعزاز کا معروف قلعہ صلاح الدین نے چالیس دنوں کے محاصرے کے بعد فتح کیا تھا۔ محاصرے کے دوران جانی نقصان تو کوئی نہ ہوا تھا لیکن ان چالیس دنوں میں لشکر کو جو جانفشانی کرنا

بڑی تھی وہ ایک الگ بات تھی۔ سلطان کا خیال تھا کہ ملک الصالح نے اپنی بہن کو اس کے پاس اس لیے بھیجا ہے کہ وہ ملک الصالح کے لیے کچھ مزید مراعات حاصل کرے۔ بہر حال سلطان کو اپنے آقا سلطان نورالدین کے ناتے شہزادی کا بڑا لحاظ تھا۔

سلطان نے نظریں نیچی کرکے کہا۔ "اور کوئی حکم آقازادی؟"

سلطان کا مقصد تھا کہ شہزادی کی کوئی اور بھی خواہش ہے یا وہ اس سلسلے میں کچھ اور کہنا چاہتی ہے لیکن شہزادی ابھی بچی تھی وہ سمجھی کہ شاید سلطان اسے قلعہ اعزاز نہیں دینا چاہتا اور اسے کچھ اور مانگنے کو کہہ رہا ہے۔ وہ جلدی سے بولی "کیا۔ کیا سلطان نے میری درخواست نامنظور فرما دی؟"

"نہیں آقازادی۔ آپ کیسی بات کہہ رہی ہیں۔" سلطان نے وضاحت کی "میرا مقصد ہے کہ آپ کی کوئی اور بھی خواہش ہے؟"

"نہیں نہیں سلطان۔ مجھے صرف قلعہ اعزاز چاہیے۔ آپ اس سے انکار نہ کیجیے۔" شہزادی اب تک گھبرائی ہوئی تھی۔

سلطان نے فقیہ عیسیٰ ہکاری کی طرف دیکھا جو سلطان کے مصاحب، وزیر اور حاجب تینوں فرائض ایک ساتھ ادا کر رہے تھے۔

"فقیہ محترم۔" سلطان کی آواز فرطِ جذبات سے بھر آگئی تھی۔ "میری آقازادی کو سمجھائیے کہ اگر انہوں نے اس وقت مجھ سے دمشق بھی طلب کیا ہوتا تو رب کعبہ کی قسم، میں ابھی سب کچھ چھوڑ کے مصر روانہ ہو جاتا۔ فرمان جاری کیجیے کہ ہم نے قلعہ اعزاز سے اپنا قبضہ اٹھا لیا۔ آقازادی کو اختیار ہے کہ وہ اپنی طرف سے جسے چاہیں قلعہ اعزاز کا حاکم مقرر فرمائیں۔"

پھر سلطان نے اشارہ کیا اور جواہرات سے بھرے ہوئے تین خوان لا کے شہزادی کے سامنے رکھے گئے۔

سلطان نے فرمایا "آقازادی۔ یہ تحفہ قبول فرمائیے۔"

شہزادی کی خوشی کے مارے آواز نہیں نکل رہی تھی۔ اس نے گھٹی ہوئی آواز میں کہا "سلطان میں آپ کی بہت شکر گزار ہوں۔ آپ واقعی سلطان ہیں۔"

سلطان نے حکم دیا۔ "ہم اور ہمارے تمام عمائدینِ سلطنت آقازادی کو قلعہ حلب تک رخصت کرنے جائیں گے۔"

پھر لوگوں نے دیکھا کہ سلطان دمشق صلاح الدین ایوبی نے سہارا دے کر شہزادی حلب کو گھوڑے پر سوار کیا اور اس کے گھوڑے کی لگام پکڑ کے چلنے لگا۔ مصر اور دمشق کے تمام عمائدین سلطان کے جلوس میں پاپیادہ چل رہے تھے۔

یہ مختصر جلوس قلعے کے دروازے پر پہنچا تو لوگوں کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ اللہ اللہ کیا احترام تھا سلطان کا اپنے آقا کے لیے اپنے ولی نعمت مرحوم نورالدین زنگی کا۔ یہ سچ بھی ہے کہ صلاح الدین کو ایوب نے صلاح الدین نہیں بنایا تھا بلکہ یہ نورالدین زنگی کی اعلیٰ مگر خاموش تربیت تھی جس کی ٹھنڈی بھٹی میں یہ سونا کندن بن کے نکلا تھا۔

صلاح الدین اور ملک الصالح کے اس معاہدے سے جس میں ملک الصالح کے ساتھ زنگی خانوادے کے تمام معروف حکمران شامل تھے، شام کی خانہ جنگی کا خاتمہ ہو گیا۔ ملک صالح کو حلب دے دیا گیا تھا وہ اسی پر قانع ہو گیا۔ والیٔ موصل سیف الدین غازی نے تین حملوں میں سلطان سے جو شکستیں کھائی تھیں اس نے غازی کی کمر توڑ کر رکھ دی تھی۔ اس نے بھی مناسب سمجھا کہ بچی کھچی ریاست کو غنیمت سمجھے اور سلطان صلاح الدین سے پھر ٹکرانے کی کوشش نہ کرے کیونکہ سلطان کی طاقت میں روز بروز اضافہ ہی ہوتا چلا جا رہا تھا۔

انہی دنوں سلطان کا فرنگیوں سے بھی معاہدہ ہو گیا تھا۔ اگرچہ فرنگی مسلمانوں کے ساتھ کیے ہوئے معاہدے کو کوئی وقعت نہ دیتے تھے اور انہوں نے اپنا یہ وتیرہ بنا لیا تھا کہ جب تک زور نہ چلے اس وقت تک معاہدے کی پابندی کرو اور جب طاقت آ جائے یا کوئی سنہری موقع مل جائے تو معاہدے کی پروا نہ کرو۔ چنانچہ معاہدہ ہوئے چند ہی دنوں بعد انہوں نے بکاع کی وادی پر حملہ کر کے اسے لوٹ لیا۔ فصلوں کو جلا دیا اور آبادیوں کو ویران کر دیا۔ پھر واپسی پر اپنے ساتھ مویشیوں کے گلے بھی لیتے گئے۔ اس کے علاوہ ان کے ہاتھ کافی مال غنیمت بھی لگا تھا۔

سلطان صلاح الدین نے معاہدے کی خلاف ورزی اور فرنگیوں کے ظلم و ستم کو بڑی شدت سے محسوس کیا لیکن انتقام کے ابھرتے ہوئے لاوے کو اسے مصلحت کے چھینٹوں سے ٹھنڈا کرنا پڑا کیونکہ فرنگیوں کے علاوہ ایک اور طاقت بڑی تیزی کے ساتھ ابھر رہی تھی جس نے دو بار اس پر قاتلانہ حملہ کیا تھا اور یہ اس کی خوش قسمتی تھی کہ وہ بال بال بچ گیا تھا۔ چنانچہ اس نے پہلے اس پر زور طاقت سے نمٹنے کا فیصلہ کیا جو البرز کے پہاڑوں میں بیٹھی انسانی جانوں سے کھیل رہی تھی۔ ان کرائے کے قاتلوں نے صرف شام ہی نہیں بلکہ تمام اسلامی علاقوں میں اودھم مچا رکھا تھا۔ پس صلاح الدین نے فیصلہ کیا کہ وہ ان کے پہاڑی علاقوں میں گھس کے ان کا خاتمہ کرے گا۔

حلب سے معاہدے کے بعد سلطان صلاح الدین ایوبی نے مصر سے جو لشکر طلب کیا تھا اسے واپس بھیج دیا اور باقی لشکر کے ساتھ کوہ سماک کے دروں کی طرف چلا۔ یہ پہاڑی سلسلہ مشرق سے مغرب تک پھیلا ہوا تھا اور ان پر ان باطنیت حشیشین کا پورا پورا قبضہ تھا۔

اس طویل پہاڑی سلسلے سے کسی قافلے کا نکلنا ناممکن تھا بلکہ بعض سرداروں اور بادشاہوں نے حشیشین کو ختم کرنے کے لیے چڑھائی کی تو انہیں اپنی فوج سے ہاتھ دھونا پڑے تھے۔ سلطان صلاح الدین ایوبی نے اپنے لشکر کے ساتھ ان کے مغربی مرکز مصیاف پر حملہ کیا تھا۔ اس حملے کی تفصیل بیان کرنے سے پہلے اس فرقہ حشیشین کے بارے میں کچھ بتانا ضروری ہے۔

حشیش بھنگ کو کہتے ہیں اور حشیشین یا حشیشن بھنگ پینے والے کو کہتے ہیں مگر یہ پتا نہیں کہ بھنگ پینا اس فرقے کے مذہبی لوازم میں ضروری تھا یا پھر حسن بن صباح کی اس جنت جس کا نام فردوس بریں تھا اس میں داخلے کی یہ لازمی شرط تھی۔ یہ جنت ارضی جس کا نام اس کے بنانے والے حسن بن صباح نے رکھا تھا، ایک اتنا بڑا دھوکا تھا جس پر پہلی بار دیکھنے والے کو اعتبار آ جاتا تھا اور وہ اس جنت میں ایک بار داخل ہونے کے بعد دوبارہ اور سہ بارہ دیکھنے کی آرزو پیدا ہو جاتی تھی۔

درختوں پر جواہرات سے ترشے ہوئے پرندے بیٹھے دکھائی دیتے تھے جو ہوا کے خنک اور مہک جھونکوں کے ساتھ نغمہ سرائی کرتے تھے۔ دودھ کی نہریں بہتی تھیں جن میں بجرے پڑے ہوتے جن میں مردوں اور عورتوں کے جوڑے خوش گپیاں کرتے دکھائی دیتے تھے۔ خوبصورت بدن والی عورتیں اور نازک نازک حوریں ادھر ادھر گھومتی دکھائی دیتی تھیں جنت کا سماں پیدا کرنے کے لیے یہاں خوبصورت اور نوخیز لڑکے یعنی غلمان بھی مہمانوں کی خدمت کرتے نظر آتے تھے۔

یہاں ہر شخص اپنے رنگ میں مست نظر آتا تھا۔ کسی کو کسی پر اعتراض نہ ہوتا تھا۔ نیا مہمان جب اس جنت میں داخل ہوتا تو اسے حوریں گھیر لیتیں اور اس کا ہاتھ پکڑ کے جنت کی سیر کراتیں۔ خوبصورت کشتیوں اور بجروں پر دودھ کی نہر کی سیر کراتیں۔ لذیذ لذیذ پھلوں سے تواضع کرتیں۔ انہیں جو نازنین پسند ہوتی وہ اس کی خدمت پر مامور کر دی جاتی اور اسے دنیا کی ہر چیز مہیا کر دی جاتی۔ اس مہمان کو دو چار یا ایک ہفتہ اس جنت میں رکھا جاتا پھر جنت کی شراب یعنی بھنگ کا پیالہ اسے پیش کیا جاتا جسے پیتے ہی وہ بے ہوش ہو جاتا اور وہ اس جنت سے پھر اس جگہ بھیج دیا جاتا جہاں سے اسے لایا گیا تھا۔

ظاہر ہے کہ اس جنت میں جو شخص چند دن گزار لیتا تھا وہ پھر وہاں جانے کے لیے بے چین ہوتا اور حشیشین کے امام جسے شیخ الجبل کہا جاتا تھا اس کے گرگوں کی خوشامد کرتا کہ اسے پھر جنت میں بھیج دیا جائے۔ اس طریقے سے اسے جنت میں دوبارہ بھیجے جانے کا حکم دیا جاتا مگر مشروط طور پر۔ شرط یہ ہوتی کہ وہ شیخ الجبل کے نامزد کیے ہوئے شخص کو خنجر مار کر ختم کر دے۔ شیخ الجبل دراصل کرائے کے قاتلوں کا ٹھیکے دار تھا۔ قاتلوں کو وہ اپنی جنت کا جلوہ دکھا کر قابو میں کر لیتا اور ان سے بڑے بڑے امراء وزراء اور بادشاہوں تک کو قتل کرا دیتا اور اس سے جو کثیر رقم حاصل ہوتی تھی اسے وہ اپنی بنائی ہوئی جنت پر صرف کرتا تھا۔

اس خطرناک گروہ یا فرقے کے دو اہم مرکز تھے۔ ایک مشرقی مرکز دوسرا مغربی مرکز۔ ان مراکز کے دروازے جو پتھر کے بنے ہوئے پہاڑوں میں اس طرح جڑے ہوئے تھے کہ ان کے درمیان ذرا سی درز بھی نظر نہ آتی تھی۔ ان دروازوں کو باہر سے کھولنا ناممکن تھا۔ یہ صرف اندر ہی سے کھولے جا سکتے تھے۔ دروازوں کے اوپر لکھا ہوتا تھا

سَلَامٌ عَلٰی مستنصر باللہ امیر الدنیا وَقاهر السلاسل الذین

یہ عبارت پتھر پر ہی کندہ ہوتی تھی۔ بہرحال یہ حشیشن جب اس جنت کی سیر سے نکل کے دنیا میں آتے تو شیطانوں سے بڑھ کے خونخوار اور خوفناک ہوتے تھے۔ فتنہ و فساد اور قتل و غارت میں ایسے ماہر ہوتے تھے کہ ان کی جرأت پر حیرت ہوتی تھی۔ عام طور سے ان شیاطین سے امیروں، وزیروں، سرداروں اور بادشاہوں کو قتل کرانے کا کام لیا جاتا تھا۔ حشیشین کے دعاۃ پورے مشرق وسطیٰ میں پھیلے ہوئے تھے جو اپنے آدمیوں کے ساتھ پورا تعاون کرتے اور قتل کے بعد قاتل کو بچا لینے میں مدد دیتے تھے۔

ان قاتلوں کو شیخ الجبل کی طرف سے "فدائین" کا خطاب دیا جاتا تھا گویا یہ قتل نہ کرتے تھے بلکہ اپنے شیخ کے حکم پر فدا ہو جاتے تھے۔ جو فدائی پکڑا جاتا اور پھانسی پر چڑھایا جاتا اسے شہید کے نام سے پکارتے تھے۔ یہ لوگ شاہی محلات اور نامور سرداروں کے خیموں میں گھس جاتے تھے اور لمحوں میں بندۂ انسان کو موت کے گھاٹ اتار دیتے تھے۔ یہ اس قدر جرأت مند ہوتے تھے کہ انگریزی کا لفظ اسیسن اس لفظ حشیشین سے مشتق ہے گویا اسیسن اور حشیشن ہم معنی ہیں۔

حشیشن کی تحریک میں ایک تو انسان کو بھنگ کا ٹھنڈا شربت پلایا جاتا تھا اور اسے تاثر یہ دیا جاتا تھا کہ یہ شراب طہورا ہے اور جس پر یہ عمل کیا جاتا اسے شیخ الجبل کے سامنے پیش کر کے یہ یقین دلایا جاتا تھا کہ اس کا ہر قدم یعنی ہر قتل اسے شیخ الجبل اور اس کی جنت سے قریب سے قریب تر کرتا چلا جائے گا۔ اس تحریک میں ایسے قاتل بھی تھے جنہوں نے اپنے خنجر سے ایک دو نہیں بلکہ بارہ بارہ قتل

کیے تھے۔ یہ قاتل شیخ الجبل کے محبوب خدمت گاروں میں شامل ہوچکے تھے اور انہیں ہر ہفتہ اس جنت ارضی کی سیر کی اجازت ملتی تھی۔

حشیشن تحریک کا بانی حسن بن صباح تھا۔ اس کا قول تھا:

"ہر مقدس شے کو سلطنت اور مذہب کے کھنڈروں میں دفن کر دو۔"

علامہ ابن خلدون کا خیال ہے کہ حشیشن کے عقائد فرقہ قرامطہ سے ملتے ہیں اور یہ اسی فرقے کی ایک شاخ ہے۔ قرامطہ فرقہ والے اسلام کے کسی اصول کو نہیں مانتے تھے بلکہ ایک نئی شریعت کے موجد تھے۔ نماز صرف دو وقت پڑھتے لیکن طہارت اور پاکیزگی ضروری نہیں سمجھتے تھے۔ شراب یا عورت مرد کا ملاپ اس فرقے میں جائز تھا مگر حشیشن کو ہم قرامطہ کی شاخ نہیں کہہ سکتے۔ مصر کے فاطمی خلیفہ المستنصر کے زمانے میں اس کی دو شاخیں ہو گئیں ایک مستعلویہ اور دوسری نزاریہ۔ مستنصر کے بڑے بیٹے کا نام نزار تھا۔ خلافت اس کو ملنا چاہیے تھی لیکن نزار کی بہن نے چھوٹے بھائی مستعلی کے حق میں فیصلہ دیا اور وہ خلیفہ ہو گیا۔ نزار اسکندریہ چلا گیا اور وہاں خلافت کا دعویٰ کیا مگر مستعلی کی فوجوں نے اسے شکست دی اور قید کر کے قتل کر دیا۔

حشیشن کا بانی حسن بن صباح اسی نزار کی امامت کا قائل تھا۔ حسن بن صباح اس کا داعی تھا اور اس نے مشرق میں اس کی دعوت دی اس لیے نزاری کو مشرقی اسمٰعیلیہ کہہ سکتے ہیں۔ اس حسن بن صباح کا شجرہ نسب کچھ یوں تھا۔

حسن بن علی محمد بن جعفر بن حسین بن الصباح بن الحمیری

حسن بن صباح ابتدا میں اثنا عشری تھا مگر جب اس کی ملاقات امیر ضراب سے ہوئی جو فاطمی فرقے کا داعی تھا تو حسن بن صباح کا جھکاؤ اسمٰعیلی مذہب کی طرف ہو گیا۔ حسن بن صباح دو اسمٰعیلی داعیوں کے ساتھ حلقہ اصفہان کے بڑے شیخ ابن عطاش کے پاس پہنچا۔ شیخ ابن عطاش اس وقت رے میں مقیم تھے۔ حسن بن صباح ان کے پاس سات برس رہا پھر ۴۷۱ھ میں شیخ نے اسے مصر جانے کا حکم دیا۔

یہ زمانہ فاطمی خلیفہ المستنصر کا تھا جس کے بیٹے مستعلی اور نزار تھے۔ جب ان دونوں بھائیوں میں جانشینی کا جھگڑا چلا تو مصر کے وزیر امیر بدر جمالی نے حسن بن صباح کو مصر چھوڑنے پر اس لیے مجبور کر دیا کہ حسن بن صباح، خلیفہ کے بڑے بیٹے نزار کی خلافت کے حق میں تھا۔ اس طرح حسن بن صباح پھر اصفہان واپس آ گیا اور "نزاریہ" کے نام سے دعوت دینے لگا۔ اس وقت قرامطہ کی طاقت ٹوٹ چکی تھی چنانچہ بچے کھچے قرامطی اس نزاریہ تحریک میں شامل ہو گئے۔ چونکہ مصر میں نزار کا چھوٹا بھائی مستعلی خلیفہ تھا اس لیے نزار یا نزاریہ تحریک خفیہ طور پر چلتی رہی اور باطنیہ کے نام سے موسوم ہو گئی۔

باطنی حسن بن صباح کی سرداری میں آہستہ آہستہ ایران کے قلعوں پر قبضہ کرتے رہے۔ آخر ۴۸۳ھ میں حسن بن صباح نے کوہ البرز کے ایک بلند اور سنگین قلعہ "الموت" پر قبضہ کر لیا۔ یہ قلعہ صوبہ دیلم کا ایک مشہور قلعہ تھا جس کی بلندی کی وجہ سے دیہاتی لوگ اسے طالقان یعنی عقاب کا گھونسلہ کہتے تھے۔ طالقان دراصل ایک سلسلہ کوہ کا نام بھی ہے اس لیے اسے "آشیانہ عقاب" بھی کہا جاتا ہے۔

اس آشیانہ عقاب کو مرکز بنانے کے بعد عقاب یعنی حسن بن صباح مسلمانوں کے لیے ملک الموت بن گیا اور اس نے قتل و خون ریزی کا بازار گرم کر دیا پھر ۴۸۵ ہجری میں اس دور کی ایک عظیم ہستی نظام الملک طوسی کو حسن بن صباح کے ایک فدائی نے قتل کر دیا۔ اس تحریک میں لفظ فدائی کا اضافہ اسی حسن بن صباح نے کیا تھا۔ اس نے مسلمانوں کو جنت کا فریب دے کر انہیں خونی اور قاتل بنا دیا۔ اس کو تحریک فدائی بھی کہا جاتا ہے۔

سلجوقی سلطان ملک شاہ کی وفات پر جب جانشینی کا جھگڑا چلا تو ان نزاریوں، باطنیوں یا فدائیوں نے اس سے بہت فائدہ اٹھایا۔ ملک شاہ کے جانشین برکیارق نے ان قاتلوں کی خدمات حاصل کر لیں وہ جس کو قتل کرنا چاہتا اس کا نام حسن بن صباح کو بھجوا دیتا اور چند ہی دنوں میں اس کا خاتمہ ہو جاتا۔ یہ بات بہت جلد ہی عمائدین سلطنت کو معلوم ہو گئی اور انہوں نے برکیارق پر الزام لگایا کہ وہ باطنیہ فرقے میں شامل ہو گیا ہے حالانکہ وہ باطنیوں سے اپنے دشمن کو ختم کرنے کا کام لیتا تھا۔ برکیارق کی جب زیادہ بدنامی ہوئی تو اس نے باطنیوں کو ختم کرنے کے احکامات صادر کر دیے۔ اس میں شہروں میں رہنے والے تقریباً تمام فدائین ختم ہو گئے اور ان کا زور ٹوٹ گیا لیکن قلعوں پر ان کا ہی قبضہ رہا۔

سلطان سنجر نے بھی فدائیین کو ختم کرنے کا قصد کیا تھا مگر حسن بن صباح نے اسے صلح کرنے پر مجبور کر دیا۔ ایک مغربی مورخ کے مطابق حسن بن صباح نے اپنی تحریک شام کے ملک میں بھی پھیلانے کا فیصلہ کیا اور یہ لوگ شمال مشرق سے شام میں داخل ہوئے۔ سب سے پہلے سلجوقی امیر رضوان بن تتش ان کے حلقے میں شامل ہوا اس نے ایک ماہ تک جمعہ کے خطبہ میں فاطمی خلیفہ مستعلی کا نام پڑھوایا۔ فدائیوں نے بانیاس کو اپنا پہلا مستحکم قلعہ بنایا، پھر شام کے متعدد قلعے ان کے قبضے میں آ گئے۔ انہوں نے یہاں بھی فدائیوں والا طریقہ اختیار کیا اور قتل و غارت کا کام کرتے رہے۔ اب مصیاف کو انہوں نے اپنا مرکز بنا لیا تھا جہاں ان کا شیخ رہتا تھا۔ کہتے ہیں ان کی تعداد ساٹھ ہزار تک پہنچ گئی تھی۔

سلطان صلاح الدین کے زمانے میں جب اس پر دوبارہ فدائیوں نے حملے کیے تو ان کا شیخ الجبل راشد الدین سنان یا سنان تھا۔ اس کا مرکز مصیاف تھا جس پر سلطان صلاح الدین نے حملہ کیا تھا اور اسے محاصرے میں لے لیا تھا۔

مغربی مؤرخ سلطان صلاح الدین ایوبی کی فدائیوں کے خلاف مہم کو بالکل ناکام قرار دیتے ہیں اور یہاں تک کہتے ہیں کہ سلطان فدائیوں سے خوفزدہ ہو کر بھاگ کھڑا ہوا تھا حالانکہ وہ اس کو تو تسلیم کرتے ہیں کہ سلطان نے شیخ الجبل کے بہت سے علاقوں کو تباہ کر دیا تھا اور پھر اس نے ان کے سب سے مضبوط قلعہ مصیاف کا محاصرہ کیا تھا۔ یہ قلعہ سب سے مستحکم اور بلندی میں آشیانۂ عقاب سے کم نہ تھا اور ایک ناقابلِ دسترس چوٹی پر واقع تھا اس کے نشیب میں ایک ویران کھائی تھی۔ سلطان نے قلعے پر شدید سنگ باری اور پیہم یورش کی مگر قلعے پر کوئی اثر نہ ہوا۔

فدائیوں کے ایک ہمدرد مؤرخ نے مصیاف پر حملے کی ایک مافوق الفطرت تصویر کشی کی ہے جو قارئین کے مطالعہ کے لیے دلچسپی کا باعث ہوگی۔ یہ مؤرخ جو دراصل افسانہ تراش تھا اس کا نام ابو الفراس تھا۔ اس کا بیان اس طرح ہے:

صلاح الدین نے مصیاف کا محاصرہ کیا تو شیخ الجبل وہاں موجود نہ تھا۔ سلطان کا فرمان جس میں اسے قبول اطاعت کا حکم دیا گیا تھا وہ شیخ الجبل کو قادموس کے قریب ایک گاؤں میں موصول ہوا۔ اس نے قاصد سے کہا کہ وہ سلطان سے ملنا چاہتا ہے۔ محاصرے کی وجہ سے مصیاف کا راستہ بند تھا اس لیے شیخ الجبل اپنے دو ساتھیوں کو لے کر ایک پہاڑی کی چوٹی پر جا بیٹھا اور وہاں سے محاصرے کے نتیجے کا انتظار کرنے لگا۔

سلطان صلاح الدین نے شیخ الجبل کو پہاڑی پر دیکھا کہ شیخ الجبل سامنے کی پہاڑی پر بیٹھا ہے۔ اسے یقین ہو گیا کہ دشمن اس کے قبضے میں ہے۔ اس لیے اس نے چند آدمیوں کو شیخ کی گرفتاری کے لیے چوٹی کی طرف بھیجا لیکن اسے گرفتار کرنے کے لیے جانے والے اس وقت بے بس ہو گئے جب انہیں کسی غیبی طاقت نے آگے بڑھنے سے روک دیا۔ انہیں اپنے اعضاء بے حس محسوس ہونے

ابو الفراس کے مطابق یہ شیخ الجبل کی کرامت یا خرقِ عادت کا اثر تھا۔ اس کے معتقدین کا عقیدہ تھا کہ شیخ انسان کی شکل میں زندہ خدا تھا۔ چنانچہ شکست خوردہ اور پریشان حال قاصد واپس صلاح الدین کے پاس گیا اور اس نے تمام کیفیت بیان کر دی۔ ان کی محیر العقول اطلاع سے صلاح الدین بے حد خوفزدہ ہو گیا۔ اسے اپنے اوپر دونوں حملے یاد تھے۔ اب اسے شبہ ہونے لگا کہ شاید وہ اس شیطان کی مافوق الفطرت طاقت سے نہ بچ سکے گا۔ اس نے اپنے خیمے کے گرد کھریا مٹی اور راکھ بکھروا دی تاکہ چوری چھپے آنے والے کے پیر کے نشان اس پر بن جائیں۔ صلاح الدین کے پہریداروں کو لالٹینیں اور مشعلیں دی گئیں اور رات کو پہرہ دینے والی گارڈ کو ہر گھنٹہ تبدیل ہونے کا حکم دیا گیا لیکن خوف نے سلطان کا پیچھا نہ چھوڑا اور اس سے آرام کی نیند رخصت ہو گئی۔

ابو الفراس آگے چل کے ایک اور دلچسپ انکشاف کرتا ہے وہ کہتا ہے کہ ایک شب ایسا ہوا کہ سلطان کے پہریداروں نے دیکھا کہ مصیاف کی فصیل پر سے ایک روشنی نیچے کی طرف اترنے لگی۔ یہ روشنی وہاں پہنچی جہاں شیخ الجبل بیٹھا تھا پھر یہ روشنی سلطان کے لشکر میں داخل ہوئی سلطان کے خیمے کے پاس جگنو کی طرح چمکی اور غائب ہو گئی۔ ابو الفراس کا بیان ہے کہ ٹھیک اس وقت جب مصیاف سے اترنے والی روشنی سلطان کے خیمے کے پاس آ کے جگنو کی طرح چمک کے غائب ہو گئی ٹھیک اسی وقت سلطان کی آنکھ کھل گئی تھی اس نے سائے کو خیمے سے باہر کی طرف جاتا ہوا دیکھا۔

سلطان اٹھ کے بیٹھ گیا۔ اس نے محسوس کیا کہ اس کے لیمپ کی جگہ تبدیل کر دی گئی ہے۔ پھر اسے دیکھ کر اور تعجب ہوا کہ اس کے بستر کے قریب تکونی روٹیاں رکھی ہیں۔ روٹیوں کی ساخت اس طرح کی تھی جیسی اسمٰعیلی پکاتے تھے۔ روٹی کے اوپر ایک کاغذ کا پرچا رکھا تھا۔ اس پرچے کو خنجر کی نوک سے روٹی میں پیوست کیا گیا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ وہ خنجر زہر آلود تھا۔ سلطان نے خنجر ہٹا کر کاغذ نکالا جب اس نے پڑھا تو لکھا تھا۔

"سلطنت کے بادشاہ کی قسم۔ تیرے پاس جو کچھ ہے
وہ نہ رہے گا۔ ہر چیز ہمارے قبضۂ اقتدار میں ہے تیری
طاقت اور اقتدار کے باوجود فتح ہماری ہوگی۔ ہم تجھے
یہ بتانا چاہتے ہیں کہ تجھے اس وقت تک زندہ رکھا جائے
گا جب تک تیرے اعمالوں کی تجھے سزا نہ مل جائے۔"

تحریر پڑھ کے سلطان نے ایک زور کی چیخ ماری۔ پہریدار اور محافظ بھاگ کے اندر آئے۔ سلطان نے انہیں روٹیاں، خنجر اور پرچا دکھایا۔ وہ سب خوفزدہ ہو گئے۔ شیخ الجبل سلطان کے سرہانے تک آیا تھا اور یہ رقعہ رکھ گیا تھا۔ کسی نے نہ تو اس کو دیکھا اور نہ پیروں کی آواز سنی تھی۔ مگر خیمے کے باہر جو کھریا مٹی اور راکھ بکھیری گئی تھی اس پر پاؤں کے نشان بنے تھے یہ نشان باہر کی طرف جا رہے تھے۔

سلطان نے کہا: میں نے شیخ الجبل کو جاتے ہوئے دیکھا ہے۔ لوگ اس کے بارے میں جو بتاتے ہیں وہ اس سے مختلف ہے۔

پھر اس نے اپنے نائب کو بلا کر حکم دیا "کسی کو شیخ الجبل کے پاس بھیجو اور اس سے کہو کہ ہمیں یہاں سے بخیریت نکل جانے دے۔ اس سے یہ کہنا کہ وہ میری پچھلی غلطیوں کو معاف کر دے۔"

سلطان کے نائب نے ایک ہرکارہ شیخ الجبل کے پاس بھیجا۔ ہرکارہ سیدھا اس کے پاس پہنچ گیا اور سلطان کی درخواست زبانی پیش کی۔

شیخ الجبل نے جواب دیا "تمہارا بادشاہ جب تک محاصرہ برقرار رکھے گا تب تک اس کی جان کی ضمانت نہیں دی جا سکتی۔"

ہرکارے نے واپس جا کر سلطان کے سامنے شیخ الجبل کا جواب بیان کر دیا۔ سلطان صلاح الدین یہ جواب سن کر محاصرہ چھوڑ چھاڑ اور لشکر لے کر اسی وقت روانہ ہو گیا۔

لشکر کے راستے میں ابن منذرخ نام کا ایک پل پڑتا ہے۔ جب لشکر اس پل پر پہنچا تو پل کے محافظوں نے صلاح الدین کو بتایا کہ وہ بے فکر پل سے گزر جائے کیونکہ اس کی راہداری کا پروانہ پل کے محافظ سردار کے پاس پہنچ گیا ہے۔

ابوالفراس کا یہ بیان کس قدر مضحکہ خیز اور لغو ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ حشیش کے فدائی مسلمان بادشاہوں اور والیوں کے لشکر میں قبل از وقت ملازمت حاصل کر لیتے تھے تاکہ وقت پڑنے پر وہ بادشاہ یا والی کو آسانی سے اپنے خنجر کا نشانہ بنا سکیں۔ یہ بات خود سلطان کو بھی معلوم تھی اور اس پر دو بار قاتلانہ حملہ ہو چکا تھا۔ غور کرنے کی بات یہ ہے کہ اگر سلطان حشیشین کے شیخ الجبل سے خوفزدہ ہوتا تو اس سے بدلہ لینے کے لیے ان خطرناک قاتلوں کے سب سے مضبوط مرکز پر حملہ کیوں کرتا؟

اصل قصہ یہ تھا کہ سلطان صلاح الدین نے پہلے تو حشیشین کے چھوٹے قلعے اور آبادیاں تہس نہس کیں پھر اس نے ان کے مغربی مرکز مصیاف کا محاصرہ کیا۔ یہ محاصرہ اس قدر سخت تھا اور سلطان کی منجنیقوں نے قلعے پر اس قدر پتھر برسائے تھے کہ حشیشین اور ان کے شیخ الجبل کا ناطقہ بند ہو گیا اور انہیں اپنی بچت کی کوئی صورت نظر نہ آ رہی تھی۔ مصیاف پر رات دن پتھر برستے رہتے تھے۔ محاصرہ اتنا سخت تھا کہ شیخ الجبل کو باہر سے کوئی مدد نہ مل سکتی تھی۔ جب محاصرے کی سختیاں حد سے بڑھ گئیں تو شیخ الجبل نے سلطان صلاح الدین کے ماموں شہاب الدین حارمی کے پاس اپنی سفارت بھیجی اور ان سے درخواست کی وہ سلطان صلاح الدین سے اس کی جان بخشی کرا دیں۔

سلطان کے ماموں نے سلطان سے سفارش کی کہ شیخ الجبل کو معاف کر دیا جائے وہ وعدہ کرتا ہے سلطان صلاح الدین کے لشکر کی طرف کبھی رخ نہیں کرے گا اور نہ سلطان کے کسی معاملے میں دخل دے گا۔ سلطان صلاح الدین نے صاف انکار کر دیا کہ اس کے دین کے وعدوں کا کوئی اعتبار نہیں کیا جا سکتا پھر یہ کہ اس نے دو مرتبہ سلطان پر قاتلانہ حملے کرائے ہیں اس لیے اسے زندہ نہیں چھوڑا جائے گا۔ شہاب الدین حارمی نے شیخ الجبل کو اطلاع بھیج دی کہ اس کی حرکتوں سے سلطان بے انتہا ناراض ہے اور اسے معاف کرنے پر کسی طرح آمادہ نہیں ہو رہا۔

شیخ الجبل بہت گھبرایا ہوا تھا۔ اس نے شہاب سے درخواست کی کہ وہ شیخ الجبل کو سلطان کے سامنے پیش کرے اور شیخ الجبل خود سلطان سے معافی مانگے گا اور آئندہ کے لیے اس کے معاملات میں دخل دینے سے توبہ کرے گا۔ پس شہاب الدین حماۃ سے چل کے سلطان صلاح الدین کے پاس آیا اور دوبارہ سفارش کی اور شیخ الجبل کو سلطان کے سامنے پیش کرنے کی اجازت چاہی۔ اس طرح شیخ الجبل، شہاب الدین حارمی کے ساتھ سلطان صلاح الدین کے سامنے پیش ہوا۔ وہ ایک لمبے قد کا آدمی تھا اور چلنے میں اس کی کمر میں خم پیدا ہو جاتا تھا۔ وہ سر جھکائے ہوئے سلطان کے سامنے آیا اور اس سے معافی طلب کی۔ سلطان نے اپنے ماموں کی بے انتہا سفارش پر اسے معاف کر دیا اور محاصرہ اٹھا کر واپس آ گیا۔

پچھلے صفحات میں ذکر ہو چکا ہے کہ سلطان صلاح الدین نے اپنے مصر کے قیام کے دوران جب وہ امیر صلاح الدین اور مصر کا گورنر تھا، اپنے بھائی شمس الدولہ توران شاہ کو ایک لشکر کے ساتھ یمن کی فتح پر بھیجا تھا۔ توران شاہ نے وہاں پہنچ کے یمن کو فتح کیا اور اس ملک کا پورا انتظام کر کے صلاح الدین کے بلاوے پر دمشق آ گیا۔ صلاح الدین اپنی طاقت دمشق اور قاہرہ کے گرد جمع کر رہا تھا اس لیے اس نے توران شاہ کو یمن سے واپس بلا لیا تھا۔

ادھر سلطان صلاح الدین حشیشین کے مرکز مصیاف کا محاصرہ اٹھانے کے بعد دمشق واپس آیا تو توران شاہ وہاں موجود تھا۔ صلاح الدین تقریباً دو سال سے مصر سے باہر تھا اور وہاں جانا چاہتا تھا۔ توران شاہ کے آنے سے اسے تقویت ملی۔ اس نے دمشق کا انتظام توران شاہ کے سپرد کیا اور خود مصر روانہ ہو گیا۔ صلاح الدین جب مصر سے دمشق آیا تھا تو اس نے ابوالحسن بن ستان سنجان بن محمد کو مصر میں اپنا نائب مقرر کیا تھا جو اب تک بڑی خوبی سے انتظام سلطنت چلا رہا تھا۔

سلطان صلاح الدین کا قاہرہ میں بڑا شاندار استقبال کیا گیا۔ وہ یہاں سے روانہ ہوا تھا تو امیر صلاح الدین تھا اور اب وہ سلطان دمشق اور قاہرہ ہو کر واپس آیا تھا۔ اس کے علاوہ سلطان

نے حشیشین جیسے ظالم جابر اور خونی فرقے کو گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کر دیا۔ یہ فرقہ مصر کے سابق فاطمی امیروں کو بھی امیرِ مصر کے خلاف بھڑکایا کرتا تھا۔ فرنگی بھی ان قاتلوں سے کام لیا کرتے تھے۔ اس طرح سلطان صلاح الدین نے حشیشین کا زور توڑ کے فرنگیوں اور سابق فاطمی اُمرا کا بھی بالواسطہ زور توڑ دیا تھا۔

سلطان صلاح الدین ایوبیؒ کا قاہرہ کی سرحد پر پُرجوش استقبال کیا گیا اور وہاں سے دارالوزارت اور شاہی محل تک اُسے جلوس کی شکل میں لایا گیا۔ یہ جلوس جن بستیوں اور راستوں سے گزرتا وہاں کے لوگ جلوس میں شامل ہو جاتے۔ اس طرح شاہی محل تک پہنچتے پہنچتے جلوس میں شامل لوگوں کی تعداد دو لاکھ سے زیادہ ہو گئی۔ اس میں وہ مرد، عورتیں اور بچے شامل نہ تھے جو اپنے بالا خانوں پر کھڑے سلطان صلاح الدین کے حق میں پُرجوش نعرے بلند کر رہے تھے۔

مصر کی فوج جو کمک کے طور پر دمشق بھیجی گئی تھی وہ رخصت سے پہلے ہی واپس آ چکی تھی۔ سلطان نے دوسرے دن دربارِ عام لگایا۔ غربا اور مساکین میں اناج، کپڑا اور نقد رقم تقسیم کی گئی۔ صلاح الدین شام کی جنگوں میں حاصل ہونے والے مالِ غنیمت کا ایک حصہ مصر ساتھ لے کے آیا تھا۔ اس کو مصر کے بیت المال میں جمع کر دیا گیا۔ یہ دراصل اُس حقِ خدمت کا صلہ تھا جو مصری فوج نے ملکِ شام میں شامیوں کے دوش بدوش میدانِ جنگ میں ادا کی تھی۔

سلطان صلاح الدین کو سب سے بڑی فکر فصیلِ شہر اور فصیلِ قلعہ کی تھی جو اُس کے خیال میں بیرونی حملوں کو روکنے کے قابل نہ تھیں۔ سلطان نے دونوں فصیلوں کی مرمت اور اُس میں اضافے کا ایک نیا منصوبہ بنایا اور اس کام پر قراقوش کو مامور کیا۔ قراقوش سلطان کے لیے بڑی خدمات انجام دے چکا تھا اور بڑا تجربے کار تھا۔ فصیل کا احاطہ تقریباً اُنیس ہزار تین سو فیٹ تھا۔ یہ کام شروع ہوا تو بس ہوتا ہی رہا اور تیس سال بعد سلطان صلاح الدین کے بھتیجے نے اسے تکمیل تک پہنچایا۔ قلعے کے بانی کا یہ کتبہ باب المدرج پر اب بھی موجود ہے۔

"الملک الناصر صلاح الدنیا والدین، ابو فتح یوسف بن ایوبؒ نے اس قلعے کی تعمیر کا حکم دیا اور زیرِ ہدایت العادل سیف الدین ابو بکر محمد اور زیرِ اہتمام امیرِ مملکت قراقش بن عبداللہ مملوک ملک الناصر، ۵۷۹ھ ہجری مطابق ۱۱۸۳-۱۱۸۲ء تعمیر ہوا۔"

اس کے علاوہ ۲۸۰ فیٹ گہرا کنواں، بیر یوسف صلاح الدین کے حکم سے قراقش نے چٹان میں کھدوایا تھا۔ صلاح الدین کی مشہور یادگاروں میں قاہرہ کا طویل کاریز اور بالائی مصر میں بڑی نہر اب تک موجود ہے۔ اس نہر کو بحرِ یوسف کہتے ہیں۔ رفاہِ عامہ کے کاموں میں جیزہ کی پتھر دیوار ہے۔ یہ دیوار مصر کے اہرام کے پتھروں سے صحرا کے دامن میں سات میل دُور چالیس محرابوں پر تعمیر کی گئی ہے۔ یہ دراصل عربیوں کے حملوں کی مدافعت کے لیے تیار کی گئی تھی لیکن کبھی اس کی ضرورت پیش نہیں آئی۔

سلطان صلاح الدین کو مصر میں مصروف دیکھ کر فرنگی نے ہاتھ پیر نکالے اور ایک بڑے لشکر کے ساتھ قلعہ الحارم پر حملہ کر دیا۔ یہ قلعہ شاہ حلب ملک الصالح کے علاقے میں تھا۔ ملک الصالح تو قلعہ کو کوئی کمک نہ بھیج سکا مگر بعلبک کے گورنر نے اس وقت بڑا کام دکھایا۔ وہاں کا گورنر ازمغانہ کا باپ امیر شمس الدین بن المقدم تھا۔ وہ بعلبک سے فوجی دستے لے کر نکلا اور الحارم کے قریب ایک دلدلی جنگل میں چھپ گیا اور اچانک فرنگیوں پر حملہ کر کے انھیں شدید نقصان پہنچایا۔ المقدم نے دو سو فرنگیوں کو گرفتار کر لیا۔

امیر المقدم کے ہاتھوں مار کھا کر فرنگی لشکر نے دمشق کی سرحد پر حملہ کر دیا۔ دمشق کے حاکم توران شاہ کو فرنگیوں کے حملے کی اطلاع ملی تو وہ دمشق سے فوج لے کر نکلا اور مروج کے مقام پر فرنگیوں کے مقابل ہوا۔ مروج میں فرنگیوں اور دمشق کی فوج میں شدید جنگ ہوئی، جس میں توران شاہ کو شکست ہو گئی اور اُسے پسپا ہونا پڑا۔ اس جنگ میں دمشق کا ایک مشہور سردار سیف الدین ابوبکر بن السلیدہ فرنگیوں کے ہاتھوں گرفتار ہو گیا۔

فرنگیوں کے ان حملوں کی خبر قاہرہ پہنچی تو سلطان صلاح الدین فوراً لشکر لے کر فرنگی علاقوں کی طرف چل پڑا۔ وہ عقلان پہنچا مگر اُس کے مقابلے میں کوئی نہیں آیا۔ خیال تھا کہ شاید نصرانی لشکر دمشق پر حملہ کرنے گیا ہے۔ سلطان نے رملہ اور لد کو تاراج کیا اور یروشلم کی سرحد کے [illegible] تک اپنے لشکر کو پھیلا دیا۔ مگر اچانک نہ معلوم کس طرف سے نکل کے فرنگی لشکر سلطان صلاح الدین کے سامنے آ گیا۔ لشکر کے آگے بشپ آف بیت اللحم، اصلی صلیب۔ جسے صلیب الصلبوت کہا جاتا ہے، اُٹھائے چل رہا تھا۔

فرنگیوں کے لشکر کی تعداد کا کہیں ذکر نہیں ملتا بہرحال یہ ایک بڑا لشکر تھا جس میں بامیان، ریجینالڈ آف سیدون، ڈوڈی، ماشر

آف کی تمیل اور جو سلین دے سینٹ جیسے فرنگیوں کے لیڈر کے موجود تھے۔ مغربی مورخ ایک طرف یہ بتاتے ہیں کہ سلطان صلاح الدین کے ساتھ چھبیس ہزار کا لشکر تھا پھر دوسرے ہی لمحے یہ کہتے ہیں کہ سلطان کا لشکر مختلف شہروں میں گھسا ہوا حملے کر رہا تھا۔ مسلم مورخوں کے مطابق سلطان کا تمام لشکر منتشر حالت میں شہروں کو گھیرنے میں مصروف تھا اور سلطان کے ساتھ اُس وقت اُس کے محافظ دستوں اور چند سرداروں کے علاوہ اور کوئی نہ تھا۔ سلطان اگر چاہتا تو پسپا ہو کر پیچھے ہٹ سکتا تھا مگر اُس نے اس مختصر سواروں کے ساتھ دشمن کے مقابلے کا فیصلہ کیا اور میدان میں ڈٹ گیا۔

چنانچہ رملہ کے قریب تل جزار کے مقام پر ۲۵ نومبر ۱۱۷۷ء کو سلطان صلاح الدین اور نصرانی لشکر کا مقابلہ ہوا۔ ایک طرف سلطان اپنے محافظ دستے اور چند حواریوں کے ساتھ موجود تھا اور اُس کے مقابلے پر ۳۷۵ نائٹس، سیکڑوں ٹمپلرز اور ہزاروں سواروں اور پیادوں کا نصرانی لشکر تھا۔ کہتے ہیں کہ یہ بڑی شدید جنگ تھی۔ ایک طرف سے نائٹس اور ٹمپلرز حملہ آور ہو رہے تھے تو دوسری طرف نصرانی سواروں کے غول سلطان کو گھیرے میں لینے کی کوشش کر رہے تھے۔

سلطان صلاح الدین اور اُن کے محافظوں اور حواریوں نے بڑا سخت مقابلہ کیا۔ سلطان کے ایک بھتیجے محمد نے سلطان کی حفاظت میں بہادری کے بڑے جوہر دکھائے۔ سلطان کا دوسرا بھتیجا جس کا ابھی عنفوان شباب تھا اور مسیں بھیگ رہی تھیں وہ سلطان کی حفاظت کرتے کرتے قربان ہو گیا۔ تمام دن لڑائی ہوتی رہی پھر شام ہوتے ہوتے نصرانیوں نے ایک زبردست حملہ کر کے سلطان کے حفاظتی دستے کو پیچھے ہٹنے پر مجبور کر دیا۔ سلطان نے رات کے اندھیرے سے فائدہ اُٹھایا اور اپنا گھوڑا جنگل کی طرف موڑ دیا۔ سلطان کے اہم سرداروں میں فقیہ عیسیٰ ہکاری بھی تھے جو شام تک مقابلہ کرتے رہے پھر رات ہونے پر ایک طرف نکل گئے مگر راستہ بھول گئے اور نصرانیوں نے انھیں گرفتار کر لیا۔

سلطان صلاح الدین نے کسی اچانک حملے کی پیش بندی نہیں کی تھی اور لشکر کو دور تک پھیلا دیا تھا اس لیے انھیں شکست کا سامنا کرنا پڑا۔ عیسائیوں نے سلطان کی اس شکست پر بہت بغلیں بجائیں۔ سلطان کئی دن جنگلوں میں بھٹکتا پھرا۔ وہ اور اُس کے چند ساتھی بھوک و پیاس کی تکلیف سے بھی دوچار ہوئے پھر مصیبتیں جھیلتے ہوئے کسی طرح قاہرہ پہنچے۔ سلطان کو اس جنگ میں بھاری جانی نقصان اُٹھانا پڑا۔ جب انھیں معلوم ہوا کہ ان کے خاص دوست اور سردار فقیہ عیسیٰ ہکاری فرنگیوں کے ہاتھوں گرفتار ہوئے ہیں تو اُنہیں بہت افسوس ہوا۔

فقیہ عیسیٰ ہکاری کا حال یہ ہوا تھا کہ جب وہ شکست کھا کر پیچھے ہٹے تو رات ہو گئی تھی۔ اُن کے ساتھ اُن کے بھائی ظہیر اور کچھ ساتھی بھی تھے۔ یہ لوگ راستے سے بھٹک گئے اور رات بھر ادھر اُدھر بھٹکتے پھرے اور صبح دم انھیں فرنگیوں کے ایک دستے نے گرفتار کر لیا۔ سلطان صلاح الدین نے ان لوگوں کو ساٹھ ہزار دینار فدیہ ادا کر کے رہا کرا لیا۔ اس طرح مسلمانوں کا جانی نقصان کے علاوہ مالی نقصان بھی ہوا۔ اسلحہ کا پورا ذخیرہ اور سامان خورد و نوش بھی نصرانیوں کے ہاتھ لگا اور وہ اُسے یروشلم اُٹھا لے گئے۔

محاذ پر ایک ذرا سی غلطی کس طرح شکست کا شاخسانہ بن جاتی ہے اس کی مثال جزار کا معرکہ ہے۔ سلطان صلاح الدین نے عسقلان پہنچ کر جب نصرانیوں کو اپنے مقابل نہ پایا تو اُس نے اندازہ لگایا کہ نصرانی خوف زدہ ہو کر دُور کے شہروں میں بھاگ گئے ہیں لیکن یہ اندازہ غلط تھا۔ نصرانی لشکر نے سلطان کو اندر آنے کا موقع دیا تھا پھر جب سلطان نے اپنے لشکر کو ٹکڑوں اور گروہوں کی شکل میں شہروں میں گھس جانے کا حکم دیا تو نصرانیوں نے اس موقع سے بھرپور فائدہ اُٹھایا اور فوراً سلطان اور محافظ دستے کو گھیرے میں لے کر شکست سے دوچار کر دیا۔ اس مغربی مورخ نے لکھا ہے سلطان نے چھبیس ہزار لشکر کے ساتھ عسقلان پر حملہ کیا تھا پھر عیسائیوں نے انھیں جزار کے میدان میں بُری طرح شکست دی اور سلطان کے لشکر کو کاٹ کے رکھ دیا۔ جس کے نتیجے میں سلطان کا پورا لشکر قتل ہو گیا اور بمشکل چند لشکری میدان سے جانیں بچا کر بھاگ سکے تھے۔

مغربی مورخ کے اندازے میں اگرچہ بہت مبالغہ ہے لیکن یہ حقیقت ہے کہ سلطان کے ساتھ جانے والا لشکر اس بُری طرح تباہ ہوا تھا کہ سلطان کو اُسے از سرِ نو ترتیب دینا پڑا تھا۔ اپنی اس شکست کے بارے میں سلطان صلاح الدین نے دمشق میں اپنے بھائی توران شاہ کو جو خط لکھا تھا۔ وہ کچھ اس طرح تھا:

خط کے شروع میں حماسہ کے ایک شاعر کا ایک شعر لکھا تھا جس کا مطلب تھا کہ "میں نے تمھیں اس وقت یاد کیا جب ہمارے درمیان نیزوں کی بوچھاڑ تھی اور گندم گوں سیدھے نیزے ہم پر حملہ کر رہے تھے۔"

آگے چل کے سلطان نے لکھا تھا: "ہم کئی مرتبہ ہلاکت اور تباہی کے کنارے پر پہنچ گئے۔ اللہ تعالیٰ نے ہمیں ان خطرات سے بچایا۔ وہ ہم سے کوئی کام لینا چاہتا ہے اور اُسی کے حکم کے مطابق میں

ثابت قدم اور صحیح و سالم رہا۔"

سلطان صلاح الدین کے فوجی دستے فرنگیوں کے شہروں میں گھس گئے تھے۔ اُن میں سے کچھ شہید ہوئے، کچھ گرفتار ہوئے اور بہت کم بچ کے واپس آسکے۔ گرفتار ہونے والوں کو سلطان نے فدیہ ادا کرکے رہا کرالیا تھا۔

۱۱۷۸ء کے چند ماہ سلطان صلاح الدین اور اُس کے لشکر کے لیے بہت بُرے ثابت ہوئے۔ جنوب میں سلطان کو رملہ (جزار) میں شکست کا منہ دیکھنا پڑا اور ٹھیک اُسی وقت شمال میں حماۃ پر مصیبت آئی۔ اُن دنوں ایک فرنگی سردار ساحلِ شام پر فرنگیوں کی طاقت کو جمع کر رہا تھا۔ اُس نے دولت کے زور پر ایک بڑا لشکر بنا لیا تھا۔ اِس کی خبر دمشق میں پہنچ گئی تھی لیکن دمشق کے حاکم توران شاہ نے اِس پر کوئی توجہ نہ دی۔ تاریخ تو یہاں تک بتاتی ہے کہ جس وقت فرنگی لشکر حماۃ کی طرف بڑھ رہا تھا تو والیٔ دمشق حالات سے باخبر ہونے کے باوجود عیش و عشرت میں مبتلا تھا۔

اِس فرنگی سردار کے تحت فرنگیوں کے ایک بڑے لشکر نے حماۃ پر حملہ کر دیا۔ حماۃ کا حاکم سلطان صلاح الدین کا ماموں شہاب الدین حارمی تھا۔ وہ اُس وقت سخت بیمار تھا۔

فرنگیوں کا حملہ اِس قدر اچانک اور سخت تھا کہ حماۃ کا شہر آدھے سے زیادہ فرنگیوں کے قبضے میں آگیا۔ باقی شہر اور قلعہ مسلمانوں کے پاس رہا۔ مسلمان دراصل قلعہ بند ہو کر مدافعت کرنا چاہتے تھے لیکن اِس صورت میں انھیں بقیہ شہر سے بھی ہاتھ دھونا پڑتے تھے۔

اُدھر فرنگیوں کا محاصرہ سخت ہوتا جا رہا تھا۔ حاکمِ حماۃ تو صاحبِ فراش تھا اِس لیے اُس کے نائب نے تمام فوجی سرداروں کو اکٹھا کر کے مشورہ کیا۔ سرداروں نے مشورہ دیا کہ شہر کا ایک حصّہ تو دشمن کے قبضے میں جا چکا ہے اِس لیے اگر اِس وقت کمزوری کا اظہار کیا گیا تو دشمن پورے شہر پر قابض ہو جائے گا پھر قلعے کو بچانا ناممکن ہو جائے گا۔ اِس لیے رائے یہ ٹھہری کہ بجائے آدھے شہر کی حفاظت کرنے کے "یا تختہ یا تخت" کے مصداق شہر کے مقبوضہ حصّے کو واپس لینے کے لیے جوابی حملہ کر دیا جائے اِس سے گومگو کی حالت ختم ہو جائے گی اور جلد فیصلہ بھی ہو جائے گا۔

پس حماۃ کے فوجی سردار مجاہدینِ اسلام کی طرح جھرجھری لے کر اُٹھ کھڑے ہوئے۔ اپنے سرداروں کا جوش و جذبہ دیکھ کر اُن کے ماتحت لشکری بھی سرفروشی پر تیار ہو گئے اور دوسرے دن مسلمان نے اچانک فرنگیوں پر جوابی حملہ شروع کر دیا۔ فرنگی اِس کا تصور بھی نہ کر سکتے تھے۔ وہ تو یہ سمجھ کے محاصرہ کیے ہوئے تھے کہ دو چار دن میں شہر کا باقی حصّہ اُن کے قبضے میں آجائے گا اور پھر وہ قلعے کو مضبوطی سے محاصرے میں لے کر اُس پر بھی قبضہ کر لیں گے۔

مسلمانوں کے اِس جوابی حملے سے وہ سخت پریشان ہوئے۔ اُنھوں نے قدم جمانے کی بہت کوشش کی لیکن مسلمان اللہ اکبر کے نعرے لگاتے اُن پر اِس طرح جا پڑے جیسے عقاب اپنے شکار پر جھپٹتا ہے اور دیکھتے ہی دیکھتے اُنھوں نے سیکڑوں فرنگیوں کو تہ تیغ کر دیا۔ فرنگی حملہ آور بدحواس ہو گئے اور انھیں پسپا ہونا پڑا۔ مسلمانوں نے شام ہونے سے پہلے شہر کا وہ حصّہ جو حملہ آوروں کے قبضے میں آگیا تھا اُن سے واپس لے لیا اور دفاع کو مضبوط کر کے مدافعتی انداز اختیار کر لیا۔

فرنگیوں میں افراتفری پڑ گئی تھی۔ اُن کے سردار نے بھی غنیمت سمجھا کہ مسلمانوں نے شہر واپس لینے کے بعد شہر سے باہر نکل کر حملہ نہیں کیا ورنہ شاید انھیں شکست کھا کر بھاگنا پڑتا۔ پھر دوسرے دن صبح کو مسلمانوں نے فصیلِ شہر سے جھانک کے دیکھا تو میدان صاف تھا۔ فرنگی اپنے خیمے اکھاڑ کے واپس جا چکے تھے۔ یہ حماۃ کے محاصرے کا تیسرا دن تھا کہ فرنگیوں کو مجبور ہو کے محاصرہ ختم کر کے حماۃ سے پیچھے ہٹنا پڑا۔

پھر اُسی دن اطلاع ملی کہ فرنگی حماۃ سے ہٹ کر "الحارم" پہنچ گئے ہیں اور اُنھوں نے "الحارم" پر سخت محاصرہ کر لیا ہے۔ حماۃ میں اتنی طاقت نہ تھی کہ وہ "الحارم" کی مدد کو جاتا۔ دمشق کا والی توران شاہ محفلِ عیش جما کے بیٹھا تھا۔ والیٔ حلب ملک الصالح کو الحارم کی مدد کرنا چاہیے تھی کیوں کہ یہ علاقہ اُسی کے پاس تھا مگر وہ اِس وجہ سے کوئی قدم نہ اٹھا سکا کہ اُس میں اور اُس کے وزیر گمشتگین میں سخت اختلاف پیدا ہو گیا تھا۔ حلب میں جب "الحارم" کے محاصرے کی خبر پہنچی تو الملک الصالح نے فوجی اقدام کے بجائے فرنگیوں کو ایک معقول رقم دے کر "الحارم" سے واپس جانے پر آمادہ کر لیا۔ اُس کے اِس بزدلانہ اقدام میں اُس کا مخالف وزیر گمشتگین بھی برابر کا شریک تھا۔

ملک الصالح نے الحارم کو بچانے کے لیے فرنگیوں کو ایک بڑی رقم ادا کی تھی۔ فرنگیوں نے الحارم کا محاصرہ تو اُٹھا لیا مگر اب اُن کے حوصلے بڑھ گئے تھے اور اُن کے ہاتھ مفت کی دولت بھی لگی تھی۔ اِدھر حماۃ والے مطمئن ہو گئے تھے کہ اُنھوں نے فرنگیوں کو شہر سے مار بھگایا ہے اِس لیے وہ اب اِدھر آنے کی جرأت نہ کریں گے لیکن فرنگی الحارم کو چھوڑ کے جاتے ہوئے اک دم حماۃ کی طرف گھوم پڑے۔ اُنھوں نے حماۃ شہر اور قلعے کو چھوڑ کے باقی تمام مضافاتی بستیاں تہ و بالا کر دیں اور انھیں لوٹ مار کے جلا دیا۔

حماۃ کا والی شہاب الدین حارمی جو حماۃ پر پہلے حملے کے وقت شدید بیمار تھا، اب اُس کا انتقال ہو چکا تھا۔ حماۃ والے اُس صدمے

سے دوچار تھے اور سلطان کی طرف سے کوئی نیا حاکم بھیجے جانے کے منتظر تھے کہ ایک بار پھر اُن پر فرنگیوں کی مصیبت نازل ہو گئی۔ مرحوم والیٔ حماۃ کے نائب نے ایک بار پھر مجلس مشورت منعقد کی اور طے پایا کہ فوراً فصیل شہر سے نکل کر فرنگیوں کا مقابلہ کیا جائے ورنہ مدافعتی جنگ میں شہر اُن کے ہاتھ سے نکل جائے گا۔ فرنگی اُس وقت تک آس پاس کی آبادی کو خاکستر کر کے حماۃ شہر پر حملے کی تیاری کر رہے تھے۔

پھر قبل اس کے کہ فرنگی حماۃ کی فصیلِ شہر پر حملہ آور ہوتے، حماۃ کے نائب کی سرکردگی میں وہاں موجود لشکر سروں سے کفن باندھ کے حملہ آوروں پر آپڑا۔ فرنگی، حماۃ کی فوج سے پہلے بھی شکست کھا چکے تھے اس لیے اُن کے کچھ بنائے نہ بن پڑی اور ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ حماۃ کی فوج نے اُن کی گھبراہٹ اور کمزوری سے فائدہ اُٹھایا اور بڑھ بڑھ کے اتنے زبردست حملے کیے کہ فرنگیوں کو پیچھے ہٹ کر پھر اپنی صف بندی کرنا پڑی۔ لیکن حماۃ کی فوج نے اُن کی ساری صف بندی توڑ پھوڑ کے رکھ دی اور اس قدر دباؤ ڈالا کہ فرنگیوں کو سر پہ پیر رکھ کر بھاگنا پڑا۔ اس طرح حماۃ والوں نے نہ صرف اپنے والی کی عدم موجودگی میں شہر اور قلعے کی پوری حفاظت کی بلکہ حملہ آوروں کو مار بھگایا اور اُن کے بہت سے لشکری گرفتار کر لیے۔

اس جنگ میں فرنگیوں کو بہت جانی نقصان ہوا تھا۔ اس لیے نائب والی نے فرنگی مقتولین کے سروں کو اکٹھا کیا اور فرنگی قیدیوں کے ساتھ فتح کے اس تحفے کو سلطان صلاح الدین ایوبی کے پاس روانہ کیا۔ سلطان صلاح الدین ایوبی نے رملے کے قریب یروشلم کے لشکر کے ہاتھوں بُری طرح شکست کھائی تھی اور اُس کے ساتھ کا مصری لشکر آدھے سے زیادہ تباہ ہو گیا تھا لیکن سلطان نے اس شکست سے بددل ہونے کے بجائے سبق سیکھا اور صرف تین ماہ کے اندر ایک نیا لشکر تیار کر لیا۔ سلطان کا رابطہ دمشق سے قائم تھا اور اُسے دمشق کے شمال میں مسلمان علاقوں پر فرنگیوں کے حملوں کی برابر اطلاعات مل رہی تھیں اس لیے وہ قاہرہ سے بڑی تیزی سے دمشق کے شمالی اور مشرقی علاقوں کو بچانے روانہ ہوا۔

سلطان صلاح الدین ابھی پہنچا بھی نہ تھا کہ حماۃ پر فرنگیوں کے دوسرے حملے کی اطلاع ملی اور سلطان کے حمص پہنچنے سے قبل ہی حماۃ والوں نے فرنگیوں کو شکست دے کر بھگا دیا۔ پھر جب سلطان حمص پہنچ گیا تو حماۃ والوں کی طرف سے فرنگیوں کی شکست کی نوید کے ساتھ فرنگی قیدی اور فرنگی مقتولین کے سر اُس کے سامنے پیش کیے گئے۔ سلطان کے لشکر کو جنوب میں شکست ہوئی تھی اور اُس کے بہت سے لشکری قتل ہوئے تھے۔ اُس کے بدلے میں سلطان نے فرنگی قیدیوں کو قتل کرنے کا حکم دے دیا۔

سلطان کو حمص میں آئے ہوئے تیسرا دن تھا کہ اُسے فرنگی قیدیوں کا ایک اور تحفہ موصول ہوا۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ شام کے نئے فرنگی سردار نے فرنگیوں کو اکٹھا کر کے جو لشکر ترتیب دیا تھا اُس نے سب سے پہلے حلب کے علاقے پر حملہ کیا تھا اور اُس حملے میں بعلبک کا گورنر امیر شمس الدین المقدم فرنگیوں کے مقابل آیا تھا اور اس نے فرنگیوں کو شکست دے کر مار بھگایا تھا۔ امیر المقدم کے ہاتھ بہت سے فرنگی قیدی بھی آئے تھے جنھیں وہ اپنے ساتھ بعلبک لے گیا تھا چونکہ اُس وقت سلطان صلاح الدین ایوبی مصر گیا ہوا تھا اس لیے المقدم نے فرنگی قیدیوں کو قید خانے میں رکھا تھا کہ جب سلطان مصر سے واپس آئے تو اپنی کارکردگی کے ثبوت میں المقدم ان قیدیوں کو سلطان کے سامنے پیش کرے۔

المقدم کو جب اطلاع ملی کہ سلطان صلاح الدین مصر سے حمص پہنچ گیا ہے تو وہ فوراً فرنگی قیدیوں کو ساتھ لے کر سلطان کی طرف روانہ ہوا۔ امیر المقدم کے ساتھ اُس کی بیٹی ارمغانہ بھی تھی۔ جب یہ باپ بیٹی سلطان کے سامنے پہنچے تو سلطان صلاح الدین کے پاس اُس کا بہادر بھتیجا عزالدین فرخ شاہ بھی بیٹھا تھا۔ فرخ شاہ اور ارمغانہ کی نظریں چار ہوئیں تو اُن کے دلوں پر جیسے قیامت گزر گئی۔ ارمغانہ نے تو حیا کی وجہ سے چند لمحوں کے بعد اپنی نظریں نیچی کر لیں لیکن فرخ کی نظر دل کی پیاس تو بجھتی ہی نہ تھی وہ ٹکٹکی باندھے ارمغانہ کو دیکھے جا رہا تھا۔

امیر المقدم نے سلطان کو سلام پیش کیا۔ باپ کی تقلید میں ارمغانہ بھی سلطان کے سامنے خم ہو کر آداب بجا لائی۔

"یہ تمہاری بیٹی ہے المقدم؟" سلطان نے سوالیہ انداز میں کہا۔

"جی عالی جاہ یہ میری بیٹی اور آپ کی کنیز ہے۔" المقدم نے بڑے مہذب طریقے سے جواب دیا۔

"کچھ دن پہلے تم نے بتایا تھا کہ یہ بیمار ہے۔ اب کیا حال ہے اس کا؟" سلطان کو پتا نہیں المقدم کی بیٹی میں کیوں دلچسپی پیدا ہو گئی تھی۔ اُس نے ایک تو اُسے پہچان لیا پھر اب اُس کی بیماری کا حال بھی پوچھ رہا تھا۔

"ارمغانہ اب بالکل ٹھیک ہے عالی جاہ۔" پھر المقدم نے بیٹی کی طرف دیکھ کے شاید طنزاً کہا۔ "تم خوش قسمت ہو ارمغانہ سلطان معظم نے نہ صرف تم کو یاد رکھا بلکہ تمہاری خیریت بھی دریافت کی ہے۔"

ارمغانہ نے جھک کے پھر تسلیم پیش کی اور ادب سے کہا۔ "میں سلطان معظم کی شکرگزار ہوں کہ انھوں نے میری خیریت دریافت فرمائی۔"

سلطان صلاح الدین نے ارمغانہ کو جواب دینے کے بجائے امیر المقدم سے کہا: "امیر المقدم، تمہاری بیٹی نے ہمارے بھتیجے عزالدین فرخ شاہ کے اوپر ایسا احسان کیا ہے جسے نہ ہم بھول سکتے ہیں اور نہ فرخ شاہ۔"

پھر سلطان نے فرخ شاہ کو سوالیہ نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا: "کیوں فرخ شاہ تمہارا کیا خیال ہے؟"

"عالی جاہ۔ میں نہ امیر شمس الدین ابن المقدم کو بھول سکتا ہوں اور نہ ان کی بیٹی کے احسان کو کبھی بھلا سکوں گا۔ کاش میں اس احسان کو کسی طرح اُتار سکتا۔" فرخ شاہ نے ٹھہر ٹھہر کے کہا اور آخر میں ارمغانہ کی طرف دیکھا۔

امیر المقدم شاید فرخ شاہ سے جل گیا تھا۔ اس نے فوراً بات کا رخ موڑا: "عالی جاہ! دمشق سے آپ کی غیر حاضری سے فائدہ اٹھا کر بدبخت فرنگیوں نے حلب کے زیر تسلط علاقے پر اچانک حملہ کر دیا۔" امیر المقدم نے سلطان کی توجہ دوسری طرف کرنے کے لیے اپنی کہانی شروع کر دی مگر سلطان نے قطع کلام کیا۔

سلطان اُس حملے کا تمام حال اور المقدم کی کارکردگی اپنے قاصدوں سے پہلے ہی سُن چکا تھا اس لیے اُس نے کہا: "المقدم ہمیں فرنگیوں کے حملے کا حال اور تمہاری دلیری کی تمام داستان اپنے آدمیوں سے معلوم ہو چکی ہے۔ ہم تمہارے اس دلیرانہ اور شجاعانہ کارنامے سے خوش ہوئے۔ ہم نے سنا ہے کہ تم نے کچھ فرنگیوں کو گرفتار کیا ہے۔ ان کا کیا بنا؟"

"عالی جاہ! اُن بدبختوں کو میں آپ کے قدموں میں پیش کرنے کے ساتھ لایا ہوں۔" المقدم نے بڑے فخر سے جس میں تکبر کی آمیزش تھی گردن اُٹھا کر فرخ شاہ کی طرف دیکھا۔

"بہت خوب۔" سلطان نے مسرت سے کہا: "ہم قیدیوں کو تمہاری صواب دید پر چھوڑتے ہیں۔ چاہو تو انھیں قتل کر دو یا پھر فدیہ لے کر چھوڑ دو۔"

"جو حکم ہو عالی جاہ۔" المقدم اور پھول گیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ قیدیوں کو قتل کرنے یا زرِ فدیہ لے کر چھوڑنے کا اختیار صرف بادشاہ یا سلطان کو ہوتا تھا۔ سوائے اس کے کہ سلطان اپنے طور پر یہ اختیار کسی گورنر یا والی کے سپرد کر دے۔

المقدم نے گردن گھما کر حاضرین کو دیکھا جیسے وہ یہ معلوم کرنا چاہتا ہو کہ سلطان کے اس حکم کا دوسرے امیروں اور سرداروں پر کیا اثر ہوا۔ اُس وقت اُس کی نظر فرخ شاہ پر پڑی جس کی نظریں ارمغانہ کے چہرے کا طواف کر رہی تھیں۔

المقدم بوکھلائے ہوئے لہجے میں بولا: "عالی جاہ۔ میں حضورِ عالی میں ایک درخواست اور پیش کرنا چاہتا ہوں!"

"اجازت ہے۔ کہو تم کیا چاہتے ہو کیوں کہ ہم بھی تمہیں ایک انعام دینا چاہتے ہیں۔" سلطان صلاح الدین نے بڑے خوش گوار لہجے میں کہا۔

امیر المقدم کو لالچ سوار ہو گیا۔ اُس نے کہا: "عالی جاہ! آپ مجھے پہلے انعام عطا فرمایئے تب میں اپنی درخواست پیش کروں گا۔"

"نہیں امیر المقدم۔ تم نے درخواست کا ذکر پہلے کیا ہے، اس لیے تم پہلے درخواست پیش کرو گے۔" سلطان متانت سے بولا۔

"عالی جاہ۔ میں درخواست کرتے ہوئے اس لیے گھبرا رہا ہوں کہ کہیں آپ میری درخواست نامنظور نہ فرما دیں اور پھر میں انعام سے بھی محروم رہ جاؤں۔" امیر المقدم نے اپنی لالچ کا اظہار کر دیا۔

سلطان نے المقدم کو یقین دلایا: "فکر نہ کرو المقدم۔ درخواست پیش کرو۔"

"عالی جاہ۔" امیر المقدم نے کہنا شروع کیا: "میری درخواست ہے کہ عالی جاہ مع اپنے تمام اُمرا اور والیانِ علاقہ جات کے میرے غریب خانہ کو عزت بخشیں اور میری بچی ارمغانہ کی شادی کی تقریب سعید میں شرکت فرمائیں۔"

"کیا کہا؟" سلطان چونک کے سیدھا ہو گیا: "کیا تم نے اپنی بچی کا رشتہ طے کر دیا ہے؟"

"جی عالی جاہ۔ بے ماں کی بچی ہے۔ میں اُسے زیادہ دن تک گھر نہیں بٹھا سکتا۔" المقدم نے بڑی معصومیت سے کہا اور کنکھیوں سے فرخ شاہ کی طرف دیکھا۔

فرخ شاہ کا چہرہ دھواں دھواں ہو رہا تھا۔ پتا نہیں اُسے کچھ دکھائی دے رہا تھا کہ نہیں۔ جب اُس نے المقدم کے ساتھ ارمغانہ کو سلطان کے پاس آتے دیکھا تھا تو وہ کس قدر خوش ہوا تھا۔ جب سے اب تک اس کی نظریں ارمغانہ ہی کے گرد گھوم رہی تھیں مگر المقدم نے یہ منحوس خبر سُنا کر اس کے حسین خوابوں کا تانا بانا بکھیر دیا تھا۔

اُدھر سلطان سناٹے میں آ گیا تھا۔ وہ نہ معلوم کیا سوچے بیٹھا تھا کہ المقدم نے بیٹی کی شادی کی خبر سُنا کر اسے بھی مبہوت کر دیا۔

امیر شمس الدین المقدم نے سلطان کو خاموش دیکھا تو اپنی التجا دہرائی: "کیا عالی جاہ۔ غلام کی درخواست کو شرفِ قبولیت عطا نہ فرمائیں گے؟"

"امیر المقدم۔" سلطان نے سپاٹ لہجے میں کہا: "بیٹی کی تقریب کب منعقد ہوگی؟"

المقدم نے انگلیوں پر حساب لگا کے بتایا: "قمری مہینہ ختم ہونے میں چار دن باقی ہیں بس نئے چاند کی چھ تاریخ کو ارمغانہ کا عقد (رخصتی) ہوگی۔"

"کیا عقد ابھی نہیں ہوا ہے؟" سلطان نے نہ جانے کیوں سوال کیا۔

"عالی جاہ۔ میرے خاندان میں منگنی ہی سب کچھ ہوتی ہے۔" امیر المقدم نے وضاحت کی۔ "منگنی میں نے دو ماہ پہلے کر دی تھی بس رخصتی باقی ہے۔"

"ابھی نکاح بھی تو باقی ہے امیر المقدم۔" سلطان نے پھر سوال کیا۔

"جی عالی جاہ۔ وہ بھی ہو جائے گا۔ بات تو منگنی ہی سے پکّی ہو جاتی ہے۔ ہم لوگوں میں منگنی توڑنے کا رواج نہیں ہے عالی جاہ۔" امیر المقدم نے اس طرح کہا جیسے یہ کوئی اہم بات نہیں ہے۔ وہ دراصل اپنی سادگی سادگی ہی میں سلطان اور خاص کر فرخ شاہ کو یہ بتا دینا چاہتا تھا کہ اُس نے ارمغانہ کا رشتہ طے کر دیا ہے اس لیے اُس کا خیال دل سے نکال دیا جائے۔

سلطان امیر المقدم کا مُنہ دیکھ کر رہ گیا۔

"ہمیں افسوس ہے امیر المقدم۔ ہم تمھاری اس خوشی میں شریک نہ ہوسکیں گے۔" سلطان نے افسردگی سے کہا۔

"عالی جاہ۔ اگر آپ مصروفیت کی وجہ سے شرکت نہیں فرما سکتے تو امیرزادہ فرخ شاہ کو حکم دیجیے کہ وہ آپ کی نمائندگی فرمائیں۔ ان کی شرکت میرے لیے باعثِ مسرت ہوگی۔" امیر المقدم نے سلطان سے امیرزادہ کی شرکت کی درخواست میں جھجک محسوس نہ کی۔

امیر المقدم کی اس بات پر ہر ایک حیران رہ گیا۔ امیرزادہ فرخ شاہ صرف حیران ہی نہیں بلکہ پریشان بھی ہو گیا۔ اُسے یوں محسوس ہوا جیسے المقدم نے اُس کے سینے میں دوسرا خنجر بھونک دیا ہے۔ اس کے لیے یہ خبر بھی قیامت سے کم نہ تھی کہ اُس کی پسند کو کسی اور کے حوالے کیا جا رہا ہے اس پر ستم بالائے ستم کہ اُسے شادی میں شریک ہو کے اپنے ہاتھوں سے ارمغانہ کو ڈولے میں بٹھانا ہے۔

بے چاری ارمغانہ اپنی جگہ پریشان تھی۔ اُس نے باپ کے سامنے قسم کھائی تھی کہ امیرزادہ فرخ شاہ کے علاوہ کسی اور جگہ شادی کرنے کے بجائے تمام عمر کنواری بیٹھی رہے گی لیکن پھر اُس کی قسم پر امیر المقدم نے بھی قسم کھائی تھی کہ اگر ارمغانہ سالِ رواں کے اندر المقدم کی مرضی کے مطابق شادی کرنے پر آمادہ نہ ہوئی تو وہ خنجر مار کر خودکشی کر لے گا۔

ان حالات میں بے چاری ارمغانہ کیا کرتی؟ اُس نے ا...
حارثہ سے مشورہ کیا۔ حارثہ، امیر المقدم کے احسانوں تلے د...
المقدم نے نہ صرف حارثہ کی شادی کے تمام اخراجات برداشت...
تھے بلکہ حارثہ کے والدین اور اُس کے شوہر کو اپنے ساتھ بعلبک...
تھا۔ حارثہ نے بھی ارمغانہ سے سفارش کی کہ وہ اپنے باپ کی جان ب...
لیے اُس کے کہنے کے مطابق شادی کر لے۔ یہ وہ باتیں تھیں ک...
کو شادی پر تیار ہونا اور اُسے امیرزادہ فرخ شاہ کی تصویر کو...
سے نکالنا پڑا۔

پھر امیر المقدم نے ارمغانہ پر ایک ظلم اور کیا وہ یہ کہ جب...
قیدیوں کو سلطان کے حضور پیش کرنے حمص جانے لگا تو بیٹی کو...
وہ بھی اُس کے ساتھ حمص چلے۔ اِس بات کی حارثہ نے سخت...
کی اور امیر المقدم کو باتوں باتوں میں یہ سمجھانے کی کوشش کی...
سلطان کے ساتھ امیرزادہ فرخ شاہ بھی ہو سکتا ہے۔ اگر ارمغانہ...
شاہ کا سامنا ہو گیا تو کوئی نیا گل بھی کھل سکتا ہے مگر ضدی الم...
دل میں تو فرخ شاہ کے خلاف غبار بھرا ہوا تھا۔ وہ ارمغانہ اور...
کی موجودگی میں یہ اعلان کرنا چاہتا تھا کہ اُس نے ارمغانہ کا کہ...
رشتہ کر دیا ہے اور المقدم نے یہ بات کر کے دکھا دی۔ اُ...
احساس ہی نہیں ہوا کہ ارمغانہ اور فرخ شاہ کا یہ بات سُن کر کس ق...
دکھا ہوگا۔ المقدم تو فرخ شاہ سے انتقام لینا چاہتا تھا اور وہ...
قدم پر انتقام لے رہا تھا۔ فرخ شاہ کو ارمغانہ کی شادی میں بلانا...
طرح کا انتقام تھا۔

سلطان نے ایک لمحہ سوچنے کے بعد امیر المقدم کی درخوا...
قبول کر لی۔ سلطان کو ایک موقع پر شُبہ ہوا تھا کہ شاید امیرزادہ...
شاہ کو ارمغانہ سے کچھ اُنسیت ہے۔ اُس نے سوچا تھا کہ کسی...
موقع پر وہ امیر المحترم سے اس سلسلے میں بات کرے گا۔ آج ا...
کو المقدم کے ساتھ دیکھ کر سلطان نے سوچا تھا کہ آج وہ فرخ...
اور ارمغانہ کی شادی کے لیے المقدم سے سفارش کرے گا بلکہ...
نے اپنی گفتگو میں یہ کہہ کر کہ آج وہ المقدم کو ایک انعام دے گ...
اس بات کا اشارہ کیا تھا کہ وہ فرخ شاہ کو المقدم کی فرزندی...
دینے کی سفارش کرے گا لیکن المقدم نے ارمغانہ کی شادی کا...
کر کے سلطان کو خاموش رہنے پر مجبور کر دیا۔

المقدم کی باتوں سے سلطان کی طبیعت کچھ مکدّر ہو گئی...
اس لیے اُس نے المقدم سے بے دلی سے کہا تھا: "ٹھیک...
ارمغانہ کی شادی میں فرخ شاہ شرکت کریں گے۔"

"عالی جاہ۔ میرے لیے یہ باعثِ انبساط اور فخر ہوگا ک...

زادہ فرخ شاہ میری بیٹی کی شادی میں سلطانِ معظم کی نیابت کریں۔ از راہِ الطاف خسروانہ عالی جاہ۔ امیر زادے کو تاکید فرمادیں کہ وہ اس سلسلہ میں کوئی تغافل نہ برتیں۔" المقدم کا انداز ملتجیانہ تھا لیکن اس سے اُس کی خباثت بھی ظاہر ہوتی تھی۔

" اطمینان رکھو امیر المقدم۔ امیر زادے ضرور شریک ہوں گے۔" اس کے ساتھ ہی سلطان کھڑا ہو گیا جو اس بات کی علامت تھی کہ دربار برخاست ہوا اور سب لوگ اپنے خیموں میں واپس جاسکتے ہیں۔

امیر المقدم ارمغانہ کو ساتھ لے کر خیمے سے نکل گیا۔ سلطان جاتے جاتے رُک گیا پھر اُس نے تخلیے کا حکم دیا۔ سب درباری تقریباً خیمے کے باہر جا چکے تھے۔ فرخ شاہ اور دو ایک امیر باقی رہ گئے تھے۔ تخلیے کا حکم سن کر وہ بھی خیمے کے پردے کی طرف بڑھے۔ فرخ شاہ بھی جانے والوں میں شامل تھا اور بھاری قدموں سے خیالات میں کھویا ہوا چل رہا تھا۔

سلطان اس دوران پھر بیٹھ گیا تھا۔ اس نے غلام سے سرگوشی میں کہا کہ وہ فرخ شاہ کو واپس لے آئے۔ غلام تیزی سے فرخ شاہ کی طرف بڑھا جو خیمے کا پردہ اٹھا کر باہر نکلنے والا تھا۔

"سلطان آپ کو یاد فرما رہے ہیں امیر زادے۔" غلام نے آہستہ سے کہا۔

فرخ شاہ چونک پڑا، پھر حواس درست کرتے ہوئے بولا۔ "مجھے بُلا رہے ہیں سلطان؟" جیسے اُسے غلام کی بات پر اعتبار نہ آیا ہو۔

"جی ہاں امیر زادے۔ سلطانِ معظم نے مجھے آپ کو واپس لانے کا حکم دیا ہے۔" غلام نے اُسے ٹھہر ٹھہر کے سمجھایا۔

فرخ شاہ اُس کے ساتھ واپس آ گیا۔ سلطان مسند پر بیٹھا تھا۔ اُس نے فرخ شاہ کو اپنے سامنے بٹھا لیا اور بزرگوں کی طرح سمجھانا شروع کیا۔

"فرخ شاہ، ہم نے تمھیں یہ سمجھانے کے لیے بُلایا ہے کہ امیر شمس الدین المقدم ایک بہترین ناظم، مدبر، فنونِ جنگ کا ماہر اور مردِ میدان ہے لیکن یہ شخص قابلِ اعتماد نہیں۔ دوسرے کے احسان کو ایک لمحے میں بھول جاتا ہے اور سازشی ذہن کا مالک ہے۔ اُس نے اپنی بیٹی کا رشتہ کہیں اور کر دیا۔ اس کا ہمیں افسوس ہوا تھا۔ اس لیے کہ اس بہادر اور انسان دوست لڑکی کو ہم نے تمہارے لیے پسند کیا تھا اور آج اس سلسلے میں ہم المقدم سے گفتگو کرنے والے تھے مگر اُس نے اُس کی شادی کی اطلاع دے کر ہمیں روک دیا مگر اب ہم اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ یہ اچھا ہی ہوا کہ تم اس رشتے سے بچ گئے۔ ظاہر ہے کہ اگر اُس کی بیٹی سے شادی کے بعد تمہارا اور اُس کا روز سامنا ہوتا اور اُس کے دل میں تمھارے لیے جو کدورت ہے اُس کی بنا پر جلد یا بدیر کوئی نہ کوئی فتنہ ضرور کھڑا ہوتا تھا۔"

"میں سلطانِ معظم کے خیالات سے بالکل متفق ہوں۔" فرخ شاہ نے سلطان کے خیالات کی تائید کر دی۔

"صرف متفق نہیں فرخ شاہ۔" سلطان نے زور دے کے کہا۔ "تم ابھی جوان ہو اور تمھیں بہت ترقی کرنا ہے۔ اس لیے تمھیں پُرسکون ہونا چاہیئے اور اس سکون کے لیے تمھیں جلد از جلد شادی کرنا ہوگی۔ ہم تمہارے لیے کوئی معقول لڑکی پسند کریں گے۔"

"بہتر ہے، سلطانِ معظم۔" فرخ شاہ کو ذرا تسلی ہوئی۔

"آپ مجھے ہر حال میں اپنا تابعدار پائیں گے۔"

"شاباش۔ ہم تمھیں اور تقی الدین کو اپنے بیٹوں میں شمار کرتے ہیں۔"

المظفر تقی الدین اور عزیز الدین فرخ شاہ دونوں سگے بھائی تھے۔ ان دونوں بھائیوں نے سلطان صلاح الدین ایوبی کی صلیبی جنگوں میں بڑے نمایاں کارنامے انجام دیے تھے۔

سلطان صلاح الدین کی باتوں سے فرخ شاہ کو بڑا حوصلہ ہوا اور شاید اُس نے یہ سوچا کہ اب اور بھی غم ہیں زمانے میں محبت کے سوا۔

اور اُس نے فیصلہ کیا کہ وہ محبت میں آنسو بہانے کے بجائے میدان میں دشمن کا خون بہائے گا۔ اُس دن سے امیر زادہ فرخ شاہ کے معمولات میں ایک عجیب قسم کی تبدیلی آ گئی اور عشق و عاشقی میں اُلجھا ہوا ذہن خالی ہوا اور اس میں جوشِ جہاد اور شوقِ شہادت کا دریا موجیں مارنے لگا۔

اس زمانے میں بالڈون چہارم شاہ یروشلم نے ایک بڑے لشکر کے ساتھ دمشق کے علاقے پر حملہ کیا۔ اس فرنگی لشکر نے مسلمانوں کی آبادیاں برباد کر دیں، بڑی خوں ریزی کی اور بہت سے مسلمانوں کو گرفتار کر لیا۔ سلطان نے خبر پاتے ہی ایک لشکر اُدھر روانہ کیا۔ اس لشکر کی سپہ سالاری سلطان نے عزیز الدین فرخ شاہ کو دی۔ فرخ شاہ بڑی تیزی سے دشمن کی طرف بڑھا۔ فرنگی لشکر قتل و غارت گری اور لوٹ مار کے بعد واپس جانا چاہتا تھا کہ فرخ شاہ لشکر لے کر اُن کے مقابلے پر پہنچا۔ نصرانی اور اسلامی لشکر میں بڑی خوں ریز جنگ ہوئی۔ فرخ شاہ نے شجاعت کے

خوب جوہر دکھائے اور نصرانیوں کو میدان چھوڑنے پر مجبور کر دیا۔
نصرانی لشکر بڑی بے سروسامانی کے عالم میں پسپا ہوا۔
مسلمانوں نے بہت سے نصرانی فوجیوں کو گرفتار کر لیا۔ ایک دوبدو جنگ میں نصرانیوں کے سردار ہمفری کو جس کی بہادری کے بہت چرچے تھے فرخ شاہ کے ہاتھوں مارا گیا۔ مغربی مؤرخوں نے لکھا ہے کہ ہمفری آف ٹورون، یروشلم کے شاہ بالڈون کو بچاتے ہوئے مسلمانوں کے ہاتھوں مارا گیا۔ ہمفری کی بہادری کے سلسلے میں ابن الاثیر نے لکھا ہے۔

"الفاظ ہمفری کی تعریف سے قاصر ہیں۔ وہ بہادری اور چابکدستی کے لیے ضرب المثل تھا۔ مسلمانوں کی تہدید، تنبیہ اور پریشان کرنے کے لیے خدا نے اُسے عذاب کی صورت میں نازل کر رکھا تھا۔"

سلطان صلاح الدین نے عزالدین فرخ شاہ کو ایک لشکر کی سرداری کا یہ پہلا موقع دیا تھا جس میں فرخ شاہ نے ہمفری آف ٹورون کو قتل کر کے دشمن کو بھاگنے پر مجبور کر دیا تھا۔

ہمفری کے مارے جانے کا نصرانیوں کو بڑا قلق تھا۔ چنانچہ اُس کا بدلہ لینے کے لیے انطاکیہ اور لاذقیہ کے پرنس نے مسلمانوں کے قلعہ شیرز پر حملہ کر دیا تھا۔ حاکم شیرز نے سلطان صلاح الدین کو کمک کے لیے اطلاع بھجوائی۔ سلطان مرکز پر موجود نہ تھا۔ وہ بلنیاس گیا ہوا تھا۔ پھر سلطان نے اطلاع پا کر فرخ شاہ کے دوسرے بھائی تقی الدین عمر اور ناصر الدین کو فوجی کمک کے ساتھ شیرز بھیج دیا۔

سلطان صلاح الدین ایوبی بانیاس اس لیے گیا تھا کہ وہاں فرنگیوں نے حضرت یعقوب علیہ السلام کے گھر کے قریب ایک قلعہ بنا لیا تھا جس کا نام مخاضۃ الاضرار تھا۔ پس سلطان نے دمشق سے لشکر کے ساتھ کوچ کیا اور رملہ پہنچ گیا۔ وہاں بیٹھ کے سلطان نے نصرانی شہروں پر حملے کے لیے اپنے فوجی دستے روانہ کیے مگر اس وقت سلطان نے اپنے پاس بھی کافی لشکر رکھا تاکہ اگر کسی سمت سے اچانک حملہ ہو جائے تو اُس کا رملہ جیسا حال نہ ہو۔

اس کے بعد سلطان نے قلعہ مخاضۃ الاضرار کی طرف کوچ کیا اور وہاں پہنچ کر قلعے پر حملہ کر دیا محض یہ دیکھنے کے لیے کہ دشمن کے پاس کتنی طاقت ہے۔ قلعے والوں کی طرف سے کسی خاص ردعمل کا اظہار نہ ہوا۔ سلطان نے یہاں سے بھی چند فوجی دستے نصرانی شہروں کی طرف چھاپہ مارنے کے لیے بھیجے۔ ان بھیجے ہوئے دستوں سے ایک دستے پر فرنگیوں کے بادشاہ نے اپنی موجودگی سے حملہ کر دیا۔ جنگ چھڑ گئی تو مسلمانوں نے سلطان سے مدد کی درخواست کی۔ سلطان فوجیں لے کر اُس طرف چل پڑا۔

جس وقت سلطان وہاں پہنچا تو دونوں لشکروں میں شدید جنگ ہو رہی تھی۔ سلطان نے اپنی فوجوں سے فرنگیوں کو شکست دی اور اُنھیں تباہ کر دیا۔ فرنگیوں کا بادشاہ مشکل سے جان بچا کر بھاگ نکلا مگر رملہ اور نابلس کا حاکم جو فرنگی بادشاہ کا ساتھی تھا گرفتار ہو گیا۔ اُس کا دوسرا بھائی بھی گرفتار ہوا جو جبیل اور طبریہ کا حاکم تھا۔ فرنگیوں کے مددگار فرقے فداویہ داسبتاریہ کے سردار بھی گرفتار ہوئے۔

رملہ کا حاکم جس کا نام ارتیرزاں تھا اُس نے ڈیڑھ لاکھ زرفدیہ اور ایک ہزار مسلم قیدیوں کی رہائی کے بدلے میں خود کو رہا کرا لیا۔

اس جنگ میں فرخ شاہ کے بھائی تقی الدین عمر نے فرنگیوں سے مقابلہ کر کے اور انھیں بھگا کر اپنی بہادری کا دشمن سے لوہا منوا لیا۔

سلطان اپنا لشکر لے کر پھر بانیاس واپس آیا۔ یہاں سے اُس نے چھوٹے چھوٹے فوجی دستوں کو فرنگی علاقوں میں تاخت و تاراج کے لیے بھیجا۔ اُس زمانے کی فوجی حکمت عملی کچھ اس طرح تھی کہ جب کسی بڑے قلعے یا شہر پر حملہ کیا جاتا تو اُس کا محاصرہ کرنے کے بعد یا پہلے ہی کچھ فوجی دستے قرب و جوار کے علاقوں میں لوگوں کو دہشت زدہ کرنے کے لیے بھیجے جاتے تھے۔ اس کا اصل مقصد یہ ہوتا تھا جس قلعہ یا شہر کا محاصرہ کیا گیا ہے یا محاصرے کا ارادہ ہے اُس کو باہر سے کمک نہ مل سکے اور دہشت کی وجہ سے کمک بھیجنے والے اپنے ہی علاقوں میں رہیں۔ سلطان نے یہ سب کچھ اسی حکمت عملی کے تحت کیا تھا۔

فوجی دستوں کی روانگی کے بعد سلطان پھر قلعہ مخاضۃ الاضرار پہنچا اور اُس کا محاصرہ کر لیا۔ یہ قلعہ بہت مستحکم اور مضبوط تھا۔ کئی دن کی کوشش کے بعد بھی جب کوئی کامیابی نہ ہوئی تو سلطان نے فصیل کو سُرنگ کے ذریعے اُڑا دینے کا حکم دیا۔ پس سُرنگ کھدنا شروع ہوئی۔ ادھر سُرنگ کھدتی رہی اور اُدھر دشمن کو مصروف اور سُرنگ سے بے خبر رکھنے کے لیے قلعہ پر حملے جاری رہے۔ آخر سُرنگ کھد کر تیار ہوئی۔ پھر اُس میں لکڑیاں بھر کر آگ لگائی گئی۔ سُرنگ پھٹ کے اُڑی لیکن اس سے خاطر

خواہ فائدہ نہ ہوا کیونکہ اس سے فصیل کا صرف ذرا سا حصہ ٹوٹا تھا جس سے حملہ آور قلعے میں داخل نہیں ہو سکتے تھے۔

سلطان نے دوبارہ سرنگ کھودنے کا حکم دیا۔ ادھر سلطان کو اطلاع ملی کہ طبریہ میں دشمن فوجیں اکٹھا ہو رہی ہیں تاکہ قلعہ مخاضتہ الاضرار کو بچانے کے لیے سلطانی لشکر پر عقب سے حملہ آور ہوں۔ اس اطلاع پر سلطان نے سرنگ کی تیاری کی کوششیں تیز کرا دیں۔ پھر قسمت نے سلطان کا ساتھ دیا۔ روایت کے مطابق ایک عام سا آدمی جس کا تعلق سلطانی لشکر سے نہ تھا وہ شمشیر برہنہ ہاتھ میں لیے نہ معلوم کس طرح فصیل کے اوپر چڑھ گیا۔ سلطانی لشکر نے جو ایک آدمی کو فصیل پر چڑھتے دیکھا تو وہ بھی یلغار کرتا ہوا فصیل کی طرف بڑھا اور اتنا زبردست حملہ کیا کہ قلعے والے کچھ نہ کر سکے اور سلطانی لشکر کے بے شمار سپاہی سیڑھیاں لگا کر قلعے پر چڑھ گئے۔

قلعے کے اوپر زبردست، دست بدست جنگ ہوئی اور آخر قلعہ فتح ہو گیا۔ ایک روایت یہ بھی ہے کہ دوسری سرنگ جب پھٹی تو فصیل کا ایک حصہ مسمار ہو گیا اور سلطان قلعے میں داخل ہو گئے۔ بہرحال روایت کچھ بھی ہو لیکن انجام قلعے کی تسخیر پر ہوا۔ سلطان کو یہ عظیم فتح ماہ ربیع الاول ۵۷۵ھ ہجری مطابق ۱۱۷۹ عیسوی کو حاصل ہوئی۔ سلطان کے حکم کے مطابق قلعے کی فصیل کو توڑ کر زمین کے برابر کر دیا گیا۔ فرنگیوں کا جو لشکر طبریہ میں اکٹھا ہو رہا تھا۔ اُسے جب قلعے کی تسخیر اور اس کی بربادی کا حال معلوم ہوا تو وہ لوگ منتشر ہو کر اپنے اپنے ٹھکانوں کو واپس ہو گئے۔ ایک بیان کے مطابق فرنگی لشکر اس وقت قلعہ مخاضتہ الاضرار پہنچا جب وہاں قلعے کے بجائے مٹی اور پتھر کا ایک ڈھیر لگ گیا تھا۔

امیر شمس الدین ابن المقدم کی بیٹی ارمغانہ کی تاریخ شادی بہت قریب آ گئی تھی۔ امیر زادہ فرخ شاہ نے سلطان سے کچھ دن کے لیے دمشق جانے کی خواہش کا اظہار کیا۔ سلطان کو یقین تھا کہ امیر زادہ بعلبک جانا چاہتا ہے مگر اُس نے فرخ شاہ سے اس سلسلے میں کوئی گفتگو نہ کی اور اُسے اجازت دے دی۔ فرخ شاہ کو جانا تو بعلبک ہی تھا مگر وہاں جانے سے پہلے اپنے دماغ کو بالکل پُرسکون کرنا چاہتا تھا۔ سلطان کے سمجھانے کا اُس پر پورا اثر ہوا تھا۔ اُسے ارمغانہ سے بھی کوئی شکایت نہ تھی کیونکہ وہ غریب اپنے ظالم باپ کے اختیار میں تھی وہ اُس سے اپنی مرضی کے مطابق کام لے سکتا تھا۔

فرخ شاہ کو ارمغانہ کی کمزور طبیعت کا بھی تجربہ اور مشاہدہ تھا۔ اُس کے باپ امیر المقدم نے جب اُسے سردار دانیال کے ساتھ فرخ شاہ کے قتل پر مامور کیا تھا تو وہ چپ چاپ دانیال کے ساتھ اُس کے قتل پر آمادہ ہو گئی تھی۔ وہ تو فرخ شاہ کی قسمت اچھی تھی کہ خدا نے ارمغانہ کے دل میں نیکی ڈال دی اور اُسے فرخ شاہ کی بھولی صورت پر رحم آ گیا ورنہ اُس دن فرخ شاہ کا خاتمہ ہو جانا ضروری تھا۔ فرخ شاہ نے سوچا کہ جب ارمغانہ باپ کے کہنے سے ایک بے گناہ کو قتل کرنے پر آمادہ ہو سکتی ہے تو پھر اُس سے اور کوئی کام لینا المقدم کے لیے کچھ مشکل نہ تھا۔

ارمغانہ کا خیال تو وہ اپنے دل سے پہلے ہی نکال چکا تھا مگر اس وقت اُس نے ارمغانہ کو معاف کر کے اپنا دل پوری طرح مطمئن کرا لیا پھر بعلبک جانے کا قصد کیا۔ بعلبک کا دمشق سے سفر پچاس میل کے لگ بھگ تھا۔ یہ سفر وہ ایک دن میں بھی با آسانی طے کر سکتا تھا لیکن وہ قصداً دو دن پہلے بعلبک روانہ ہوا اور بعلبک سے صرف بیس میل پہلے اُس نے ایک سرائے میں قیام کیا پھر دوسرے دن صبح کو بعلبک روانہ ہوا۔

بیس میل کا فاصلہ کیا ہوتا ہے پھر فرخ شاہ جیسے شہسوار کے لیے تو یہ ایک گھنٹے کا سفر تھا۔ فرخ شاہ دن چڑھے سرائے سے روانہ ہوا اور دوپہر سے پہلے فصیل شہر میں داخل ہو گیا۔ بعلبک ایک بڑا تاریخی مقام تھا۔ سلطان صلاح الدین کے والد امیر نجم الدین ایوب کو اس شہر و قلعے کی گورنری زنگی امیر عماد الدین والئی موصل نے عطا کی تھی اور سلطان کے عہد طفلی کے کئی سال اسی قلعے میں گزرے تھے۔

فرخ شاہ شہر میں داخل ہوا تو اُسے حیرت نے گھیر لیا۔ امیر شمس الدین ابن المقدم اس کا والی تھا اور اُس کی بیٹی کی آج شادی تھی مگر شہر پر اس شادی کے کوئی آثار نظر نہ آتے تھے۔ فرخ شاہ کو اچانک خیال آیا کہ وہ یقیناً شادی کی تاریخ بھول گیا ہے۔

"چاند کی چھ تاریخ"۔ فرخ شاہ نے ذہن پر زور دے کے سوچا یہی تاریخ امیر المقدم نے سلطان کو بتائی تھی۔ بھولنے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا تھا۔ کل پانچ تھی اور آج چھ۔ پھر بھی فرخ شاہ گھوڑے سے اُترا۔ اُس نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ ایک بزرگ صورت دور سے آتے دکھائی دیے۔ فرخ شاہ نے گھوڑا سائے میں کر لیا اور اُن کے قریب آنے کا انتظار کرنے لگا۔

بزرگ قریب آئے تو فرخ شاہ نے سلام کے بعد اُن سے دریافت کیا: "بزرگ محترم آج کون سی تاریخ ہے؟"

بزرگ نے جواب میں کہا: "چھ تاریخ ہے آج۔" پھر اُس کے ساتھ سوال کیا: "اجنبی معلوم ہوتے ہو۔ کہاں سے آنا ہوا؟"

"آپ کا خیال درست ہے بزرگ۔" فرخ شاہ نے جواب دیا

"بعلبک صرف ایک بار آیا تھا وہ بھی چند گھنٹوں کے لیے۔"

"گھر کہاں ہے تمہارا سوار؟" بزرگ نے اپنا سوال دہرایا۔

"دمشق کا رہنے والا ہوں محترم۔" فرخ شاہ نے بتایا پھر چاہا کہ بزرگ سے کچھ پوچھے مگر بزرگ نے اُسے موقع نہ دیا۔

"سبحان اللہ، سبحان اللہ۔ دارالسلطنت دمشق سے آئے ہو۔" بزرگ نے بولنا شروع کر دیا۔ "وہاں ہمارا نیا سلطان بھی تو رہتا ہے۔ اعلیٰ حضرت سلطانِ عالی مقام صلاح الدین یوسف۔ خدا کی اُس پر لاکھوں برکتیں نازل ہوں۔"

"آمین۔ ثم آمین۔" پھر فرخ شاہ نے فوراً سوال کر دیا۔ "ایک بات آپ سے دریافت کرنا چاہتا ہوں بزرگ محترم۔"

"ضرور پوچھیے۔" بڑے میاں بے تکلف ہو گئے۔ "تم تو ہمارے سلطان کے شہر کے رہنے والے ہو۔"

"بعلبک کے والی امیر المقدم ہیں نا؟" فرخ شاہ نے گھبراتے ہوئے کہا۔

"ہاں ہاں۔ یہاں کے گورنر امیر شمس الدین محمد بن المقدم ہی ہیں۔ تمھیں کوئی کام ہے ان سے؟" بزرگ نے جواب دینے کے ساتھ ہی سوال بھی کر دیا۔

"مجھے کوئی کام تو نہیں ہے۔" فرخ شاہ نے ٹھہر ٹھہر کے کہا۔ "آج چھ تاریخ ہے اور جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے آج امیر شمس الدین ابن المقدم کی بیٹی کی شادی ہونا تھی؟"

"ہاں ٹھیک ہے۔ بالکل ٹھیک ہے۔ آج شادی ہونا تھی۔" یہ کہتے کہتے بزرگ کی آواز بھر آگئی اور اُن کی آنکھوں میں غم نمی بن کے چمکنے لگا۔

فرخ شاہ گھبرا گیا۔ "یہ آپ کو کیا ہوا بزرگ محترم۔ آپ کی آنکھیں کیوں بھیگ گئیں؟"

"تمھیں علم نہیں بیٹے ورنہ تم بھی میری طرح آنسو بہاتے۔" اُن کی آنکھیں چھلک پڑی تھیں۔ "جس بچی کی آج شادی ہونا تھی وہ دو دن پہلے اللہ کو پیاری ہو گئی۔ آج اُس کا سوئم ہونا ہے۔ عورتیں بتاتی ہیں کہ انھوں نے ایسی خوب صورت بچی زندگی میں نہیں دیکھی۔ محل میں کہرام مچا ہوا ہے۔ لوگوں کے گھروں میں دو دن سے کھانا نہیں پکا۔ پورا شہر اور قلعہ بچی کے غم میں غمگین اور افسردہ ہے۔ دیکھو ہر طرف کیسی ویرانی چھائی ہے۔ در و دیوار سے وحشت برستی ہے۔ کسی کام کو جی نہیں چاہتا اور اُس کا باپ۔ پہاڑ ٹوٹ پڑا ہے اُس پر۔ ایسی دھاڑیں مارتا ہے کہ کلیجہ ہل جاتا ہے۔"

بزرگ نہ معلوم کب تک ارمغانہ کا ماتم کرتے رہے اور اُس کے اس المناک واقعہ کا لوگوں پر تاثر بیان کرتے رہے مگر فرخ شاہ کچھ بھی نہ سن سکا۔ اُس کے کان تو اُس وقت بند ہو گئے جب بزرگ نے بتایا تھا۔ "دو دن پہلے اللہ کو پیاری ہو گئی۔"

پھر جب ہوش آیا تو بزرگ اُس سے دُور پہنچ چکے تھے اور وہ اکیلا اپنے گھوڑے کی لگام پکڑے کھڑا تھا۔ اُس کا جی چاہا کہ یہیں سے واپس چلا جائے۔ اب ابن مقدم کے پاس جا کے کیا کرے گا۔ فرخ شاہ نے تو ارمغانہ کی رخصتی کا غم برداشت کرنے کا خود میں حوصلہ پیدا کر لیا تھا۔ مگر یہ غم تو اُس غم سے کہیں زیادہ وزنی تھا۔ وہ آخری بار ارمغانہ کو دیکھ بھی نہ سکا۔ وہ اللہ کو کیسے پیاری ہو گئی؟ المقدم نے اُس پر ظلم تو نہیں کیا؟ کیا پتا اُس نے شادی سے انکار کر دیا ہو اور المقدم نے اپنی عزت بچانے کے لیے اُسے زہر دے دیا ہو؟ گلا گھونٹ کے مار دیا ہو؟ وہ بعلبک کا مالک ہے۔ اُس سے کون پوچھ سکتا تھا۔

فرخ نے پلٹ کے گھوڑے پر سوار ہونے کی کوشش کی مگر اُس کے پیر جیسے جواب دے گئے۔ رکاب میں پیر ڈالنے کے لیے اُسے کتنی کوشش کرنا پڑی۔ پھر گھوڑے پر بیٹھ کے خیال آیا کہ واپس جا کے سلطان کو کیا جواب دے گا؟ کیا سلطان کو یہ ناگوار نہ گزرے گا کہ میں بعلبک گیا اور میں نے المقدم سے اظہارِ افسوس بھی نہ کیا۔ سلطان بہرحال المقدم کی اہلیت کا قائل تھا۔ اُس کی کمزوری اپنی جگہ لیکن وہ فنونِ حرب میں واقعی بہت ماہر تھا۔

فرخ شاہ نے گھوڑے کا رُخ محل کی طرف موڑ دیا۔ بعلبک کا گورنر ایک خوب صورت محل میں رہتا تھا۔ یہ محل قلعے کے اندر تھا اور اس کی تزئین سلطان صلاح الدین کے والد امیر نجم الدین ایوب نے اپنی گورنری کے زمانے میں کی تھی۔ فرخ شاہ قلعے میں داخل ہوا تھا کہ سامنے سے ایک گھوڑا گاڑی آتی دکھائی دی۔ اس گھوڑا گاڑی میں المقدم بیٹھا تھا اور اُس گاڑی کے دونوں جانب مسلح سوار چل رہے تھے۔ فرخ شاہ گھوڑا روک کے کھڑا ہو گیا۔

گاڑی فرخ شاہ کے پاس پہنچی تو المقدم کی نظر اُس پر پڑی۔ المقدم تیزی سے گاڑی سے اُترا۔ فرخ شاہ نے بھی گھوڑا چھوڑ دیا تھا۔ المقدم کا حال بہت بُرا ہو رہا تھا۔ اُس کے جُبّے کے بٹن کھلے تھے اور منہ پر ہوائیاں اُڑ رہی تھیں۔ گاڑی سے اُتر کر وہ فرخ شاہ کے پاس آیا اور "ہائے امیر زادے" کہہ کے اُس سے لپٹ گیا۔ پھر جو اُس نے پھوٹ پھوٹ کے رونا شروع کیا ہے تو راہ چلتے لوگ رُک کے کھڑے ہو گئے۔ فرخ شاہ کا دل تو پہلے ہی رو رہا تھا۔ المقدم کو روتے دیکھ کر اُس کے بھی آنسو نکل آئے۔ امیر المقدم ایسے دھاڑیں مار کے رو رہا تھا کہ پاس کھڑے ہوئے لوگ بھی آنسو بہائے بغیر نہ رہ سکے۔

فرخ شاہ نے مشکل سے امیر المقدم کو اپنے سے الگ کیا اور

کہا: "صبر کیجیے امیر۔ جس کی امانت تھی اُس نے واپس لے لی۔ ہم کیا کر سکتے ہیں۔"

المقدم نے آنسو پونچھتے ہوئے کہا: "امیر زادے۔ مرنا تو سب ہے مگر کوئی ایسے مرتا ہے۔ رات کو اچھی بھلی سوئی اور ایسی سوئی کہ آنکھ ہی نہ کھولی۔ نہ کچھ کہا نہ سنا۔ جانے کس کی نظر لگ گئی اُسے۔ غم کھا گیا اُسے۔"

پھر المقدم اِک دم چپ ہو گیا۔ مشکل سے بولا: "آپ کب تشریف لائے، کیا آپ کو میرے غم کا علم ہو گیا تھا؟"

"نہیں امیر محترم۔" امیر زادے نے گلوگیر آواز میں کہا: "میں شادی کو رخصت کرنے آیا تھا۔ اُس نے اتنی جلدی کی۔ انتظار بھی نہ کیا۔ کیا پتا تھا ورنہ دو دن پہلے آجاتا۔"

المقدم نے ٹھنڈی سانس لی: "ہاں امیر زادے۔ کسی کو پتا نہ تھا۔ بعلبک والوں کو کتنی خوشی تھی اس شادی کی۔ اُن کے دلوں میں کیا کیا ارمان تھے۔ مگر سب دِل ہی میں رہ گئے۔"

المقدم نے امیر زادہ کا گھوڑا سنبھالنے کا ایک سوار کو حکم دیا اور فرخ شاہ کو لے کر گھوڑا گاڑی پر بیٹھ گیا۔ المقدم نے اپنا جانا ملتوی کر دیا تھا۔ وہ اور فرخ شاہ محل میں آگئے۔

المقدم نے خود ہی بتایا: "کوئی بیماری آزاری نہ تھی۔ ارمغانہ اچھی بھلی تھی۔ عارشہ اُس سے روز ملنے آتی تھی۔ قریب ہی ہے اس کا گھر۔ چار پانچ دن سے ارمغانہ کچھ چپ چپ تھی۔ میں نے حکیم بلا کر دکھایا۔ انھوں نے نبض دیکھی اور اطمینان دلایا کہ بچی کو آپ سے جدا ہونے کا غم ہے۔ مگر یہ غم تو اُسے کھا گیا۔ بھلا کوئی ایسا غم ہوتا ہے۔ تم ہی بتاؤ امیر زادے اگر اُسے کوئی غم تھا تو مجھے بتایا ہوتا۔ میرے سوا اور کون ہے اُس کا۔ باپ بھی میں ماں بھی میں۔ میں اس کے لیے کچھ کرتا تھا مگر وہ کچھ کہتی تو۔"

فرخ شاہ نے محسوس کیا کہ شدتِ غم سے امیر المقدم بہکنے لگا ہے۔ اُس نے ٹوکا: "آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ زیادہ مت بولیے بلکہ آرام کیجیے۔"

شام کو ارمغانہ کا سوئم تھا۔ محل کی تمام راہداریاں اور باغ میں آدمی ہی آدمی تھے۔ زنان خانے میں عورتیں بھری تھیں۔ سب کی زبان پر ایک ہی کلمہ تھا: "اللہ ایسی جوان موت کسی کو نہ دکھائے۔"

فرخ شاہ کی طبیعت بہت بھاری ہو گئی تھی۔ سوئم سے فارغ ہونے پر اُس نے امیر المقدم سے اجازت مانگی۔ امیر المقدم نے دو تین روز قیام کی درخواست کی مگر فرخ شاہ نے مجبوری ظاہر کی۔ پھر اُس رات فرخ شاہ بعلبک سے روانہ ہو گیا۔ دمشق جانے کے بجائے اُس نے محاذ کا رُخ کیا جہاں سلطان لشکر لیے مقیم تھا۔

سلطان قلعہ مخاضتہ الاضرار کو پیوند زمین کرنے کے بعد وہیں ٹھہرا ہوا تھا۔ اُس کا خیال تھا کہ فرنگیوں کا وہ لشکر جو طبریہ میں جمع ہو رہا تھا شاید مقابلے پر آئے۔ انھی دِنوں امیر زادہ فرخ شاہ سلطان کے پاس پہنچا اور سلام کر کے چُپ چاپ بیٹھ گیا۔

"کیا دمشق سے آرہے ہو فرخ شاہ؟" سلطان نے اُسے خاموش دیکھ کر دریافت کیا۔

"میں دمشق گیا تھا مگر اس وقت بعلبک سے آرہا ہوں عالی جاہ۔" فرخ شاہ نے افسردگی سے جواب دیا۔

"اچھا!" سلطان نے سر ہلایا۔ "امیر شمس الدین کا کیا حال ہے؟ اُس کی بیٹی کی شادی ہو گئی؟"

"عالی جاہ۔ آپ کے امیر شمس الدین المقدم زندہ ہیں آج کل اُن پر غموں کا پہاڑ ٹوٹ پڑا ہے۔" فرخ شاہ نے بتایا۔ "وہ اپنی بیٹی کی شادی کرنا چاہتے تھے لیکن...." فرخ شاہ کہتے کہتے رُک گیا۔

"لیکن کیا۔ خاموش کیوں ہو گئے؟" سلطان نے اُلجھتے ہوئے پوچھا۔

فرخ شاہ نے افسردگی سے کہا: "عالی جاہ وہ شادی کس کی کرتے، اُن کی بیٹی تو شادی سے دو دن پہلے ہی انتقال کر گئی۔"

"کیا کہا۔" سلطان چونک پڑا۔ "وہ بچی انتقال کر گئی۔ تم کب گئے تھے وہاں؟"

"میں ٹھیک شادی کے دن پہنچا تھا عالی جاہ۔" فرخ شاہ نے بتایا: "امیر شمس الدین المقدم مجھے قلعے سے نکلتے ہوئے مل گئے تھے۔ انھوں نے بتایا کہ ارمغانہ دو دن پہلے اچانک انتقال کر گئی ہے۔ اُس دن اُس کا سوئم تھا۔"

"تم نے معلوم کیا لڑکی کو کیا بیماری تھی؟" سلطان کا دماغ کچھ چکرا سا گیا تھا۔

"میں بعلبک گیا تو میرا خیال تھا کہ وہاں بڑی رونق ہو گی۔ آخر گورنر کی بیٹی کی شادی تھی۔ مگر میں یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ شہر پر اداسی طاری تھی۔ میں نے ایک بزرگ سے اس بارے میں پوچھا تو انھوں نے بھی یہی بتایا تھا کہ گورنر کی بیٹی دو دن پہلے مر گئی تھی اُس کے سوگ میں پورا شہر ماتم کناں تھا۔"

سلطان صلاح الدین بھی اس خبر سے افسردہ ہو گیا۔ وہ تھوڑی دیر تک سر جھکائے بیٹھا رہا پھر ٹھنڈی سانس لے کے بولا: "خدا کرے میرا خیال غلط ہو۔"

اُس وقت سلطان کے پاس دمشق کا سابق گورنر شمس الدولہ توران شاہ بھی بیٹھا ہوا تھا۔ سلطان کو اُس کے بارے میں بہت سی شکایتیں موصول ہوئی تھیں جن کی بنا پر توران شاہ کو سلطان نے دمشق سے اپنے پاس بلا لیا تھا۔

توران شاہ نے ایک دم سلطان سے سوال کر دیا: "عالی جاہ بعلبک پر ہمارے خاندان کا پہلا حق ہے۔ آپ بعلبک کی گورنری مجھے عطا کر دیجیے۔"

"فضول باتیں مت کرو توران شاہ۔" سلطان نے اُسے جھڑک دیا۔ "بعلبک میں ایک گورنر پہلے سے موجود ہے۔"

"پھر کیا ہوا عالی جاہ۔ اُسے کوئی اور علاقہ دے دیجیے اور بعلبک مجھے دے دیجیے۔" توران شاہ جیسے ضد پکڑ گیا۔ "میری سلطنت دمشق اور مصر کے لیے خدمات ہیں۔ کیا میں ایک قلعے کی گورنری کے بھی قابل نہیں؟"

"اچھا اچھا۔ سوچیں گے ہم۔" سلطان نے اُسے ٹال دیا۔

"آپ سوچیں گے عالی جاہ؟" توران شاہ، سلطان کا منہ چڑھا تھا۔ اُس نے پھر بات چھیڑ دی۔ "سوچتے ہیں چھوٹے لوگ آپ سلطان ہیں، فرمان جاری فرمائیے۔ میں کل ہی بعلبک روانہ ہو جاؤں گا۔"

اُسی وقت غلام نے اطلاع دی کہ حاکم کیفا کا قاصد حاضر ہوا ہے۔ سلطان اپنے بھائی توران شاہ کی باتوں سے بد دل ہو رہا تھا۔ اُس نے قاصد کی آمد کو غنیمت جانا اور اُسے طلب کر لیا۔

قاصد نے اندر آکر سلام پیش کیا۔

"محمود کا کیا حال ہے قاصد؟" سلطان نے قاصد سے دریافت کیا۔ حاکم کیفا اور آمد کا پورا نام تھا نورالدین محمود عادل قلیج ارسلان۔ سلطان اُسے صرف محمود کہتے تھے۔

"عالی جاہ۔ میرے آقا اس وقت سخت مصیبت میں ہیں اور اعلیٰ حضرت سے فوجی مدد کی درخواست فرمائی ہے۔" قاصد نے ادب سے جواب دیا۔

"کیا مصیبت پڑی اُس پر۔ کس نے حملہ کر دیا؟" سلطان نے پوچھا۔

قاصد نے ادھر اُدھر دیکھ کے کہا: "عالی جاہ۔ اُن کا اور اُن کے خسر کا خاندانی جھگڑا ہے۔ میرا مطلب ہے دونوں میں ذاتی اختلاف ہے۔ کئی بار جھڑپیں ہو چکی ہیں۔ اب انھوں نے جنگ کا اعلان کر دیا ہے۔"

"اعلان کر دیا ہے تو محمود سے کہو کہ جنگ کرے۔ ہمیں خسر داماد کے جھگڑے میں دخل دینے کی کیا ضرورت ہے۔" سلطان نے بُرا سا منہ بنایا۔

"عالی جاہ۔ میرے آقا آپ کی طرف سے کیفا اور آمد کے والی ہیں۔ اُن پر مصیبت پڑی ہے تو آپ کے نہیں تو پھر کس کے دروازے پر جائیں۔" قاصد نے بڑے اچھے انداز سے اپنے آقا کی وکالت کی۔

سلطان نے حیرت سے قاصد کو دیکھا۔ "تم قاصد ہو یا محمود کے وزیر؟"

قاصد گھبرا گیا۔ "عالی جاہ۔ غلام کی گستاخی معاف فرما جائے۔ شاید میری بات میرے مرتبے سے بہت بلند تھی۔ مجھے ایسا نہیں کہنا چاہیے تھا۔"

"قاصد۔ تمہاری اپنے آقا کے ساتھ وفاداری سے ہم خوش ہوئے۔" سلطان نے نرمی سے کہا۔ "کیا محمود کے خسر نے کیفا پر حملہ کر دیا ہے یا صرف جنگ کا اعلان کر کے دھمکایا ہے؟"

"شاید دھمکایا ہے عالی جاہ۔ لیکن جنگ ضرور ہوگی۔ خبر ملی ہے کہ حاکم بلد روم نے فوجی تیاریاں مکمل کر لی ہیں اور وہ کسی وقت بھی حملہ کر سکتا ہے۔" قاصد کو جہاں تک علم تھا وہ اُس نے بتا دیا۔

"اچھا تم جاؤ اور محمود کو اطمینان دلا دو کہ ہم اُس کی مدد کو پہنچ رہے ہیں۔" سلطان نے اُسے جواب دے کر واپس بھیج دیا۔

جیسا کہ سلطان نے فرمایا۔ یہ واقعی خسر داماد کا خاندانی اور ذاتی جھگڑا تھا۔ نورالدین محمود عادل بن ... کی طرف سے کیفا اور آمد کا والی تھا۔ اُس نے قلعہ رعبان کے حاکم قلیج ارسلان کی بیٹی سے شادی کی تھی مگر محمود کچھ زیادہ ہی شوخ طبیعت تھا۔ اُس نے ایک خوبصورت اور شریف بیوی کے ہوتے ہوئے دوسری شادی کر لی اور بیوی کی سوکن کو بھی اسی گھر میں لے آیا۔ ظاہر ہے کہ محمود کی پہلی بیوی اعلیٰ خاندان کی تھی جب کہ دوسری بیوی کسی نچلے طبقے کی تھی۔ اس طرح دونوں میں لڑائی جھگڑا شروع ہوا اور یہ روز کا معمول بن گیا۔

پھر وہ وقت آیا کہ قلیج ارسلان کی بیٹی میکے جا کے بیٹھ گئی۔ قلیج ارسلان نے بیٹی کو جہیز میں بہت کچھ لیا دیا تھا۔ اُسے داماد پر سخت غصہ آیا مگر رشتے کی نزاکت کی وجہ سے خاموش رہا اور معززین کے ذریعے داماد کو راہِ راست پر لانے کی کوشش کی۔ محمود بد دماغ اور ضدی تھا۔ اُس نے کسی کی کوئی بات نہ سُنی اور آخر نوبت

جنگ تک پہنچ گئی۔ ان میں کئی بار معمولی جھڑپیں ہو چکی تھیں مگر کسی بڑی جنگ کی نوبت نہ آئی تھی۔

قلیج ارسلان بڑے صبر و سکون سے بیٹی کو دوبارہ شوہر کے پاس بھیجنے کی کوشش کرتا رہا مگر محمود نے اسے قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ دراصل اس نے جس عورت سے دوسری شادی کی تھی وہ بالکل جاہل تھی ورنہ بڑے لوگوں کے گھر دو بیویوں کا ہونا کوئی عیب بات نہ تھی۔ آخر تنگ آ کے قلیج ارسلان نے محمود کے خلاف اعلانِ جنگ کر دیا۔ محمود کو اپنے آقا سلطان صلاح الدین کا زعم تھا۔ اس نے آقا سے مدد طلب کی اور صلاح الدین کو اس کی مدد پر آمادہ ہونا پڑا۔

سلطان صلاح الدین نے محمود کے حق میں فوجی اقدام سے پہلے اس معاملے کی پوری حقیقت سے آگاہ ہونے کا فیصلہ کیا۔ اسے بتایا گیا کہ محمود اور قلیج ارسلان ایک ہی خاندان سے تعلق رکھتے ہیں اور اس شادی کے بعد تو انھیں اور قریب ہو جانا چاہیے تھا لیکن قلیج ارسلان کی بیٹی اپنے اوپر سوکن برداشت نہ کر سکی اور شوہر سے جھگڑا کر کے میکے میں آ بیٹھی۔ اس کے باپ نے سمجھا بجھا کے بیٹی کو شوہر کے گھر جانے کے لیے اس شرط پر رضامند کر لیا کہ اس کا شوہر محمود اسے سوکن کے ساتھ رکھنے کے بجائے الگ حویلی میں رکھے اور دونوں کے ساتھ برابری کا سلوک کرے۔

بات معقول تھی۔ قلیج ارسلان نے ایک قاصد کے ذریعہ محمود کو پیغام بھیجا کہ اس کی بیوی شوہر کے پاس جانے کے لیے آمادہ ہے اس لیے محمود خود آئے یا اپنے کسی معتمد کے ذریعہ بیوی کو بلا لے اور اسے الگ جگہ رکھے اور برابری کا سلوک بھی کرے۔ قاصد محمود کے پاس پہنچا تو اس نے یہ شرط فوراً منظور کر لی مگر جب وہ محل کے اندر گیا تو اس کی دوسری بیوی نے نہ جانے اس پر کیا پھونک دیا کہ اس نے واپس آ کر قلیج ارسلان کو صاف جواب دے دیا۔

"قلیج ارسلان سے جا کے کہہ دو کہ محمود ان کا ماتحت نہیں۔ اگر بیٹی کو بھیجنا ہے تو کسی کے ساتھ بھیج دو یا خود پہنچا جاؤ۔ میری بیویاں ایک ہی محل میں رہیں گی۔ ہاں سلوک دونوں کے ساتھ برابر کا ہو گا۔"

قاصد یہ جواب سن کر ہکا بکا رہ گیا۔ اس نے ہمت کر کے کہا۔ "اے حاکم کیفا۔ ابھی آپ نے حاکم بلد روم کی شرط مان لی تھی اور اپنی بیگم کو واپس لانے پر بھی آمادہ ہو گئے تھے... الگ رہائش کا بھی آپ نے اعلان کیا تھا مگر اب آپ صاف انکار کر رہے ہیں۔ براہِ کرم اپنے فیصلہ پر نظرِ ثانی فرمائیے۔"

حاکم کیفا محمود کو غصہ آ گیا۔ "تم قاصد ہو یا میرے مشیر کار۔ جو میں نے کہا ہے وہ جواب قلیج ارسلان حاکم بلد روم کو پہنچا دو۔ اس جواب میں کوئی ترمیم نہیں ہو سکتی۔"

قاصد نے کچھ اور کہنا چاہا مگر محمود نے اسے روک دیا۔ "مزید گفتگو کی ضرورت نہیں۔ تم واپس جا سکتے ہو۔"

قاصد کے لیے سوائے واپس جانے کے اور کوئی چارہ نہ تھا وہ سلام کر کے واپس ہوا۔

قلعہ رعبان پہنچ کے قاصد نے حاکم بلد روم قلیج ارسلان کو بتایا۔ "اے میرے آقا۔ حاکم کیفا دل کا برا نہیں معلوم ہوتا۔ اس نے آپ کا پیغام سنتے ہی تمام باتیں مان لی تھیں۔ شاید وہ خود بیوی کو واپس لینے یہاں آتا لیکن جب وہ محل کے اندر گیا اور پھر واپس آیا تو اس کا دماغ بالکل الٹ چکا تھا۔ اس نے ہر شرط ماننے سے انکار کر دیا اور صاف الفاظ میں کہا کہ انھیں میری بیوی واپس بھیجنا ہے تو اسے پہنچا جائیں مگر دونوں کو ایک ہی گھر میں رہنا ہو گا۔"

قلیج ارسلان ایک ٹھنڈی سانس لے کر رہ گیا۔ پھر کچھ دنوں بعد اس نے حاکم کیفا کو الٹی میٹم دے دیا کہ اگر ایک ماہ کے اندر محمود اپنی بیوی کو واپس لے جانے اور شرطیں تسلیم کرنے کا اعلان کرنے میں ناکام رہا تو کیفا اور آمد پر بیک وقت حملہ کر کے دونوں قلعوں کو تباہ و برباد کر دیا جائے گا۔

یہ حالات سننے کے بعد سلطان نے فرمایا۔ "ان باتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ غلطی محمود کی ہے دوسری بات یہ کہ محمود اپنی دوسری بیوی کے کہنے میں ہے اور اس کے اشاروں پر چلتا ہے۔ مگر کیا کیا جائے۔ اس نے ہم سے مدد مانگی ہے اور ہم نے وعدہ بھی کر لیا ہے۔"

سلطان کے پاس اس وقت فرخ شاہ بیٹھا تھا۔ اس نے عرض کیا۔ "عالی جاہ۔ مجھے اجازت دی جائے تو اس سلسلے میں کچھ عرض کروں۔"

"فرخ شاہ۔ یہ جھگڑا میاں بیوی اور خسر داماد کا ہے۔ تم ان میں سے کوئی نہیں ہو پھر کیا کہنا چاہتے ہو۔" سلطان نے فرخ شاہ کو شاید یہ بتانے کی کوشش کی کہ وہ ابھی کنوارہ ہے اس لیے ان معاملات کی اونچ نیچ سے واقف نہیں۔

مگر فرخ شاہ جس قدر بہادر تھا۔ اسی قدر ذہین بھی تھا اس نے سلطان کے سامنے اس جھگڑے کا ایسا حل پیش کیا کہ سلطان حیران رہ گئے۔

فرخ شاہ نے کہا۔" عالی جاہ۔ میں نے کسی سے سنا ہے یا کہیں پڑھا ہے کہ زن وشو (میاں بیوی) میں اختلاف پیدا ہو جائے تو اُن میں صلح کرانا کارِ ثواب ہے۔ آپ قلیج ارسلان سے سفارش کیجیے کہ وہ محمود کو معاف کر دے تاکہ وہ اپنی بیوی کو لے جائے۔"

سلطان کو فرخ شاہ کا یہ مشورہ پسند آیا۔

"فرخ شاہ ہم تمہارے مشورے سے خوش ہوئے۔ اب تم خود ہی ہمارا پیغام قلیج ارسلان کے پاس لے جاؤ اور اُسے جنگ سے باز رکھو۔"

فرخ شاہ نے سلطان کے حکم پر سر جھکا دیا اور دوسرے دن شاہی قاصد کے فرائض ادا کرکے قلعہ رعبان روانہ ہو گیا۔

قلیج ارسلان نے فرخ شاہ کا پُرجوش استقبال کیا۔ اُسے معلوم تھا کہ فرخ شاہ ایک بہادر سوار، سمجھ دار سردار اور سب سے بڑھ کے یہ کہ سلطان صلاح الدین کا بھتیجا تھا۔ فرخ شاہ نے کھانے پر گفتگو شروع کی۔

"بزرگ حاکم بلد روم، سلطانِ معظم نے نورالدین محمود حاکم کیفا کی سفارش کی ہے کہ آپ محمود کو معاف کر دیجیے اور اس کی بیوی کو اُس کے پاس بھجوا دیجیے۔"

قلیج ارسلان سوچ میں پڑ گیا۔ سلطان نے اگرچہ سفارش کی تھی لیکن یہ سفارش حکم کا ہی درجہ رکھتی تھی۔ اگر انکار کرتا ہے تو سلطان کا غضب مول لیتا ہے۔ وہ جانتا تھا کہ سلطان اپنے حاکموں اور والیوں کا بہت لحاظ کرتے ہیں۔

وہ بہت دیر سوچنے کے بعد بولا: "محترم امیرزادے۔ میں سلطانِ معظم کے حکم کے تحت محمود کو معاف کرتا ہوں۔ رہا اُس کی بیوی کو واپس بھیجنے کا سوال تو میں اس سلسلے میں اپنی بیٹی سے مشورہ کرنا چاہتا ہوں۔"

"ضرور ضرور۔ آپ صاحبزادی سے مشورہ کر لیجیے۔"

امیرزادے سے اجازت لے کر قلیج ارسلان اندر گیا اور دیر تک بیٹی سے مشورہ کرتا رہا پھر منہ لٹکائے ہوئے واپس آیا۔ امیرزادہ سمجھ گیا کہ بیوی میاں کے پاس جانے پر آمادہ نہیں۔ قلیج ارسلان نے اس کی تائید کر دی۔

"محترم امیرزادے۔ میری بیٹی سلطانِ معظم کی شکرگزار ہے کہ انھوں نے اُس کے معاملے میں اتنی دلچسپی لی۔ وہ کیفا جانے پر بھی آمادہ ہے لیکن اُس نے سلطان سے درخواست کی ہے کہ اُس کے شوہر کو حکم دیا جائے کہ وہ دونوں بیویوں کو الگ الگ محلوں میں رکھے۔"

امیرزادہ کا خیال درست نکلا۔ بیوی مشروط طریقے سے شوہر کے پاس جانے پر آمادہ تھی۔ چند لمحے سوچنے کے بعد امیرزادے نے کہا۔" بزرگ حاکم بلد روم۔ آپ کی بیٹی کی شرط معقول ہے پھر بھی اگر محمود اس شرط کو تسلیم کرنے سے انکار کر دے تو؟"

قلیج ارسلان نے فوراً جواب دیا: "اُس صورت میں محمود وہ تمام قلعے واپس کر دے جو میری بیٹی کو جہیز میں دیے گئے تھے۔"

یہ مطالبہ بھی درست تھا۔ فرخ شاہ رخصت ہو کے سلطان کے پاس پہنچا اور اُسے بتایا کہ بیوی شوہر کے پاس جانا چاہتی ہے بشرطیکہ اُسے دوسرے مکان میں رکھا جائے۔

سلطان کو جلال آ گیا: "ہم نے کوشش کی مگر قلیج ارسلان نے ہماری سفارش ٹھکرا دی۔ ہمیں محمود کی مدد کو جانا پڑے گا۔"

فرخ شاہ سناٹے میں آ گیا۔ سلطان نے اُسے بولنے کا موقع ہی نہ دیا اور فیصلہ بھی کر دیا۔ سلطان کے فیصلے کو کوئی نہیں بدلوا سکتا تھا۔ پس سلطان لشکر لے کر چل پڑا۔ اس نے حلب کو بائیں ہاتھ چھوڑا اور تل باشر ہوتا ہوا قلعہ رعبان پہنچ گیا۔ نورالدین محمود بھی سلطان کی آمد سن کر وہاں آ گیا۔

فرخ شاہ بہت پریشان تھا۔ اُس کے خیال میں یہ بلا وجہ کی جنگ تھی جس میں کتنی ہی جانوں کے ضائع ہونے کا احتمال تھا۔ فرخ شاہ نے سلطان سے تو کچھ نہ کہا بلکہ نورالدین محمود کو سمجھایا کہ وہ بلاوجہ کی ضد کرکے قیمتی جانوں کا نقصان نہ کرے اور بیوی کو الگ مکان میں رکھنے کا وعدہ کر لے۔ نورالدین نے دوسری بیوی کے بھڑکانے پر قلیج ارسلان کو صاف جواب بھجوا دیا تھا مگر جب اُسے فرخ شاہ نے سمجھایا تو اُس کو اپنی غلطی کا احساس ہوا اور اُس نے خود سلطان کے سامنے اپنی غلطی تسلیم کر لی اور بیوی کو ساتھ لے جانے پر رضامند ہو گیا۔

جنگ کے آئے ہوئے بادل چھٹ گئے۔ امیرزادہ فرخ شاہ کی کوشش سے جنگ ہوتی ہوتی رُک گئی۔ سلطان نے فرخ شاہ کے ساتھ محمود کو قلعہ رعبان بھیج دیا۔ محمود نے وہاں اپنے خسر سے معافی مانگ لی۔

اس طرح ایک اجڑا ہوا گھر پھر سے بس گیا۔ محمود اپنی بیوی کو کیفا لے گیا۔ پھر اللہ کا کچھ ایسا کرم ہوا کہ محمود اپنی دوسری بیوی سے جو ایک پست گھرانے کی خوبصورت عورت تھی، ناراض ہوا اور یہ ناراضگی اس قدر بڑھی کہ محمود نے اُسے طلاق دے کر ہمیشہ کے لیے محل سے رخصت کر دیا۔

صلاح الدین کو خانہ جنگیوں میں گھرے ہوئے ...واں سال تھا۔

صلاح الدین کے آقا اور مربی سلطان نورالدین زنگی نے ...مئی ۱۱۷۴ء کو انتقال کیا تھا اب یہ ۱۱۸۰ء چل رہا تھا جسے کو تو ...طان صلاح الدین نے تقریباً پورا ملک شام فتح کر لیا تھا ...ی اب بھی بعض علاقے اس کو سلطان تسلیم نہ کرتے تھے۔ سلطان ...ہ دل میں دراصل شروع ہی سے جہاد کا جوش تھا اور وہ اہل ...نگ کے ساتھ بھرپور جہاد کرنا چاہتا تھا۔ یہ نہیں کہ اس دوران ...س نے نصرانیوں سے جنگ نہیں کی تھی لیکن اس کے دل کے ...مان اب تک نہ نکل سکے تھے۔ مصر کی وزارت کے دوران ...ہاں سے شاہ یروشلم کے ساتھ کئی معرکے ہوئے تھے لیکن ...اس وقت دمشق کے سلطان کا نائب تھا اس لیے نصرانیوں ...خلاف خود کوئی قدم نہیں اٹھا سکتا تھا پھر جب سلطان نورالدین ...ی کے بعد مصر کے ساتھ ساتھ اس کا دمشق پر بھی قبضہ ہو گیا تو ...سے شوقِ جہاد نے ایک بار پھر چٹکیاں لینا شروع کیں۔ ...ا تھا اس خانہ جنگی کا جس نے سلطان صلاح الدین کو اپنے ...ب العین کی تکمیل کا موقع دیا یوں تو مسلمان چھ سو سال سے ...دنیا کے کسی نہ کسی حصے میں جہاد کی شمع پر پروانہ وار قربان ...تے اور اس روشنی کو تاریک گوشوں تک پہنچاتے رہے ہیں ...ن سلطان صلاح الدین ایوبی کا شوقِ جہاد صرف جذبۂ جہاد ...یل نہیں تھا بلکہ اس کے دل میں ایک اور اعلیٰ اور ارفع خیال ...جاگزیں تھا اور یہ خیال تھا بیت المقدس کو نصرانیوں ...ہاتھوں سے چھین کر اس پر اللہ اکبر کا پرچم لہرانا۔

بیت المقدس مسلمانوں کا قبلہ اول ہے۔ اس قبلہ کی طرف مسلمان اس وقت تک منہ کر کے نماز پنجگانہ ادا کرتے رہے جب تک خانۂ کعبہ کی طرف سجدہ کرنے کا حکمِ خداوندی نازل نہ ہوا۔ اس طرح بیت المقدس گزشتہ ایک صدی سے نصرانیوں کے قبضہ میں چلا آ رہا تھا۔ نصرانیوں نے ۱۰۹۹ء میں یروشلم (بیت المقدس) پر قبضہ کیا تھا۔ اس سے پہلے یہ مسلمانوں کے ہاتھوں میں تھا۔ مگر جب سلطان ملک شاہ سلجوقی کا انتقال ہوا تو سلجوقی شہزادوں میں ایسی خانہ جنگی شروع ہوئی جس سے نہ صرف قونیہ کی عظیم سلطنت تباہ ہوئی بلکہ مسلمانوں کا قبلہ اول اور ملک شام کا تقریباً سارا علاقہ ان کے ہاتھ سے نکل گیا اور مسلمان مقتدر کی چادر اوڑھ کے سو گئے۔

پھر انہی تباہ شدہ سلجوقی سلطنت کی خاکستر سے اتابکِ موصل کی چنگاری بھڑکی۔ اتابک، اتالیق اور استاد کو کہتے ہیں۔ اتابک کا جدِ امجد عماد الدین زنگی، سلجوقی شہزادہ کا اتالیق تھا جس نے سلجوقی چراغ گل ہونے کے بعد موصل میں حریت اور جوشِ جہاد کا چراغ روشن کیا۔ عماد الدین زنگی ہی دراصل صلاح الدین کے باپ نجم الدین ایوب کا مربی اور آقا تھا جس نے ایک احسان کے بدلے نجم الدین ایوب کو بعلبک کے قلعہ کا حاکم بنا دیا۔ پھر عماد الدین زنگی کے ایک بیٹے سلطان نورالدین زنگی نے نہ صرف دمشق میں ایک ایسی اسلامی مملکت کی بنیاد رکھی جس نے نصرانیوں ... کی عظیم طاقت سے آنکھیں ملانا شروع کر دیں۔

سلطان صلاح الدین یوسف ایوبی اسی سلطان نورالدین زنگی

کا پروردہ امیر زادہ تھا جس نے اپنے چچا امیر اسد الدین شیر کوہ کے ساتھ مصر کی فاطمی سلطنت کا خاتمہ کیا اور نصرانیوں اور خصوصاً شاہ یروشلم سے کئی بار جنگ کی۔ سلطان صلاح الدین کی نظریں بار بار بیت المقدس کی طرف اٹھتیں اور وہ خانہ جنگیوں سے جلد سے جلد پیچھا چھڑا کر اپنے دل کی اس آرزو کی تکمیل میں خود کو مصروف کرنا چاہتا تھا۔

اس وقت تک سلطان صلاح الدین کی دھاک پورے ایشیائے کوچک (مشرق وسطیٰ) پر بیٹھ گئی تھی۔ جب سلطان دریائے فرات سے دریائے نیل تک کے علاقوں کا بڑا مسلم حکمران تھا۔ تمام چھوٹی چھوٹی ریاستیں اور شہزادے نہ صرف اس کی تکریم کرتے تھے بلکہ اپنے آپس کے جھگڑے میں سلطان کو ثالث کا درجہ دیتے تھے۔ سلطان اپنے جذبے میں پر خلوص تھا۔ اس لیے وہ اپنے اس رتبے سے کوئی ناجائز فائدہ اٹھانے کی کوشش نہیں کرتا تھا اور تمام علاقوں میں امن و امان برقرار رکھنے کی کوشش کرتا تھا۔

پھر ۱۱۸۰ء میں ایسا ہوا کہ دریائے فرات کے کنارے شام کے سرحدی شہر سموسطہ میں ایک بین العلاقائی مجلس منعقد ہوئی جس میں سلطان قونیہ قلیج ارسلان دوم، شاہ آرمینیہ سقمان دوم، شاہ موصل عز الدین مسعود جو غازی سیف الدین کے بعد شاہ موصل ہوا تھا اور جسے حلب کے شاہ ملک الصالح نے مرنے سے پیشتر حلب کا بھی وارث بنا دیا تھا، شریک ہوئے۔ ان شاہوں کے علاوہ اس مجلس میں جزیرہ، اربل، کیفا اور ماردین کے شہزادوں نے بھی شرکت کی تھی۔

سلطان صلاح الدین ایوبی نے اس مجلس کی صدارت کی اور باہمی گفتگو اور مشورے سے تمام شرکا دو سال کے لیے امن کے معاہدے پر رضامند ہو گئے تھے۔ چنانچہ معاہدہ تیار ہوا۔ سب نے اس پر دستخط کیے اور زبانی قسم کھائی کہ وہ اس پر کاربند رہیں گے اور اپنی حدود میں امن و امان قائم رکھیں گے۔ یہ ایک نمایاں کام تھا اور ہر شخص نے اطمینان کا سانس لیا۔

اس دوران یورپ اور ایشیا کے بعض ملکوں میں تبدیلیاں آگئی تھیں۔ فرانس کا بادشاہ لوئی مر گیا تھا اور اس کی جگہ فرانس کا بادشاہ فلپ آگسٹس بن گیا تھا۔ نصرانیوں کا اسقف اعظم الیگزینڈر سوئم بھی فوت ہو گیا تھا۔ قسطنطنیہ کے شہنشاہ روم کامنینوس کے بجائے تخت قسطنطنیہ پر الکسی اس براجمان تھا۔ بغداد کی عباسی خلافت میں بھی تبدیلی آگئی تھی۔ عباسی خاندان کے تینتیسویں خلیفہ مستضی کا انتقال ہو گیا تھا اس

کی جگہ الناصر تخت خلافت پر بیٹھا تھا۔

سموسطہ کے دو سالہ معاہدے سے پہلے سلطان صلاح الدین کو ایک بار پھر شمس الدین المقدم سے مورچہ لینا پڑا۔ یہ امیر بہت تجربہ کار اور شجاع تھا لیکن خود سری نے اسے تباہ کر رکھا تھا۔ سلطان نے اسے بعلبک کی حکومت بخش دی تھی مگر ایسا اتفاق ہوا کہ جب صلاح الدین کے بھائی توران شاہ کو دمشق کے حاکم کی حیثیت سے فرنگیوں کے ہاتھوں شکست ہوئی تھی اور جس میں دمشق کا ایک مشہور سپہ سالار سیف الدین ابوبکر بن السلار ہوا تھا۔ اس وقت توران شاہ کو دمشق کے حاکم کی حیثیت سے معزول کر دیا گیا تھا۔ توران شاہ اس وقت سے سلطان صلاح الدین کے ساتھ ہی رہنے لگا تھا۔

پھر جب سلطان صلاح الدین نے شمس الدین المقدم کو بعلبک کا حاکم بنا دیا تو توران شاہ کو یہ امر بہت ناگوار گزرا۔ وہ اکثر بعلبک جانے کے لیے کہتا رہتا تھا مگر سلطان ٹالتا رہا۔ پھر جب اس نے بہت ضد کی تو سلطان نے اسے بعلبک کی حکمرانی کا پروانہ دے دیا۔ اتفاق سے اسی دن المقدم دمشق آیا۔ سلطان نے اس سے زبانی بھی کہہ دیا لیکن جب توران شاہ اس سے بعلبک کا قبضہ لینے گیا تو وہ قلعہ بند ہو گیا اور اس نے بغاوت کر دی۔

توران شاہ نے واپس آکر سلطان سے المقدم کی بغاوت کی شکایت کی۔ سلطان کو شمس الدین المقدم کی جرأت پر شدید حیرت ہوئی۔ سلطان کی طاقت اس وقت اس قدر بڑھ گئی تھی کہ ملک شام کا ہر چھوٹا بڑا اس کے نام سے کانپتا تھا۔ اور حکم عدولی یا بغاوت کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ بہرحال سلطان نے بعلبک کے لیے ایک لشکر تیار کرایا اور اس کا سالار عز الدین فرخ شاہ کو مقرر کیا۔ فرخ شاہ نے دبے الفاظ میں احتجاج کیا تھا۔

"عالیجاہ! خدا کے لیے آپ مجھے بعلبک نہ بھیجیے۔۔۔ میں امیر المقدم کا سامنا نہیں کرنا چاہتا۔"

"بیوقوف نہ بنو فرخ شاہ!" "ہم تمہیں اس سے صلاح کی گفتگو کرنے نہیں بھیج رہے بلکہ بعلبک پر قبضے اور امیر شمس الدین کو قید کرنے کے لیے بھیج رہے ہیں۔ حالانکہ ہم یہ جانتے ہیں کہ المقدم کو قید کر کے ہم ایک بہترین سردار سے محروم ہو جائیں گے۔"

فرخ شاہ کے خیال میں امیر شمس الدین المقدم ایک سر پھرا انسان تھا کیونکہ کوئی سر پھرا اور پاگل انسان ہی اپنی

اکلوتی بیٹی پر اس قدر ظلم کر سکتا تھا کہ وہ دنیا ہی چھوڑ جائے اس لیے فرخ شاہ نہیں چاہتا تھا کہ وہ المقدم کے مقابلہ پر کھڑا ہو

فرخ شاہ نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا مگر سلطان نے اسے اشارے سے روک دیا۔

"تمہیں کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ بعلبک پر قبضہ کے بعد ہم تمہیں ایک تحفہ دیں گے۔" فرخ شاہ میں مخالفت کی طاقت نہ تھی۔ اس نے حکم پر سر تسلیم خم کر دیا۔

"میں عالیجاہ کے حکم کی تعمیل میں آج ہی بعلبک روانہ ہو جاؤں گا۔"

فرخ شاہ سلام کر کے رخصت ہونے لگا تو سلطان نے اسے روک کر کہا۔ "ہم نے تمہیں ایک تحفہ دینے کے لیے کہا ہے فرخ شاہ! تم نے پوچھا نہیں کہ وہ کون سا تحفہ ہے جس کا اعلان ہم پہلے کر رہے ہیں؟"

"عالیجاہ! آپ مصر اور شام کے سلطان ہیں، کوئی بھی تحفہ دے سکتے ہیں آپ۔" فرخ شاہ نے بات ختم کرنے کے لیے کہا۔

"تم ٹھیک کہہ رہے ہو فرخ۔" سلطان نے کہا۔ "لیکن یہ تحفہ تمہاری طبیعت سے مطابقت رکھتا ہے اور تمہیں اس کی ضرورت بھی ہے۔ اس لیے ہم تمہیں پہلے بتا رہے ہیں کہ بعلبک سے واپس آنے پر تمہاری شادی ہوگی۔ لڑکی ہم نے تمہارے لیے خود پسند کی ہے۔"

سلطان صلاح الدین ایوبی اپنے بھائی نور الدولہ شاہان شاہ کے دونوں بیٹوں تقی الدین محمد اور عز الدین فرخ شاہ سے بہت محبت کرتا تھا۔ سلطان کی محبت صرف اس وجہ سے نہ تھی کہ وہ دونوں بھائی اس کے بھتیجے تھے بلکہ ان کی شجاعت اور فرمانبرداری نے انہیں سلطان کے بہت قریب کر دیا تھا۔ خصوصاً سلطان کو فرخ شاہ سے گہرا لگاؤ تھا اور اس کا اظہار اس نے آگے چل کر عملی طور پر کیا۔

ارمغانہ کے انتقال یا خودکشی سے فرخ شاہ کو خانگی زندگی کے تصور ہی سے نفرت ہو گئی تھی۔ عورت کے معاملے میں وہ پہلے بھی بے حس تھا مگر ارمغانہ کی بے تکی اور دھماکہ خیز ملاقات نے اس کی ویران زندگی میں محبت کے پھول بوٹے کھلائے تھے اور اس نے ارمغانہ کو اپنا شریک حیات بنانے کا فیصلہ بھی کر لیا تھا۔ سلطان کو بھی اس کی خبر تھی اور وہ کسی مناسب موقع کی تلاش میں تھے کہ امیر شمس الدین المقدم نے اس کی شادی کا دعوت نامہ دے کر سلطان کا منہ بند کر دیا تھا۔ پھر جب فرخ شاہ، سلطان کے حکم سے ارمغانہ کی شادی میں شرکت کے لیے پہنچا تو خود المقدم نے اسے ارمغانہ کی موت کی اطلاع دی۔

فرخ شاہ کے دل میں محبت کی جو چنگاری چمکی تھی۔ وہ دب گئی اور اس نے اپنا دل پھر تیر و تلوار سے لگا لیا تھا۔ سلطان نے اس وقت شادی کا ذکر چھیڑا تو ایک لمحے کے لیے اس کے دل میں گدگدی پیدا ہوئی مگر اچانک ارمغانہ کے تصور نے اسے افسردہ کر دیا۔ وہ سلطان کو جواب دینے والا تھا کہ اسی وقت توران شاہ آ گیا اور وہ بات آگے نہ بڑھ سکی۔

"عالیجاہ! آپ نے میری درخواست کا کیا فیصلہ کیا؟" توران شاہ نے آتے ہی سوال کیا۔

سلطان کو توران شاہ کا یہ انداز پسند نہ آیا لیکن سلطان، بھائی، بھتیجوں سے بہت محبت کرتا تھا اس لیے نرمی سے بولا۔

"توران شاہ! ایک بات کو بار بار نہیں دہراتے۔ ہم نے تمہاری درخواست منظور کر لی ہے۔ فرخ شاہ لشکر لے کر جا رہا ہے۔ بعلبک کے قبضہ کے بعد تمہیں وہاں بھیج دیا جائے گا۔"

"عالیجاہ! لشکر کے ساتھ میں بھی بعلبک پر قبضہ کر سکتا ہوں۔" توران شاہ نے گستاخانہ انداز میں کہا۔ "لشکر کی کمان آپ مجھے دیجیے۔"

سلطان چڑ گیا۔ بولا۔ "توران شاہ! سلطان تم ہو کہ میں ہوں؟ ہم جسے بہتر سمجھتے ہیں اسے لشکر کا سردار بناتے ہیں۔"

توران شاہ پھر بھی خاموش نہ ہوا۔ "عالیجاہ! لشکر کے ساتھ مجھے بھی جانے کی اجازت دی جائے۔"

"تم کیا کرو گے وہاں جا کے؟" سلطان کو غصہ آ گیا۔ "سالار فرخ شاہ ہے۔ حکم اسی کا چلے گا۔"

توران شاہ بڑا ڈھیٹ تھا... پھر بولا۔ "فرخ شاہ بیشک سالار ہے۔ میں سپاہیوں کی طرح جنگ کروں گا۔"

اب فرخ شاہ نے اعتراض کیا۔ "آپ میرے چچا ہیں توران شاہ! میں آپ کو حکم دیتے ہوئے اچھا نہ معلوم ہوں گا۔"

توران شاہ نے فوراً بڑی ذہانت کا جواب دیا۔ "کیا سلطان معظم کے بڑے بھائی سلطان کی کمان میں جنگ نہیں کرتے؟ تمہارا حکم ماننا میرا فرض ہوگا۔"

سلطان سمجھ گیا کہ توران شاہ نہیں مانے گا۔ اس نے توران شاہ کو فرخ شاہ کے ساتھ جانے کی اجازت دے دی۔ پھر فرخ شاہ کو سمجھایا۔ "فرخ شاہ! ہم بعلبک کی گلیوں میں کھیلے ہیں۔ مجھے وہاں کے راستوں اور علاقوں سے محبت ہے۔ خونریزی

سے پرہیز کرنا۔ امیر شمس الدین مطیع ہو جائے تو اُسے گرفتار نہ کرنا۔ اپنے خیموں میں جگہ دینا اور اُسے عزت سے ہمارے پاس لانا۔"

"بہتر ہے عالیجاہ!" فرخ شاہ نے سر جھکایا۔ "تمام احکامات پر عمل ہوگا۔"

* فرخ شاہ لشکر لے کے بعلبک پہنچ گیا۔ سلطان نے خونریزی سے منع کیا تھا، پھر قلعہ پر حملہ کیسے کرتا۔ محاصرہ کر کے بیٹھ گیا اور محاصرہ میں روز بروز سختی کرتا جاتا۔ سخت محاصرہ ہی شمس الدین المقدم کو اطاعت پر مجبور کر سکتا تھا۔ المقدم قلعہ بند ہو کر بیٹھا تھا۔ فصیل پر تیر انداز موجود تھے لیکن انہیں اس وقت تک تیر چلانے کی اجازت نہ تھی جب تک فصیل پر حملہ نہ ہو۔ یہ عجیب طرح کا محاصرہ تھا۔ نہ محاصرہ کرنے والا پتھر برساتا نہ محصور تیر چلاتے۔

توران شاہ یہ دیکھ کر جلتا تھا۔ ایک دن فرخ شاہ کو سنانے کے لیے بولا "ہم نے یمن میں بڑے بڑے قلعوں کو دنوں میں فتح کر لیا تھا۔" واضح رہے کہ توران شاہ کو یمن بھیجا گیا تھا اور اس نے اپنی اور لشکر کی بہادری کی وجہ سے یمن پر قبضہ کر لیا تھا۔

"وہ کس طرح چچا توران شاہ؟" فرخ شاہ نے زہر خند کہا۔

"اس طرح کہ اک دم یلغار کی۔ قلعہ پر سیڑھیاں لگائیں اور اُوپر چڑھ گئے۔ زیادہ مداخلت کا امکان ہوا تو سرنگ میں لکڑیاں بھر کر فصیل کو اُڑا دیا۔" توران شاہ نے بڑے فخر سے کہا۔

"اس کے صلے میں آپ کو فاتحِ یمن کا خطاب ملا تھا...؟" فرخ شاہ نے سوالیہ انداز میں کہا۔

"ہاں ملا تھا۔" توران شاہ نے جواب دیا۔ "بہادری کا مظاہرہ کرنے والوں کو خطاب ملتا ہے۔"

"کتنے آدمی کام آئے تھے ایک قلعہ کے فتح کرنے میں؟" فرخ شاہ نے پوچھا۔

"جنگ میں مرنے والوں کو نہیں گنا کرتے۔" توران شاہ نے اکڑ کے جواب دیا۔

"اب فرمائیے، مجھ سے کیا چاہتے ہیں؟"

"چاہتے کیا ہیں۔ حملہ کرو اور قلعہ فتح کر لو۔"

"اور جب قلعہ فتح کر کے جاؤں تو سلطان مجھے سُولی پر چڑھا دیں۔" فرخ شاہ نے غصہ سے کہا۔

"کیوں... کیوں سُولی پر چڑھائیں گے؟" توران شاہ نے حیرانی سے پوچھا۔

"میرے پیارے چچا جان!" فرخ شاہ دانت پیس کر ...

"سلطان نے فرمایا تھا کہ خونریزی سے پرہیز کرنا۔ المقدم اطاعت کرے تو اُسے گرفتار نہ کرنا۔ آپ مجھے سلطان کی نظر میں گرانا چاہتے ہیں؟"

"ارے... نہیں... نہیں۔ تم تو ناراض ہو گئے فرخ..." توران شاہ نے فرخ کو غصہ میں دیکھا تو خوشامد پر اُتر آیا۔ "میں نے تو یونہی بات کی تھی۔ لشکر تمہاری کمان میں ہے... جیسا چاہو کرو۔"

محاصرہ طول کھینچ رہا تھا اور توران کی بے چینی بڑھتی جا رہی تھی۔ انہیں بعلبک پر قبضہ کی جلدی تھی۔ اس لیے فرخ شاہ پر رُعب ڈالنے یا اپنی بے چینی ثابت کرنے کے لیے رات کے بیشتر حصہ میں خیمے کے سامنے ٹہلتے رہتے تھے۔

پھر ایک دن قلعہ کا دروازہ کھُلا اور ایک سوار نیزہ پر سفید کپڑا باندھے نکلا۔ سفید پرچم یا کپڑا امن کی نشانی تھی۔ فرخ شاہ امن کی ایک رُکنی سفارت کے استقبال کے لیے خیمے سے باہر نکل آیا۔ توران شاہ بھی اس کے پاس آ کر کھڑا ہو گیا۔ یہ سوار آہستہ آہستہ قریب آ رہا تھا۔

توران شاہ نے تبصرہ کیا۔ "ذرا چال تو دیکھو۔ معلوم ہوتا ہے گھوڑے پر نہیں گدھے پر سوار ہے۔"

"چچا جان!" فرخ شاہ نے ادب سے درخواست کی۔ "یہ ... کا سفیر ہے۔ خدا کے لیے کوئی ایسی ویسی بات نہ کہیے گا کہ شرمندگی اُٹھانا پڑے۔"

"واہ! میں کیوں بات کرنے لگا۔ سپہ سالار تم ہو۔ میں کچھ نہیں بولوں گا۔" توران شاہ مسلسل اور ہر بات میں بول رہے تھے مگر بڑی معصومیت سے فرما رہے تھے کہ میں کیوں بولوں گا۔

سوار سفیر قریب آیا تو معلوم ہوا کہ وہ امیر شمس الدین المقدم ہیں۔ فرخ شاہ نے آگے بڑھ کر اس کا استقبال کیا۔

امیر شمس الدین المقدم! میں آپ کو خوش آمدید کہتا ہوں۔ آپ کی تشریف آوری میرے لیے باعث فخر ہے۔" فرخ شاہ نے بڑے خلوص سے کہا۔

جس طرح فرخ شاہ کو المقدم کو دیکھ کر تعجب ہوا تھا۔ اسی طرح المقدم کو فرخ شاہ کو دیکھ کے چونکا۔ "امیر زادے آپ کیا آپ عالیجاہ کے ساتھ تشریف لائے ہیں؟"

فرخ شاہ کے جواب دینے سے پہلے قریب کھڑے

ہوئے توران شاہ نے جواب دیا۔" سلطان معظم چھوٹے چھوٹے قلعوں کو سرنگوں کرنے نہیں آتے۔ لشکر کے سالار عزالدین فرخ شاہ ہیں۔"

فرخ شاہ توران شاہ کو گھور کے رہ گیا۔ بھلا ان کو دخل دینے کی کیا ضرورت تھی۔ المقدم نے فرخ شاہ سے سوال کیا تھا وہی جواب دیتا۔

فرخ شاہ ہی نہیں المقدم بھی توران شاہ کی اس بے جا مداخلت سے جل اٹھا تھا۔ اس نے جواب دیا۔" درست فرمایا آپ نے توران شاہ! سلطان معظم چھوٹے قلعوں کو فتح کرنے نہیں جایا کرتے لیکن شاید آپ کو علم نہیں کہ سلطان امیر زادے فرخ شاہ کو صرف اہم جنگوں پر سپہ سالار بنا کر بھیجتے ہیں۔"

توران شاہ نے بعلبک کے قلعے کو چھوٹا قلعہ کہا تھا اور فرخ شاہ کی سپہ سالاری کو کوئی اہمیت نہ دی تھی۔ اس طرح اس نے اپنے خیال میں المقدم اور فرخ شاہ دونوں ہی کو حقیر کرنے کی کوشش کی تھی لیکن امیر شمس الدین المقدم نے اسے ایسا جواب دیا کہ اس کے دانت کھٹے ہو گئے تھے۔

فرخ شاہ نے اس پر المقدم کو تحسین آمیز نظروں سے دیکھا پھر المقدم سے بولا۔" امیر محترم! فرمائیے میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟"

"امیر زادے!" المقدم نے سنبھل کے کہا۔" میں امیر شمس الدین نہیں بلکہ بعلبک کے حاکم کا سفیر ہوں۔ مجھے آپ کی کسی خدمت کی ضرورت نہیں۔"

"پھر کیا سفیر محترم یہ فرمائیں گے کہ وہ قلعے سے نکل کر دشمن کے خیموں میں کیوں تشریف لائے ہیں؟" فرخ شاہ نے بھی سنجیدگی اختیار کی۔

"امیر زادے! میں سلطان کے پاس امن کا پیغام لے کر آیا تھا لیکن وہ نہیں آئے ہیں۔" المقدم نے پریشان ہوتے ہوئے کہا۔

"آپ کے امن کا پیغام لینے کا تو مجھے اختیار ہے امیر محترم!" شمس الدین کے سوال کے جواب میں فرخ شاہ نے کہا۔ "مگر ابھی تک امن شکنی کسی طرف سے نہیں ہوئی۔ ہر طرف امن ہی امن ہے۔ قلعے کے اندر امن اور قلعے کے باہر شاہی لشکر کے خیموں میں امن۔ کیا آپ نقص امن کا شکوہ کرنے آئے ہیں؟"

"میں سلطان سے کچھ مانگنے آیا تھا شہزادے! اور میں جو مانگنا چاہتا ہوں اسے آپ کو دینے کا اختیار نہیں ہے۔" المقدم نے کہا۔

"امیر محترم! آپ جو مانگنا چاہتے ہیں صرف وہی میرے اختیار سے باہر نہیں بلکہ میں آپ کو کچھ نہیں دے سکتا۔۔" فرخ شاہ نے اپنی مجبوری ظاہر کر دی۔" ہاں میں آپ کو ایک چیز ضرور دے سکتا ہوں۔ بشرطیکہ آپ اس کی خواہش کریں۔"

"بھلا وہ کون سی چیز ہے امیر زادے! ذرا مجھے بھی تو بتائیے۔" المقدم نے دلچسپی سے پوچھا۔

"وہ چیز عزت اور احترام!" فرخ شاہ نے مضبوط لہجے میں کہا۔ "سلطان معظم نے فرمایا تھا کہ اگر امیر شمس الدین المقدم اطاعت قبول کر لیں تو ان کا پورا احترام کیا جائے اور انہیں سلطان کے پاس بڑی عزت سے لے جایا جائے۔"

"میں اپنے آقا سلطان دمشق و مصر اور امیر زادے آپ کا بھی شکر گزار ہوں کہ سلطان مجھے اب بھی اس قابل سمجھتے ہیں۔" امیر المقدم نے پورے خلوص سے کہا، پھر کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔" امیر زادے کیا میں آپ سے بغلگیر ہو سکتا ہوں؟"

واضح رہے کہ فرخ شاہ امیر المقدم کو اپنے خیمے میں لے آیا تھا اور یہ تمام گفتگو خیمے میں فرش خاک پر بچھی ہوئی ایک چٹائی پر ہوئی تھی۔

امیر زادہ المقدم کی اس فرمائش پر پریشان ہو گیا۔

"امیر المقدم! میں آپ کی بات سمجھ نہیں سکا۔ آپ مجھ سے بغلگیر کیوں ہونا چاہتے ہیں؟"

"یہ بھی میں آپ کو بتا دوں گا۔ آپ میری درخواست تو قبول فرمائیے۔" المقدم نے اصرار کیا۔

امیر زادے کو اس خواہش کو پورا کرنے کے لیے کھڑا ہونا پڑا۔ امیر المقدم، فرخ شاہ کے سینے سے سینہ ملا کر کھڑے ہو گئے پھر اس نے سرگوشی کی۔

"امیر زادے! میں جب آپ کو دیکھتا ہوں تو یقین کیجیے کہ مجھے اپنی مرحوم ارمغانہ یاد آ جاتی ہے۔"

امیر زادے فرخ شاہ کے جسم میں غم کی ایک تیز لہر دوڑ کر نکل گئی اس نے بھی سرگوشی کی۔

"امیر! میرے ساتھ توران شاہ ہیں۔ آپ کچھ خیال فرمائیں۔" امیر شمس الدین اس سے الگ ہو گیا۔

فرخ شاہ نے دریافت کیا۔" امیر! آپ نے کیا فیصلہ کیا؟"

"کیا فیصلہ امیر زادے؟"

"کیا آپ سلطان کی اطاعت قبول کرتے ہیں؟"

امیر شمس الدین المقدم نے بڑے مدبرانہ انداز میں کہا... "امیر زادے! غلاموں سے روز روز تجدید عہد نہیں کرایا جاتا۔ میں سلطان کا غلام ہوں اور آخری سانس تک غلام رہوں گا۔"

"الحمدللہ۔ (آمین)" فرخ شاہ کی زبان سے نکلا۔

توران شاہ نے فوراً دخل دیا۔ "امیر! اس کا مطلب ہے کہ تم قلعہ بعلبک سے دستبردار ہو گئے۔"

"امیر توران شاہ! میں بعلبک سے اسی دن دستبردار ہو گیا تھا جس دن سلطان نے آپ کو یہ قلعہ عطا کرنے کا اعلان کیا تھا۔" امیر شمس الدین نے بالکل واضح الفاظ میں کہا۔ "رہا میرے قلعہ بند ہونے کا سوال، تو اس کے لیے عرض ہے کہ کبھی کبھی غلام بھی اپنے آقا سے اکڑ جاتا ہے۔ آخر اس کا بھی تو کوئی حق ہوتا ہے۔ ہر حکم ماننے والا اگر ایک حکم ماننے سے انکار کر دے تو کیا آقا اُسے قتل کر دے گا؟"

"ہرگز نہیں امیر المقدم!" فرخ شاہ نے تائید کی۔ "شاید یہی وجہ ہے کہ سلطان آپ کی حکم عدولی کو بھی برداشت کر جاتے ہیں۔ انہوں نے مجھ سے ہمیشہ آپ کی تعریف کی ہے۔"

"آقا آخر آقا ہی ہوتا ہے۔"

"پھر کیا ارادہ ہے آپ کا؟" فرخ شاہ نے پوچھا۔

"اب کیا ارادہ ہو سکتا ہے۔ سلطان میرا آقا اور میں اس کا غلام۔"

"پھر آپ میرے ساتھ چل رہے ہیں دمشق؟"

امیر شمس الدین نے ایک لمحہ سوچا۔ "دمشق تو مجھے جانا ہی ہے۔ مجھے سلطان سے کچھ مانگنا ہے۔" امیر دمشق چلنے پر آمادہ ہو گیا۔

"امیر! آپ قلعہ والوں سے کہہ آیئے کہ وہ آپ کا انتظار نہ کریں اور یہ کہ آپ دمشق جا رہے ہیں۔" فرخ شاہ نے امیر المقدم کو اصول کی بات بتائی۔

"خیر! آپ تشریف رکھیے۔ میں ابھی قلعہ ہو کے آتا ہوں۔" امیر شمس الدین نے جواب دے کے اپنے دونوں بازو کھول دیے جیسے وہ فرخ شاہ سے بغلگیر ہونا چاہتا تھا۔ فرخ شاہ کو بھی دہ جانے کیا سوجھی کہ وہ فوراً اس کے سینے سے لگ گیا۔ پھر دیر تک اسی طرح سینے سے لگا کھڑا رہا۔

✤

فرخ شاہ امیر المقدم کو دمشق لے گیا لیکن سلطان اس سے اس قدر ناراض تھا کہ اُسے دربار میں آنے کی اجازت نہ دی۔ ایک دن، دو دن، چار دن گزر گئے مگر سلطان کا غصہ ٹھنڈا ہونے کا نام نہ لے رہا تھا۔ امیر المقدم مہمان خانہ میں پڑے پڑے تنگ آ گیا تھا۔ امیر زادہ فرخ شاہ اُس سے روز ملنے آتا اور تسلی دے کر چلا جاتا اور امیر المقدم کو روز یہ امید بندھ جاتی کہ شاید آج سلطان نے باریابی کی اجازت دی ہو مگر فرخ شاہ آتا اور افسردگی سے مطلع کرتا۔ "امیر محترم! سلطان آج بھی آپ کے حق میں فیصلہ نہیں کر سکے۔"

امیر المقدم کا دل بیٹھ جاتا اور وہ آئندہ روز پر امید لگا لیتا۔ ایک دن امیر المقدم صبح سے ہی جز بز ہو رہا تھا۔ فرخ شاہ اپنے وقت مقررہ پر آیا اور بولا۔

"امیرِ محترم! سلطان..."

فرخ شاہ اتنا ہی کہہ پایا تھا کہ امیر المقدم نے اُسے روک دیا اور چیخ کے بولا۔ "بس امیر زادے! بہت ہو چکی۔ میرا فیصلہ سلطان نہیں بلکہ میں خود کروں گا۔"

"امیرِ محترم!" فرخ شاہ نے دخل دیا۔ "آپ میری بات تو سنیے۔"

"نہیں امیر زادے! اب تک میں آپ کی سنتا تھا مگر آج آپ میری سنیں گے۔ میں نے اپنا فیصلہ خود ہی کر لیا ہے۔ آپ سلطان معظم سے میری جانب سے عرض کریں کہ شمس الدین ابن المقدم کے قتل کا حکم صادر فرمایا جائے کیونکہ وہ انتظار کے اس کرب کو ختم کرنا چاہتا ہے۔ آپ جایئے اور اُن سے کہہ دیجیے۔"

فرخ شاہ نے امیر المقدم کے پاس بیٹھتے ہوئے کہا۔ "امیرِ محترم! میں آپ کے اور سلطان کے درمیان نہیں آنا چاہتا۔ جو کہنا ہے وہ خود آپ، سلطان سے جا کے کہہ دیجیے کیونکہ سلطان نے آج آپ کو دربار میں طلب کیا ہے۔"

"ہائیں!" المقدم حیران رہ گیا۔ "آپ نے مجھے پہلے کیوں نہیں بتایا امیر زادے؟"

"آپ نے مجھے بولنے کا موقع ہی کب دیا تھا؟" فرخ نے اُسے جواب دیا۔

پھر فرخ، امیر المقدم کو ساتھ لے کر دربار میں پہنچا... المقدم نے سلطان کو دیکھتے ہوئے سلام پیش کیا۔ اُسے اندازہ ہوا کہ سلطان کی تیوریوں پر اس وقت بھی بل پڑے ہیں۔

سلطان نے المقدم کو تیز نظروں سے دیکھا۔ "تم حکم عدولی کی جرأت کب تک کرتے رہو گے شمس الدین؟" سلطان کے الفاظ میں سختی اور آواز میں تلخی تھی۔

امیر شمس الدین المقدم نے صرف چند لمحوں میں جواب کو ترتیب دیا اور بڑے پرسکون لہجے میں بولا: "جب تک سلطان معظم عفو و درگزر کے راستے پر گامزن رہیں گے اور گنہگاروں کی بخشش ہوتی رہے گی۔ غلام بھی اپنی گستاخیوں پر قابو نہیں پا سکے گا۔"

امیر شمس الدین المقدم کا جواب اس قدر نپا تُلا اور برجستہ تھا کہ درباریوں پر سناٹا چھا گیا۔ شمس الدین المقدم نے سلطان کی بالکل صحیح تعریف کی تھی۔ سلطان صلاح الدین آغازِ سلطانی سے ہی اس قدر رحم دل تھا کہ وہ اپنے بدترین دشمن کو بھی معاف کر دیا کرتا تھا۔

سلطان کچھ دیر امیر المقدم کے جواب پر غور کرتا رہا پھر بولا۔ "شمس الدین! ہمیں معلوم ہوا ہے کہ تم ہم سے کچھ مانگنا چاہتے ہو! ہم نے تمہیں بعلبک بے مانگے دیا تھا لیکن جب ہم نے واپس لیا تو تم گستاخی پر اُتر آئے۔ اب تم کیسے امید کر سکتے ہو کہ ہم تمہاری کوئی مانگ پوری کریں گے؟"

"عالیجاہ! سائل تو ہر دروازے پر صدا لگاتا ہے۔ اب یہ دینے والے کی مرضی ہے کہ وہ چاہے تو دامن بھر دے یا پھر دھتکار دے۔" شمس الدین المقدم نے پھر ایک معقول جواب دیا۔

"شمس الدین! حکومت کے فیصلے نوکِ خنجر سے ہوتے ہیں۔ الفاظ کی تکرار کا کوئی اثر نہیں ہوتا۔" سلطان نے گفتگو ختم کی۔ "پھر بھی تم اپنی خواہش بیان کر دو۔"

"عالیجاہ! غلام کی یہ عرض ہے کہ بعلبک نہ سہی پھر بھی بعلبک ہی جیسا کوئی نامور علاقہ مجھ ناچیز کو بخشا جائے تاکہ دربارِ عالی میں میری عزت برقرار رہے اور ہم چشموں میں عمر کے اس حصے میں سُبکی یا شرمندگی محسوس نہ ہو۔" امیر شمس الدین المقدم نے اپنا مدعا بیان کر دیا۔

"اتنی سی بات کا تم نے اتنا ہنگامہ کیا۔ کل تم دربار میں آؤ گے تو تمہاری پسند کا علاقہ تمہیں دے دیا جائے گا۔" سُلطان نے اسی وقت فیصلہ کر دیا۔

دوسرے دن سے فرخ شاہ کی شادی کا ہنگامہ کھڑا ہو گیا۔ سلطان کو مصر چھوڑے ہوئے کافی عرصہ ہو گیا تھا اور اب وہ جلد سے جلد ادھر کا ایک چکر لگانا چاہتا تھا۔ تیسرے دن فرخ شاہ کی شادی ہو گئی۔ لڑکی خاندان ہی کی تھی۔ کوئی زیادہ اہتمام نہیں کیا گیا اور دلہن رُخصت ہو کے شاہی محل کے ایک حصے میں آ گئی۔ یہ سلطان کا حکم تھا۔ سلطان کے اہل و عیال شاہی محل میں رہتے تھے۔ فرخ شاہ کو بھی ضرورت کے مطابق ایک بڑا حصہ دیا گیا تھا۔ سلطان نے فرخ کو شاہی محل میں جگہ کیوں دی تھی۔ اس کی وجہ دوسرے ہفتے معلوم ہوئی۔ سلطان نے مصر روانہ ہوتے وقت فرخ شاہ کو دمشق کا حاکم بنا دیا۔ اور اسے شاہی خاندان کا ناظم بھی مقرر کیا گیا۔

سلطان نے شمس الدین المقدم کو اپنی ناراضگی کے باوجود اس علاقہ کی حکمرانی عطا کر دی جس کی اس نے خواہش کی تھی۔ پھر ہر طرف سے مطمئن ہونے کے بعد سلطان صلاح الدین مصر چلا گیا۔

☆

شام کی چھوٹی چھوٹی ریاستیں مثلاً نصیبین، کیفا، ماردین وغیرہ تھیں تو آزاد لیکن وہ کسی نہ کسی بڑی طاقت سے متعلق رہتی تھیں اور ضرورت کے وقت ان سے فوجی مدد طلب کرتی تھیں۔ بڑی طاقتیں دو ہی تھیں۔ ایک سلطان صلاح الدین کی اور دوسری والئ موصل سیف الدین غازی کی......

صلاح الدین اور والئ موصل میں دو سال کے لیے معاہدۂ امن ہوا تھا۔ اس لیے دمشق اور موصل میں خاموشی طاری تھی لیکن دوسرے سال جبکہ سلطان صلاح الدین قاہرہ میں تھا اور ابھی دو سالہ معاہدہ کی مدت باقی تھی تو والئ موصل کی طرف سے معاہدہ کی خلاف ورزی ہوئی۔

بات دراصل یہ ہوئی تھی کہ والئ موصل سیف الدین غازی کا ۵۷۶ ہجری (۱۱۸۰ء) میں انتقال ہو گیا۔ سیف الدین غازی کے انتقال پر موصل کا والی عزالدین مسعود بنا۔ اس کے متعلق سب کا یہ خیال تھا کہ اس میں اُمورِ سلطنت چلانے کی پوری اہلیت موجود تھی۔

عزالدین مسعود میں اہلیت ہو یا نہ ہو لیکن اس کی قسمت کا ستارہ بڑے عروج پر تھا۔ عزالدین کو والئ موصل ہوئے چند ماہ ہی گزرے تھے کہ اُسے ایک اور بڑی ریاست مفت میں مل گئی اور وہ ریاست تھی حلب کی۔ حلب کا بادشاہ ملک الصالح تھا جو اپنے وزیر گمشتگین کے شکنجے میں تھا۔ اس کی عمر ابھی صرف انیس سال کی تھی کہ اُسے بھی موت نے آن گھیرا۔ وہ اچانک بیمار ہوا اور طبیعت اتنی خراب ہوئی کہ بستر سے لگ گیا۔ نورالدین زنگی کا یہ بیٹا اپنے نام الصالح کی طرح واقعی صالح اور سعید تھا۔ مورخین نے تصدیق کی ہے کہ ملک الصالح اپنی نوجوانی میں بھی پاک دامن رہا۔ حالانکہ شاہی محلات میں...

شہزادے دس سال کی عمر میں جوان ہو جاتے ہیں یا یہ کنیزیں انہیں جوان بنا دیتی ہیں۔ ملک الصالح جب مرض الموت میں مبتلا تھا اور کوئی دوا کارگر نہ ہوتی تھی تو ایک طبیب نے دوا میں شراب کا استعمال تجویز کیا۔

ملک الصالح نے فقیہہ شہر سے پوچھا: "اے فقیہہ محترم! کیا شراب کا استعمال جائز ہے؟"

فقیہہ شہر نے جواب دیا: "اے شاہ محترم! دوا میں اگر شراب شامل کی جائے تو یہ استعمال شرعی نقطۂ نظر سے جائز ہے۔"

ملک الصالح کی طبیعت بگڑتی جا رہی تھی اور نزع کا عالم طاری ہونے کے قریب تھا مگر اللہ کے اس نیک بندے نے فقیہہ سے ایک اور سوال کیا: "مجھے یہ بتائیے کہ اس کے استعمال سے موت کا وقت ٹل سکتا ہے؟"

"ہرگز نہیں۔" فقیہہ نے انکار کیا۔ "موت اور موت کا وقت دونوں اٹل چیزیں ہیں۔ ان میں ایک لمحہ کا بھی فرق نہیں پڑ سکتا۔"

ملک الصالح نے بڑے حوصلے سے جواب دیا: "پھر میں ایسی دوا نہیں پی سکتا جس میں شراب شامل ہو۔ میں اپنے خدا کی حرام کی ہوئی چیز پی کر اس سے نہیں ملوں گا۔"

شاہ ملک الصالح لاولد تھا۔ اس لیے اس نے وصیت کی کہ اس کی موت پر موصل کے نئے والی عزالدین مسعود کو حلب کی سلطنت دی جائے۔ اس طرح عزالدین مسعود جو سال بھر پہلے کسی ریاست کا بھی والی نہ تھا تو ایک موصل اور حلب کا حکمران ہو گیا۔ اسے دو، دو ریاستیں مفت ہاتھ آ گئیں تو اس کا دماغ عرش بالا پر پہنچ گیا۔ عزالدین مسعود کا چچیرا بھائی عمادالدین ریاست سنجار کا والی تھا۔ اس نے عزالدین سے کہا کہ وہ حلب کا سنجار سے تبادلہ کر لے۔ حلب ایک بڑی ریاست تھی۔۔۔ عزالدین سنجار سے تبادلہ کرنے پر آمادہ نہ ہوا۔

سنجار کا حاکم عمادالدین، عزالدین سے زیادہ چالاک تھا۔ عزالدین کے انکار پر اس نے کہہ بھیجا کہ اگر عزالدین تبادلہ پر آمادہ نہیں تو وہ (عمادالدین) اپنی ریاست کو سلطان صلاح الدین کے حوالے کر دے گا اور سلطان کی طرف سے عزالدین کے مقابلے پر آئے گا۔ عزالدین مسعود ڈر گیا اور اس نے فوراً حلب عمادالدین کے حوالے کر دیا اور سنجار پر اپنا آدمی مقرر کر دیا۔

عزالدین مسعود اور عمادالدین دونوں ہی سلطان صلاح الدین کے مخالف تھے۔ عزالدین مسعود تو سلطان کا جانی دشمن تھا۔ چنانچہ یہ دونوں سلطان کو زک پہنچانے کی تدبیریں کرنے لگے۔ والیٔ حلب عمادالدین نے سلطان کے علاقہ دیار بکر پر حملہ کر دیا۔ بڑی لوٹ مار مچائی۔ دوسری طرف عزالدین نے اس سے بھی زیادہ غلط اور نقصان دہ قدم اٹھایا۔ وہ مسلمانوں کے دشمن فرنگیوں سے مل گیا۔ فرنگیوں سے معاہدہ کیا کہ اگر وہ سلطان پر حملہ کریں گے تو موصل اور حلب کے لشکر فرنگیوں کی مدد کریں گے۔ اس کے علاوہ سلطان صلاح الدین کے جانی دشمن حشیشن کے شیخ الجبل کے پاس ایک سفیر بھیجا اور اسے اس بات پر اُبھارا کہ وہ صلاح الدین کا خاتمہ کر دے تو اس کی جماعت کو ایک معقول علاقہ دیا جائے گا اور حلب میں حشیشین کے تبلیغی مراکز کھولنے کی اجازت دی جائے گی۔"

سلطان صلاح الدین کو موصل اور حلب کے زنگی والیوں کی ان بیجا حرکتوں کی خبریں برابر مل رہی تھیں لیکن اس نے جو معاہدہ موصل اور حلب کے سابق فرمانرواؤں سے کیا تھا وہ اس کے قدم پکڑ رہا تھا۔ ابھی اس معاہدہ کے ختم ہونے میں چند ماہ باقی تھے۔ اس لیے اس نے عمادالدین اور عزالدین کے خلاف کوئی قدم نہیں اٹھایا مگر جب ان دونوں کی مخالفانہ سرگرمیاں روز بروز بڑھتی رہیں تو سلطان کو یہ محسوس ہوا کہ ان نادانوں کی وجہ سے نہ صرف سلطان بلکہ شام کے تمام مسلمانوں کی سالمیت کو خطرہ پیدا ہو گیا ہے تو اس نے مصر سے دمشق واپس جانے کا فیصلہ کیا۔

سلطان کی مصر سے روانگی سے پہلے ملک شام کی ایک چھوٹی سی ریاست کا ذکر دلچسپی سے خالی نہ ہو گا۔ یہ تھی ریاست آمد جسے بعض تواریخ میں عمید بھی کہا گیا ہے۔ یہ ریاست رقبہ کے لحاظ سے جتنی چھوٹی تھی اپنی دولتمندی کی وجہ سے موصل اور حلب سے زیادہ مالدار تھی۔ مشہور تھا کہ ریاست آمد میں دھن برستا ہے اور ہر شخص اس قدر فارغ البال ہے کہ پوری ریاست میں کوئی فقیر ہے اور نہ خیرات زکوٰۃ لینے والا ہے۔

اس پر طرہ یہ کہ آمد صرف مال و دولت ہی میں دوسری ریاستوں پر فوقیت نہیں رکھتی تھی بلکہ اس مختصر سی ریاست میں دولتِ علم کے بھی بیش بہا خزانے موجود تھے۔ تمام مؤرخ اس بات پر متفق ہیں کہ آمد کی سرکاری لائبریری میں دس لاکھ کتابیں موجود تھیں۔ علم کا یہ اتنا بڑا خزانہ ہے کہ سوائے بغداد کے اور کوئی شہر اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا تھا۔

تیسری انفرادیت اس ریاست کو اس وجہ سے حاصل

تھی کہ چاروں طرف سے مسلمان ریاستوں اور مسلم تہذیب میں گھرے ہونے کے باوجود آمد کی ریاست ایک نصرانی ریاست کا نقشہ پیش کرتی تھی۔ آمد کا فرمانروا مسلمان، وزیر مسلمان، آبادی مسلمان، عمارتیں مسلم طرز تعمیر کا نمونہ مگر پھر بھی اس ریاست پر کسی نصرانی کا شبہ ہوتا تھا۔ شاہی محل پر جائیے تو بیشتر پہریدار عیسائی، کنیزیں عیسائی، ملازم عیسائی، لباس عیسائی، گفتگو کا انداز نصرانی، طرز رہائش نصرانی، بلکہ شاہی محل کے پائیں باغ میں ایک چوبی (لکڑی کا بنا ہوا) چھوٹا سا مگر بہت خوبصورت گرجا بھی بنوایا گیا تھا اور یہ سب کچھ لوازمات صرف ایک ہستی یعنی فرمانروائے آمد کی عیسائی ملکہ مریتا کی دلبستگی کی وجہ سے کیا گیا تھا۔

مشہور ہے کہ مسلمان جہاں جاتے ہیں یا جس جگہ رہتے ہیں وہاں کی ہر چیز کو مسلمان کر لیتے ہیں لیکن ریاست آمد میں یہ کام ملکہ مریتا نے کیا تھا۔ وہ عیسائی ملکہ جس دن سے شاہی محل میں داخل ہوئی تھی اس روز سے ہر چیز جیسے کافر ہوگئی تھی۔ روایت ہے کہ آمد کی ملکہ مریتا ایک عیسائی راہب مسٹر فلپ مرونالڈ کی بیٹی تھی۔ راہب فلپ نے مریتا کو نن بنایا تھا تاکہ وہ عمر بھر دوشیزہ رہ کر کنواری مریم کی عبادت کرتی رہے مگر مسٹر فلپ کا یہ ارادہ اس وقت تبدیل ہوگیا یا انہوں نے اس ارادہ کو خود بدل دیا جب ریاست آمد کے عاشق مزاج اور جواں عمر فرمانروا کا اس کی بیٹی مریتا پر دل آگیا۔

اس خوبصورت مگر تباہ کن حادثہ کی تفصیل اس طرح بیان کی گئی ہے کہ ریاست آمد کا ولی عہد جس روز باقاعدہ ریاست کا بادشاہ بنا تھا۔ اس دن ایک اتنا بڑا جشن منایا گیا تھا جس کی مثال ملک شام کی ریاستوں میں نہیں ملتی۔ نوجوان حکمران آمد نے اپنی تاجپوشی کی رسومات ادا ہونے کے بعد حکم دیا کہ اعلیٰ حضرت شاہی سواری پر سیر کو نکلیں گے اور اس طرح اپنی پیاری رعیت کو دعوت نظارہ دیں گے۔ انہوں نے

علم الاعداد علم دست شناسی، علم تحریر، علم قیافہ، علم نجوم، کردار شناسی نہ جادو ہیں نہ جھومنتر۔ اللہ تعالیٰ نے ہر ذی روح کو دماغ نام کا کمپیوٹر عطا کیا ہے اس کمپیوٹر میں سوچنے، سمجھنے اور محسوس کرنے کی صلاحیتیں بھر دی ہیں۔ ضرورت ہے کہ کسی علم کی طرف توجہ دی جائے صرف توجہ دینے ہی سے ہر کسی کو دو اور دو چار کی طرح سکھایا جا سکتا ہے۔ سیکڑوں ماہرین نے ہزاروں سال تجربات کئے اور پھر ایس صدیقی نے سب کے تجربات کو موجودہ صدی میں "دنیا کے چھ پراسرار علوم" کے نام سے یک جا کر دیا ہے۔ (پروفیسر عالم اقبال)

ڈاکٹروں کا کہنا ہے اگر انسان اپنی بیماری کو جان لے تو اس کا تدارک آسان ہو جاتا ہے اور بہت معمولی معمولی دواؤں سے وہ اپنا علاج خود کر سکتا ہے۔ عالی جناب ڈاکٹر پی۔ سی گپتا نے معجزہ دکھانے والی دو سو ہومیو پیتھک دوائیں اور ان کے استعمال کے طریقے "ہومیو پیتھک ڈاکٹر بنو" نامی کتاب قیمت بیس روپے میں درج کر دیئے ہیں۔ اس کتاب کی مدد سے غریب و نادار لوگ پیسہ بچا کر بھرپور فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ "کتاب والا" سے طلب کریں۔ (محمد انیس)

ہٹلر ایک معمولی سپاہی تھا ——— اور ——— راسپوتین ایک پادری ——— ایک نے جرمن کو اور دوسرے نے روس کو مٹھی میں جکڑ رکھا تھا ——— سوچئے ——— کس طرح؟ ——— آپ کے جسم میں بھی یہ طاقت پوشیدہ ہے ——— آپ بھی اس خداداد قوت سے واقف ہو کر اپنے جسم میں چھپی طاقت کو بیدار کر سکتے ہیں ——— سوئی ہوئی اپنی جسمانی طاقت کو بیدار کرنے کے لئے پڑھئے۔

——— ہپناٹزم کیا ہے؟ ——— ہپناٹزم کے عملی طریقے ——— ہپناٹزم سے علاج

کہیں سے سُن لیا تھا کہ عباسی خلیفہ رزمگاہوں میں دادِ شجاعت دینے کے بعد اب محل نشیں بلکہ حجرہ نشیں ہو گئے ہیں اور اپنی محبوب رعایا کے بے حد اصرار پر کبھی کبھی یا ہفتہ مہینے میں ایک بار جھروکے میں آ بیٹھتے ہیں کیونکہ انہیں اب محلاتی رنگ رلیوں میں اس قدر مشغولیت رہتی ہے کہ وہ روز دربارِ خاص یا دربارِ عام نہیں لگا سکتے۔

فرمانروائے آمد نے اپنے ایامِ شہزادگی میں عباسی خلیفہ کے اس وتیرے پر بہت غور کیا تھا اور ان کی عقلِ رسا نے یہ نتیجہ نکالا تھا کہ انہیں اپنی انفرادیت برقرار رکھنے کے لیے عباسی خلفاء کے بالکل برعکس یعنی جس طرح وہ اپنی رعایا کو کبھی کبھی درشن دیتے تھے۔ فرمانروائے آمد اپنی رعایا کو روزانہ درشن دیا کرے گا۔ اس کا طریقہ یہ ہو گا کہ وہ شاہی سواری میں شاہی لباس زیب تن کر کے شاہانہ شان و شوکت سے آمد کے تمام کوچہ و بازار کا دن میں کم از کم ایک بار ضرور چکر لگایا کرے گا۔ یہ ولی عہد شہزادے کی عہدِ طفلی کی طفلانہ باتیں تھیں مگر جس روز انہوں نے بادشاہت کا تاج اپنے سر رکھا اُس دن یہ باتیں حقیقت کا روپ دھار گئیں۔

فرمانروائے آمد نے اپنے اس خواب کو حقیقت میں تبدیل کرنے کے لیے بہت پہلے سے تیاریاں شروع کر دی تھیں۔ اس نے حکم دیا تھا کہ اس کی سواری کے لیے ایک ایسا شاہی رتھ تیار کیا جائے جو سوائے پہیوں کے باقی پورا کا پورا خالص سونے کا ہو۔ مقصد یہ تھا کہ شاہی سواری تمام کی تمام سونے کی بنائی جائے اور سوائے سونے کے اور کوئی دھات استعمال نہ ہو۔ چنانچہ اس قسم کا رتھ ان کی تاجپوشی سے بہت پہلے تیار ہو گیا تھا اور انہوں نے اسے بہت پسند فرمایا۔ سوائے اس کے کہ رتھ کے پہیے لکڑی کے تھے جن کے اُوپر سونے کے پتر چڑھائے گئے تھے۔ اور لگامیں چمڑے کی تھیں جن پر سونے کے تار لپیٹے گئے تھے۔

امیر بہاؤالدین بن نیسان اس سلطنت کا کرتا دھرتا اور وزیرِ اعظم تھا۔ اس نے بچپن سے جوانی تک ولی عہد کے رنگ ڈھنگ دیکھے تھے یا یوں کہنا چاہیئے کہ اسے شہزادے کی کمزوریوں کا علم ہو گیا تھا۔ امیر بہاؤالدین ایک انتہائی سخت مزاج بلکہ جابر قسم کا امیر تھا اور خود [illegible] تھا کہ اپنی من مانی کے آگے کسی دوسرے کی چلنے نہیں دیتا تھا۔ ظاہر ہے کہ ایسے شخص کو بغیر کسی قدغن اور روک ٹوک کے ہر قسم کے اختیارات

ملنا چاہیئے تھے۔ یہ اختیارات حاصل کرنے کے لیے امیر [illegible] بہت پہلے سے تدبیریں شروع کر دی تھیں۔ شہزادے [illegible] گرد اس نے اپنے اعتماد کی چند کنیزیں اور غلام مقرر کیے تھے جن کے ذریعے امیر کو شہزادے کی پسند و ناپسند کے بارے میں معلومات حاصل ہوتی تھیں۔

شیطانی طبیعت والوں کے کام اکثر شیطان کر دیتا [illegible] آمد کا وزیرِ اعظم بھی شیطان کا چیلا تھا۔ اس نے سوچا تھا کہ حکو[مت] کے نظم و نسق کے اختیارات حاصل کرنے کا بہترین طریقہ [یہ] ہے کہ تاجپوشی کے بعد آمد کے فرمانروا کو کسی طرح شاہی محل میں قید کر دیا جائے مگر اس قید اس طرح ہو کہ فرمانروا محل سے باہر نکلنے سے خود پرہیز کرنے لگے۔ پس اس کے شیطانی کام میں شیطان نے اس کا بھرپور ساتھ دیا اور عین تاجپوشی کے بعد ایک ایسا واقعہ پیش آیا جس نے فرمانروائے آمد کو شاہی محل کے دلفریب قید خانے میں ہمیشہ کے لیے مقید کر دیا۔

ولی عہد کی تاجپوشی میں نزدیک اور دُور کی بہت سی ہستیوں کو دعوت دی گئی تھی لیکن شاطر وزیر امیر بہاؤالدین بن نیسان نے کسی ملک کے والی یا شہزادے کو مدعو نہیں کیا تھا بلکہ عام طور سے وزیروں کو بلایا گیا تھا اور وزیر بھی [illegible] جو اپنی اپنی حکومتوں کے سیاہ و سفید کے مالک تھے۔ تاجپوشی کے دن قلعہ اور شہر کو دُلہن کی طرح سجایا گیا تھا۔ رعایا کی دلبستگی کے لیے ناچ رنگ کے سینکڑوں طائفے بلائے گئے تھے۔ تاجپوشی کا جشن ایک ہفتے تک منایا جانا تھا اور عوام و خاص کو حکم دیا گیا تھا کہ جشن کے دوران سوائے کھیل تماشوں اور ناچ رنگ کے اور کوئی کام نہ ہو گا۔ نہ کسی کے گھر چولہا جلے گا۔ ہر گھر پر شاہی مطبخ سے کھانا پہنچایا جائے گا۔ وزیر امیر بہاؤالدین نے واقعی اس قدر اعلیٰ قسم کے انتظامات کیے تھے جو قابلِ ستائش تھے۔ وزیر اپنے فرمانروا کو پوری طرح شاہ [illegible] کر کے اپنے ہاتھوں میں لینا چاہتا تھا۔

تاجپوشی کے دن آمد کے حکمران کے سر پر تاج نہیں رکھا گیا اس لیے کہ ایک ریاست کے حکمران کو "شاہ" بننے کا حق حاصل نہ تھا۔ ملکِ شام میں صرف سلطان صلاح الدین کو سلطانی اور حکمرانی کی سند عباسی خلیفہ بغداد نے عطا کی تھی یا پھر ایک شاہ ملک الصالح تھا جو ولی عہد سلطنت ہونے کی وجہ سے خود کو شاہ کہلوا[تا] تھا اور لوگ بھی . . . . . سلطان نورالدین زنگی مرحوم کی نسبت سے اُسے شاہ یا بادشاہ کہنے سے نہ ہچکچاتے تھے۔ تاجِ شاہی [illegible]

علاوہ فرمانروا آمد کی تاجپوشی کے دن اور دیگر تمام رسومات ادا کی گئیں۔ اُسے لباسِ فاخرہ پہنا کر جس میں ہزاروں کی تعداد میں ہیرے جواہرات ٹانکے گئے تھے۔ سونے کی ایک چوکی پر بٹھایا گیا تھا جو تختِ شاہی کی طرح آراستہ کی گئی تھی۔

اس کے بعد نذرانہ کی رسم ادا کی گئی۔ امراء، عمائدینِ ریاست اور متمول شہریوں نے نذریں پیش کیں پھر ان نذرانوں سے بڑھ کے انہیں نوازا گیا۔ کسی کو قیمتی پارچہ جات کا تحفہ ملا تو کسی کو موتیوں اور جواہر ریزوں کے ہار عطا کیے گئے۔ شہر میں جگہ جگہ فقیروں اور مسکینوں میں تقسیم ہونے کے لیے کپڑے۔ جنس اور ضروریاتِ زندگی کی بہت سی چیزیں تقسیم کرنے کے لیے رکھی گئی تھیں۔

مگر اللہ رے! عوام کی خوشحالی اور دولتمندی کہ جشن کے ایک ہفتے کے دوران کیا مجال کہ کوئی فقیر اس جگہ کے قریب سے گزرے۔ یہ تقسیم کا سامان جس طرح آیا اور سجایا گیا تھا اسی طرح اُٹھا کر واپس بھیج دیا گیا تھا۔ یقیناً اس ریاست کے خواص اور عوام پر اللہ تعالیٰ کی خاص نوازش تھی جس نے انہیں اپنی ضرورتوں سے بے نیاز کر دیا تھا۔

ان رسموں کے بعد جنہیں تاجپوشی کا نام دیا گیا تھا۔ ولی عہد نے جو اب آمد کا حکمران بن گیا تھا، حکم دیا کہ شاہی سواری کا جلوس محلِ شاہی سے برآمد ہو کر بڑی سڑک اور بڑے بڑے محلوں سے گزر کر واپس محل آئے۔ حکمراں نے وزیر بہاؤالدین ابن نیساں سے ایک دن پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ اس کا جلوس برآمد ہوگا۔ اس اشارے پر امیر بہاؤالدین نے صبح ہی کو شاہی سواری آراستہ پیراستہ کروائی تھی اور شاہی رتھ محل کے باہر سیڑھیوں کے نیچے لا کے کھڑا کر دیا گیا تھا۔ حکمراں کا حکم پاتے ہی امیر بہاؤالدین نے فوراً اعلانچی کے ذریعے پورے شہر میں ڈگی پٹوا دی کہ ریاست آمد کے والی اور حکمراں کا جلوس سڑکوں اور محلوں سے گزرنے والا ہے۔ اس لیے لوگ اپنے حکمراں کا استقبال اور دیدار کرنے کے لیے سڑکوں کے کنارے قطار اندر قطار کھڑے ہو جائیں۔ خواتین کو حکم دیا گیا کہ وہ اپنے مکان کی چھتوں سے جلوس کا منظر دیکھیں۔

نقارہ پر چوٹ پڑی۔ ڈھول تاشے بجنے لگے۔ مختصر ریاست کی مختصر فوج مگر بہت چاق و چوبند اور نئے اسلحہ سے آراستہ جلوس کے آگے پیچھے اور دائیں بائیں چلنے لگی۔ امراء اور معززینِ شہر کو حکم تھا کہ آمد کے حکمراں کے جلوس کے ساتھ پاپیادہ چلیں۔ وزیر باتدبیر امیر بہاؤالدین نے شہر کے کسی مفتی، فقیہہ، یا عالمِ دین کو جلوس میں شرکت کی دعوت نہیں دی تھی کیونکہ اس کا خیال تھا کہ علماء و فضلاء اس جلوس کو خلافِ شرع قرار دینے میں ذرا بھی رعایت نہیں کریں گے کیونکہ اس تقریب پر وزیر نے بے دریغ روپیہ پانی کی طرح بہایا تھا۔

شاہی جلوس دیکھنے کے لیے پورا شہر و قلعہ اُمڈ آیا تھا۔ سڑک کے دونوں طرف لوگ اپنے حکمراں کی تعظیم اور اس کے دیدار کے لیے جمع تھے۔ چھتوں اور بالاخانوں پر عورتیں نظریں جمائے بیٹھی تھیں جس سمت سے جلوس گزرتا۔ آگے کھڑے ہوئے بچے خوشی سے تالیاں بجاتے۔ بڑے اپنے حکمراں کی درازیٔ عمر کے نعرے لگاتے۔ خواتین کا عالم ہی کچھ اور تھا۔

اور پھر جلوس اچانک ایک جگہ رک گیا۔ کہنے والے کہتے ہیں کہ فرمانروائے آمد نے خود ہاتھ کے اشارے سے جلوس کو رُکنے کا حکم دیا تھا۔ یہ ایک بڑی سڑک کا چوراہا تھا اور چاروں طرف لوگوں کا اژدہام تھا۔ فرمانروا نے اپنے وزیر امیر بہاؤالدین ابن نیساں کو جو اس وقت رتھ کے ساتھ پیدل چل رہا تھا، اُسے قریب بلایا اور اس سے سرگوشیوں میں کچھ کہا۔

وزیر سر ہلاتا ہوا شاہی سواری کے پاس سے ہٹ کر سڑک کے کنارے اس جگہ پہنچا جہاں مسلمانوں کے درمیان ایک نصرانی راہب کھڑا تھا۔ اس کے ساتھ تیرہ، چودہ سال کی ایک دوشیزہ تھی۔ دونوں کے لباس گرد آلود تھے۔ ان کے گلے میں چھوٹی چھوٹی چاندی کی صلیبیں لٹک رہی تھیں۔ چہرے مہرے سے دونوں مسافر معلوم ہوتے تھے۔

وزیر بہاؤالدین نے قریب پہنچ کر اس لانبے بوڑھے آدمی کو مخاطب کیا جو پچاس سے اُوپر نظر آتا تھا۔

"کیا نام ہے تمہارا بزرگ محترم؟"

وہ بوڑھا اور اس کے ساتھ کی لڑکی شاہی رتھ کے پاس سے آتے ہوئے آدمی کو حیرانی اور قدرے خوف سے دیکھ رہے تھے۔ جب آنے والے نے اسے اس قدر مہذب انداز میں مخاطب کیا تو اس کا خوف کچھ کم ہوا۔

"میں ایک نصرانی راہب ہوں اور میرا نام نطپ رونالڈ ہے۔" بوڑھے نے بھی تمیزداری سے جواب دیا۔

"اور یہ لڑکی جو تمہارے ساتھ ہے یہ کیا لگتی ہے تمہاری؟" وزیر نے دوسرا سوال کیا۔

بوڑھے نے چند لمحے سوچنے کے بعد جواب دیا: "میرے بیٹے یہ مرینا ہے جس نے اپنی زندگی کنواری مریم پر نچھاور کر

دی ہے اور ایک پاکباز نن بن گئی ہے۔"

وزیر بہاؤالدین نے اس کے جواب پر غور نہیں کیا بلکہ وہ بات فوراً کہی جس کے لیے فرمانروا نے اُسے بھیجا تھا: "مقدس راہب! ہمارے فرمانروا نے تم دونوں کو شاہی محل میں بُلایا ہے وہ تم سے گفتگو کرنا چاہتے ہیں۔"

بوڑھا بڑا کائیاں تھا آخر اس نے دُنیا دیکھی تھی۔ وہ سمجھ گیا کہ اسے شاہی محل کیوں بُلایا جا رہا ہے۔ بے پروائی سے بولا: "تمہارے فرمانروا ایک راہب سے کیا بات کرنا چاہتے ہیں۔ خیر! میں آجاؤں گا مگر یہ بچی نہیں آسکے گی۔ اس لیے کہ اس نے دُنیا کا تمام عیش و آرام تج دیا ہے۔ شاہی محل میں جانے سے اس کی وہ قسم ٹوٹ جائے گی جو اس نے نن بننے کے وقت کھائی تھی۔"

"یہ میں کچھ نہیں جانتا۔ تمہیں فرمانروا نے طلب کیا ہے۔ اگر تم یا یہ لڑکی جانے سے انکار کرے گی تو تمہیں زبردستی لے جاؤں گا۔" وزیر بہاءالدین نے بڑے سخت لہجے میں کہا۔

راہب تو اپنی قیمت بڑھا رہا تھا پھر بھی اس نے بات کو طول دینے کے لیے ایک سوال اور کیا: "کیا فرمانروا نے یہ بھی حکم دیا ہے کہ انکار کی صورت میں ہمیں طاقت کے زور پر اُٹھوا لیا جائے؟"

"ہاں ہاں یہ فرمانروا کا حکم ہے۔ اب بتاؤ، سیدھی طرح چلتے ہو کہ نہیں؟" وزیر کا لہجہ اور سخت ہو گیا تھا۔

"فرمانروا تو خدا کا نائب ہوتا ہے۔ اس کے حکم سے کون انکار کر سکتا ہے۔" راہب نے جواب دیا: "میں ضرور چلوں گا۔ میری بیٹی مرینا بھی فرمانروا سے باتیں کر کے خوش ہوگی۔"

وزیر بہاءالدین نے جلوس کے ساتھ چلنے والے ایک سوار کو بلا کر کچھ کہا۔ سوار تیزی سے ایک طرف روانہ ہو گیا۔ بہاءالدین اپنے فرمانروا کے پاس واپس آگیا تھا۔ اس سے باتیں کیں اور واپس آکر پھر فلپ اور مرینا کے پاس کھڑا ہو گیا۔ اسی وقت جلوس میں حرکت پیدا ہوئی اور وہ آگے بڑھنے لگا۔ فلپ اور مرینا کبھی جاتے جلوس کو دیکھتے تو کبھی اس آدمی کو جس نے انہیں حکم دیا تھا اور ان کے ساتھ کھڑا ہوا تھا۔

جلوس کے گزر جانے کے بعد راہب نے کہا: "میرے بیٹے! تم نے میرا نام پوچھا۔ میں نے بتایا لیکن تم نے مجھے اب تک نہیں بتایا کہ تم کون ہو؟ اور میں شاہی محل میں کیوں طلب کیا گیا ہوں۔"

"مقدس باپ!" وزیر بہاءالدین کے لہجے میں اچانک تبدیلی آگئی تھی: "مجھے افسوس ہے کہ میرے الفاظ سے آپ کو تکلیف پہنچی۔ میں اس کے لیے آپ سے معافی چاہتا ہوں۔"

راہب نے ایک لمحہ وزیر کے چہرے کو غور سے دیکھا۔ کچھ سوچا اور بولا: "میرے بیٹے! یہ میری بات کا جواب تو نہیں، ویسے ہم جیسے راہب کسی کی بات کا بُرا نہیں مانتے۔"

"شکریہ مقدس باپ!" وزیر خوش ہو گیا: "اب میں آپ کو سب کچھ بتاتا ہوں۔ میرا نام امیر بہاءالدین ہے اور میں اس ریاست کا سب سے بڑا وزیر یعنی وزیرِ اعلیٰ ہوں۔ رہا آپ کے اس سوال کا جواب کہ آپ کو شاہی محل میں کیوں طلب کیا گیا ہے۔ اس کا جواب فی الحال وہی ہے جو میں آپ کو پہلے دے چکا ہوں یعنی فرمانروائے ریاست آپ دونوں سے گفتگو کرنا چاہتے ہیں۔"

"ہوں۔" راہب نے زور سے ہنکاری بھری: "تمہارے فرمانروا کی شادی ہو چکی ہے کیا؟"

وزیر نے چونک کر راہب کو دیکھا: "مقدس باپ! کسی فرمانروا کے بارے میں ایسے سوالات نہیں پوچھے جاتے کیونکہ اس سوال سے فرمانروا کی توہین ہوتی ہے۔ فرمانروا تو فرمانروا ہی ہوتا ہے۔ وہ تو روزانہ ایک شادی کر سکتا ہے اور اگر... شادی نہ بھی کرے تو اُسے کیا فرق پڑتا ہے؟"

"تمہیں کوئی فرق نہیں پڑتا بیٹے! مگر مجھے بہت فرق پڑتا ہے۔" راہب رونالڈ فلپ نے ذرا ناگوار لہجے میں کہا جیسے اُسے وزیر کے جواب سے تکلیف پہنچی ہو۔

وزیر بہاءالدین کو بھی اس کا احساس ہو گیا تھا۔ اس نے بات بنانے کے لیے کہا: "مقدس باپ! آپ کو ناگوار گزرا ہو تو مجھے ایک بار پھر معاف کر دیجیے۔"

"میرے وزیر بیٹے! اب تمہیں کچھ بتانے کی ضرورت نہیں۔" راہب کے چہرے پر ایسا کھنچاؤ پیدا ہوا جیسے وہ مسکرا رہا ہو مگر اس کی مسکراہٹ اس کی لمبی اور بے ترتیب داڑھی میں اٹک کے رہ گئی تھی۔

"آپ بہت عقلمند ہیں مقدس باپ۔" وزیر خوشامد کرنے لگا: "اب آپ سے ملاقات ہوتی رہے گی۔ میرا مطلب ہے کہ میں آپ کی خدمت میں حاضر ہوتا رہوں گا۔" فلپ کچھ جواب دینا چاہتا تھا کہ ایک بند گاڑی ان کے قریب آکے رکی۔

"گاڑی میں تشریف رکھیے مقدس باپ!" وزیر بہاءالدین نے بڑی عاجزی سے درخواست کی۔

راہب نے مرینا کو اشارہ کیا پھر دونوں بڑی بے تکلفی سے گاڑی میں بیٹھ گئے۔ وزیر کے حکم سے گاڑی کے پردے گرا دیے گئے۔ گاڑی چلی تو اس کے دائیں بائیں دو مسلح سوار چل رہے تھے۔ راہب فلپ نے پردے سے جھانکا۔ وزیر اپنے گھوڑے پر سوار ہو کے کسی طرف جا رہا تھا۔

فلپ نے آہستہ سے کہا: "مرینا معلوم ہوتا ہے کہ ہم اپنی منزل پر آ گئے ہیں"

مرینا چہرے سے بہت بھولی بھالی معلوم ہوتی تھی لیکن تھی سمجھدار۔ اس نے فلپ سے جو دراصل اس کا باپ تھا کہا۔
"بابا! کیا آپ کو یقین ہے کہ ہمیں شاہی محل میں جگہ مل جائے گی؟"
"بیٹی مرینا جب خداوند یسوع مسیح اور کنواری مریم کے طفیل ہم محل کی طرف جا رہے ہیں تو پھر ان کی دعا سے محل میں جگہ بھی مل جائے گی" فلپ نے بیٹی کو امید دلائی "میں جانتا ہوں کہ تمہیں ریاست کے حکمران کے سامنے پیش کیا جائے گا۔ اب یہ تمہاری قابلیت ہے کہ تم اس موقع سے فائدہ اٹھاؤ اور حکمران کے دل میں اپنے لیے جگہ پیدا کرو"

مرینا نے باپ کو کوئی جواب نہ دیا بلکہ کسی گہری سوچ میں ڈوب گئی۔ بارھویں صدی عیسوی کے آغاز ہی سے ملک شام اور بحیرہ روم کے کنارے تمام نصرانی ریاستوں کا چراغ گل ہونا شروع ہو گیا تھا۔ پہلے تو موصل کے اتابک عمادالدین زنگی نے نصرانیوں کو کسی جگہ شکست دے کر بانیاس اور الرہا جیسے علاقے نصرانیوں سے چھین لیے تھے پھر اس کے بیٹے نورالدین زنگی نے تو اپنی زندگی ہی جیسے جہاد کے لیے وقف کر دی تھی۔ نورالدین زنگی خود بہادر تھا۔ اسی لیے وہ بہادروں کی قدردانی کیا کرتا تھا۔ ایوبی خاندان کا وہی آقا اور مربی تھا۔ اس نے اپنے دور میں نجم الدین ایوب اور اسدالدین شیرکوہ جیسے سرداروں کو اپنے دامن عاطفت میں پناہ دے کر اپنی سلطنت کو اس قدر مضبوط کر دیا کہ اس کا لشکر شام سے نکل کر مصر پہنچا اور اس پر قابض ہو گیا۔

راہب فلپ نے اپنی بیٹی مرینا کے ساتھ اس لیے مسلمان ریاستوں کا رخ کیا تھا کہ مرینا کو کسی امیرزادے کے سپرد کر کے اس کے سائے میں آرام کرے۔ بظاہر راہب نظر آنے والا فلپ رونالڈ حقیقت میں تیسرے درجے کا ایک آوارہ مزاج انسان تھا۔ اس نے پوری جوانی جوئے خانوں اور قحبہ خانوں میں گزاری تھی۔ یا پھر قیدخانوں کی نذر کی تھی۔ جب بڑھاپا آیا اور ہاتھ پیر دل

نے جواب دینا شروع کیا تو اس نے ایک ادھیڑ عمر کی عورت سے شادی کر لی۔ مرینا اسی عورت کی بیٹی تھی جس کے باپ کا نام نہ فلپ اور نہ مرینا کو معلوم تھا۔ فلپ نے اپنی ہونے والی بیوی سے اس کے پہلے شوہر کا نام کبھی نہیں پوچھا۔ اس لیے کہ اس عورت نے فلپ سے وعدہ لیا تھا کہ وہ اس کی پچھلی زندگی کے متعلق کوئی سوال نہ کرے گا۔

مرینا چھ ماہ کی تھی کہ اس کی ماں کا انتقال ہو گیا۔ اس وقت سے فلپ رونالڈ اس معصوم بچی کو کھلونا بنائے ہوئے تھا۔ اس میں کام کاج کی طاقت نہ رہ گئی تھی۔ اس لیے پہلے تو مرینا کے نام پر لوگوں سے مختلف انداز میں رقم اینٹھتا رہا پھر جب مرینا بڑی ہوئی تو اسے ملازم کرا کر اپنا اور اس کا پیٹ پالتا رہا۔ مرینا اگرچہ نیک اور سمجھدار تھی لیکن اس نے فلپ کے ساتھ اس لیے سمجھوتہ کر رکھا تھا کہ اس دنیا میں اس کا کوئی اور نہ تھا۔ بدقسمتی یہ بھی تھی کہ مرینا، فلپ کو اپنا سگا باپ سمجھتی تھی۔

پھر جب مرینا میں جوانی کے آثار پیدا ہوئے تو فلپ کو زیادہ لالچ سوار ہوئی۔ دراصل اس کی آوارگی کے زمانہ کا ایک دوست اسے کچھ دنوں پہلے ملا تھا۔ اس نے فلپ کو مشورہ دیا تھا کہ اگر بڑھاپا آرام سے گزارنا ہے تو بیٹی کو لے کر کسی اسلامی ریاست میں چلا جا اور وہاں اس کی شادی کسی امیرزادے سے کر دے۔ اس طرح تیری زندگی آرام سے گزرے گی۔ مسلمانوں میں چونکہ چار شادیاں شرعاً جائز ہیں اس لیے ریاستی امیرزادے اکثر عیسائی لڑکیوں سے شادی کر لیتے ہیں۔

فلپ رونالڈ کا اسلامی ریاستوں کا یہ پہلا دورہ تھا۔ اس نے ایک راہب کا روپ دھارا۔ مرینا کو نن بنایا اور انطاکیہ سے چل پڑا جہاں کا وہ رہنے والا تھا۔ فلپ نے مرینا کو اچھی طرح سمجھا بجھا دیا تھا اور اسے یہ سبز باغ دکھایا تھا کہ اگر اس کی شادی کسی مسلمان امیرزادے سے ہو جائے تو اس کی زندگی بڑے آرام سے گزرے گی ورنہ اسے کسی لفنگے اور شرابی عیسائی جوان سے شادی کرنا پڑے گی اور تمام عمر تنگدستی اور غربت میں بسر کرے گی۔

مرینا اور رونالڈ دونوں ہی اپنے خیالوں میں گم تھے کہ گاڑی ایک جھٹکے کے ساتھ رک گئی۔ فلپ نے ذرا سا پردہ ہٹا کر باہر دیکھا۔ کئی کنیزیں اور غلام باہر کھڑے تھے۔ ایک کنیز نے آگے بڑھ کے گاڑی کا ریشمی پردہ ہٹا لیا۔

"خوش آمدید، آپ شاہ آمد کے مہمان ہیں۔ گاڑی سے نیچے تشریف لائیے۔" مرینا اور فلپ کے چہرے خوشی سے چمک اُٹھے۔ دونوں گاڑی سے اُترے۔ غلاموں نے فلپ کو گھیر لیا۔ تو مرینا کو کنیزوں نے اپنے حلقے میں لے لیا۔

"بزرگ محترم! تشریف لے چلیے۔" ایک غلام نے بڑے ادب سے کہا۔

"اور میری بیٹی! اُسے بھی ساتھ لے چلو۔" فلپ گھبرا گیا۔ تھا کہ کہیں مرینہ کو اس سے جدا نہ کر دیا جائے۔

غلام نے اُسے تسلی دی۔ "محترم بزرگ! آپ فکر نہ کریں۔ آپ کی دختر غسل کے بعد لباس تبدیل کرے گی پھر آپ کے پاس تشریف لائیں گی۔"

فلپ کو کچھ اطمینان ہوا۔ "مگر مجھے کہاں لے جا رہے ہو؟" اس نے دریافت کیا۔

"آپ بھی پہلے غسل فرمائیں گے پھر لباس تبدیل کر کے مہمان خانہ میں اپنی بیٹی کے پاس تشریف رکھیں گے اور جب آپ کو فرمانروا کی طرف سے طلب کیا جائے گا تو پیش ہوں گے۔"

راہب فلپ کو مہمان خانہ کے برابر والے حمام میں پہنچایا گیا۔ مہمان خانہ کا ساز و سامان دیکھ کے اس کے ہوش اُڑ گئے تھے۔ اب جو حمام میں داخل ہوا تو دو غلاموں اور دو کنیزوں نے اُسے گھیر لیا اور راہب کے کپڑے اُتارنے چاہے۔

راہب بگڑ گیا۔ بولا۔ "یہ کیا کر رہے ہو۔"

"مقدس باپ!" ایک غلام نے کہا۔ "آپ پریشان نہ ہوں۔ ہم سب آپ کی خدمت پر مامور ہیں۔"

راہب کا سر چکرانے لگا۔ وہ مہینے میں ایک بار نہاتا اور ایک ہی بار کپڑے تبدیل کرتا تھا۔ یہاں چار چار خدمت گار اُسے نہلانے کو تیار تھے۔ اس نے زور سے سر کو جھٹکا دیا کہ کہیں وہ خواب تو نہیں دیکھ رہا ہے مگر یہ تو حقیقت تھی۔ وہ شاہی سواری میں بیٹھ کے یہاں تک آیا تھا اور یہ تمام شاہانہ انتظامات ہی تھے۔ نہ کوئی سحر تھا، نہ ٹونا ٹوٹکا ہے۔ یہ تو ایک کھلی ہوئی حقیقت تھی۔

آخر راہب نے خود کو غلاموں اور کنیزوں کے حوالے کر دیا۔ راہب پر نشہ طاری ہونے لگا۔ پھر اُسے نہیں معلوم کیا کیا ہوا۔ پھر راہب نے آئینے میں اپنی صورت دیکھی تو چونک اُٹھا۔ اُسے اپنے اوپر شبہ ہونے لگا کہ اگر اس کے داڑھی نہ ہوتی تو وہ اپنی شکل بھی نہ پہچان پاتا۔ نئے لباس میں وہ ایک بزرگ رئیس معلوم ہوتا تھا جس کی خدمت کے لیے چار چار خدمت گار موجود تھے۔ راہب ان خدمت گاروں کے جلوس میں مہمان خانہ میں پہنچا تو اس پر حیرت کا ایک اور دورہ پڑا۔

مہمان خانہ میں دروازے کے بالکل سامنے ایک خوبصورت اور بھولی بھالی شہزادی بیٹھی تھی۔ راہب نے کبھی کسی شہزادی کو نہ دیکھا تھا مگر اس نے جو کچھ لوگوں سے سنا تھا اس کی بنیاد پر اس نے شہزادیوں اور ملکاؤں کے اپنے ذہن میں پیکر تراش رکھے تھے۔ اس وقت اس کے سامنے بیٹھی ہوئی شہزادی بالکل اس کے خیالی پیکر کے مانند تھی۔

"بابا!" شہزادی نے اک دم کھڑے ہو کر راہب کو مخاطب کیا۔

راہب کو اپنے کانوں پر اعتبار نہ آیا۔ یہ آواز تو اس کی مرینا کی تھی لیکن یہ تو شہزادی ہے۔ پھر جب اس نے شہزادی کے چہرے کو غور سے دیکھا تو معلوم ہوا کہ جس طرح نئے لباس نے خود راہب کو اپنی نظروں میں اجنبی بنا دیا تھا اسی طرح اس کی مرینا بھی نئے لباس میں اجنبی سی دکھائی دے رہی تھی... لباس کے علاوہ اس کے بال بھی خوبصورتی سے سنوارے گئے تھے اور اس کے ہاتھوں اور گلے میں ہلکا زیور بھی تھا جس کی دمک سے آنکھیں خیرہ ہو جاتی ہیں۔

"ارے مرینا! یہ تو ہے!" راہب نے اُسے دیکھتے ہوئے اپنے ہاتھ پھیلا دیے۔

"اور یہ آپ ہیں بابا!" مرینا بھی ہاتھ پھیلا کے راہب کی طرف بڑھی اور اس کے سینے سے لگ گئی۔

راہب نے مرینا کو الگ کرتے ہوئے آہستہ سے کہا۔ "مرینا! کنواری مریم نے تجھ پر رحمتوں کی بارش کی ہے۔ کچھ دیر بعد ہمیں فرمانروا کے سامنے پیش کیا جائے گا۔ وہاں خود تجھے اپنی تقدیر بنانا ہوگی۔ میں تیری کوئی مدد نہ کر سکوں گا۔" مرینا کوئی جواب تو نہ دے سکی۔ اس نے صرف شرما کے نظریں جھکا لیں۔

پھر فلپ اور مرینا کو اطلاع دی گئی کہ کچھ دیر بعد انہیں فرمانروائے آمد کے سامنے پیش کیا جائے گا۔ فرمانروا کی طرف سے وزیر سلطنت امیر بہاء الدین بن نیسان دونوں سے کچھ سوالات کریں گے۔ انہیں مہذب طریقے سے جواب دیا جائے۔ دراصل وزیر بہاء الدین نے نوادر فرمانروا کے ذہن میں یہ بات ڈال دی تھی کہ وہ عام انسانوں سے بلند ہستی ہے اس لیے اُسے عام انسانوں سے گفتگو نہ کرنا چاہیے بلکہ صرف

پنے مرتبے کے لوگوں سے ہی بات کرنا چاہیے۔

اس موقع پر فرمانروا نے کہا تھا کہ وہ راہب کی لڑکی سے بات کرنا چاہتا ہے لیکن وزیر نے اُسے روک دیا۔ پھر فلپ اور مرینا اور راہب سے گفتگو کی ذمہ داری اپنے سر لے لی تھی۔ فرمانروا نے وزیر کو وہ تمام سوالات بتا دیے تھے جو وہ مرینا اور اس کے باپ سے کرنا چاہتا تھا۔

فلپ اور مرینا کو فرمانروا کے خاص کمرے میں پہنچایا گیا تو اس کی آرائش دیکھ کر دونوں دنگ رہ گئے۔ انہوں نے جنت کے محلات کے بارے میں جو تصور کیا تھا، یہ کمرہ اس سے خوبصورت اور آرائش میں ان کے خیالوں سے بھی زیادہ بلند تھا۔ انہیں آئے چند ہی لمحے گزرے تھے کہ کنیز نے اطلاع دی۔

"باادب، باملاحظہ، فرمانروائے آمد تشریف لاتے ہیں۔"

اس کمرے یا ہال میں جگہ جگہ جمنی چوکیاں رکھی تھیں جن پر خوبصورت گدیاں رکھی تھیں لیکن کنیزوں نے انہیں بتا دیا تھا کہ وہ فرمانروا کے آنے تک کھڑے رہیں پھر جب انہیں بیٹھنے کا حکم دیا جائے تو اس جگہ بیٹھیں جہاں بیٹھنے کا اشارہ کیا جائے۔

فرمانروا کے آنے پر مرینا اور فلپ نے جھک کے کورنش پیش کیا مگر نظریں نیچی کرکے کھڑے ہوئے وزیر سلطنت بہاءالدین فرمانروا کے ساتھ آیا تھا۔

"مقدس باپ!" وزیر سلطنت نے گفتگو کا آغاز کیا "آپ سر بلند کرکے فرمانروائے آمد کے دیدار سے اپنی آنکھیں منور فرمائیے اور اپنی پری جمال بیٹی کو بھی حکم دیجیے کہ وہ فرمانروائے آمد کے دیدار سے فیضیاب ہوں۔"

فلپ اور مرینا نے آہستہ آہستہ سر بلند کیا اور جھجکتی نظروں سے فرمانروائے آمد کو دیکھا۔ فرمانروا ایک نوخیز جوان تھا، ابھی اس کی مسیں بھیگ رہی تھیں۔ وہ اکہرے بدن اور دراز قد و قامت کا جوان تھا۔ باوجود کم سنی کے اس کے چہرے پر ایک خاص قسم کا وقار تھا جس نے اُسے خوبصورت بنا دیا تھا۔

"مقدس باپ!" وزیر سلطنت نے پہلا سوال کیا: "کیا آپ اپنے اور اپنی بیٹی کے بارے میں کچھ بتانا پسند فرمائیں گے؟"

وزیر نے فرمانروا کی طرف دیکھا پھر سوال کیا: "مقدس باپ آپ کا تعلق کس ریاست سے ہے اور آپ کس پیشے سے متعلق ہیں؟"

فلپ نے جواب میں کہا: "میں انطاکیہ کا رہنے والا ہوں۔ میرا نام فلپ رونالڈ ہے۔ میں راہب ہوں اور میری بیٹی مرینا ایک نن ہے۔"

وزیر بہاالدین نے کہا: "فرماں روائے آمد کو تمہاری بیٹی پسند آگئی ہیں۔ وہ اُس سے شادی کرنا چاہتے ہیں۔"

فلپ نے تیز لہجہ میں کہا: "میں نصرانی راہب ہوں، یہ میری بیٹی ہے۔ اس نے ہمیشہ کنواری رہنے کا عہد کیا ہے وہ شادی کیسے کرسکتی ہے؟" فلپ نے یہ بات مرینا کی اہمیت جتانے کے لیے کہی تھی ورنہ وزیر کی بات سُن کے تو اس کا دل باغ باغ ہوگیا تھا۔

راہب کے انکار پر وزیر بہاؤالدین کا چہرہ غصہ سے لال ہوگیا۔ مرینا اور فلپ نے وزیر کو غصہ میں دیکھا تو ان کی جان نکل گئی۔ مگر تیر کمان سے نکل چکا تھا فلپ انکار کے بعد اپنے منہ سے اقرار کیسے کرسکتا تھا۔

اسی وقت فرماں روائے آمد نے اشارے سے وزیر کو اپنے پاس بلا کے آہستہ آہستہ کچھ کہا۔ وزیر نے وہاں سے واپس آ کے فلپ کے بجائے مرینا سے سوال کیا: "اے راہب کی خوبصورت بیٹی۔ تم بالغ ہو۔ اپنے متعلق تمہیں فیصلہ کرنے کا حق ہے۔ بتاؤ کہ اگر فرماں روائے آمد تمہارے ساتھ شادی کرنے کی خواہش کریں تو تم کیا جواب دوگی؟"

مرینا نے فوراً جواب دیا: "اگر مجھے اپنے بارے میں فیصلہ کرنے کا حق حاصل ہے تو میرا یہ جواب ہے کہ فرماں روائے آمد مجھے پسند ہیں۔ اگر وہ مجھ سے شادی کرنا چاہتے ہیں تو میں اسے اپنی خوش نصیبی سمجھوں گی۔"

باپ کی بگاڑی ہوئی بات کو بیٹی نے سنبھال لیا.... حالانکہ فلپ بھی یہی چاہتا تھا مگر اُس نے مرینا کی قیمت بڑھانے کے لیے انکار کا سہارا لیا تھا۔

فرماں روائے آمد نے حکم دیا: "قاضیٔ شہر کو بلایا جائے۔"

وزیر نے ایک غلام کو قاضی شہر کی طرف دوڑا دیا پھر اُس نے راہب فلپ رونالڈ سے دریافت کیا: "مقدس باپ آپ نے اپنی بیٹی کا فیصلہ سُن لیا۔ آپ کو کوئی اعتراض ہے اس فیصلہ پر؟"

"میری بیٹی بالغ اور بااختیار ہے۔ اُس کے فیصلہ پر اعتراض نہیں کرسکتا۔" راہب فلپ نے یہ کہہ کر اپنی غلطی کا ازالہ کردیا۔

آمد کے قاضیٔ شہر جو مفتیٔ شہر بھی تھے، تشریف لے آئے۔ دربار میں کسی کو بیٹھنے کا حکم نہ تھا۔ قاضی صاحب بھی

امیروں کی قطاریں کھڑے ہو گئے۔

فرماں روا نے قاضی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا: "قاضی شہر کا مقام امیروں میں نہیں بلکہ ہمارے پہلو میں ہے۔"

پھر اُس نے وزیر بہاؤالدین کو حکم دیا: "امیر بہاؤالدین قاضیٔ شہر کو احترام کے ساتھ ہمارے پاس لائیے اور تختِ شاہی کے دائیں جانب کی چوکی پر بٹھائیے۔"

وزیر بہاؤالدین بن نیسان کو فرماں روا کا یہ حکم بہت شاق گزرا۔ وہ اپنے برابر کسی کو نہیں سمجھتا تھا۔ قاضیٔ شہر کی اُس کی نظروں میں کوئی وقعت نہ تھی۔ چنانچہ اُس نے اپنی اس خباثت کا ثبوت اُسی وقت مہیا کر دیا۔

وزیر بہاؤالدین نے قاضیٔ شہر سے تحکمانہ لہجے میں کہا۔ "قاضیٔ شہر، تختِ شاہی کے قریب، تشریف لے جائیں اور دائیں جانب رکھی چوکی پر تشریف رکھیں۔"

فرماں روا نے فوراً دخل دیا۔ "نہیں وزیر بہاؤالدین اس طرح نہیں۔ ہم مذہب سے کتنے ہی دُور سہی لیکن مذہبی لوگوں کا احترام ہم پر فرض ہے۔ قاضیٔ شہر کا ہاتھ پکڑ کر چوکی تک لایا جائے اور انھیں احترام سے بٹھایا جائے۔"

وزیر بہاؤالدین کو فرماں روا کا یہ حکم پہلے سے زیادہ ناگوار گزرا مگر اُسے مجبوراً تعمیل کرنا پڑی۔ وہ قاضیٔ شہر کا ہاتھ پکڑ کر چوکی تک لایا اور انھیں بٹھایا۔

فرماں روا کی زبان کھل چکی تھی۔ اُس نے خود سوال کیا: "قاضیٔ شہر ہمیں بتایا جائے کیا ایک مسلمان ایک نصرانی دوشیزہ کو اپنے عقد میں لا سکتا ہے؟"

"اعلیٰ حضرت فرماں روائے آمد۔" قاضی نے بڑے صاف اور واضح لہجے میں جواب دیا: "نصرانی بائبل مقدس پر بالکل اس طرح ایمان رکھتے ہیں جس طرح ہم مسلمان قرآنِ حکیم پر ایمان رکھتے ہیں۔ بائبل مقدس چار آسمانی اور الہامی کتابوں میں سے ایک ہے اور آسمانی کتابوں پر ایمان رکھنے والوں کو اجازت دی گئی ہے کہ وہ آپس میں شادی بیاہ کر سکتے ہیں۔ اس لیے ایک مسلمان مرد کا ایک نصرانی عورت سے عقد جائز ہوگا۔"

اس جگہ اس بات کی وضاحت ضروری ہے کہ انجیل (بائبل)، توریت، زبور اور قرآنِ حکیم چاروں الہامی اور آسمانی کتابیں تسلیم کی گئی ہیں اور ان کتابوں کے ماننے والوں کو اجازت دی گئی ہے کہ وہ ایک دوسرے سے شادی کر سکتے ہیں۔

فرماں روائے آمد اگرچہ مسلمان تھا لیکن وہ اِس مسئلے کو نہیں جانتا تھا۔ اُس کا خیال تھا کہ قاضیٔ شہر اِس شادی پر اعتراض کرے گا تو وہ اُس سے پوچھے گا کہ پھر یہ شادی کس طرح کی جا سکتی ہے اور اُسے اس کے لیے کیا کرنا ہوگا مگر یہ مسئلہ اپنے آپ ہی حل ہو گیا۔

فرماں روائے آمد نے اعلان کیا: "ہم اپنی اور مرینا بنت فلپ کی شادی کا اعلان کرتے ہیں اور قاضیٔ شہر سے عقد کرنے کی درخواست کی جاتی ہے۔"

قاضیٔ شہر نے چونکہ اس عقد کو جائز قرار دے دیا تھا اس لیے درباریوں نے اس پر اظہارِ مسرت کیا۔ وزیر بہاؤالدین اور فلپ بھی بہت خوش تھے۔ فلپ کو فرماں روا کا خسر بن کے دُنیا کا عیش و آرام ہاتھ آ رہا تھا اور وزیر بہاؤالدین کو فرماں روائے آمد کو کارِ سلطنت سے غافل رکھنے کا ایک موقع ہاتھ آ گیا تھا۔

دُولھا دُلھن وہاں موجود تھے۔ تمام درباری باراتی بن گئے اور اُس وقت اسلامی طریقے سے عقد ہو گیا۔ فلپ نے اس عقد پر نصرانی رنگ چڑھانے کے لیے ایک پادری کی خدمات حاصل کیں۔ پادری نے شاہی محل پہنچ کے نصرانی مذہب اور رواج کے مطابق کچھ رسوم ادا کر کے اِس عقد کو پکا کر دیا۔

فرماں روا کی شادی کا جشن بڑے دھوم دھام سے منایا گیا۔ مرینا اور فلپ کا جی چاہتا تھا کہ انھیں بغیر محنت کے غیب سے جو عزت اور دولت حاصل ہوئی وہ اُس کا پبلک میں مظاہرہ کریں تاکہ لوگوں کو معلوم ہو جائے جس مرینا اور فلپ کو وہ حقارت کی نظر سے دیکھتے تھے وہ ایک ریاست کے شاہی خاندان میں داخل ہو گئے ہیں۔ مرینا اپنا ہنی مون منانے کے لیے انطاکیہ جانا چاہتی تھی مگر یہ بات مصلحت اور دُور اندیشی کے خلاف تھی۔ آمد کے فرماں روا کی تین بیویاں پہلے ہی تھیں۔ اِس کے علاوہ محل کی تقریباً تمام ہی کنیزیں جوان اور طرحدار تھیں اور فرماں روائے آمد کی اُن پر نظرِ کرم بھی رہی تھی۔ اس لیے خطرہ تھا کہ اگر انھوں نے ریاست کو ایک دن کے لیے بھی چھوڑا تو انھیں نقصان بھی پہنچ سکتا تھا۔

راہب فلپ رونالڈ جس نے رہبانیت کو سلام کر کے چھوڑ دیا تھا اور اب ایک امیر کبیر شہری کی طرح زندگی گزار رہا تھا۔ اُس نے بیٹی کی دل لگی کے لیے شاہی محل کے اُس

بڑے حصّہ کو جس میں مرینا کی رہائش تھی اُسے مسلم ثقافت سے بچا کر نصرانی ثقافت میں ڈھال دیا تھا۔ مرینا کے محل (محل سے مُراد محل کا وہ حصّہ جس میں مرینا کا قیام تھا) کے تمام مسلم ملازمین ایک ایک کرکے برخاست کر دیے گئے تھے اور اُن کی جگہ نصرانی کنیزوں اور غلاموں کو بھرتی کیا گیا تھا۔ محل کی سجاوٹ میں بھی فرنگی اندازِ فکر اختیار کیا گیا تھا۔

جیسا کہ پہلے کہا جاچکا ہے کہ بائیں باغ کے ایک حصّہ میں ایک چوبی گرجا گھر بھی کھڑا کر دیا گیا تھا۔ یہ عبادت خانہ فولڈنگ تھا اور ضرورت کے وقت اِسے حصّوں میں تقسیم کرکے اکٹھا کیا جاسکتا تھا۔ باورچی نصرانی۔ دھوبی، نائی نصرانی یہاں تک کہ جمعدارنیاں بھی نصرانی بلائی گئی تھیں۔ غرضیکہ شاہی محل کا یہ حصّہ آمد کے بجائے انطاکیہ کے شاہی محل کا حصّہ معلوم ہوتا تھا۔ ان تمام تبدیلیوں پر وزیرِ سلطنت بہاؤالدین ابن نیسان نے کوئی اعتراض نہ کیا تھا بلکہ اِس سلسلہ میں فلپ کو خود بھی مشورے دیا کرتا تھا۔

یہ باتیں چھپنے والی تو نہ تھیں۔ محل کا ایک حصّہ کرستان اور فرنگستان بن گیا تھا۔ باتیں محل میں پھیلتے پھیلتے باہر تک جا پہنچیں۔ پھر لوگوں میں چہ میگوئیاں شروع ہوئیں۔ قہوہ خانوں میں اس موضوع پر بحث مباحثہ ہونے لگا۔ لوگوں نے علماء کرام تک بات پہنچائی۔ علماء ایک وفد لے کر قاضی شہر جو مفتی شہر بھی تھے، کے پاس پہنچے۔ قاضی کو پہلے ہی اس قسم کی شکایتیں مل رہی تھیں۔ اُس نے علماء سے وعدہ کیا کہ وہ وزیرِ سلطنت سے اِس سلسلہ میں گفتگو کرے گا۔

قاضی شہر وزیرِ سلطنت کے پاس گئے اور انہیں علماء کی شکایتوں سے آگاہ کیا۔ وزیرِ سلطنت بجائے شکایات پر توجہ دینے کا وعدہ کرتا۔ اُس نے قاضی شہر ہی کو معزول کر دیا اور اُس کی جگہ دوسرا قاضی مقرر کر دیا۔ اِس پر قلعہ اور شہر میں ہنگامہ ہوگیا۔ لوگ سڑکوں پر نکل آئے۔ انھوں نے وزیرِ سلطنت بہاؤالدین کے خلاف نعرے لگائے۔ جواب میں وزیرِ سلطنت کے حکم سے لوگوں کے ہجوم پر فوج نے تیروں کی بارش کر دی۔ درجن بھر سے زیادہ آدمی مارے گئے۔ لوگوں میں دہشت پھیل گئی۔ وہ کونوں کھدروں میں دبک گئے۔

درجن بھر آدمی جان سے گئے۔ سڑکیں انسانی خون سے رنگین ہوگئیں مگر نہ کوئی داد نہ فریاد۔ فریاد کس سے کی جائے۔ فرماں روا تک کوئی پہنچ ہی نہ سکتا تھا۔ اس ہنگامہ سے وزیرِ سلطنت بہاؤالدین کے لوگ بہت خلاف ہوگئے۔

وزیر بہاؤالدین فطرتاً جابر اور ظالم تھا۔ اُس نے فرماں روائے آمد کو محل تک محدود کر دیا تھا۔ فرماں روا نے دربار لگانا کیا، سیر و تفریح کو نکلنا بھی چھوڑ دیا تھا۔ شراب کو اُم الخبائث "برائیوں کی ماں" کہا گیا ہے۔ فرماں روا پہلے شراب نہ پیتا تھا۔ عیسائیوں کے محل میں آنے سے شراب بھی آگئی۔ ایک نوجوان فرماں روا کو کیا چاہیے۔ شراب اور شباب۔ یہ دونوں چیزیں اُسے میسّر تھیں۔ مرینا کا رنگ ہی سفید نہ تھا بلکہ وہ واقعی میں ایک حسین لڑکی تھی اور شادی کے بعد تو اُس کے حُسن میں اور نکھار آگیا تھا۔

ریاست آمد کے یہ حالات تھے۔ لوگ وزیر سے تنگ تھے مگر ریاست چھوڑ کے کسی اور جگہ جانے کا تصوّر بھی نہ کرتے تھے۔ آمد میں روپے پیسے کی ریل پیل تھی۔ چیزیں سستی۔ روپے کی افراط۔ آمد والوں کو وزیر کی وجہ سے ذہنی کوفت تھی مگر کسی اور قسم کی پریشانی نہ تھی۔ آمد کے علماء ضرور پریشان تھے۔ اس لیے کہ شاہی محل میں بڑی کثرت سے شراب جانے لگی تھی۔

عیسائی غلام اکثر شراب پی کر محل سے باہر آجاتے۔ وہ غل غپاڑہ مچاتے۔ مار پیٹ بھی کرتے۔ لوگ صبر سے کام لیتے کیوں کہ اگر لڑتے تو وزیر عیسائیوں کی حمایت پر آجاتا۔ اس سے شکایت کرتے تو وہ اُلٹا گلے پڑجاتا۔

مرینا کی فرماں روا سے شادی ہونے کی بات نصرانی ریاستوں میں بھی پھیل گئی تھی۔ اُن ریاستوں کے لوگ مفلس اور قلاش تھے۔ انھیں معلوم ہوا کہ اُن کی ہم مذہب لڑکی ایک مسلمان فرماں روا کی بیوی بن گئی ہے تو انھوں نے ریاست آمد کا رُخ کیا۔ اس طرح آمد میں آہستہ آہستہ عیسائیوں کی تعداد بڑھنے لگی۔ لوگوں نے یہ بات وزیرِ سلطنت تک پہنچائی مگر اُس نے قطعی پروا نہ کی۔

❀

ریاست موصل اور ریاست حلب میں اچانک جو تبدیلی آئی تھی اُس سے سلطان صلاح الدین بہت فکرمند تھا۔ موصل کے والی سیف الدین غازی کا انتقال ہوا تو اُس کی وصیت کے مطابق اُس کا بھائی عزالدین موصل کا حاکم ہوگیا پھر حلب کا ملک الصالح کا انتقال ہوا تو اُس کی وصیت کے مطابق حلب کا حکمراں بھی عزالدین کو بنایا گیا۔ ایک اور تبدیلی یہ آئی کہ عزالدین نے حلب اپنے چچیرے بھائی عمادالدین کے حوالے کر دیا اور اُس کا علاقہ سنجار موصل کے تحت کر لیا۔

سلطان صلاح الدین، عماد الدین کو جو اب حلب کا حاکم بن گیا تھا۔ اُسے بالکل پسند نہ کرتا تھا۔ عماد الدین بڑا لوالہوس اور بے باک حکمران تھا۔ حلب پر اس کے قبضہ سے سلطان کے منصوبہ میں رخنہ پڑتا تھا۔ عماد الدین نے حلب پر قبضہ کرتے ہی اُن علاقوں پر ہاتھ صاف کرنے کا ارادہ کیا۔ سلطان اس وقت تک مصر میں تھا لیکن اپنے شاہی علاقہ جات کو خطرہ میں دیکھ کر اُس نے دمشق واپس آنے کا فیصلہ کر لیا۔

سلطان کے معاہدہ کی تاریخ ۱۱ ستمبر ۱۱۸۲ء کو ختم ہو رہی تھی۔ مخالف فریق نے جس میں موصل کا حکمران عز الدین اور عیسائیوں کا ریجی نالڈ نے حسب معمول اپنا قول و قرار توڑ دیا تھا۔ ریجی نالڈ مسلمانوں سے انتقام لینے کے لیے بے چین تھا۔ کرک کا حاکم ہمفری آف ٹورون مر چکا تھا اور ریجی نالڈ نے کرک کی بیوہ وارثہ اسٹیفیا سے شادی کر لی تھی اور اس کے طفیل وہ بحیرۂ مُردار کے قلعوں کا مالک بن گیا تھا۔ اس نے اپنی حیثیت سے ناجائز فائدہ اُٹھایا اور معاہدے کے دوران مسلمانوں کے ایک قافلہ کو جس میں تمام کے تمام پُرامن سوداگر تھے انھیں گرفتار کر لیا۔ سلطان کو اس کی خبر ملی تو اُسے بڑا دُکھ ہوا۔ اتفاق سے انہی دنوں نصرانی زائرین کا ایک جہاز جو یروشلم جا رہا تھا وہ طوفانی ہواؤں سے دمیاط پہنچ گیا اور خشکی پر چڑھ آیا۔ سلطان نے اُسے روک لینے کا حکم دے دیا۔ سلطان کا یہ قدم ریجی نالڈ کے اُس اقدام کا ردِ عمل تھا جس میں اس نے مسلمان سوداگروں کے قافلہ کو روکا تھا۔ مگر مغربی مورخین نے اس پر بڑا واویلا مچایا ہے اور ریجی نالڈ کی حرکت کو نظر انداز کیا ہے۔

۱۱ مئی ۱۱۸۲ء کو سلطان صلاح الدین قاہرہ سے دمشق روانہ ہوا۔ اُسے رخصت کرنے کے لیے تمام عمائدینِ سلطنت موجود تھے۔ وہ ایک ایک کر کے سلطان کی طرف بڑھتے اور اُسے پُرنم آنکھوں سے الوداع کہا۔

حکومت کے جاسوس ایک دوسرے کے علاقوں میں چکر لگاتے رہتے تھے۔ سلطان کی مصر سے روانگی کی اطلاع جاسوسوں کے ذریعے عیسائی حکومت کو ہو گئی تھی۔ سلطان بھی یہ جانتا تھا کہ نصرانی اُس کا راستہ ضرور روکیں گے کیوں کہ مصر سے دمشق جانے والی شاہراہ نصرانی سرحدوں کے قریب سے گزرتی تھی چنانچہ سلطان نے شاہراہ چھوڑ کے ریگستان سینائی کا راستہ اختیار کیا اور خلیج عقبہ کے آغاز پر پہنچ گیا۔ وہاں سے وہ کوہ سیر سے آگے چٹانی میدان سے ہوتا ہوا شمال میں پہنچا اور راستے میں دشمن کو تلاش کرتا رہا۔ وہ الشوبک کے قریب سے نکلا تو اُس کے نواحی علاقہ کو روندتا ہوا آگے بڑھا۔ لطف کی بات یہ تھی کہ کرک کے قلعہ کے باہر خندقوں میں نصرانی فوج بیٹھی تھی لیکن اُس نے باہر نکل کے سلطان کو روکنے کی کوشش نہ کی۔ پس وسط جون میں سلطان بو آب ہوتا ہوا دمشق پہنچ گیا۔

اسی دوران دمشق کے قائم مقام حاکم فرخ شاہ نے دریائے اُردن کو پار کر کے گلیلی اور دبوریہ کو تاراج کیا اور پہاڑی قلعہ جبیس (تقیف) پر قبضہ کر لیا۔ اس یلغار میں فرخ شاہ کے ہاتھ بیس ہزار مویشی اور ایک ہزار قیدی آئے۔ سلطان کو اس کی اطلاع ملی تو وہ بہت خوش ہوا۔

معاہدہ کی میعاد ختم ہو رہی تھی اور سلطان کو موصل اور حلب کے والیوں سے اس بات کا حساب لینا تھا کہ انھوں نے فرنگیوں اور شیخ الجبل سے اُس کے خلاف کیوں معاہدہ کیا۔ اتفاق سے انہی دنوں امیر مظفر الدین کوکبری جو موصل کے زیرِ سایہ حران پر حکومت کر رہا تھا وہ عز الدین والئ موصل کے خلاف ہو گیا اور اُس نے سلطان سے مل کے انہیں جزیرہ پر حملہ کرنے کا مشورہ دیا۔ سلطان کے منصوبہ میں شام اور جزیرہ کی چھوٹی چھوٹی مسلم ریاستیں بار بار رخنہ ڈالتی تھیں اس لیے فرنگیوں کے مقابلہ پر جانے سے پہلے وہ ان ریاستوں کا علاج کرنا چاہتا تھا۔

سلطان صلاح الدین نے چند روز دمشق میں قیام کیا پھر وہ طبریہ کی طرف روانہ ہوا۔ طبریہ میں فرنگیوں کی فوجیں جمع ہو گئی تھیں۔ سلطان کی آمد کی خبر سُن کر فرنگی فوجیں وہاں سے ہٹ کے کوکب کی پہاڑی کے دامن میں اپنا کیمپ لگایا۔ اس پہاڑی پر قلعہ کوکب کی فصیلیں بنی ہوئی تھیں۔ سلطان اُس وقت طبریہ پہنچ چکا تھا۔ اُس نے اپنے دونوں بھتیجوں تقی الدین اور فرخ شاہ کو لشکر اور تیر انداز دستوں کے ساتھ فرنگیوں کے مقابلہ پر بھیجا۔ دونوں لشکروں میں ایک خوف ناک جنگ ہوئی جس میں مسلمان کامیاب ہوئے۔ فرنگی پسپا ہو کر فرابیلا چلے گئے اور سلطان دمشق واپس آگیا۔

سلطان پھر لشکر لے کر نکلا۔ اُس نے ظاہر یہ کیا کہ وہ حلب کو فتح کرنے جا رہا ہے۔ موصل اور حلب کے لشکر سلطان کے مقابلہ کے لیے یکجا ہو گئے تھے۔ وہ یہ سُن کے کہ سلطان کا رُخ حلب کی طرف ہے، فوراً اپنے اپنے علاقوں کو واپس ہو گئے۔ اس طرح سلطان نے بڑے اطمینان سے بیرا کے مقام پر دریا فرات

عبور کیا۔ دریا کے اُس طرف سلطان کے بہی خواہ موجود تھے جنھیں سلطان نے اپنی آمد سے خفیہ طور پر مطلع کر دیا تھا۔

ان استقبال کرنے والوں میں مظفر الدین کوکبری بھی تھا جس نے سلطان کو الجزیرہ پر حملہ کا مشورہ دیا تھا۔ مظفر الدین حاکم موصل سے اس قدر خوف زدہ تھا کہ اُس نے سلطان سے موصل پر حملہ کرنے کی بھی درخواست کی۔ اس جگہ گنجاں کے حکمراں نے بھی سلطان سے ملاقات کی۔ سلطان نے اعلان کرا دیا کہ الجزیرہ کا جو حکمراں اُس کی اطاعت قبول کرے گا اُسے اُس کے علاقہ پر بحال رکھا جائے گا اور جو اطاعت سے سرتابی کرے گا اُس پر بزورِ شمشیر قبضہ کیا جائے گا اور اُس علاقہ کو تباہ کر دیا جائے گا۔ سلطان کے اس اعلان کا یہ اثر ہوا کہ الجزیرہ کا بڑا حصّہ اُس کے زیرِ نگیں آگیا۔

سلطان ادھر فتوحات میں مصروف تھا کہ دمشق سے اطلاع آئی کہ فرنگیوں نے دمشق کے مضافات پر حملہ کر دیا ہے اور وہ تاخت و تاراج میں مصروف ہیں۔ سلطان چونکہ موصل پر حملہ کا منصوبہ بنا چکا تھا اس لیے دمشق واپس نہ جا سکا لیکن فرنگیوں کی روک تھام کے لیے اُس نے عارضی انتظامات کر دیے پھر یکسوئی کے ساتھ موصل کی طرف پیش قدمی کی۔

سلطان صلاح الدین نے قلعہ پر حملہ کر دیا کیوں کہ اُس کا یہ ایک دیرینہ خواب تھا مگر اُس کے مقدمۃ الجیش کے سپاہیوں کے لیے قلعہ کی دیواریں عذاب ثابت ہوئیں۔ اس قلعہ کی دوہری فصیلیں تھیں۔ اُس کا کوئی حصّہ کمزور نظر نہ آتا تھا۔ دونوں فصیلوں پر چاق و چوبند مدافعتی دستے تعینات تھے۔ قلعہ کے اندر سامانِ خورد و نوش تقریباً ایک سال کے لیے موجود تھا۔ یہی حال اسلحہ کا تھا جس کا ڈھیر لگا ہوا تھا۔

روایت ہے کہ والیٔ موصل عزالدین مسعود اور بعض دوسرے والیانِ ریاست نے سلطان صلاح الدین کو صلح پر آمادہ کرنا چاہا مگر سلطان نے صلح کی پہلی شرط حلب پر قبضہ کی رکھی کہ اگر حلب اُس کے حوالہ کر دیا جائے تو وہ موصل سے محاصرہ اُٹھا لے گا۔ عزالدین یہ شرط ماننے پر تیار نہ تھا۔ اس لیے کہ اب اُس کا حلب پر قبضہ نہ تھا۔ اُس نے حلب کو سنجار سے بدل لیا تھا اور حلب پر اس وقت عمادالدین قابض تھا جس پر عزالدین کا کوئی اثر نہ تھا۔ ادھر سلطان کا ایک ہی مطالبہ تھا۔ "حلب یا موصل۔"

۱۱ر نومبر ۱۱۸۲ء کو موصل کا محاصرہ شروع ہوا۔ سلطان نے خود بابِ کندہ کا مورچہ سنبھالا اور اپنے بھائی تاج الملوک بوری کو بابِ عمادیہ پر مقرر کیا۔ فصیلوں پر شدید سنگ باری کی گئی لیکن یہ دیواریں ٹھوس تھیں۔ سنگ باری کا اُن پر کوئی اثر نہ ہوا۔ ایک ماہ تک مسلسل فصیلوں میں شگاف ڈالنے کی کوشش کی گئی مگر کامیابی نہ ہوئی اور سلطان کو موصل سے محاصرہ اُٹھانا پڑا۔

سلطان نے موصل سے ہٹ کر سنجار پر حملہ کیا۔ یہ وہی سنجار تھا جس کا والی عمادالدین تھا۔ اُس نے سنجار کا علاقہ حلب سے بدل لیا تھا اور اس وقت حلب کا گورنر وہاں موجود تھا۔ اس علاقہ سے موصل کو رسد مہیا ہوتی تھی۔ سلطان نے اسی لیے اس پر حملہ کیا تھا کہ موصل کے ہاتھ سے رسد کا علاقہ نکل جائے گا تو اُس کے حوصلے پست ہو جائیں گے لیکن سنجار نے زبردست مدافعت کی اور پندرہ دن تک سلطانی فوجیں قلعہ پر قابض نہ ہو سکیں۔ سلطان نے فوراً حکمتِ عملی تبدیل کی اور اک دم ایسی یلغار کی کہ قلعہ کا تمام مدافعتی نظام درہم برہم ہو گیا اور سلطانی لشکر قلعہ میں داخل ہو گیا۔ سلطان نے قلعہ کے گورنر اور دوسرے افسروں کو غضبناک لشکریوں کے ہاتھوں سے بچا کر انھیں احترام کے ساتھ بحفاظت موصل پہنچوا دیا۔

سلطان نے سنجار میں مختصر سی فوج چھوڑی اور اس متحدہ دُشمن کی طرف چلا جو اُس کا انتظار کر رہا تھا۔ اس اتحاد میں موصل کا والی، آرمینیا کا شاہ، مردین کے شہزادے، سپاہی اور حلب کی فوج تھی۔ یہ متحدہ لشکر ہرزم کے مقام پر اکٹھا ہوا تھا۔ پہلے تو متحدہ لشکر کے حوصلے بہت بلند تھے لیکن جب سلطانی لشکر قریب پہنچا تو اتحادیوں نے صلح کے لیے فوراً قاصد بھیجا۔

قاصد سلطان کے سامنے پیش ہوا۔ اُس نے کہا: "متحدہ کمان نے سلطان سے صلح کی بات چیت کا پیغام دیا۔"

سلطان نے جواب دیا۔ "اس پیغام کا جواب ہرزم کے میدان میں دیا جائے گا۔"

متحدہ لشکر کا پیغام ایک جملہ میں تھا۔ سلطان نے جواب بھی ایک ہی جملہ میں دیا۔ جب یہ پیغام متحدہ کمان تک پہنچایا گیا تو وہ حواس باختہ ہو گئے اور میدان چھوڑ بھاگے۔

سلطان ہرزم کے میدان میں پہنچا تو میدان صاف تھا بڑے چھوٹے تمام حلیف خوف اور دہشت کے عالم میں اپنے اپنے ٹھکانوں کو بھاگ کھڑے ہوئے تھے۔

ایک مورخ نے میدانِ ہرزم کا نقشہ ان الفاظ میں کھینچا

ہے۔" وہ مردوں کی طرح آئے تھے لیکن عورتوں کی طرح روپوش ہو گئے۔"

حقیقت یہ ہے کہ ہوا کا رُخ بدل گیا تھا اور کامیابی سلطان کے قدم چوم رہی تھی۔ والئ موصل اپنے قلعہ کے باہر آیا تھا لیکن سلطان کا مقابلہ نہ کر سکا اور بھاگ کے پھر موصل میں قلعہ بند ہو گیا۔ سلطان نے موصل کو اُس کے حال پر چھوڑا اور الجزیرہ کے علاقہ کا انتظام کر کے شمال کی طرف روانہ ہوا۔ اب سلطان کے سامنے قلعہ آمد یا عمید تھا۔ آمد کا ایک امیر محمد بن قرا، آمد کے جابر اور ظالم وزیر امیر بہاؤالدین کے خلاف ہو گیا تھا۔ اُس امیر نے سلطان کی توجہ قلعہ آمد کی طرف دلائی تھی۔ اِس وقت امیر محمد بن قرار اور اُس کا بیٹا سلطان کے ساتھ تھے۔ آمد کا قلعہ بھی موصل کی طرح بہت مستحکم تھا۔ اُس پر آسانی سے قبضہ کرنا مشکل نظر آ رہا تھا مگر قلعہ پر مسٹر اور ڈارلنگ کی حکومت تھی۔ فرماں روائے آمد نے راہب فلپ رونالڈ کی بیٹی مرینا سے شادی کی تھی اور شاہی محل میں محدود ہو کر رہ گیا تھا۔ روایت ہے کہ شادی کے بعد سے فرماں روائے آمد نے شاہی محل سے ایک دن بھی باہر قدم نہیں نکالا تھا۔ فرماں روا کو اُس کی بیوی مرینا مسٹر کہا کرتی تھی اور فرماں روا مسٹر اپنی بیوی کو ڈارلنگ کے نام سے پکارتا تھا۔ اِس لیے قلعہ کے اندر باہر مسٹر اور ڈارلنگ کی حکومت مشہور ہو گئی تھی۔

سلطان نے قلعہ کا محاصرہ کیا مگر مسٹر اور ڈارلنگ کو اس کی نہ خبر ہوئی اور نہ کسی نے خبر کرنے کی ضرورت محسوس کی۔ فرماں روائے آمد نے مے نوشی بھی شروع کر دی تھی۔ اقتدار اُس کے وزیر بہاؤالدین ابن نیساں کے ہاتھ میں تھا۔

آمد کے وزیر امیر بہاؤالدین کو نہ عوام کی پرواہ تھی نہ خواص کی۔ فوج اُس کے ہاتھ میں تھی اور وہ ہر معاملہ میں اپنی من مانی کرتا تھا۔ سلطان صلاح الدین نے آمد کا محاصرہ کیا تو فوج اور عوام کو اپنی رائے ظاہر کرنے کا موقع مل گیا۔ قلعہ کی مضبوطی کے پیش نظر سلطان نے بجائے قلعہ پر حملہ کرنے کے ایک اور ترکیب استعمال کی۔ اُس نے قلعہ کے اندر سینکڑوں تیر پھنکوائے۔ ہر تیر کے ساتھ ایک پرچہ لگا ہوا تھا جس میں سلطان صلاح الدین کا ایک فرمان لکھا ہوا تھا جس کا مضمون کچھ اس طرح تھا:-

"اہلیانِ آمد کو مطلع کیا جاتا ہے کہ سلطان صلاح الدین قلعہ پر حملہ کر کے بے گناہ آبادی کو تباہ اور شہر کے حُسن کو برباد نہیں کرنا چاہتے۔ اِس لیے سلطان اعلان کرتے ہیں کہ جو لوگ بغیر مقابلہ کے سلطان کی اطاعت قبول کر لیں گے۔ اُن کے ساتھ فتح کے بعد احسان کیا جائے گا اور جو مقابلہ کریں گے اُن سے پورا پورا بدلہ لیا جائے گا۔"

اہلِ شہر وزیر امیر بہاؤالدین کے ظلم و ستم سے عاجز تھے وہ اُس کی غلامی سے آزاد ہونا چاہتے تھے۔ اُدھر قلعہ کی حفاظت کرنے والے لشکریوں کو یہ معلوم تھا کہ قلعہ فتح ہو جائے گا۔ کیوں کہ سلطان کے سامنے قلعہ زیادہ دیر نہیں ٹھہر سکتا ہے۔ بس عوام اور فوجیوں دونوں میں بددلی پھیل گئی اور انھیں اپنی جانوں کی فکر پڑ گئی۔ ایک طرف عوام نے تعاون سے ہاتھ کھینچا تو دوسری طرف فوجیوں نے سلطانی لشکر کا مقابلہ کرنے سے انکار کر دیا۔ اب تو وزیر بہاؤالدین کی عقل ٹھکانے آگئی اُس نے فوراً سلطان کے وزیر قاضی فاضل کو امن کی گفتگو کرنے کے بہانے قلعہ میں بلایا

سلطان نے وزیر قاضی فاضل کو قلعہ میں جانے کی اجازت دے دی۔ قاضی فاضل وہاں پہنچا تو وزیر بہاؤالدین نے بڑے عجز سے قاضی فاضل کو سلام کیا۔ پھر سر جھکا کے عرض کیا۔

"قاضیٔ محترم!" آپ سلطانِ معظم کے وزیر ہیں اور میں فرماں روائے آمد کا وزیر ہوں۔ اِس رشتے سے ہم آپ ایک ہی قبیلہ کے ہیں۔ آپ کو میری مدد کرنا چاہیے۔"

قاضی فاضل اُس کی تعریف سُن چکے تھے کہ وہ بہت ظالم اور جابر ہے۔ اُس نے مفتی اور علماء کو قید میں بند کر رکھا ہے۔ قاضی فاضل نے اُسے جواب دیا۔

"امیر بہاؤالدین میں آپ کی مدد صرف اُس حالت میں کر سکتا ہوں کہ آپ مفتی اور قاضیٔ شہر کو آزاد کر دیں۔ اِس کے علاوہ علماء اور دیگر جتنے مذہبی لوگوں کو آپ نے قید میں ڈال رکھا ہے اُن سب کو آپ فوراً چھوڑ دیں۔"

"یہ سب کچھ ہو جائے گا قاضیٔ محترم۔ آپ مجھ سے وعدہ تو فرمائیے کہ آپ میری مدد فرمائیں گے۔" امیر بہاؤالدین قاضی سے پہلے قول و قرار کرا لینا چاہتا تھا۔

قاضی فاضل کو غصہ آگیا۔ "امیر بہاؤالدین تم کیا مجھے بیوقوف سمجھتے ہو۔ میں صلح کی گفتگو کرنے آیا ہوں۔ تمہاری

...ش پوری کرنے نہیں آیا۔"

امیر بہاؤالدین سہم گیا "آپ ناراض نہ ہوں قاضی ...میں تمام قیدیوں کو اسی وقت رہا کیے دیتا ہوں۔"

امیر بہاؤالدین نے اپنے نائب سے کہا "قید خانے ...دروازے کھول دیے جائیں اور اعلان کر دیا جائے اور انہیں ...یا جائے کہ انہیں سلطان صلاح الدین کے وزیر قاضی ...ل کے حکم پر رہا کیا جا رہا ہے۔"

واضح رہے کہ یہ گفتگو قلعہ کے صدر دروازہ کے اندر ...ہی تھی۔ امیر بہاؤالدین نے قاضی فاضل کو صدر دروازے ...داخل ہوتے ہی گھیر لیا تھا۔

قاضی فاضل نے کہا "کیا اس شہر کا یہی دستور ہے کہ ...دروازے پر کھڑے کھڑے گفتگو کرتے ہیں؟" امیر ...ؤالدین، قاضی کے اس گہرے طنز پر پانی پانی ہو گیا۔

"آپ میرے غریب خانہ پر تشریف لے چلیے۔" امیر ...ؤالدین نے انکسار سے کہا۔ پھر وہ قاضی فاضل کو اپنے ...ب خانہ پر لے گیا۔ امیر کا غریب خانہ دیکھ کر قاضی کی عقل ...ب رہ گئی۔ انھوں نے امیر بہاؤالدین پر دوسرا طنز کیا۔ ...ن اللہ آپ کے غریب خانہ کا یہ عالم ہے تو پھر قصر شاہی ...ر جنت کے کسی ایوان کا مقابلہ کرتا ہوگا۔"

امیر نے دانت نکال کے کہا "قاضی محترم یہ سب آپ ...کرم فرماؤں کی نوازش کا نتیجہ ہے۔"

قاضی صاحب ابھی امیر بہاؤالدین کے اس عالی شان ...کی آرائش و زیبائش دیکھ رہے تھے کہ محل کے سامنے کے ...ان میں لوگ جمع ہونے شروع ہو گئے۔ قاضی فاضل کے ...ے پر شکنیں پڑ گئیں۔ امیر بہاؤالدین دوڑ کے باہر گیا پھر فوراً واپس آ گیا۔

"قاضی محترم۔ کسی تردد کی ضرورت نہیں۔ یہ سب جیل ...قیدی ہیں جو آپ کا شکریہ ادا کرنے آئے ہیں۔" امیر ...ؤالدین نے بڑی مسرت سے کہا۔

قاضی فاضل چند لمحے سوچنے کے بعد بولے "صرف ...ہی لوگوں کو اندر بلا لیا جائے باقی لوگوں کو میرے شکریہ کے ...تھ واپس کر دیا جائے۔"

قاضی فاضل کے کہنے کے مطابق سوائے مفتی، قاضی ...مذہبی لوگوں کے باقی کو شکریہ کے ساتھ واپس کر دیا گیا۔ مفتی ...یرہ اندر آئے تو قاضی فاضل نے اُٹھ کے انھیں خوش آمدید کہا اور اُن سے بغل گیر ہوئے۔

قاضی فاضل نے امیر بہاؤالدین سے کہا "ہاں امیر بہاؤالدین اب فرمائیے۔ آپ کیا کہنا چاہتے ہیں؟"

امیر بہاؤالدین نے مفتی وغیرہ پر نظر ڈالی پھر بولا۔

"قاضی محترم۔ یہ کوئی مذہبی معاملہ نہیں ہے کہ مفتی اور علماء کے سامنے گفتگو کی جائے۔ یہ ایک سیاسی اور ریاستی معاملہ ہے اس میں کسی دوسرے کو کس طرح شریک کیا جا سکتا ہے؟"

قاضی فاضل کی تیوریوں پر بل پڑ گئے "امیر بہاؤالدین اسلام کے دائرے سے کوئی چیز باہر نہیں۔ سیاست۔ ثقافت تجارت ہر چیز مذہب کے تابع ہے۔ میں ان اشخاص کی موجودگی میں اس لیے گفتگو کرنا چاہتا ہوں کہ یہ ہماری گفتگو کے شاہد رہیں۔ تمہیں جو کہنا ہے۔ صاف اور برملا کہو۔"

امیر بہاؤالدین نے پژمردہ آواز میں کہا "میں قلعہ آمد ایک شرط پر حوالہ کرنے کو تیار ہوں۔"

"کیا شرط ہے تمہاری؟" قاضی فاضل نے دریافت کیا۔

"مجھے صرف دو دن کی مہلت دی جائے تاکہ میں اپنے ساتھ لے جانے والا سامان قلعہ سے نکال سکوں۔" ایک اور بیان کے مطابق امیر بہاؤالدین نے تین دن کی مہلت مانگی تھی۔

قاضی فاضل کچھ دیر سوچنے کے بعد بولے "امیر بہاؤالدین تمہاری شرط میں واپس جا کے سلطان معظم کے سامنے پیش کروں گا کیونکہ میں شرط قبول کرنے کا مجاز نہیں۔"

"آپ سلطان معظم سے میری سفارش تو کریں گے؟" امیر بہاؤالدین نے عاجزی سے درخواست کی۔

"میں پوری کوشش کروں گا امیر۔"

"آپ کو اُمید ہے کہ سلطان میری شرط منظور کر لیں گے؟" امیر کو یقین نہ آ رہا تھا۔

"امیر۔ کوشش کرنا میرا کام ہے اور منظور کرنا سلطان کے اختیار میں ہے۔ میں اس سلسلہ میں قبل از وقت کچھ نہیں کہہ سکتا۔" قاضی فاضل نے صاف الفاظ میں جواب دیا۔

"اچھا خیر۔ آپ کی مرضی۔" امیر بہاؤالدین نے بڑی افسردگی سے کہا۔ قاضی فاضل اُٹھ کے کھڑے ہو گئے۔ اُن کے ساتھ دوسرے لوگ بھی کھڑے ہو گئے۔

"آپ تشریف رکھیے قاضی محترم۔" امیر بہاؤالدین نے درخواست کی "ان لوگوں کو جانے دیجیے مجھے آپ سے کچھ ذاتی گفتگو کرنا ہے۔"

مفتی وغیرہ قاضی صاحب کا شکریہ ادا کرکے اور ہاتھ ملا کے رخصت ہو گئے۔

قاضی فاضل نے بیٹھتے ہوئے کہا۔ "امیر آپ کو مجھ سے ذاتی گفتگو کیا کرنا ہے میں سلطان کے حکم سے صلح کی گفتگو کرنے آیا ہوں۔ ذاتی گفتگو کا مجھے کوئی حق نہیں۔"

امیر بہاؤ الدین نے اِدھر اُدھر دیکھ کے کہا۔ "قاضی محترم دراصل بعض اشخاص میرے اور میرے گھر والوں کے دشمن ہو رہے ہیں۔ میں اپنے اہلِ خانہ کو آپ کے ساتھ سلطانی لشکرگاہ میں بھیجنا چاہتا ہوں۔"

قاضی فاضل کو بڑی حیرانی ہوئی مگر بات اس طرح کی تھی کہ وہ انکار نہ کر سکے۔

امیر بہاؤ الدین نے کہا۔ "میں ابھی انتظام کر کے حاضر ہوتا ہوں۔" یہ کہہ کے امیر بہاؤ الدین محل کے زنانخانہ میں چلا گیا۔

جب کافی دیر تک امیر بہاؤ الدین اندر سے نہ آیا تو قاضی فاضل کو فکر ہوئی۔ اُس نے اِدھر اُدھر دیکھا کہ شاید کوئی غلام یا کنیز نظر آجائے مگر اتنے بڑے محل میں اُسے ایک غلام بھی نظر نہ آیا۔ اسی وقت امیر بہاؤ الدین اندر سے برآمد ہوا۔

"تم کہاں چلے گئے تھے امیر بہاؤ الدین۔ کیا تمہارے غریب خانہ میں ایک بھی ملازم نہیں؟" قاضی فاضل نے اس سے پوچھا۔

امیر نے افسردگی سے جواب دیا۔ "قاضی محترم۔ اگر ملازم ہوتا تو اندر سے اتنی دیر بعد کیوں آتا۔ دیکھیے کیسا خراب زمانہ آگیا ہے ایک وقت تھا غلام اپنے آقا پر جان دیتے تھے مگر آج کل ان کی نمک حرامی کا یہ حال ہے کہ ابھی میں نے ہتھیار نہیں ڈالے مگر تمام غلام اور کنیزیں مجھے چھوڑ کے بھاگ گئے ہیں جیسے خدانخواستہ میں چھوت کی بیماری ہوں۔ مجھے آنے میں دیر اس وجہ سے ہوئی کہ میں گھر کی پچھلی طرف کی ایک دیوار توڑ رہا تھا۔ میں آپ کو اسی ٹوٹی ہوئی دیوار کے راستے سے قلعہ کے باہر بھیجوں گا کیوں کہ میری خواتین آپ کے ساتھ ہوں گی اور میرے مخالف خوامخواہ آپ کے مزاحم ہوں گے۔"

امیر بہاؤ الدین کی بڑی عبرت ناک حالت تھی۔ وہ ایک عظیم الشان قصر میں رہتا تھا۔ مگر اُس کے ظلم اور جبر کی وجہ سے کیا عوام کیا خواص سب ہی اُس کے خلاف ہو گئے تھے۔ آج صبح ہی سے قلعہ میں یہ افواہ گرم تھی کہ بہاؤ الدین قلعہ پر سلطان کا قبضہ کرا دے گا کیوں کہ فصیل کے محافظوں نے سلطان کے خلاف ہتھیار اُٹھانے سے انکار کر دیا ہے۔ اس افواہ کا یہ اثر تھا کہ [illegible] کے تمام ملازم اُس کے قصر سے بھاگ گئے تھے۔

امیر بہاؤ الدین، قاضی فاضل کو اندر لے گیا۔ اُس کی بیوی [illegible] ایک بیٹی نصف نقاب ڈالے چلنے کے لیے تیار تھیں۔ پھر یہ [illegible] ٹوٹی ہوئی دیوار کے پاس پہنچے۔ قصر کا یہ حصہ ایک ویران سڑک [illegible] تھا جس پر لوگوں کی بہت کم آمد و رفت تھی۔ امیر بہاؤ الدین، خو[illegible] اور قاضی فاضل کو اُس راستے سے لے کر فصیل کے مغربی دروا[illegible] پر پہنچا۔ وہاں کے محافظ اب تک بہاؤ الدین کے وفادار تھے [illegible] نے فوراً دروازہ کھول دیا۔ پہلے خواتین پھر قاضی فاضل قلعہ سے نکلے پھر دروازہ بند ہو گیا۔ لشکر میں پہنچ کے قاضی فاضل نے خو[illegible] کو سلطان کے سامنے پیش کیا۔

"سلطان معظم۔" قاضی فاضل نے تفصیل بیان کی: "و[illegible] سلطنت امیر بہاؤ الدین قلعہ آمد حوالہ کرنے پر تیار ہے۔ اُ[illegible] کے اس کے صلہ میں درخواست کی ہے کہ اُسے صرف تین [illegible] کی مہلت عطا کی جائے تاکہ وہ قلعہ سے اپنا سامان نکال سکے [illegible] چوتھے دن قلعہ سلطانی لشکر کے حوالہ کر دیا جائے گا۔"

سلطان صلاح الدین بڑی توجہ سے قاضی کی باتیں سُن [illegible] تھے۔ انھوں نے فرمایا۔

"یہ خواتین کون ہیں اور لشکرگاہ میں کس لیے آئی ہیں؟"

خواتین نے اُس وقت فوراً جھک کے سلطان کی خدمت میں تسلیمات پیش کی۔

قاضی فاضل نے سلطان کو جواب دیا۔ "سلطان عالی مقا[م] یہ خواتین قلعہ میں محفوظ نہیں ہیں اس لیے وزیر موصوف نے انہیں سلطان کی پناہ میں بھیجا ہے۔"

سلطان نے ذرا توقف کے بعد فرمایا۔ "امیر بہاؤ الدین [illegible] سامان نکالنے کے لیے تین دن کی مہلت دی جاتی ہے۔ یہ خواتین ہماری پناہ میں رہیں گی۔" سلطان کا حکم ختم ہوا تھا کہ امیر بہاؤ الدین کی بیوی بولی۔

"سلطان معظم نے میرے شوہر کو سامان اُٹھانے کے [لیے] تین دن کی مہلت دی ہے۔ میں اور میرا پورا خاندان سلطان [کو] دُعائیں دیتا رہے گا لیکن میرے شوہر سلطان کی اس کرم نوازی [سے] فائدہ نہیں اُٹھا سکتے جب تک سامان اُٹھانے کے لیے مزدور[وں] کا انتظام نہ کیا جائے۔"

خاتون کی بات شاید سلطان کی سمجھ میں نہیں آئی۔ اُنھوں [نے] سوالیہ نظروں سے قاضی فاضل کی طرف دیکھا۔ قاضی نے خا[تون] [illegible]

سے سوال کیا۔

"خاتون۔ شاید تم یہ کہنا چاہتی ہو کہ تمہارا سامان اُٹھانے کے لیے ہم تمہیں مزدور بھی مہیا کریں؟"

"جی ہاں قاضی محترم۔ میری سلطان سے یہی درخواست ہے۔" خاتون نے تائید کی۔

"مگر کیوں۔ کیا ریاست آمد میں سامان اُٹھانے والے مزدور نہیں ہوتے ہیں؟" قاضی فاضل نے حیران نظروں سے خاتون کو دیکھا۔

"قاضی محترم۔ آمد میں مزدور ہوتے ہیں۔" خاتون نے ایک ٹھنڈی سانس لی۔ "مگر جب وقت بگڑتا ہے تو اپنا سایہ بھی ساتھ چھوڑ دیتا ہے۔ آمد کی فوجوں نے مقابلے سے انکار کر دیا ہے۔ میری کنیزیں اور غلام چھوڑ کر چلے گئے ہیں۔ آپ کو علم ہے کہ ہم مکان کی پچھلی دیوار توڑ کر قلعہ سے نکلے ہیں اگر ہم بڑے دروازے سے آنے کی کوشش کرتے تو عوام و خواص ہمیں پریشان کرتے مگر یہ آپ سے شکوہ نہیں بلکہ میرے شوہر کے اعمال کی یہ سزا ہے۔ اُنھوں نے ریاست کے کسی آدمی سے بنا کے نہیں رکھی اقتدار کے نشہ نے انھیں اپنوں سے بیگانہ کر دیا۔"

سلطان اور تمام درباری خاتون کے اس اظہار سے بہت متاثر ہوئے۔ سلطان نے حکم دیا کہ خاتون کو جس قدر آدمیوں کی ضرورت ہو وہ انھیں عطا کیے جائیں۔ اس کے علاوہ بھی اگر کوئی اور ضرورت ہو تو وہ بھی پوری کی جائے۔

کتاب الروضتین کا بیان ہے کہ سلطانی لشکر کے تین سو سپاہی تین دن اور رات قلعہ سے وزیر بہاؤ الدین کا سامان نکالتے رہے پھر چوتھے دن سلطانی لشکر نے قلعہ کا قبضہ لیا تو وزیرِ سلطنت اپنا سینہ پیٹ رہا تھا کہ ہائے میرے سامان کا سواں حصہ بھی قلعہ سے نہیں آسکا۔ یہ سامان پانچ بڑے بڑے خیموں میں جمع کیا گیا تھا۔

ریاست کے کتب خانہ میں دس لاکھ چالیس ہزار کتابیں موجود تھیں۔ سلطان صلاح الدین نے علم و ادب کا یہ بیش بہا خزانہ اپنے وزیر قاضی فاضل کو بخش دیا۔ قاضی فاضل اتنی کتابیں دیکھ کر حیران رہ گیا۔

قاضی فاضل نے سلطان کے حضور عرض کیا "سلطانِ معظم۔ بغداد کے علاوہ علم و ادب کا اتنا بڑا خزانہ دُنیا کے کسی حصہ میں موجود نہیں۔ میں اس لیے حضور کا جس قدر بھی شکریہ ادا کروں وہ کم ہے۔ مگر اب سوال یہ ہے کہ ان کتابوں کو سلیقے سے رکھنے کے لیے دمشق میں مجھے کم از کم چار بڑی بڑی حویلیاں درکار ہوں گی۔ اس لیے میری درخواست ہے کہ میں ان میں سے کچھ منتخب کتب خود اپنے پاس رکھوں باقی کتب کو دمشق کے سلطانی کتب خانہ میں منتقل کر دیا جائے۔"

سلطان نے قاضی فاضل کو انتخاب کی اجازت دے دی۔ لین پول کے مطابق قاضی فاضل نے جو کتابیں منتخب کیں انھیں وہ ستر اونٹوں پر بار کر کے اپنے ساتھ دمشق لے گیا۔ باقی کتابوں کا اندازہ آپ خود کر سکتے ہیں۔

اوپر بیان ہو چکا ہے کہ آمد کے ایک باغی امیر محمد ابن قراد نے سلطان سے مل کے انھیں آمد کے وزیر بہاؤ الدین کے ظلم و ستم سے آگاہ کر کے اُن سے آمد پر حملہ کی درخواست کی تھی۔ اس لیے سلطان نے امیر محمد ابن قراد کے بیٹے نور الدین کو آمد کا حاکم مقرر کر دیا۔ نور الدین قلعہ کا چارج لینے گیا تو وہاں چاندی سونے اور جواہرات کے ڈھیر دیکھ کر اس کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ وہ اس قدر گھبرایا کہ فوراً سلطان کے پاس واپس پہنچا۔ "سلطان معظم۔ آپ نے مجھے آمد کا حاکم مقرر فرمایا ہے لیکن وہاں مال و دولت کے علاوہ نادر و نایاب چیزوں کا اس قدر انبار ہے کہ اس کا شمار ممکن نہیں۔ آپ از راہِ کرم ریاست کا خزانہ اور نادر اشیاء اپنے ساتھ دمشق لیتے جائیے۔"

"نہیں نور الدین۔ ہم نے جب تمہیں آمد کا حاکم بنایا تو اب آمد میں جو کچھ ہے وہ تمہارا ہے۔ ہم اُن لوگوں میں نہیں جو پیڑ تو دے دیتے ہیں مگر پھل دینے سے انکار کر دیتے ہیں۔"

سلطان صلاح الدین کی بخشش کا یہ انداز تاریخ میں درج ہو کر امر ہو گیا اور اس کے ساتھ یہ بات بھی تاریخ کی زینت ہو گئی کہ آمد کا حاکم نور الدین سات سال تک شاہی محلات کا فالتو سامان فروخت کرتا رہا اور پوری ریاست آمد کا کوئی گھر ایسا نہ بچا جس میں فروخت کیا ہوا مال نہ پہنچا ہو۔ تحقیق سے یہ بات سامنے آئی کہ ریاست آمد الجزیرہ کی سب سے زیادہ مالدار اور خوشحال ریاست تھی۔ فرماں روایانِ آمد کا عہد قدیم ہی سے یہ دستور تھا کہ وہ ہر تقریب کے لیے نیا ساز و سامان خریدتے تھے مثلاً جب نیا فرماں روا مقرر ہوتا تھا تو اس کے لیے نیا محل تعمیر کیا جاتا اور اس محل میں نیا ساز و سامان لگایا جاتا۔ نوادرات بھی نئے خریدے ہوئے ہوتے تھے۔

اس طرح آمد میں نئے محل اور نیا سامان جمع ہوتا گیا۔ کوئی فرماں روا پرانا محل اور پرانا سامان نہ استعمال کرتا تھا

محل کو معہ ساز و سامان کے محفوظ کر دیا جاتا اور اُس کی دیکھ بھال کے لیے باقاعدہ چند غلام مقرر کر دیے جاتے۔ اس طرح کے ساز و سامان سے بھرے ہوئے محلات ریاست کے قلعہ اور بیرون قلعہ درجنوں نہیں بلکہ سیکڑوں کی تعداد میں تھے۔ ظاہر ہے کہ اُن کا سامان تصوّر سے بھی زیادہ ہوگا۔

ریاست آمد پر قبضہ اور اُس کے مال و دولت اور نوادرات کا ذکر ادھورا رہ جائے گا اگر ریاست کے اصل فرماں روا جو مسٹر فرماں روا کے نام سے اور اُن کی بیگم مرینا جسے ڈارلنگ کا خطاب دیا گیا تھا۔ ان کے بارے میں نہ کہا جائے مسٹر فرماں روا اپنی رنگ رلیوں میں ایسے مصروف تھے کہ انہیں حملہ اور قبضہ کا کوئی علم نہ ہو سکا۔ پھر آمد کا نیا قلعہ دار نور الدین قلعہ میں داخل ہوا جہاں مسٹر فرماں روا کا بھی شاہی محل تھا تو لوگوں نے نور الدین کو بتایا کہ امیر وزیر بہاؤ الدین یہاں سے چلا گیا ہے لیکن آمد کا اصل حاکم اور فرماں روا ابھی تک اپنے محل میں موجود ہے۔ لازم ہے کہ اُسے بھی قلعہ سے بیدخل کیا جائے۔

نور الدین نے پہلے تو فرماں روا کے تمام حالات سُنے اور خُوب ہنسا پھر اُس نے ایک فوجی دستے کو حکم دیا کہ مسٹر فرماں روا کو محل سے لے آؤ اگر وہ آنے سے انکار کریں تو انہیں زبردستی لایا جائے۔ شاہی محل پر فوجی دستہ پہنچا تو وہاں کہرام مچ گیا۔ اُن کی تو دُنیا ہی الگ تھی۔ انھیں علم ہی نہ ہوتا کہ سورج کب نکلا اور کب غروب ہوا۔ انھیں بتایا گیا کہ ریاست آمد کے لیل و نہار بدل گئے ہیں۔ وزیر امیر بہاؤ الدین نے قلعہ سلطان دمشق کے حوالے کر دیا ہے اور نئے حاکم قلعہ نے اُسے طلب کیا ہے اگر وہ جانے سے انکار کرے گا تو لشکری اُسے پکڑ لے جائیں گے۔

قلعہ والوں پر پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ کنیزوں اور غلاموں نے جو نام کے عیسائی تھے رو رو کے آسمان سر پر اُٹھا لیا۔ پھر ڈارلنگ مرینا نے فرماں روا کو مشورہ دیا کہ وہ حاکم قلعہ کے پاس جائے کیوں کہ حاکم اب قلعہ کا مالک اور وہ (فرماں روا) اُس کی رعایا اور ایک عام شہری ہے۔ مرینا نے یہ بھی مشورہ دیا کہ وہ حاکم سے اپنی گزر بسر کے لیے ایک معقول رقم کا سوال کرے۔ کیا عجب کہ حاکم کو رحم آ جائے اور وہ خزانہ سے اتنا کچھ دے دے کہ انھیں کسی اور کا منہ نہ دیکھنا پڑے۔

مرینا نے مسٹر فرماں روا کو ایک بند گاڑی میں سوار کیا اور کنواری مریم کی دعاؤں کے ساتھ رخصت کرنا چاہا مگر مسٹر فرماں روا اکڑ گئے کہ اگر مرینا ساتھ نہیں جائے گی تو وہ بھی حاکم کے پاس نہیں جائے گا خواہ اسے لشکریوں کے ساتھ گرفتار ہو کے جانا پڑا۔

مرینا نے مسٹر فرماں روا کی بات مان لی مگر اُس نے دُوسرا لباس تبدیل کیا کیوں کہ وہ ایک مسلمان حکمراں کے سامنے جا رہی تھی اور اُس کا نصرانی لباس نیم عریاں نہیں بلکہ عریاں تھا۔ پھر اُس نے فرماں روا کو سمجھایا۔

"مسٹر فرماں روا۔ میں آپ کے ساتھ چل رہی ہوں اس لیے آپ کے بجائے حاکم قلعہ سے میں گفتگو کروں گی۔ آپ بالکل خاموش رہیں گے۔"

مسٹر فرماں روا نے سر ہلا کر اقرار کیا اور مرینا کے ساتھ گاڑی میں بیٹھ کے روانہ ہوئے۔

حاکم کے پاس پہنچ کے فرماں روا اور اُس کی بیوی مرینا نے عام رعایا کی طرح حاکم کو جھک کے سلام کیا۔ پھر مرینا نے کہا۔ "اے حاکم قلعہ آمد۔ میں سابق قلعہ دار آمد کی بیوی ہوں۔ ہم دونوں آپ کے حکم کی تعمیل میں حاضر ہوئے ہیں اس خیال سے کہ ہم نے نہ سلطان سے جنگ کی ہے اور نہ اُن کے خلاف مُنہ سے کوئی بات نکالی ہے۔ ہمیں اُمید ہے کہ آپ ہمیں وزیرِ سلطنت کی خطاؤں کی سزا نہیں دیں گے۔"

"ٹھیک ہے تمہیں کوئی سزا نہیں دی جائے گی۔" حاکم بدر الدین نے اُس کی بات مان لی۔ "ہاں اگر تم آمد میں رہنا چاہتے ہو تو تمہیں شاہی محل چھوڑ کے ایک عام انسان کی طرح یہاں رہنا ہوگا۔"

مرینا نے التجائی انداز میں کہا۔ "اے حاکم قلعہ آپ غور کر سکتے ہیں کہ جن لوگوں کے ہم کبھی آقا تھے اب اُن کے ساتھ برابری کے درجہ پر رہنا کس قدر مشکل ہوگا۔ اگر آپ ہم پر نوازش فرمائیں تو ہمیں ایک معقول رقم شاہی خزانہ سے عطا کر دیں تو ہم آمد چھوڑ کر کہیں چلے جائیں۔"

"معقول رقم سے تمہاری کیا مراد ہے؟" امیر بدر الدین نے پوچھا۔

مرینا نے جواب میں کہا۔ "رقم اتنی ہونا چاہیے کہ ہم اپنی بقیہ زندگی اچھی طرح گزار سکیں۔"

"دیکھو سلطان دمشق ابھی قلعہ کے باہر لشکر گاہ میں موجود ہیں۔ تم اُن سے جو چاہے طلب کر سکتے ہو اور وہ سب کچھ عطا

کر سکتے ہیں۔ بہتر ہے کہ تم اُن کے سامنے اپنی درخواست پیش کرو۔" حاکم قلعہ نے اُسے مشورہ دیا۔ مرینا اس بات سے بہت خوش ہوئی۔ اُس نے سلطان صلاح الدین کا بڑا نام سُنا تھا۔ وہ سلطان کو اپنی آنکھوں سے دیکھنا چاہتی تھی۔ مسٹر فرماں روا اور وہ دوبارہ گاڑی میں بیٹھ کے سلطان کے پاس پہنچے۔ اُن کے ساتھ گھوڑے پر سوار حاکم قلعہ بدرالدین بھی چل رہا تھا۔

مسٹر فرماں روا نے سلطان کے سامنے بڑے مہذب طریقے سے اپنا مقدمہ پیش کیا۔ "اے سلطان معظم! آپ نے قلعہ آمد فتح کیا اُس کی میں مبارک باد پیش کرتا ہوں اور خدا سے دُعا کرتا ہوں کہ آپ روزانہ ایک قلعہ فتح کیا کریں۔ میں بھی..."

سلطان صلاح الدین نے پریشان ہو کے بدرالدین کی طرف دیکھا جو مسٹر فرماں روا کے برابر کھڑا تھا۔ "بدرالدین تم کس شخص کو لے آئے۔ تم نے تو کہا تھا کہ آمد کا سابق فرماں روا حاضری کی اجازت چاہتا ہے مگر یہ...؟"

"سلطان عالم۔" بدرالدین سر خم کرکے بولا۔ "یہی آمد کے سابق فرماں روا ہیں جن کی غفلت کا یہ عالم ہے کہ انہیں آج معلوم ہوا کہ سلطانی لشکر نے آمد کے قلعہ پر قبضہ کر لیا ہے۔ وہ بھی اُس وقت جب میں نے سپاہی بھیج کے انہیں محل سے بلوایا۔"

"یہاں کس لیے آئے ہیں یہ لوگ؟" سلطان کا مزاج مکدر ہو گیا تھا۔

"یہ مجھ سے اتنی رقم طلب کر رہے تھے جسے دینے کا مجھے اختیار نہیں۔ میں حضورِ عالی میں انہیں لایا ہوں کہ ان کے مطالبہ پر غور کیا جائے یا رد کر دیا جائے۔" بدرالدین نے اصل حال بیان کر دیا۔

سلطان خدا جانے کیوں نرم پڑ گیا۔ اس نے نرم لہجے میں پوچھا۔ "تم کیا چاہتے ہو۔ کیا مطالبہ ہے تمہارا؟"

"سلطان سخی اور بخشش کرنے والے ہوتے ہیں۔" مسٹر فرماں روا نے سنبھل کے کہا۔ "خدا نے میری غفلت کی مجھے سزا دی۔ مجھے نہ خدا سے شکوہ ہے اور نہ آپ سے شکایت۔ بس اس قدر التماس ہے کہ سلطان عالی مقام مجھے اتنی رقم عطا فرمائیں کہ ہم میاں بیوی کی بقیہ زندگی آرام سے گزر جائے۔"

"اے نادان انسان۔ تو غافل تھا اس لیے خدا نے تجھ سے ریاست اور اقتدار چھین لیا مگر میں تیری التماس کو رد نہیں کر سکتا اس لیے کہ مجھے روزِ قیامت اپنے خدا کو جواب دینا ہے۔" پھر سلطان نے بدرالدین کو حکم دیا۔ "اے بدرالدین ان دونوں میاں بیوی کو عزت کے ساتھ آمد کے شاہی خزانہ میں لے جاؤ اور ان سے کہو یہ جس قدر سونا چاندی، ہیرے جواہرات اور نوادرات اُٹھا کر قلعہ سے باہر لے جا سکتے ہوں وہ لے جائیں لیکن یہ موقع انہیں ایک بار دیا جائے پھر یہ قلعہ میں لوٹ کے نہیں آ سکتے۔"

مسٹر فرماں روا اور ڈارلنگ مرینا، سلطان کے حضور سجدہ کی حد تک جھک گئے۔ مرینا نے سیدھے ہوتے ہوئے کہا۔ "سلطان عالی مقام۔ میرے بابا سلطان کی شجاعت اور جواں مردی کے جو قصے سُناتے تھے اُن پر مجھے یقین نہ آتا تھا مگر آج آپ کی سخاوت کا عالم آنکھوں سے دیکھا تو یہ بھی ثابت ہوا کہ جس انسان کو خداوند یسوع مسیح نے شجاعت بخشی ہے اُس نے اُسے اتنا ہی سخی بھی بنایا ہے۔"

دونوں سلطان کو سلام کرکے واپس ہوئے۔ گاڑی باہر کھڑی تھی۔ اُس پر بیٹھ کے وہ آمد کے خزانہ کی طرف چلے۔ بدرالدین گھوڑے پر سوار اُن کے ساتھ ساتھ تھا۔ خزانہ پر پہنچ کے مسٹر فرماں روا نے دو چری تھیلے طلب کیے جو انہیں مہیا کر دیے گئے۔ پھر میاں بیوی نے ان تھیلوں کو صرف ہیرے جواہرات سے اتنا بھرا جتنا وہ اُٹھا سکتے تھے۔ بدرالدین دور کھڑا انہیں بڑی دلچسپی سے دیکھ رہا تھا۔ مرینا نے فرمائش کی کہ اُس کے بابا کو محل سے بلوا دیا جائے۔ بابا یعنی راہب فلپ رونالڈ کو حالات کا علم ہو گیا تھا اور پریشانی کے عالم میں اندر باہر بھاگ رہا تھا۔ اطلاع پا کر وہ بھاگتا ہوا آیا۔

مسٹر فرماں روا اور مرینا ڈارلنگ تھیلے سنبھالے کھڑے تھے۔ بابا نے بیٹی کے ہاتھ سے تھیلا لینا چاہا مگر مرینا نے انہیں منع کر دیا۔ "نہیں بابا۔ سلطان کا حکم ہے میں اور مسٹر جس قدر دولت اُٹھا کر لے جا سکتے ہیں وہ لے کر قلعہ سے نکل جائیں۔"

پھر ایک نااہل اور غافل فرماں روا کا انجام پورے قلعہ نے دیکھا۔ بدرالدین اُن کے ساتھ تھا اور جب تک وہ دونوں قلعہ سے نکل نہ گئے وہ انہیں دیکھتا رہا۔

حسبِ موقع

"یار! تم نے پچھلے سال جو مچھلی شکار کی تھی، مختلف لوگوں کے سامنے تم اس کا وزن مختلف بیان کر رہے ہو۔"

"بھئی میں ہر شخص کو اتنا ہی وزن بتاتا ہوں جتنے پر وہ یقین کر سکے۔"



سلطان صلاح الدین دریائے فرات عبور کر کے موصل اور الجزیرہ کی طرف جا رہا تھا کہ اس دوران دمشق سے ایک تیز رفتار سوار سلطان کی خدمت میں حاضر ہوا۔ سوار کو دیکھ کر سلطان چونکا۔ اس لیے کہ اس سوار نے اپنا گریبان چاک کر رکھا تھا۔ اس زمانہ میں لوگ جب کوئی غم ناک خبر کسی دوسرے کو سناتے تو اپنا گریبان چاک کر لیتے تھے۔

سلطان سوار کو دیکھتے ہی افسردہ ہو گیا تھا۔ سوار آنکھیں نیچی کیے گفتگو کی اجازت کا انتظار کر رہا تھا۔ آخر سلطان نے ایک ٹھنڈی سانس لی اور فرمایا۔

"اے چاک گریباں قاصد! ہم نے خود کو اس غم ناک خبر سننے پر آمادہ کر لیا ہے جو تو لے کر آیا ہے۔ ہمیں بتا کہ ہمارا کون عزیز ہم سے منہ موڑ گیا؟"

"عالیجاہ" اور قاصد کی آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگ گئی۔ قاصد کے رونے سے سلطان گہری فکر میں ڈوب گئے، پھر کچھ لمحوں بعد دلی غم کو دباتے ہوئے بولے۔

"تیرا غم ہمارے غم میں شامل ہو گیا قاصد۔ اب امتحان نہ لے اور بتا کہ کون ستارہ ٹوٹ کر افلاک کی گہرائیوں میں گم ہو گیا؟"

قاصد نے آنسو پونچھے اور اشکبار آنکھیں اٹھا کر کہا۔

"عالیجاہ! آپ کے دلبند بھتیجے عزالدین فرخ شاہ بن شاہان شاہ نے آپ کو داغ مفارقت دیا ہے"

سلطان سناٹے میں آ گئے "جواں عمر فرخ شاہ!! ابھی اس کی عمر ہی کیا تھی۔ ہمارا دل تو اس کے روشن مستقبل کی پیش گوئیاں کر رہا تھا اور وہ ہمیں چھوڑ گیا"

سلطان کو یقیناً اس خبر سے شدید صدمہ ہوا، مگر خدا نے انہیں صبر و تحمل کا عظیم سرمایہ عطا کیا تھا اور بردباری اور قوت برداشت کی صفات سے نوازا تھا۔ کچھ توقف کے بعد اناللہ وانا الیہ راجعون کہا پھر دریافت فرمایا۔

"یہ سانحہ کہاں اور کیسے واقع ہوا؟"

قاصد نے تفصیل بتائی "امیرزادے فرخ شاہ، دمشق سے ایک لشکر لے کر جہاد کے لیے روانہ ہوئے۔ راستے میں طبیعت خراب ہوئی۔ سرداروں نے واپسی کا مشورہ دیا۔ وہ مع لشکر کے واپس آ گئے۔ بیماری اگرچہ کچھ نہ تھی بس بہانہ ہو گیا۔ امیرزادے کی جواں مرگ پر پورا دمشق سوگ میں ڈوب گیا"

"بیشک وہ جوانمرد تھا اور ہمارا دست و بازو" سلطان نے فرخ شاہ کی خدمات کا اعتراف کیا۔

سلطان کے ایک بھائی نورالدولہ شاہاں شاہ کے دو بیٹے عزالدین فرخ شاہ اور تقی الدین المظفر اور ایک بیٹی عذرا خاتون تھی۔ سلطان نے اپنے دونوں بھتیجوں کو شروع ہی سے اپنے ساتھ رکھا تھا اور یہ سلطان کے زیر سایہ اپنی شجاعت اور بہادری کے جوہر دکھا رہے تھے۔ ان دونوں سلطان نے عزالدین فرخ شاہ کو دمشق کا حاکم اور اپنے اہل خانہ کا ناظم

مقرر کیا تھا۔ فرخ شاہ اپنے ان دونوں فرائض کو احسن طریقے سے نباہ رہا تھا کہ اچانک اُسے موت نے آگھیرا اور عین جوانی کے عالم میں اس نے انتقال کیا۔

فرخ شاہ ایک خاموش طبع جوان تھا۔ فرخ شاہ اور تقی الدین دونوں اپنی بہادری میں ثانی نہ رکھتے تھے اور سلطان ہمیشہ انہیں یا اہم کام یا معرکوں پر مامور کرتا تھا بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ جس محاذ پر سلطان خود جانا چاہتا تھا مگر مجبوریوں کی وجہ سے وہاں نہیں پہنچ سکتا تو وہاں تقی الدین یا فرخ شاہ کو بھیجتا تھا۔ فرخ شاہ میں شجاعت کے ساتھ ساتھ محبت کا بھی کچھ شائبہ تھا لیکن اس کی بدقسمتی کہ وہ بڑے بڑے میدان مارنے کے بعد بھی محبت کے میدان میں ناکام رہا جس کی وجہ ارمغانہ کا باپ امیر شمس الدین محمد بن المقدم تھا جو خدا معلوم کیوں فرخ شاہ کے خلاف ہو گیا تھا اور المقدم کی مخالفت ہی نے آخر ارمغانہ کی جان لے لی اور وہ فرخ شاہ کی محبت میں گھٹ گھٹ کے مرگئی۔

مگر یہ محبت بھی کچھ عجیب چیز ہے اور اس کی کارفرمائیاں عجیب تر۔ امیر شمس الدین المقدم دو معصوم دلوں کی محبت میں دیوار بن کے کھڑا ہوا تھا۔ اس نے فرخ شاہ کو قتل کرانے کی کوشش کی پھر جب سلطان صلاح الدین کے بھائی نے بعلبک کی گورنری کے لیے ضد کی جس پر سلطان کے حکم سے ہی شمس الدین المقدم فائز تھا۔ اس وقت سلطان نے بھائی کی ضد سے مجبور ہو کر المقدم کو حکم دیا کہ وہ بعلبک کی گورنری اس کے بھائی کے سپرد کر دے تو احسان فراموش المقدم سلطان سے اکڑ گیا اور بعلبک چھوڑنے سے انکار کر دیا۔

سلطان کو اس کی اس حرکت پر غصہ آیا اور بہت آیا۔ اس نے بعلبک کے محاصرے کا حکم دے دیا۔ شاہی فوجوں نے بعلبک کو گھیر لیا۔ اسی قلعہ بعلبک میں سلطان کا بچپن گزرا تھا کیونکہ ایک زمانہ میں سلطان کا باپ نجم الدین ایوب اس قلعہ کا حاکم تھا۔ سلطان کو بھی اس قلعہ سے دلی محبت تھی۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ شمس الدین المقدم کو سزا دینے کے لیے وہ قلعہ پر سنگ باری کرائے اور اس کی فصیلیں منہدم ہو جائیں۔ اس لیے اس نے حکم دیا تھا کہ قلعہ کا سختی سے محاصرہ کیا جائے مگر زبردستی قبضہ کرنے کی کوشش نہ کی جائے۔

نافرمان شمس الدین المقدم کچھ دن تو قلعہ بند رہا مگر جب سامان رسد ختم ہونے لگا اور باہر سے محاصرے کی وجہ سے ہر چیز کی آمد و رفت بند ہو گئی تو بہت پریشان ہوا اور سلطان کے پاس صلح کا پیغام بھیجا اور شرط یہ لگائی کہ وہ اس وقت قلعہ بعلبک خالی کرے گا جب اُسے اس کی مرضی کا علاقہ عطا کیا جائے گا۔ سلطان کو اس کی شرط یا فرمائش پر غصہ کے بجائے ہنسی آئی ہوگی مگر سلطان نے المقدم کے قاصد کے سامنے اپنے تاثرات کا کوئی اظہار نہ ہونے دیا اور اس کی شرط تسلیم کر لی۔

اس جگہ سلطان کو ہنسی آنے کی بات اس لیے لکھی گئی ہے کہ پہلے سلطان نے خود شمس الدین المقدم کے پاس حکم بھیجا تھا کہ وہ بعلبک کا قلعہ اس کے بھائی کے حوالے کر دے اور اُسے (المقدم کو) اس قلعہ کے بدلے میں وہ علاقہ عطا کیا جائے گا جس کو خود شمس الدین المقدم پسند کرے گا۔ یہی دلچسپ بات تھی اور اس پر ضرور ہنسی آنا چاہیے تھی کہ المقدم نے قلعہ خالی کرنے کی جو شرط لگائی تھی وہ سلطان نے اُسے پہلے ہی صلے میں دینے کا اعلان کیا تھا۔ بہرحال سلطان نے اُسے بہترین علاقہ دے کر اس سے بعلبک کا قلعہ خالی کرا لیا۔

امیر شمس الدین المقدم کی صرف یہی گستاخیاں نہ تھیں بلکہ اس نے ارمغانہ اور فرخ شاہ کے درمیان فراق کے جو کانٹے بوئے تھے اس کی اطلاع سلطان کو ہو گئی تھی۔ سلطان کو یہاں تک شبہ ہوا تھا کہ شاید امیر شمس الدین المقدم نے اپنی بیٹی سے ناراض ہو کر اُسے زہر دے دیا تھا مگر ان تمام باتوں کے باوجود سلطان صلاح الدین نے المقدم کی کوتاہیوں کو انا کا مسئلہ نہیں بنایا اور اسے سلطنت کے سب سے اہم شہر اور قلعہ یعنی دارالسلطنت دمشق کا گورنر بنا دیا یہی نہیں بلکہ امیر شمس الدین المقدم کو دمشق میں اپنا نائب بھی مقرر کیا۔ سلطان کے اس اقدام سے ثابت ہوتا ہے کہ ملکی انتظام اور کاروبار سلطنت میں سلطان کس قدر مخلص، ایماندار اور دوراندیش تھا۔ سلطان کے درجنوں بھائی اور بھتیجے تھے مگر سلطان انہیں اپنے اپنے مقام پر رکھتا تھا۔

اس سے پہلے ذکر ہو چکا ہے کہ سلطان نے کچھ دنوں کے لیے اپنے ایک بھائی کو دمشق کا گورنر بنایا تھا جس کی بے پروائی کی وجہ سے دمشق کی فوج کو نصرانیوں کے ہاتھوں زبردست شکست اُٹھانی پڑی تھی اور اس جنگ میں

دمشق کا ایک مشہور سردار ہلاک ہوگیا تھا۔ اس وقت سے سلطان بہت محتاط ہوگئے تھے اور ملکی انتظام کے معاملے میں احتیاط سے کام لیتے تھے۔ امیر شمس الدین المقدم میں کئی عیب تھے لیکن وہ ایک اچھا منتظم اور بہادر سردار تھا۔ دمشق کا حاکم اُسے اسی وجہ سے مقرر کیا گیا تھا۔

سلطان صلاح الدین نے اپنے مرحوم آقا نورالدین زنگی کے دن دیکھے تھے۔ نورالدین زنگی مرحوم نے اپنی زندگی کا بیشتر حصہ جہاد میں گزارا تھا اور اسی کے نقش قدم پر چلنے کے لیے سلطان صلاح الدین اپنی تمام تر کوششیں کر رہا تھا۔ یوں تو اس کی فرنگیوں (نصرانیوں) سے کئی بار جنگ ہو چکی تھی۔ مصر کے قیام کے دوران شاہ یروشلم سے اور اسکندریہ کے محاصرہ میں رومی شہنشاہ قسطنطنیہ سے بھی اس کا سابقہ پڑ چکا تھا لیکن اب تک اس کے دل میں چھپے ہوئے جذبۂ جہاد کی تسکین نہیں ہوئی تھی۔ ایک مرتبہ اس کے مربی سلطان نورالدین زنگی نے اس سے کہا تھا۔

"صلاح الدین! جانتے ہو میری زندگی کا مقصد اور میرا نصب العین کیا ہے؟" صلاح الدین اس وقت بہت کم عمر تھا' اس لیے نورالدین زنگی کے سوال کا جواب نہ دے سکا تھا۔ ذرا اس نے کہا تھا۔

"آقائے محترم! میری عقل ناقص آپ کے پروازِ خیال تک نہیں پہنچ سکتی" پھر مرحوم نورالدین نے ایک ٹھنڈی سانس بھر کر کہا تھا۔

"صلاح الدین! میری زندگی کا مقصد وہی ہے جو میرے باپ امیر عمادالدین زنگی کا تھا جو سلجوقی سلطانوں کا تھا۔ جو عباسی خلفاء کا تھا مگر جسے کوئی بھی حاصل نہ کر سکا۔ کاش میں اس مقصدِ زندگی تک پہنچ سکتا!"

صلاح الدین پھر بھی کچھ نہ سمجھ سکا تھا اور اس نے دست بستہ عرض کیا تھا "اے سلطان عالی مقام! آپ نے مجھے حکم دیا ہے کہ میں دیکھو اور کچھ حاصل کرو۔ میں آپ کو دیکھتا ہوں اور وہ کچھ سیکھنے کی کوشش کرتا ہوں جو مجھے آپ میں دکھائی دیتا ہے لیکن میری رسائی آپ کے دل تک نہیں پھر میں آپ کا نصب العین کیسے سمجھ سکتا ہوں؟" اس وقت سلطان مرحوم نے بڑے دکھ سے بتایا تھا۔

"صلاح الدین! ارضِ مقدس اور قبلۂ اوّل یعنی بیت المقدس کو تقریباً پون صدی پہلے نصرانیوں نے ہم مسلمانوں سے چھینا تھا مگر اتنے طویل عرصہ میں کوئی امیر، کوئی بادشاہ اور کوئی خلیفہ یا سلطان اس ارضِ پاک کو نصرانیوں کے ناپاک ہاتھوں سے آزاد نہ کرا سکا۔ کہنے کو میں سلطان ہوں۔ مسلمانوں کے عباسی خلیفہ نے کئی بار میری توجہ اس طرف مبذول کرائی ہے۔ مگر افسوس کہ میں اس مقصد کو نہ پہنچ سکا جس کی آرزو مجھ سے پہلے کے تمام بادشاہوں اور سلطانوں کے دل میں تھی"۔

صلاح الدین نے بڑے جوش سے کہا تھا "اے آقائے محترم! آج میں نے آپ سے یہ بھی سیکھا ہے کہ ہر مسلمان کو اپنے قبلۂ اوّل کی بازیابی کے لیے کوشش کرنا چاہیے صرف کوشش ہی نہیں بلکہ بیت المقدس کی آزادی کو اپنا مقصدِ زندگی اور نصب العین بنانا چاہیے"!

یہ بھی ایک عجیب اتفاق تھا کہ جس دن صلاح الدین نے اپنے اس جذبہ کا سلطان مرحوم سے اظہار کیا تھا۔ اُسی دن سلطان نورالدین زنگی نے اپنے مشہور جنرل اسدالدین شیرکوہ کو حکم دیا تھا کہ وہ مصر کے محاذ پر جاتے وقت اپنے ساتھ نوعمر صلاح الدین کو بھی لیتا جائے اور یہ بھی عجیب بات تھی کہ صلاح الدین نے مصر جانے کی سخت مخالفت کی تھی لیکن اُسے سلطان کے حکم پر مصر جانا پڑا تھا' اور صلاح الدین کی مصر کی روانگی ہی اُس کے عروج کی پہلی سیڑھی ثابت ہوئی۔

صلاح الدین نے مصر میں بحیثیت ایک امیر زادے پھر بحیثیت وزیرِ اعظم مصر پھر گورنر مصر کی حیثیت میں جو کارہائے نمایاں انجام دیے' ان سے قارئین بخوبی واقف ہو چکے ہیں۔۔۔ پھر جب مصر کے بعد صلاح الدین کو سلطنت دمشق حاصل ہوئی تو اس کے جذبۂ جہاد اور بیت المقدس کی بازیابی کے تصور میں شدت پیدا ہو گئی' اگرچہ اس سے پہلے شام میں الرہا (اڈیسہ) کی مضبوط عیسائی ریاست پر مسلمانوں کا قبضہ ہو چکا تھا اور سلطان نورالدین زنگی نے بھی تاحیات جہاد کر کے نصرانیوں پر کئی کاری ضربیں لگائی تھیں لیکن اب بھی اُن کا زور باقی تھا۔

سلطان کو نصرانیوں سے زیادہ شام کے مختلف مسلمان حکمرانوں کی طرف سے پریشانی تھی۔ اس لیے اس نے پہلے اسی پریشانی کو ختم کرنے کا فیصلہ کیا جس میں اس کا بہت سا قیمتی وقت ضائع ہو گیا اور وہ اپنے اصل مقصد کی طرف رجوع نہ ہو سکا۔ شام میں مسلمانوں کی طرف حلب اور موصل

دو ایسی ریاستیں باقی تھیں جو اب تک سلطان کے قبضہ میں نہ آسکی تھیں اور اُسے پریشان کر رہی تھیں۔

پس سلطان نے فتح آمد کے بعد اپنی فوجیں حلب کے مضافات میں داخل کر دیں اور تل خالد اور عنتاب کے علاقے فتح کرنے کے بعد قلعہ حلب کا محاصرہ کر لیا۔ محاصرہ کے دوران محصورین نے شدید مدافعت کی اور اس لڑائی میں سلطان کا چھوٹا بھائی تاج الملوک بوری شدید زخمی ہوا۔ سلطان حلب کو ہر قیمت پر حاصل کرنا چاہتا تھا۔ حاکم حلب عماد الدین کچھ عرصہ تک مدافعت کرتا رہا مگر محاصرہ اس قدر سخت تھا کہ اہل قلعہ بیچ اُٹھے۔ ادھر فوج نے اپنی تنخواہ کا مطالبہ کر دیا۔ عماد الدین نے مجبور ہو کر قلعہ اس شرط پر حوالے کرنے پر آمادگی ظاہر کی کہ اُسے حلب کے بدلے میں نصیبین وغیرہ کے علاقے دے دیئے جائیں۔

عماد الدین کی طرف سے طومان الباروقی صلح کا پیغام لے کر آیا۔ سلطان نے اس کی شرائط منظور کر لیں اور عماد الدین نے معاہدہ کے مطابق قلعہ خالی کر دیا۔ اس فتح کی خوشی میں ایک جشن منعقد کیا گیا لیکن قلعہ میں داخل ہونے سے پہلے سلطان کے بھائی تاج الملوک بوری کا انتقال ہو گیا جو اس محاصرے کے دوران بہت زخمی ہوا تھا۔ اس طرح جشن کا سارا مزا کرکرا ہو گیا پھر بھی حلب پر قبضہ کی ہر ایک کو خوشی تھی۔

سلطان نے حلب پر اپنے کمسن بیٹے الظاہر غازی کو حاکم مقرر کیا اور امیر سیف الدین تادیج کو اس کا نگراں بنا دیا۔

حلب پر فتح کے ساتھ ہی اس میں جذبۂ جہاد بڑی شدت سے عود کر آیا اور اس نے دیار بکر اور الجزیرہ سے فوجیں طلب کر لیں، پھر وہ ایک بڑے لشکر کے ساتھ دریائے اُردن عبور کر کے نصرانی علاقوں میں داخل ہو گیا۔ سلطانی لشکر کی آمد کی خبر اُڑتے ہی نصرانی اپنے علاقے چھوڑ کر بھاگ کھڑے ہوئے۔ وہاں سے سلطان نے بیسان کا رُخ کیا۔ اور اس کو تباہ کر دیا۔ بیسان کی تباہی کے بعد تمام نصرانی علاقوں میں جن میں نصرانی لشکر موجود تھا۔ وہ گھبرا کر پیچھے ہٹا اور پہاڑ پر چڑھ گیا۔ پھر انہوں نے اپنے گرد خندق کھود کر خود کو محفوظ کر لیا۔

سلطان پہاڑی کے پاس پہنچے اور نصرانی لشکر کو قلعہ سے اُتارنے کی کوشش کی لیکن وہ اپنی جگہ سے نہ ہلے اور خندق کی وجہ سے محفوظ رہے۔ سلطان نے انہیں اُن کے حال پر چھوڑا اور قلعہ الکرک کی طرف روانہ ہوئے۔ یہ قلعہ بہت مضبوط تھا اور یہاں کا حاکم بڑا متعصب نصرانی تھا۔ سلطان نے قلعہ کا محاصرہ کر کے اس پر منجنیق سے سنگ باری شروع کر دی۔ اہل قلعہ نے زبردست مدافعت کی۔ بیرونی علاقے تو فتح ہو گئے لیکن قلعہ پر قبضہ نہ ہو سکا۔

اس وقت مصر پر سلطان کا بھائی ابوبکر الملک العادل حاکم تھا۔ سلطان نے اُسے مصر سے بلوایا اور اُسے حکم دیا کہ وہ اپنے اہل و عیال کے ساتھ قلعہ الکرک پر جہاں وہ محاصرہ کیے ہوئے تھا آ کر ملے۔ چنانچہ الملک العادل اپنے اہل خانہ کے ساتھ قلعہ الکرک کے محاصرہ کے دوران ہی آ کر سلطان سے مل گیا۔ سلطان نے الملک العادل کو حلب شہر اور حلب کے قلعہ کی حکومت پیش کی جو اس نے قبول کر لی۔

سلطان نے دراصل الکرک کی فتح کا پورا سامان نہیں کیا تھا۔ اس لیے وہ کچھ عرصہ محاصرہ کے بعد مال غنیمت سمیٹ کر واپس دمشق چلا گیا۔ دمشق پہنچ کے سلطان نے اپنے بھتیجے تقی الدین بن شاہان شاہ کو ملک العادل کی جگہ مصر کا حاکم مقرر کیا اور ملک العادل کو حلب اور منبج کی امارت سونپی۔ جب ملک العادل، حلب جانے لگا تو سلطان نے اپنے ایک بیٹے ملک العزیز عثمان کو اس کے ساتھ بھیج دیا اور دوسرے بیٹے ملک الافضل کو تقی الدین کے پاس مصر روانہ کیا۔

سلطان نے کچھ دن بعد قلعہ الکرک پر دوبارہ یلغار کی مگر کامیابی حاصل نہ ہوئی۔ اس طرح موصل پر کئی بار حملہ کیا۔ مگر موصل فتح نہ ہو سکا پھر ایک شدید محاصرے کے بعد موصل اُسے حاصل ہو گیا مگر وہ جب حران میں مقیم تھا تو سخت بیمار ہو گیا اور زندگی کی توقع نہ رہی۔ شخصی حکومتوں میں بادشاہ وقت کے بیمار ہوتے ہی تخت و تاج کے دعویدار اُٹھ کھڑے ہوتے ہیں اور اپنے حق میں زمین ہموار کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ پس ادھر جب سلطان اپنی زندگی سے مایوس ہوا تو اس بات کا بہت افسوس ہوا کہ اس نے اپنے کسی بیٹے کو بھی کسی علاقے کا مستقل اور خود مختار حاکم نہیں مقرر کیا۔ سلطان کے بعض دوستوں نے بھی اس کی اس طرف توجہ دلائی۔ چنانچہ سلطان نے اپنے فرزند ملک العزیز عثمان کو مصر کا خود مختار حاکم بنا کر بھیجا اور مصر سے اپنے بھتیجے تقی الدین اور بیٹے ملک الافضل کو اپنے پاس بلوالیا مگر تقی الدین نے دمشق جانے سے انکار کر دیا۔ تقی الدین کا ایک غلام قراقوش تھا

جسے اس نے آزاد کر دیا تھا۔ اس نے شمالی افریقہ کے علاقہ طرابلس اور جریدہ کو فتح کیا تھا اور ان پر قابض تھا۔ تقی الدین کا ارادہ تھا کہ وہ بھی افریقہ چلا جائے گا۔

سلطان کو تقی الدین کی مخالفت اور حکم عدولی کی اطلاع ملی تو اُسے بہت افسوس ہوا۔ تقی الدین کا بھائی عزالدین فرخ شاہ تو سلطان کا دست راست تھا۔ اس کا پہلے ہی انتقال ہو چکا تھا۔ تقی الدین پر بھی سلطان کم و بیش فرخ شاہ ہی کی طرح اعتبار کرتا تھا۔ چنانچہ سلطان نے تقی الدین کو ایک پیار بھرا خط لکھا اور سلطنت کے لیے اُس کی خدمات کو سراہا۔ تقی الدین دل سے سلطان کو نہیں چھوڑنا چاہتا تھا۔ اس لیے خط موصول ہوتے ہی دمشق آ گیا۔ سلطان نے اُسے حمات، منبج، معرہ، کفرتاب، جبل جوزا اور راس کے تمام علاقوں کی حکومت عطا کر دی۔

اس سلسلے میں ایک روایت یہ بھی ہے کہ جس وقت تقی الدین جسے سلطان نے مصر کا حاکم مقرر کیا تھا، کو سلطان کی بیماری اور اس کے ساتھ ہی اس کی موت کی اطلاع ملی تو اس نے خود سلطان بننے کا ارادہ کیا۔ اس نے لوگوں کے سامنے یہ جواز پیش کیا کہ سلطان صلاح الدین پہلے مصر کے حاکم تھے پھر انہیں دمشق کی حکومت ملی تھی۔ اس لیے ان کے بعد مصر کا حاکم ہونے کی وجہ سے سلطنت دمشق کا حقدار ہوں۔

یہ خبر سلطان تک پہنچی تو انہوں نے اپنے معتمد ترین امیر فقیہ عیسٰی ہکاری کو مصر روانہ کیا۔ فقیہ عیسٰی کی بات سے کوئی انکار نہیں کر سکتا تھا۔ اُن کا حکم، سلطان کا حکم سمجھا جاتا تھا۔ سلطان نے فقیہ عیسٰی سے کہہ دیا تھا کہ وہ تقی الدین کو مصر سے نکال کے وہاں خود قیام کریں۔ فقیہ عیسٰی ہکاری بڑی خاموشی سے مصر پہنچے۔ وہ رات کے وقت پہنچے تھے۔ اس لیے انہوں نے رات ایک کارواں سرائے میں گزاری پھر صبح کو جب تقی الدین دربار لگائے بیٹھا تھا تو وہ اچانک دربار میں پہنچے۔ تقی الدین انہیں دیکھ کر پاس ادب سے کھڑا ہو گیا۔

فقیہ عیسٰی نے اس سے سوال کیا: "تقی الدین تمہارا کیا ارادہ ہے؟"

تقی الدین اور مصریوں کو اس وقت تک یہی علم تھا کہ (خدانخواستہ) سلطان صلاح الدین کا انتقال ہو گیا ہے۔

تقی الدین نے اسی خیال کے تحت اپنا مقدمہ یا حق فقیہ صاحب کے سامنے پیش کرتے ہوئے کہا۔

"فقیہ محترم! یہ تو آپ تسلیم کریں گے کہ خاندان ایوبیہ کی نوجوان نسل میں سلطنت دمشق کے لیے میری خدمات سب سے زیادہ ہیں۔"

فقیہ عیسٰی ہکاری نے جواب دیا: "چلو یہ تسلیم کر لیا مگر۔"

"مگر کا جواب میں بعد میں دوں گا۔" تقی الدین نے فقیہ عیسٰی ہکاری کی بات کاٹتے ہوئے کہا: "آپ یہ بھی تسلیم کریں گے کہ تمام بڑی بڑی جنگوں میں میں نے حصہ لیا۔"

"یہ بھی تسلیم مگر۔"

تقی الدین نے پھر بات کاٹی: "فقیہ محترم! پہلے مجھے عرض کر لینے دیجیے پھر میں جواب دوں گا۔" پھر تقی الدین نے غٹاغٹ کر کہا: "تیسری بات یہ کہ کتنی اہم معرکوں پر مجھے سرداری اور سپہ سالاری کا اعزاز حاصل ہوا۔ یہ اعزاز اس وقت تک صرف تین افراد کو حاصل ہوا۔ ایک شمس الدولہ توران شاہ جس نے یمن فتح کیا۔ دوسرا میرا بھائی عزالدین فرخ شاہ جسے دمشق کی گورنری حاصل ہوئی اور تیسرا میں یعنی تقی الدین بن نورالدولہ شاہان شاہ بن نجم الدین ایوب۔ شمس الدولہ توران شاہ اور عزالدین فرخ شاہ کا انتقال ہو چکا ہے۔ اس لیے میں سلطنت کے وارثوں میں سب سے افضل ہوں۔ چوتھی بات جس کا تعلق روایت اور دستور سے ہے، وہ یہ ہے کہ سلطان صلاح الدین پہلے مصر کے حاکم تھے پھر انہیں دمشق کی سلطنت حاصل ہوئی تھی۔ اس وقت سلطنت دمشق کے سب سے بڑے صوبہ اور علاقہ مصر کا میں حاکم ہوں۔ اس لیے بھی مجھے دمشق کے تخت و تاج کا وارث ہونے کا حق پہنچتا ہے۔" فقیہ عیسٰی ہکاری نے بڑے تحمل سے تقی الدین کی دلیلیں سنیں، جب وہ چپ ہوا تو بولے: "تم اپنی کہانی سنا چکے یا ابھی کچھ اور کہنا ہے؟"

"جی ہاں، میں سب کچھ کہہ چکا اب آپ انصاف فرمایئے۔" تقی الدین نے بڑی امیدوں سے کہا۔

"انصاف۔" فقیہ عیسٰی ہکاری نے تلخی سے جواب دیا: "کس بات کا انصاف چاہتے ہو؟"

تقی الدین نے وضاحت کی: "یہی کہ میں خاندان ایوبیہ میں سلطنت دمشق کا سب سے بڑا حقدار ہوں۔"

"سنو تقی الدین۔" فقیہ کے لہجے میں اور تلخی آ گئی: "اگر انصاف چاہتے ہو تو سنو! تم دروغ گو اور جھوٹے ہو۔"

اس وقت دربار میں مصری امراء اور سرداروں کے علاوہ بعض قدیم امرائے نوریہ بھی موجود تھے جو سلطان صلاح الدین کے مصر سے دمشق منتقل ہونے کے وقت مصر ہی میں رہ گئے تھے۔ انہوں نے فقیہ عیسیٰ ہکاری کے تیور اور تلخ لہجہ محسوس کیا تو گھبرا گئے۔ خود تقی الدین کو پسینہ آ گیا۔ اس نے کھسیانے لہجہ میں کہا۔

"عالی مقام! امیر فقیہ عیسیٰ ہکاری! آپ میرے بزرگ ہیں۔ میں آپ کا حکم مان سکتا ہوں لیکن آپ نے سر دربار مجھے دروغ گو اور جھوٹا کہہ کے میری توہین کی ہے۔ میں نے کون سی غلط بات کہی، کیا جھوٹ بولا؟"

"تمہارے جھوٹا ہونے کی صرف یہی دلیل کافی ہے کہ تم نے سنی سنائی باتوں پر کان دھرے اور ان پر بغیر تحقیق کے یقین کر لیا۔" فقیہ عیسیٰ ہکاری جیسے سنجیدہ اور ثقہ قسم کے انسان ایک بالکل عام لہجہ میں گفتگو کر رہے تھے اور حاکم مصر پر ایک سنگین الزام لگا رہے تھے۔

تقی الدین کو بھی غصہ آ گیا تھا.... لیکن اس نے ضبط سے کام لیا اور ادب سے بولا۔ "فقیہ محترم! میں بالکل نہیں سمجھا کہ سلطنتِ دمشق پر اپنا دعویٰ اور حق ثابت کرنا کس طرح جھوٹ ہے اور میں نے کس سنی سنائی بات پر کان دھرے ہیں؟"

"تقی الدین! تمہاری بہادری کی میں قدر کرتا ہوں لیکن تم ایک ایسی سلطنت اور تخت و تاج کے دعویدار ہو جبکہ تم سے زیادہ شجاع اور عالی دماغ ہیں۔" فقیہ عیسیٰ ہکاری اپنی سانس ٹھہراتے ہوئے بولا۔ "تقی الدین! تمہاری اس گستاخی کی سزا یہ ہے کہ تم سورج غروب ہونے سے پہلے پہلے قاہرہ کی حدود سے نکل جاؤ۔" تقی الدین سناٹے میں آ گیا اور درباریوں کے پیروں کے نیچے سے زمین نکل گئی۔

تقی الدین نے ایک جھرجھری لے کر خود کو سنبھالا اور مضبوط لہجے میں بولا۔ "فقیہ محترم! آپ مجھے کس حیثیت سے قاہرہ بدر ہونے کا حکم دے رہے ہیں۔ کیا آپ کو علم نہیں کہ میں اس وقت مصر کا گورنر ہوں۔ مجھے سلطان صلاح الدین ایوبی نے اپنے ایک فرمان کے ذریعے مصر کی امارت عطا کی تھی۔"

فقیہ ہکاری نے بھی اتنے ہی مضبوط لہجے میں جواب دیا۔ "تقی الدین! جس سلطانِ دمشق نے تمہیں مصر کی امارت کا پروانہ جاری کیا تھا اس سلطانِ دمشق نے تمہیں امارت سے معزول کر کے مجھے مصر کی گورنری پر مامور فرمایا ہے۔ اس لیے اس وقت مصر کے گورنر تم نہیں میں ہوں۔"

"مگر آپ کو کس سلطانِ دمشق نے گورنری عطا کی ہے؟" تقی الدین نے حیرانی سے سوال کیا۔

"اے نادان تقی الدین! مجھے اس سلطان نے گورنری دی ہے جس نے تم سے یہ اعزاز چھین لیا ہے۔ اگر اب بھی نہیں سمجھ سکے یا سمجھنے سے قاصر ہو تو سنو! دمشق کا ایوبی سلطان صلاح الدین پہلے بھی تھا اور اب بھی ہے۔" فقیہ عیسیٰ نے انتہائی غصہ سے جواب دیا۔

"لیکن سلطان کا تو اب انتقال ہو چکا ہے؟" تقی الدین نے فوراً کہا۔

فقیہ عیسیٰ ہکاری نے فوراً تلوار کھینچ لی اور چیخ کر کہا۔ "او گستاخ تقی الدین! اگر تو نے اب میرے سامنے سلطان کو مردہ کہا تو میں تیری زبان کھینچ لوں گا۔"

تقی الدین گھبرا گیا اور بولا۔ "بزرگِ محترم! کیا میں نے جو کچھ سنا وہ جھوٹ تھا؟"

"وہ تو جھوٹ تھا ہی مگر تو سب سے بڑا جھوٹا ہے۔ جس نے بغیر تحقیق کے ایک افواہ پر یقین کر لیا۔"

"مجھے معاف کر دیجیے۔ بڑی غلطی ہوئی مجھ سے...."

تقی الدین گڑگڑانے لگا۔

"جا۔ بس تیری یہی سزا ہے کہ فوراً قاہرہ سے نکل جا۔" فقیہ عیسیٰ ہکاری پر اب تک غصہ سوار تھا۔ "مجھے معلوم ہوتا کہ تم کان کے اتنے کچے ہو اور تمہاری نادانی کا یہ عالم ہے تو میں تمہیں مصر کا حاکم بنانے کی شدت سے مخالفت کرتا۔ شکر کرو تقی الدین! کہ سلطان نے صرف تمہیں مصر کی گورنری سے معزول کیا ورنہ اگر انہوں نے مجھے سزا دینے کا اختیار دیا ہوتا تو میں تمہارا بڑا برا حشر کرتا۔"

تقی الدین اس کے حواریوں اور تمام درباریوں نے سن لیا کہ خود سلطان نے تقی الدین کو امارتِ مصر سے معزول کر دیا ہے تو ان کی نظریں بھی فوراً پھر گئیں اور تقی الدین کو غروبِ آفتاب سے قبل قاہرہ چھوڑ دینا پڑا۔

تقی الدین قاہرہ کی سرحد سے نکل تو آیا لیکن اب سوال یہ تھا کہ وہ جائے تو کدھر جائے۔ سلطان اس کے خلاف ہو گیا تھا اس لیے کسی جگہ پناہ ملنے کی امید نہ تھی۔ اس کے لیے سوائے اس کے اور کوئی چارہ نہ تھا کہ وہ سلطان کی نظروں سے دور رہ کر اس وقت کا انتظار

کرے جب سلطان اُسے معاف کر دیں۔ چنانچہ تقی الدین نے قاہرہ کی سرحد پار کر کے ایک مقام پر اپنا خیمہ نصب کیا اور وہیں رہنے لگا۔

پھر یہ بات پورے شہر قاہرہ میں مشہور ہو گئی، کل کے گورنر تقی الدین کو سلطان نے معزول کر کے شہر بدر کر دیا ہے اور اب وہ قاہرہ سے باہر ایک خیمہ میں تنہا پڑا ہوا ہے۔ سلطان کے خوف کی وجہ سے کوئی اس کے پاس نہیں پھٹکتا۔

روایت ہے کہ مصر کے پرچہ نویس (شاہی جاسوس) نے دربار دمشق میں پرچا لگایا کہ تقی الدین معتوب اور مردود ہو کر قاہرہ کے باہر اکیلا ایک خیمہ میں پڑا ہے اور انتظار کر رہا ہے کہ شاید کسی وقت کرم سلطانی کا کوئی ایسا بادل اُٹھے جو دمشق سے اُڑ کے قاہرہ پہنچے اور تقی الدین کے خیمہ پر اس طرح برسے کہ اس کے تمام دلدر دُور ہو جائیں۔ سلطان نے پرچہ نویس کی اس اطلاع پر فوراً ہی تقی الدین کو معاف کر دیا اور اسے ایک التفات بھرا خط لکھ کر دمشق بلوا لیا۔

یہ تو خیر مصر کی بات تھی جو ملک شام سے ہزاروں میل دُور تھا مگر سلطان کچھ اس قدر شدید بیمار ہوا تھا کہ خود سلطان کے ساتھ رہنے والے بھی اس کی زندگی سے مایوس ہو گئے تھے۔ پہلے بیان کیا جا چکا ہے کہ سلطان پر بیماری کا دورہ اس وقت پڑا تھا جب وہ حراں میں مقیم تھا۔ اس وقت سلطان کے ساتھ ان کا بھائی ملک العادل اور ایک بیٹا ملک العزیز عثمان موجود تھا۔ ان دو کے علاوہ سلطان کا چچا زاد بھائی ناصر الدین محمد بن شیر کوہ بھی سلطان کے پاس تھا۔

شیر کوہ کے نام سے کون واقف نہیں۔ صلاح الدین کو، صلاح الدین بنانے والا اس کا چچا اسد الدین شیر کوہ ہی تو تھا۔ شیر کوہ، صلاح الدین کو جو ان دنوں جامعہ دمشق میں مذہبی کتب کا گہرا مطالعہ کر رہا تھا، اپنے ساتھ زبردستی مصر کے محاذ پر لے گیا۔ اور مصر کے اس محاذ نے جس میں صلاح الدین بادل نخواستہ شامل ہوا تھا، سلطان کی قسمت کے دریچے کھول دیے۔ پہلے اس نے چھوٹے چھوٹے معرکوں میں اپنی تلوار صاف کی اور شمشیر زنی کا سکہ بٹھایا پھر اسکندریہ کے محاذ پر محض اپنی جنگی حکمت عملی اور شجاعت کی بدولت اس نے شہنشاہ روم کے بحری بیڑے کو مار بھگایا تھا۔

کہنے کا مقصد یہ ہے کہ اگر امیر اسد الدین شیر کوہ صلاح الدین کو زبردستی اپنے ساتھ مصر نہ لے جاتا تو وہ صلاح الدین تو رہتا مگر سلطان صلاح الدین نہ بن پاتا۔ مرحوم سلطان نور الدین زنگی نے عظیم جرنل اور سپہ سالار کے بیٹے ناصر الدین محمد کو اس کے باپ کے انتقال پر حمص اور رحبہ کا علاقہ دے دیا تھا جسے سلطان صلاح الدین نے اپنے دور میں بحال رکھا تھا بلکہ اس میں اور علاقہ کا اضافہ کر دیا تھا۔

مگر یہ ناصر الدین محمد بن شیر کوہ ایسا احسان فراموش نکلا کہ حراں میں سلطان بیمار ہوئے اور ان کی بیماری نے طول کھینچا، ناصر الدین حراں سے حلب پہنچا اور وہاں کے امراء سے ملا۔ انہیں اس بات پر آمادہ کرنے کی کوشش کی کہ وہ لوگ سلطان کی وفات کے بعد نئے بادشاہ بنائے جانے کی حمایت کریں۔

سلطان کے ایک دوست اور وفادار امیر نے ناصر الدین کی باتیں سنیں تو اسے غصہ آ گیا۔ اس نے ناصر الدین کو ٹوک دیا۔

"امیر زادے، اللہ اللہ کیجیے۔ خدا ہمارے سلطان کو ہمارے سروں پر قیامت تک برقرار رکھے۔ آپ کو ان کی زندگی ہی میں اپنی بادشاہت کی فکر پڑ گئی۔"

ناصر الدین خجل ہو گیا۔ بولا۔ "میں ابھی کی بات نہیں کر رہا ہوں۔ میرا مطلب ہے کہ اگر خدا نخواستہ سلطان۔۔"

"چپ ہو جاؤ امیر زادے۔" امیر نے اس کی بات کاٹ دی۔ "آپ کو سلطان کی زندگی کی دعا مانگنا چاہیے۔"

"امیر محترم! میرا یہ مطلب نہیں کہ خدا نخواستہ۔۔"

"امیر زادے۔" وفادار امیر چیخ پڑا۔ "آپ سلطان کے لیے خدا نخواستہ کے الفاظ نہ استعمال کیجیے بلکہ دعا کیجیے کہ ان کا سایہ ہم پر ہمیشہ برقرار رہے۔"

"ٹھیک ہے، ٹھیک ہے، میں اپنے الفاظ واپس لیتا ہوں۔" ناصر الدین محمد بن شیر کوہ شرمندہ ہو گیا۔ "میری بھی دعا ہے کہ خدا تعالیٰ ہمارے سلطان کو ہمیشہ زندہ رکھے۔"

وفادار امیر خوش ہو گیا اور بولا۔ "اب آپ نے درست فرمایا، امیر زادے، ہمیں سلطان کی زندگی میں ان کے بارے میں کسی قسم کی بدگمانی نہ ہونا چاہیے اور نہ افواہوں پر توجہ دینا چاہیے۔ افواہ تو آخر افواہ ہی ہوتی ہے۔ اسے حقیقت سے دُور کا بھی واسطہ نہیں ہوتا۔"

ناصر الدین نے اس سلسلے میں حلب کے کچھ اور امیروں سے بھی گفتگو کی اور ان سے تعاون کی خواہش کا اظہار کیا۔ مگر انہوں نے اُسے مثبت جواب نہیں دیا۔ ناصر الدین شاید

ضدی طبیعت کا انسان تھا۔ کسی طرف سے بھی تعاون کا وعدہ نہ ہونے کے باوجود اس نے اپنی کوشش جاری رکھی۔ وہ حلب سے واپس حمص پہنچا۔ وہاں اُس نے اپنے امرائے تعاون کی اپیل کی۔ وہ اس کے امیر تھے پھر انہوں نے بہت بے دلی سے ناصر الدین کی حمایت پر آمادگی ظاہر کی۔

ناصر الدین نے محسوس کر لیا کہ اس کی کامیابی تقریباً ناممکن ہے لیکن ایک تو اس پر سلطان دمشق ہونے کا بھوت سوار ہو گیا تھا۔ دوسرے اُسے یہ بھی غلط فہمی تھی کہ وہ امیر اسد الدین شیر کوہ کا بیٹا ہے۔ لوگ اس کے نسبی تعلق کی بنا پر اس کا ضرور ساتھ دیں گے۔ پس اس نے اپنی تگ و دو کا سلسلہ دارالسلطنت دمشق تک پہنچایا اور وہاں کے امیروں کو خطوط لکھ کر ان کے تعاون کی کوشش کی۔

لیکن قدرت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ سلطان پر فدائیوں کی طرف سے دو قاتلانہ حملے ہو چکے تھے اور سلطان پھر بھی زندہ تھے (جو کسی عجوبے سے کم نہ تھا۔ اس لیے کہ ظالم فدائیوں کے خنجر کبھی خطا نہ کرتے تھے مگر سلطان صلاح الدین کے معاملہ میں قاتلوں کی تمام مہارت اکارت ہو گئی اور اس پر حملہ کرنے والے خود ہی مقتول ہو گئے۔ خدا نے صلاح الدین کو اس لیے نہیں پیدا کیا تھا کہ وہ بے دین فدائیوں کے ہاتھ سے قتل ہو یا بیماری اس کی زندگی کا خاتمہ کر دے۔ وہ تو ایک خاص مقصد کے لیے پیدا کیا گیا تھا۔ یہ مقصد صلاح الدین کے لاشعور سے شعور کی سطح تک آ گیا تھا اور اس مقصد کی تکمیل کے لیے وہ سولہ سترہ سال سے خود کو تیار کر رہا تھا۔

ناصر الدین کے اس رویے سے بعض امراء نے اُسے بُرا بھلا کہا۔ بعض مُسکرا کے رہ گئے اور کچھ لوگوں نے محض اس کا دل رکھنے کے لیے اُسے اپنی حمایت کا یقین دلایا مگر قدرت کی ستم ظریفی دیکھیے کہ سلطان عالی مقام کو خدا نے شفا عطا فرمائی۔ جس روز اس نے غسل صحت کیا، وہ بقر عید کی رات تھی۔ اسی رات کو ناصر الدین بادشاہی کا ارمان دل میں لیے ہوئے اس دُنیا سے رُخصت ہو گیا۔ ایسے ہی موقع کے لیے کہا گیا ہے کہ جسے اللہ رکھے اُسے کون چکھے۔

سلطان کو اگرچہ ناصر الدین کے ارمانوں اور ارادوں کا علم ہو گیا تھا لیکن اس مرد نیک نے اس کے بیٹے کے پاس حمص اور رحبہ کا علاقہ بحال رکھا اور وہ شیر کوہ ثانی کے نام سے سلطان کے زیر سایہ حمص کا حاکم مقرر ہوا۔

*

۱۱۸۲ء (۵۷۸ھ) میں مدینہ منورہ اور مکہ معظمہ پر مجوزہ حملے کا وہ واقعہ پیش آیا جس کے تصور سے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ شام کے فرنگی فرمانرواؤں میں والیٔ کرک ریجی نالڈ (پرنس ارطاط) مسلمانوں کا سب سے بڑا دشمن تھا۔ یہ خبیث طبیعت اور فتنہ پرور ذہن کا مالک تھا اور ہمیشہ اس دُھن میں لگا رہتا تھا کہ کس طرح عافیت پسند مسلمانوں کو دُکھ دے۔ مسلمان قافلوں پر حملہ کرنا اور مکہ معظمہ جانے والے حاجیوں کو تنگ کرنا اس کا من پسند مشغلہ تھا۔

قلعہ کرک کا ریجی نالڈ، شام کے صلیبیوں (فرنگیوں) کو مسلمانوں کے خلاف ہمیشہ بھڑکایا کرتا تھا۔ چنانچہ اس کی مسلم دشمنی اس حد کو پہنچ گئی کہ اس نے یہ فیصلہ کیا کہ وہ مردود اپنی قوت سے مسلمانوں کے خدا کا گھر یعنی خانہ کعبہ اور مسلمانوں کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا روضہ یعنی مدینہ منورہ کو (نعوذ باللہ) پیوند خاک کر دے گا تاکہ مسلم قوم ہمیشہ کے لیے ختم ہو جائے اور ان کی آن و بان شرم و خجالت کا پیکر اختیار کر لے۔

ریجی نالڈ نے اپنے اس ناپاک ارادے کی تکمیل کے لیے ایک سال پہلے بھی کوشش کی تھی لیکن بعض دشواریوں کی وجہ سے وہ کامیاب نہ ہو سکا تھا۔ پھر اگلے سال اس نے پھر ارادہ باندھا۔ مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ پر حملے کے لیے حملہ آور کو بحر قلزم سے گزرنا ضروری تھا اور اس سمندری سفر کے لیے ریجی نالڈ کو بحری بیڑے کی ضرورت تھی۔ قلعہ کرک اور بحر قلزم کے درمیان ریگستان واقع تھا جس پر عرب بدو قبیلے قابض تھے۔ اور انہیں ساتھ ملائے بغیر اس کا لشکر بحر قلزم تک نہیں پہنچ سکتا تھا۔

اس مشکل کو حل کرنے کے لیے اس دغا باز نے ایک طرف تو ایسے جہاز بنانے کا حکم دیا جن کے ٹکڑے الگ ہو سکتے تھے اور پھر ضرورت کے وقت انہیں جوڑ کر جہاز مکمل کیا جا سکتا تھا۔ چنانچہ کرک میں بڑی خاموشی کے ساتھ اس طرح کے جہاز بننے شروع ہو گئے۔ دوسری طرف ریجی نالڈ نے عرب بدوؤں کو رشوت دے کر اس امر پر راضی کر لیا کہ وہ نہ صرف ریجی نالڈ کی فوج کو ریگستان سے گزرنے دیں گے بلکہ لشکر کے سامان کو کرک سے ساحل قلزم تک پہنچانے میں اس کی مدد کریں گے۔

یہ دونوں کام اس قدر خاموشی سے ہوئے کہ مسلمانوں

کو اس کی کانوں کان خبر نہ ہو سکی۔ جب جہاز تیار ہو گئے تو ریجی نالڈ ان جہازوں کو الگ الگ حصوں میں تقسیم کر کے خلیج عقبہ میں لے آیا۔ اس کام میں اُسے بدوؤں کی مدد حاصل رہی...

پھر اس نے افریقی ساحل کی بندرگاہ ایلہ کی کچھ جہازوں سے ناکہ بندی کی اور باقی جہازوں کو جوڑ کے اُن پر نصرانی لشکر کو سوار کرایا اور بحرِ قلزم کی مصری بندرگاہ عیذاب کو تباہ کرنے روانہ کیا۔ یہ بحرِ قلزم میں اتنی بڑی اور جرأتمندانہ کارروائی تھی کہ چھپی نہ رہ سکی اور اس کی خبر قاہرہ پہنچ گئی۔

اس حیرت انگیز خبر سے قاہرہ اور اسکندریہ والے ششدر رہ گئے۔ ان کی حیرانگی کو ہسپانوی عرب ابن جبیر کے الفاظ میں سُنیئے۔ ابن جبیر ان دنوں اسکندریہ میں موجود تھا۔ وہ لکھتا ہے۔

"۱۱۸۳ء میں ریجی نالڈ کی مہم کے کچھ قیدی اسکندریہ لائے گئے۔ ان قیدیوں کو اونٹوں پر بٹھایا گیا تھا۔ یعنی اُن کے مُنہ اونٹوں کی دُم کی طرف تھے اور انہیں رسیوں سے باندھا گیا تھا۔ مکّہ معظمہ اور مدینہ منورہ پر نصرانی حملہ کی خبر سے مصریوں میں جو اضطراب پیدا ہوا تھا۔ اس کی مثال تاریخ میں نہیں ملتی۔ لوگ ایک دوسرے کو ٹکڑوں میں واقعات سُناتے تھے۔ اور شدتِ جذبات سے اُن کے جسم کانپتے تھے۔

ایک مصری نے دوسرے کو بتایا: "میں نے سُنا ہے کہ ملعون نصرانیوں نے ریگستان کے بدوؤں کو رشوت دے کر اس بات پر رضامند کیا کہ وہ اُن کے جہازوں کو بحرِ قلزم تک پہنچنے کے لیے راستہ دے دیں" دوسرے نے انکشاف کیا: "دراصل وہ جہاز نہیں تھے بلکہ جہازوں کے مختلف ٹکڑے تھے... جنہیں بدوؤں کی مدد سے ریگستان پار کر کے بحرِ قلزم تک لایا گیا تھا اور وہاں انہیں جوڑ کے جہاز تیار کیے گئے تھے۔"

تیسرے نے ایک اور خبر سُنائی: "میں نے تو یہ بھی سُنا ہے کہ ظالم نصرانیوں نے مسلمانوں کے سولہ جہازوں میں آگ لگا کر انہیں سمندر میں غرق کر دیا تھا۔"

وہ خاموش ہوا تو کسی اور نے ایک اور انکشاف کیا۔ "ان کافروں نے جدّہ کے قریب حاجیوں کا ایک جہاز بھی پکڑ لیا تھا۔ عیذاب (بندرگاہ) پر بھی اُترے تھے اور کوس سے آنے والے ایک مسلمان قافلہ کو گرفتار کر کے اُن کا قتلِ عام کیا تھا

انہوں نے یمن سے آنے والے اُن دو جہازوں پر قبضہ کر [لیا] تھا جو خانۂ کعبہ کے لیے سامان لا رہے تھے۔"

اور آخر میں ایک بوڑھے مصری نے سرد آہ بھر کر کہا: "نصرانی بادشاہ اس وجہ سے ملک عرب گیا تھا کہ مدینہ منورہ [کو] لُوٹے اور تاراج کرے پھر روضۂ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ و[سلم] سے حضور پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے جسمِ اطہر کو باہر نکا[لے]"

پھر اس نے کانوں کو ہاتھ لگائے اور بولا: "کیا اس سے [پہلے] کسی نے ایسی ہیبت ناک خبر سُنی۔ اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ ا[س] نے امیر البحر لُولُو کو وقت پر بھیج دیا اور اس کے تیز رفتار جہاز[وں] نے کافروں کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیے۔"

یہ تو ابن جبیر کا تجزیہ ہے۔ تاریخ میں اس کی تفصیل [اس] طرح بیان کی گئی ہے کہ ریجی نالڈ نے جزیرہ نمائے عرب پر [فوج] کشی کا قصد اس لیے کیا تھا کہ مدینہ منورہ میں روضۂ رسول [صلی اللہ] علیہ وآلہ وسلم منہدم کر کے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم [کے] جسمِ اطہر کی بے حرمتی کرے اور خانۂ کعبہ کو زمین بوس کر دے۔ اس کے لیے اس نے ایسے جہاز تیار کرائے جن کے ٹکڑے [ہو] سکتے تھے۔ ان ٹکڑوں کو وہ کرک سے خلیج عقبہ لے گیا۔ و[ہاں] اس نے ٹکڑوں کو جوڑ کے بحری بیڑا تیار کیا اور عیذاب [پر] حملہ۔ اس نے چند جہازوں کے ذریعے ایلہ کا راستہ بھی [بند کیا]۔

اس کی اطلاع جب مسلمانوں کو پہنچی تو ان کا بحری [بیڑا] فوراً حرکت میں آگیا۔ اس بیڑے کا امیر البحر لُولُو تھا۔ امیر [البحر] لُولُو نے پہلے ایلہ کا بحری راستہ کھولا۔ پھر وہ اپنے بیڑے [کو] "الحورا" تک لے گیا جو بحرِ قلزم کی ایک چھوٹی بندرگاہ [تھی]۔ نصرانی بادشاہ نے اسی بندرگاہ سے مدینہ منورہ پر حمل[ے کا] منصوبہ بنایا تھا۔ نصرانیوں نے مسلمانوں کے بحری بیڑے [کو] آتے دیکھا تو جہازوں سے اُتر کر پہاڑوں اور جھاڑیوں [میں] جا چھپے۔

مسلمان بھی ساحل پر پہنچ کے جہازوں سے اُتر[ے]۔ لُولُو نے بدوؤں سے گھوڑے خریدنے کا حکم دیا۔ گھوڑ[ے] جمع ہوئے تو لُولُو نے فوجیوں کو گھوڑوں پر سوار کر دیا اور د[شمن] کے تعاقب میں روانہ ہوا۔ نصرانی غاروں اور باغوں میں چھپے ہوئے تھے۔ مسلمانوں نے ایک ایک کو ڈھونڈ نکالا۔ [ان] میں سے بیشتر کو قتل کر دیا گیا۔ باقی اسکندریہ بھیج دیے گئے۔ [یہ] وہی قیدی تھے، جنہیں ابن جبیر نے اسکندریہ میں دیکھا [تھا]۔

رانی بادشاہ یعنی فرمانروائے کرک اس دارو گیر میں اپنی
بچا کر نکل گیا۔

ز بھی ٹالڈ فرمانروائے کرک کو اپنی جسارت کی کافی سزا مل گئی تھی لیکن یہ واقعہ ایسا نہ تھا جسے سلطان صلاح الدین نداز کر دیتا۔ سلطان نے فیصلہ کیا کہ وہ نصرانیوں کو اس باکی کی ضرور سزا دے گا۔ اس نے حلب کے قیام کے دوران یوں کو گھر جانے کی اجازت دے دی تھی لیکن اُسے اُن بہت جلد ضرورت پڑ گئی اور انہیں واپس بلا لیا گیا۔ اس کے وہ سلطان نے اپنے زیر تسلط تمام علاقوں کے حاکموں کو فوج لے کر دمشق پہنچنے کا حکم دیا۔

پھر آغاز سال میں سلطان اپنا لشکر لے کر ریگستان کے تے جنوب کی طرف روانہ ہوا۔ اسلامی لشکر نے فوراً سے ہو کر دریائے اُردن عبور کیا اور غور کے زرخیز علاقہ کو تاراج ہوا بیسان میں داخل ہوا۔ بیسان والے اسلامی لشکر کی خبر سن کر ہی شہر چھوڑ کر بھاگ گئے تھے۔ وہاں سے سلطان وادی یل پہنچا پھر گلبوا کے دامن میں بیر جالوت کے قریب خیمہ زن ۔ اس علاقہ میں سلطان کے ایک گشتی دستہ سے فرینکس مرانی) کی اس فوجی جماعت سے مڈبھیڑ ہو گئی جو کرک سے رویہ کی مرکزی فوج کے پاس جا رہی تھی۔ مسلمانوں نے فرینکس شکست دی۔ اس لڑائی میں مسلمانوں کا صرف ایک سوار شہید ہوا۔

اس شکست کی خبر جب گائی لگنن کو جو بالڈون کی ادی کے زمانہ میں کمان سنبھالے ہوئے تھا، پہنچی تو وہ اپنی ج کے ساتھ مسلمانوں سے مقابلہ کے لیے چلا۔ اس نے لغنارت پہاڑیاں پار کیں اور ایسڈرالن کے میدان میں آیا پھر وہ ولا کی طرف بڑھا جہاں سلطان صلاح الدین کے لشکر سے ں کا مقابلہ ہوا۔

آرچر کا بیان ہے کہ: "بڑے بوڑھوں کا کہنا ہے کہ طین میں اس سے زیادہ صلیبی کبھی جمع نہ ہوئے تھے۔ ایک ار تین سو نائیٹس اور پندرہ ہزار سے زیادہ مسلح سپاہی تھے۔ ی یورپ کے بڑے بڑے حکمران بھی شامل تھے۔ ہنری ن کا ڈیوک ہلیفی کارالف، اس کے علاوہ شام کے بڑے مسیحی رئیس گائی، رینجی ٹالڈ، بالڈون، عیلین کابلیاں ریہ کا والٹر اور کونتی جوسلین وغیرہ تھے۔"

نصرانیوں نے اس تیاری جنگ کے پیش نظر سلطان صلاح الدین ں عین جالوت سے الفولا (العفوکر) پہنچا۔ اس مقام پر سلطان کے پانچ سو سواروں نے جو ہراول دستے میں شامل تھے نصرانی لشکر میں طوفان برپا کر دیا۔ ایک دستے کا دشمن کے پورے لشکر سے بھڑ جانا ہی ایک حیرت انگیز بات تھی۔ ظاہر ہے نصرانی لشکر کے مقابلہ میں یہ سوار صرف دادِ شجاعت ہی دے سکتے تھے۔ انہوں نے کمال شجاعت کا مظاہرہ کیا مگر دشمن کی نیزہ بردار صفوں میں نہ گھس سکے۔ آخر دونوں لشکروں نے ایک دوسرے کے مقابل تو بانیا اور جالوت پر اپنے لشکر اُتارے یہ دونوں مقامات ایک دوسرے سے صرف ایک میل کے فاصلہ پر تھے۔

دونوں لشکر پانچ دن تک ایک دوسرے کے مقابل پڑے رہے۔ منصوریہ سے آنے والا یہ نصرانی لشکر بڑے طمطراق سے آیا تھا اور خیال یہ تھا کہ وہ آتے ہی سلطانی لشکر پر حملہ آور ہو گا لیکن پتا نہیں وہ آپس میں کیا کھچڑی پکاتے رہے۔ سلطان نے اس وقفہ سے پورا فائدہ اٹھایا اور سطح مرتفع پر قبضہ کر لیا... پھر سلطان نے دشمن کے گرد لشکر پھیلا کر اس کے فرار کا راستہ بند کر دیا۔ اس دوران اطالوی سوداگر وینس اور لمبارڈی سے آنے والوں نے نصرانی لشکر میں اضافہ کر دیا۔ کیونکہ یہ سوداگر اپنے جہاز چھوڑ کر صلیبی جنگ میں شرکت کے لیے وہاں پہنچ گئے تھے۔

لشکر کی اس کثرت کے باوجود نصرانی دبکے بیٹھے رہے۔ سلطان نے انہیں میدان میں نکالنے کی ہر ممکن کوشش کی تھی لیکن نصرانی مقابلہ پر نہ نکلے۔ رسد کا راستہ بند ہو جانے سے نصرانی لشکر میں قحط سا پیدا ہو گیا۔ مدد کو آنے والے ان سوداگروں نے اور زیادہ مصیبت کھڑی کر دی۔ یہ سوداگر پُرجوش تو تھے لیکن نہ انہیں ہتھیار باندھنے کی عادت تھی اور نہ وہ تکلیف برداشت کر سکتے تھے۔ وہ بہت جلد اس محاصرے سے تنگ آ گئے۔ غذائی صورتِ حال نے انہیں اور زیادہ بدحواس کر دیا۔

اکتوبر کا مہینہ آ گیا تھا اور برسات کا موسم شروع ہونے والا تھا۔ واضح رہے کہ یہ بحر روم کی آب و ہوا کا علاقہ تھا اور اس آب و ہوا کی یہ خاصیت ہے کہ بارش موسم سرما میں ہوتی ہے سلطان جنگ کا فیصلہ بارش سے پہلے چاہتا تھا لیکن دشمن کسی صورت میدان میں آنے پر تیار نہ تھا۔ کہتے ہیں کہ اگر نیت صاف ہو اور ارادہ میں خلوص تو جنگ کے موقعوں پر اکثر تائیدِ غیبی حاصل ہوتی ہے۔ مسلمانوں کو تائید غیبی کا پہلے بھی تجربہ

ہو چکا تھا۔

پس ایسا ہوا کہ نصرانی لشکر میں شامل ہونے والوں نے قحط اور محاصرے سے گھبرا کر بھاگنا شروع کر دیا۔ سلطان نے انہیں باہر نکالنے کے لیے ایک طرف کا راستہ کھول دیا تھا جب بھگدڑ مچی تو کیا سوداگر اور کیا لشکری سب ہی بھاگنے لگے۔ دوسری طرف مسلمان اس راستہ کو دُور تک گھیرے ہوئے تھے۔ چنانچہ سلطان کے تیر اندازوں نے ان بھاگنے والوں کا تعاقب کیا۔ نصرانی بھاگتے رہے اور تیر ان پر برستے رہے۔ اس طرح یہ بھگوڑے بڑے شرمندہ اور خجل ہو کر صفوریہ واپس آ گئے۔ یہ وہی مقام تھا جہاں سے ایک ہفتہ پہلے وہ بڑی شان سے صفیں باندھ کر مسلمانوں کو تباہ کرنے روانہ ہوئے تھے۔

اس مہم سے فارغ ہونے کے بعد سلطان نے کرک کا رُخ کیا۔ ریجی نالڈ حاکم کرک مسلمانوں کا سب سے بڑا دشمن تھا۔ وہ فریبی اور دغاباز بھی تھا۔ سلطان کرک کو تباہ کر کے اس مسلم دشمن کو ختم کرنا چاہتا تھا۔ ایک روایت کے مطابق کرک پر حملے کے وقت سلطان کے ساتھ مصری فوج بھی تھی جس کی کمان سلطان کے بھائی ملک العادل کے ہاتھ میں تھی۔ قلعہ کرک کی فصیل بہت مضبوط تھی۔ اس کے گرد ایک بہت گہری خندق بھی تھی۔ سلطان نے سات منجنیقوں سے قلعہ پر سنگ باری شروع کرائی مگر کوئی اثر نہ ہوا۔ اس دوران جاسوسوں نے اطلاع دی کہ دشمن کے لیے فوجی کمک آ رہی ہے۔ چنانچہ سلطان محاصرہ اُٹھا کر دمشق واپس ہو گیا۔

چند ماہ بعد سلطان نے کرک پر دوبارہ فوج کشی کی۔ سلطان کا مزاج بہت برہم تھا۔ جب تک کرک پر قبضہ نہ ہوتا، سلطان کو چین نہیں آ سکتا تھا۔ اس طرح کرک کے خلاف چار مرتبہ فوج کشی کی گئی مگر کامیابی نہ ہو سکی۔ سلطان ہر بار ناکام ہونے کے بعد پہلے سے زیادہ عزم کے ساتھ حملہ کرتا لیکن سنگی فصیل پر منجنیقوں کی سنگ باری کا کوئی اثر نہ ہوتا اور سلطان کو کسی نہ کسی وجہ سے محاصرہ اُٹھا کر دمشق واپس جانا پڑتا۔

شیخ سعدیؒ نے کسی جگہ ایک شعر میں کہا ہے کہ ایک مرتبہ دمشق میں ایسا زبردست قحط پڑا کہ لوگ عشق کرنا بھی بھول گئے۔ جنگ کے زمانہ میں بھی کچھ اسی طرح کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ لوگ سہمے سہمے اور ڈرے ڈرے رہتے ہیں۔ سلطان صلاح الدین کی زندگی کا یہ دور ایک مسلسل جنگ کا دور تھا اور لوگوں کو سوائے جنگی تیاریوں کے عشق عاشقی یا شادی بیاہ کا خیال ہی نہ آتا تھا لیکن نصرانیوں کی طرف حالات اس کے برعکس تھے۔

پس کرک پر پانچویں بار فوج کشی کے دوران کرک میں ایک عظیم شادی کا جشن منایا جا رہا تھا۔ شاہ یروشلم کی سوتیلی بہن شہزادی ازابیلا کی شادی ہمفرے آف تورون چہارم کے ساتھ ہو رہی تھی۔ پورے شہر میں چراغاں تھا اور خوشیاں منائی جا رہی تھیں۔ لوگ رنگ رلیوں میں مشغول تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے قلعہ اور شہر کرک والوں کو جنگ یا محاصرہ کی کوئی فکر نہ تھی۔ اس دَور میں قلعہ اور شہر الگ الگ ہوتے تھے اور دونوں کے گرد سنگی فصیلیں ہوتی تھیں۔

سلطان لشکر لے کر پہنچا تو اس نے شہر میں جشنِ بہاراں محسوس کیا۔ شہر اور قلعہ کی بُرجیاں جگمگا رہی تھیں۔ فصیلوں پر بھی چراغاں تھا اور موسیقی کی تانیں فضا میں بکھری ہوئی تھیں۔ سلطان کو ان کی اس جرأت پر غصہ آ گیا ہو گا۔ اس نے فوراً حملے کا حکم دے دیا۔ مسلمان لشکری بھوکے شیروں کی طرح دشمن پر جھپٹ پڑے۔ نصرانیوں کی پہلی دفاعی لائن یعنی شہری فصیل سے تیروں کی بارش شروع ہو گئی مگر مسلمان یلغار کرتے ہوئے فصیل کے دروازے تک پہنچے اور اتنا شدید حملہ کیا کہ صدر دروازہ ٹوٹ گیا اور مسلمان شہر میں گھس گئے۔

اس طرح سلطان کا شہر پر قبضہ ہو گیا۔ حاکم کرک ریجی نالڈ اور دُولہا دُلہن مع باراتیوں اور بچے کھچے فوجیوں کے قلعہ میں منتقل ہو گئے اور وہاں انہوں نے اور دھوم دھام سے شادی کا جشن منانا شروع کیا۔ اس طرح ان کی رنگ رلیوں میں کوئی فرق نہ آیا۔ سلطان کے لیے قلعہ پہلے کی طرح ناقابلِ تسخیر نظر آ رہا تھا۔ صبح کے وقت قلعہ کا دروازہ کھلا اور سفید پرچم بلند کیے سوار نکلنا شروع ہوئے۔ سواروں کے پیچھے غلاموں کی ایک لمبی قطار تھی جن کے سروں پر سامان لدا معلوم ہوتا تھا۔

جنگی دستور کے مطابق آنے والوں کا استقبال کیا گیا۔ سفید پرچم امن اور صلح کی نشانی سمجھا جاتا تھا اس لیے بڑی خوشی سے انہیں خوش آمدید کہا گیا۔ امن کا قاصد ریجی نالڈ کا نائب تھا۔ سلطان کی طرف سے ملک العادل نے اس کا استقبال کیا۔ ریجی نالڈ کا نائب گھوڑے سے اُترا۔ ملک العادل نے آگے بڑھ کے اس سے مصافحہ کیا۔

"میں سلطانِ دمشق کی طرف سے امن کے وفد کو خوش آمدید کہتا

...تا ہوں" ملک العادل نے وفد کے قائد سے ہاتھ ملاتے
...ئے کہا۔
وفد کے قائد نے مسکرا کے پوچھا "کیا میں پوچھ سکتا
...ل کر میں کس مسلم سردار سے مخاطب ہوں؟"
"میں سلطان معظم کا بھائی ملک العادل ہوں اور آپ
...یا نام ہے؟" ملک العادل نے اپنا تعارف کرایا اور اس
...متعارف ہونے کی کوشش کی۔
"میں فرمانروائے کرک کا نائب ہوں اور سلطان کو
...ہزادی ازابیلا اور ہمفرے آف تورون چہارم کی شادی
...شرکت کی استدعا کرنے حاضر ہوا ہوں" نائب نے
...انت سے جواب دیا۔
ملک العادل نے کہا "میں آپ کو سلطان کے حضور
...ش کیے دیتا ہوں۔ آپ ان سے گفتگو کر لیجیے"
"ٹھیک ہے" نائب نے اثبات میں سر ہلا دیا "اور
...ں میں فرمانروائے کرک کی طرف سے مسلم سرداروں کے
...ے کھانے اور شراب کا تحفہ لے کر آیا ہوں۔ اسے قبول
...یا جائے"
"یہ بات بھی سلطان کی عرض کیجیے گا" اور ملک العادل
...ے ساتھ لے کر چلا۔ سلطان کو پہلے اطلاع ہو چکی تھی کہ قلعہ
...حاکم کا وفد آ رہا ہے۔ سلطان اپنے خیمہ میں بیٹھا تھا جب
...رمانروائے کرک کا نائب اور سلطان کا بھائی ملک العادل
...ن کے حضور پہنچے۔ ملک العادل نے ناظم وفد کا تعارف کرایا۔
"سلطان معظم! حاکم کرک کے نائب حضور سلطانی میں حاضر
...انداز کچھ عرض کرنا چاہتے ہیں" اس سے پہلے ناظم وفد سلطان
...سلام پیش کر چکا تھا اور سلطان نے ہاتھ کے اشارے سے
...ں کا سلام قبول کر لیا تھا۔
"اجازت ہے" سلطان نے شاہانہ انداز میں جواب دیا۔
ناظم وفد نے عرض کیا "اے سلطان دمشق۔ میرے آقا
...س ارناط ریجی نالڈ نے آپ کو دوستی کا پیام دیا ہے اور
...خواہش کی ہے کہ سلطان دمشق اپنے سرداروں کے ساتھ اگر
...شاہی خاندان کی شادی کے جشن میں شرکت فرمائیں تو ان کی
...ن نوازش ہو گی؟"
"شاہی خاندان کے کس فرد کی شادی ہو رہی ہے اے
...ظم وفد؟" سلطان دمشق نے استفسار کیا۔
"عالی مقام سلطان" ناظم نے جواب دیا "شاہ کرک
کی سوتیلی بہن شہزادی ازابیلا کی شادی ہمفرے آف تورون
کے ساتھ ہو رہی ہے۔ یہ چراغاں اور جشن اس سلسلے میں
منعقد ہوا ہے"
سلطان نے بڑی متانت سے کہا "افسوس کہ ہم اس
وقت میدان جنگ میں موجود ہیں' ورنہ شاہی جوڑے کے لیے
شایان شان تحائف بھیجے جاتے' پھر بھی ہماری طرف سے
حاکم قلعہ کا شکریہ ادا کیا جائے۔ یہاں شاہی جوڑے کی
ضیافت کا تو اہتمام نہیں کیا جا سکتا پھر بھی تمام باراتیوں
کا آج رات کا کھانا ہماری خیمہ گاہ سے بھیجا جائے گا ہمیں
یہ اندازہ نہیں اور ہم ناظم سے اس بارے میں سوال بھی نہیں
کریں گے کہ شادی میں کتنے باراتی شریک ہو رہے ہیں۔
بس ہم اپنے اندازے کے تحت دس ہزار اشخاص کا کھانا
روانہ کریں گے جسے قلعہ کے کسی بھی دروازے پر حاصل کیا
جا سکتا ہے"
"میں اپنے آقا اور شاہی جوڑے کی طرف سلطان کی
اس پُر خلوص عنایت کا شکریہ ادا کرتا ہوں" قائد اس
سلطان کے رُعب سے گھبرا گیا تھا اور اس کی آواز مشکل
سے نکل رہی تھی "میں اپنے آقا تک سلطان کا پیغام پہنچا
دوں گا مگر اس سے پہلے میں یہ عرض کر دوں گا کہ میرے آقا کو
پہلے سے یہ علم تھا کہ اس شادی میں آپ شرکت نہیں کریں
گے اس لیے میرے آقا نے آپ کے لشکر کے لیے کھانا اور
بیش قیمت شراب کی ایک ہزار بوتلیں میرے ساتھ بھیجی
ہیں امید ہے کہ سلطان اسے قبول کرتے ہوئے شکریہ کا
موقع عطا کریں گے"
سلطان اس پیشکش پر ذرا دیر سوچتا رہا پھر بولا "کھانا
قبول کرنے میں ہمیں کوئی عذر نہیں لیکن جہاں تک شراب
کا سوال ہے تو حاکم قلعہ کو معلوم ہونا چاہیے کہ ہم مسلمان
ہیں اور ہمارے مذہب میں نہ صرف شراب حرام ہے بلکہ
اسے ام الخبائث (برائیوں کی ماں) کہا گیا ہے۔ ہم اسے
قبول کرنے سے قطعی معذور ہیں۔ ناظم وفد اسے اپنے ساتھ
واپس لے جا سکتے ہیں"
نصرانیوں میں شراب کا استعمال لوازمات زندگی کا ایک
اہم جزو ہے۔ قائد وفد کو سلطان کے اس انکار سے تعجب
ہوا' مگر وہ خاموش رہا اور واپس جانے کے لیے کھڑا ہو گیا۔
سلطان نے اس سے دریافت کیا "شادی کی محفل

قلعہ کے کس حصّہ میں منعقد ہو رہی ہے۔ تم جانتے ہو کہ جنگ کا زمانہ ہے۔ ہم نہیں چاہتے کہ لاعلمی میں کوئی ایسی بات ہو جائے جس سے باراتیوں اور شاہی جوڑے کو کوئی نقصان پہنچے۔"

وفد کا ناظم سلطان کی اس بات سے بہت متاثر ہوا۔

"میں سلطان کا ذاتی طور پر شکرگزار ہوں کہ انہیں ہمارے مہمانوں کا اس قدر خیال ہے۔ سلطان کی اطلاع کے لیے عرض کروں گا کہ شادی کی محفل صدر دروازے کے مشرق کی جانب ایک بڑے ہال میں منعقد ہو گی۔ اس حصّہ کی شناخت یہ ہے کہ اس کے اوپر قلعہ کے دو بڑے برجوں میں سے دائیں جانب کا برج واقع ہے۔"

"ٹھیک ہے ہم سمجھ گئے۔" سلطان نے سر کو اثبات میں جنبش دی۔ کہتے ہیں کہ شاہی جوڑے کی شادی کے سلسلے میں ایک ہفتہ تک قلعہ میں جشن منایا گیا... مگر مشرقی برج کی طرف نہ تو منجنیق سے کوئی پتھر پھینکا گیا اور نہ تیراندازوں نے فصیل کے اس حصّے کو نشانہ بنایا گیا۔ سلطان نے اس کے لیے سخت تاکید کی تھی۔ اس تمام عرصہ میں جنگ جاری رہی اور تو منجنیقیں سوائے مخصوص حصّہ کے باقی قلعہ پر سنگباری کرتی رہیں۔ اس سنگباری نے فصیل میں شگاف ڈال دیا... لیکن نصرانیوں نے اس قدر مدافعت کی کہ سلطانی لشکر فصیل کے اس شگاف سے کوئی فائدہ نہ اٹھا سکا

فصیل کے گرد گہری خندق کو بھی بڑی حد تک پاٹ دیا گیا مگر پھر بھی اسلامی لشکر کے سپاہی فصیل تک نہ پہنچ سکے کیونکہ فصیل سے اس قدر تیر برس رہے تھے کہ خندق پار کرنے والا لقمۂ اجل بن جاتا تھا۔ اس اثنا میں قلعہ والوں کے قاصد شاہ یروشلم بالڈون تک پہنچ گئے اور اس نے فوراً مدد کے لیے ایک بھاری لشکر روانہ کر دیا... سلطان کو تاخیر پسند نہ تھی جب اُسے معلوم ہوا کہ یروشلم سے امدادی لشکر روانہ ہو چکا ہے تو وہ محاصرہ اُٹھا کر دمشق واپس آ گیا۔

اس دوران شاہ ایمالرک بالڈون کا انتقال ہو چکا تھا۔ اور اس کے کمسن بیٹے بالڈون دوم کو بادشاہ بنا دیا گیا تھا اور ریمنڈ آف تریپولس (طرابلس) کو اس کا ولی مقرر کیا گیا تھا۔ ریمنڈ اور لوسگنن ایک دوسرے کے شدید مخالف تھے مگر دونوں اس بات پر متفق تھے کہ اس وقت جنگ وجدل کا موقع نہیں اس لیے فی الحال سلطان دمشق سے صلح کر لی جائے

اور مناسب وقت کا انتظار کیا جائے لیکن جنگجو ٹمپلرز اور ہاسپٹلرز اس رائے سے متفق نہ تھے مگر صلح پسندوں کا پلہ بھاری [illegible] اور بالڈوم کے ولی کے مشورہ سے سلطان کے ساتھ آئندہ چار سال کے لیے صلح ہو گئی۔

ریمنڈ آف طرابلس کا یہ معاہدہ مدافعانہ اور جارحانہ تھا۔ سلطان صلاح الدین نے اُسے تخت و تاج حاصل کرنے کی کوششوں میں مدد دینے کا وعدہ کیا تھا اور ریمنڈ نے اس کے صلہ میں طرابلس میں قید تمام مسلمانوں کو رہا کر دیا۔ اس کے علاوہ دمشق کے قحط کے دوران اس نے بڑی فراخدلی سے غلہ بھیجا تھا پھر بھی اس دوستی کی بنیادوں میں خلوص بہت کم تھا اس لیے کہ یہ تو ان دو مسلح سپاہیوں کی نیند کے مانند تھا جو عالمِ خواب میں بھی جنگی بگل سن کر چونک پڑتے ہیں اور ایسی صلح لمحوں میں شکست و ریخت سے دوچار ہو جاتی ہے۔

دوسری طرف صلیبی جنگوں کے خواہاں یورپ کے دول یورپ میں جنگی جنون پیدا کرنے اور آگ بھڑکانے میں مصروف تھے۔ نصرانی بطریق ہرکلیس فوجی بھرتی کے لیے یورپ کے ملکوں ملکوں میں گھوم رہا تھا جبکہ انگریز نائٹس کو شیو فیس سے کوہ پائرنیز تک صلیبیں بلند کیے کھڑے تھے۔ یہ دونوں گروہ مسلمانوں کے خلاف ہتھیار اُٹھانے کے لیے بیتاب ہو رہے تھے۔ اگرچہ کسی جگہ بھی صلیبی جنگ نہیں ہو رہی تھی لیکن ان تیاریوں سے ظاہر ہوتا تھا کہ آئندہ جلد ہی صلیبی جنگ کی بھٹی دہک اُٹھے گی۔

سلطان صلاح الدین خود بھی اس صلح کو قطعی عارضی سمجھتا تھا۔ اُسے یورپ سے اطلاع مل رہی تھی کہ بطریق لوگوں میں جنگی جنون پیدا کر کے انہیں مذہبی جنگ (صلیبی جنگ) کے لیے فوجی بھرتی کی کوشش کر رہا ہے اور انگریز جنگجوؤں نے پورے یورپ میں صلیبیں اٹھا رکھی ہیں۔ ان اطلاعات کے باوجود سلطان اپنی سلطنت کے حالات درست کرنے میں لگ گیا تھا۔ سلطان صلاح الدین نے دمشق کو اپنا دارالسلطنت مقرر کیا تھا اور اس شہر اور اس قلعہ کو مضبوط سے مضبوط تر بنا رہا تھا۔ دمشق زمانہ ماقبل تاریخ میں بھی ایک اہم شہر تھا۔ اس شہر کو مشرق کی تمام ریاستوں کے صدر مقام ہونے کا فخر حاصل رہا اور تمام تر قدیم قوموں کے اتصال کا مرکزی مقام بھی یہی دمشق

ا۔ مصر، ایران اور بھارت جانے والا سامان اس شہر کی ڑیوں سے ہوکر گزرتا تھا۔ زمانۂ قدیم سے سوداگروں کے لے دریائے فرات کے ذریعہ یا حمص اور حلب کے راستے نے بیش قیمت سامان کی گانٹھیں بحرِ روم کی بندرگاہوں ر مصر و عرب کو لے جاتے تھے۔ اس طرح بدوؤں کے نہ بدوش قبیلے اپنے مویشیوں کو موسمِ بہار اور موسمِ سرما ں دمشق لاتے اور عرب اور دریائے فرات کے درمیانی قوں میں کنوؤں کے سلسلے کے ساتھ گھوما کرتے۔

دمشق کی خوشحالی اس کے محلِ وقوع اور قدرتی برتری وجہ سے تھی۔ دمشق کو یونانی "حسین ترین" اور عربوں میں شہر "عروسِ مشرق" اور "باغِ جہاں" کے نام سے مشہور ا۔ سلطان صلاح الدین کے دورِ حکومت میں بھی دمشق میں ندرنگ و نسل کے لوگ آباد تھے۔ شہر مختلف محلوں میں تقسیم ا۔ ہر محلے کے گرد چہار دیواری ہوتی تھی جس کے دروازے ت ہوتے ہی بند کر لیے جاتے تھے۔ گلیوں، کوچوں اور اروں میں سایہ دار درخت تھے جن کا سایا مکان کے ے منقش کمروں کی دیواروں پر لہرایا کرتا تھا۔ اسی شہر شق میں وہ مسجد امیہ ہے جس کے صحن میں کھڑے ہوکر وائی م حضرت امیر معاویہؓ نے حضرت عثمان غنیؓ کا خون آلود کانپتے اور لرزتے ہاتھوں سے لوگوں کو دکھایا تھا اور مسجد امیہ کے ممبر پر زوجہ عثمانؓ نائلہ کی کٹی ہوئی لیاں سجائی گئی تھیں۔

سلطان صلاح الدین ایوبی کے دورِ حکومت میں پانوی عرب ابن جبیر دمشق آیا تھا تو دمشق کی بعض عجیب و ب چیزوں کا ذکر کیا ہے۔ اس نے لکھا ہے کہ مسجد امیہ ایک دیوار گیر گھڑی تھی جس میں پیتل کے عقاب گھنٹے تے تھے۔ ہر گھنٹے کے بعد پیتل کا ایک دروازہ بند ہو جاتا ۔ رات کے وقت روشنی کے ذریعے وقت ظاہر کیا جاتا تھا۔ ں کا گھٹتے ہوئے پانی سے اندازہ کیا جاتا تھا۔ اس نے کے بیس جامعہ (کالج) خیراتی شفاخانوں اور خانقاہوں ی تفصیلی ذکر کیا ہے۔

ابن جبیر لکھتا ہے کہ سلطان صلاح الدین قلعہ میں تا ہے۔ قلعہ شہر کے جدید حصہ میں بالکل الگ تھلگ اقع ہے۔ قلعے کے اندر ہی سلطان کی مسجد ہے۔ قلعے کے لے شہر سے باہر مغرب کی طرف وہ میدان بھی جو اپنی

سرسبزی اور خوبصورتی میں ریشمی زربفت کے تھان معلوم ہوتے ہیں۔ دونوں میدانوں کے درمیان ندی بہتی ہے۔ میدان کے درمیان خور کے درختوں کا ایک چھوٹا سا جنگل ہے۔ سلطان چوگان بازی اور گھوڑے دوڑانے اسی میں جاتے ہیں۔ ہر شام تیر اندازی کی مشق کرنے، چوگان اور گھڑ سواری کے لیے شہزادے بھی یہاں آتے ہیں۔

ابن جبیر لکھتا ہے کہ سلطان اپنی رعایا کے حقیر ترین مزدور کی طرح محنت و مشقت کرتا تھا۔ سلطان صلاح الدین ہفتے میں دو دن ایوانِ عام میں بیٹھتا اور رعایا کی شکایات سنتا اور انہیں فوری انصاف مہیا کرتا تھا۔ اس کا بہت سا وقت مراسلات کے پڑھنے اور جواب دینے میں گزرتا تھا۔ اگرچہ... قاضی فاضل عمادالدین اور بہاءالدین سلطان کے مستعد اور بے مثال مشیر اور ناظم تھے لیکن مراسلہ نگاری میں خود خاص حصہ لیتا تھا۔

صلاح الدین نے شجاعت و بصیرت اور عدل و انصاف کا نظام اپنے آقا سلطان نورالدین زنگی سے سیکھا تھا لیکن باوجود اس قدر منصف اور عادل ہونے کے وہ عدل کے معاملہ میں اپنے آقا کے مرتبہ کو نہیں پہنچتا تھا۔ مرحوم سلطان نورالدین زنگی کے عدل کے بارے میں ایک واقعہ بہت مشہور ہے اور اس واقعہ کو سلطان صلاح الدین نے خود اپنے امیروں کی اصلاح کے لیے ان کے سامنے کئی بار بیان کیا تھا۔ وہ واقعہ کچھ اس طرح ہے۔

سلطان نورالدین زنگی نے جب دمشق کو دارالسلطنت بنایا تو اس کے امرا نے بھی وہیں اپنے محلات تعمیر کرائے۔ اور املاک اور جائدادیں حاصل کی تھیں۔ یہ امراء گردوسی زمینداروں پر بہت ظلم اور زیادتی کرتے تھے اور یہ شکایتیں سلطان کے قاضی کمال الدین کے پاس پہنچتی تھیں۔ قاضی کمال الدین بہت سخت قاضی تھے۔ وہ کسی امیر کی پروا نہ کرتے تھے۔ اور روز ایک نہ ایک امیر ان کے ہاتھ سے سزا پاکر سلطان نورالدین کے پاس قاضی کی شکایت لے کر جاتا تھا۔

سلطان نورالدین زنگی کے پاس قاضی کمال الدین کی صدہا شکایتیں پہنچ چکی تھیں لیکن سلطان نے ان شکایتوں پر کوئی کارروائی نہ کی تھی، حالانکہ قاضی کمال الدین روزانہ دربارِ سلطانی میں کسی نہ کسی مشورے کے لیے تشریف لاتے

تھے۔ قاضی کمال الدین کو بھی یہ علم تھا کہ سلطان کے امرأ نے ان کی شکایتیں کی ہیں اور وہ تیار ہو کر جاتے تھے کہ سلطان اُن سے کسی مقدمہ کے بارے میں وضاحت طلب کریں تو وہ تفصیلی جواب پیش کریں مگر سلطان نورالدین کو اپنے قاضی پر اس قدر اعتماد تھا کہ انہوں نے امرأ کی کسی بات پر کان نہیں دھرے اور قاضی بے خوف و خطر انصاف کے تقاضے پورے کرتے رہے۔

ایک دن سُلطان نورالدین نے قاضی کمال الدین سے بر سبیل تذکرہ دریافت کیا: "کہیئے قاضی کمال! آپ کو انصاف مہیا کرنے میں کوئی پریشانی تو نہیں؟"

"الحمد للہ۔ مجھے کوئی پریشانی نہیں" قاضی نے جواب دیا۔ "عالیجاہ نے مجھے اس قدر اختیارات عطا کر دیے ہیں کہ مجھے انصاف کرتے وقت شرعی تقاضے پورے کرنے میں کوئی پریشانی محسوس نہیں ہوتی۔"

"اس کا مطلب ہے کہ ہمارے امرأ اور وزرا نے کمزور اور زیر دستوں کو پریشان کرنا چھوڑ دیا ہے۔" سلطان نے بڑی مسرت سے کہا۔

"سلطانِ معظم! اس سلسلے میں میں کوئی قطعی جواب نہیں دے سکتا۔" قاضی نے ادب سے جواب دیا۔ "جہاں تک اُن کی شکایات کا تعلق ہے جو میری عدالت میں پیش ہوتی ہیں اُن کے لیے تو میں کہہ سکتا ہوں کہ مظلوموں کو انصاف مل جاتا ہے اور زیادتی کرنے والے کو شرعی سزا دے دی جاتی ہے لیکن دوسری زیادتیوں اور ناانصافیوں کے بارے میں کچھ نہیں کہا جا سکتا۔"

سلطان نورالدین نے چونک کر قاضی کو دیکھا: "قاضی کیا تمہارا مطلب ہے کہ زیادتیوں اور ناانصافیوں کے کچھ ایسے معاملات اور مقدمات ہوتے ہیں جو تمہارے علم تک نہیں لائے جاتے؟"

"جی عالیجاہ! ایسے صدہا مقدمات ہیں جو میری عدالت تک پیش نہیں ہوتے۔" قاضی کمال الدین نے بے خوف کہہ دیا تھا۔

سلطان نورالدین زنگی کا چہرہ متفکر ہو گیا۔ انہوں نے دریافت کیا: "قاضی کمال! اس کی جواب طلبی تو روزِ قیامت مجھ سے ہو گی؟"

"ہرگز نہیں عالیجاہ!" قاضی کمال الدین نے سلطان کے اطمینان کے لیے کہا: "جو زیادتی اور ناانصافی آپ کے علم میں نہ آئے یا میری عدالت میں نہ پہنچے۔ آپ سے اس کی باز پرس کیوں ہو گی۔"

"مگر قاضی کمال! اللہ تعالیٰ نے مجھے رعایا کا محافظ بنایا ہے۔ اگر کسی پر زیادتی ہوتی ہے تو مجھے اس کا ازالہ کرنا چاہیے ورنہ میں گناہگار ہوں گا۔" سلطان نے جرح کا رُخ اختیار کیا۔

"سلطانِ عالی مقام!" قاضی نے سنبھل کر کہا: "عالم الغیب صرف خدا کی ذاتِ واحد ہے۔ وہ جانتا ہے کہ کون کس پر ظلم کر رہا ہے۔ بندہ تو یہ معلوم ہی نہیں کر سکتا کہ کس نے کس پر کتنا ظلم کیا ہے۔ وہ تو صرف یہی جانتا ہے کہ ظلم و زیادتی ہوتی رہی اور ہو رہی ہے۔"

"کیا کہہ رہے ہو قاضی کمال؟" سلطان نورالدین کا لہجہ سخت ہو گیا: "کیا تم یہ کہنا چاہتے ہو کہ میرے امرأ عوام کو پریشان کر رہے ہیں اور انہیں روکنے والا کوئی نہیں؟"

"عالیجاہ! میری تقصیر معاف فرمائی جائے۔" قاضی کمال نے سلطان کا جلال کم کرنے کے لیے فوراً کہا: "قاضی شہر ہونے کی وجہ سے یہ بات میرے فرائض میں شامل ہے کہ میں عوام کے دکھ درد سے واقف اور باخبر رہنے کی کوشش کروں۔ میں اپنی اطلاعات کی بنا پر یہ عرض کرنے کی جرأت کر رہا ہوں کہ عالیجاہ کے ایک امیر سے عوام کو بہت سی شکایتیں ہیں۔ وہ اپنی شکایات میرے پاس لانے کی ہمت نہیں کرتے۔"

"کیوں؟ اس کا سبب کیا ہے۔ کیا تم انہیں انصاف نہیں دے سکتے؟" سلطان نے اور زیادہ سخت لہجے میں کہا۔

"سلطانِ معظم!" قاضی نے جواب دیا: "دراصل آپ کے امیر کا اس قدر جلال اور دبدبہ ہے کہ عوام کو یہ یقین ہی نہیں آتا کہ انہیں میری عدالت سے انصاف مل سکے گا۔"

"قاضی کمال!" سلطان نورالدین تختِ شاہی پر کھڑا ہو گیا۔ اس کا سارا بدن جلال سے کانپنے لگا: "یہ انصاف کی توہین ہے۔ احکامات شرعیہ میں دخل ہے۔ ہمارے کس امیر نے ایسی گستاخی کی جرأت کی ہے؟"

"عالیجاہ!" قاضی کمال الدین نے مضبوط لہجے میں کہا: "خدا مجھے غیبت کے گناہ سے معاف فرمائے۔ حالانکہ کسی کے ظلم کی تشہیر کرنا غیبت نہیں ہے۔ مجھے بتایا گیا ہے کہ امیر اسد الدین شیرکوہ کے حواری اور ملازمین غریب عوام پر زیادتی کرتے ہیں... مگر مظلوم اس خوف سے شکایت نہیں

کرتے کہ اُن کی میری عدالت میں کوئی شنوائی نہیں ہو گی میں اس سلسلے میں قطعی مجبور ہوں۔ اس لیے کہ اگر شکایت میری عدالت میں پیش کی جائے تو میں بے خوف و خطر ظالم کو اس کے ظلم ثابت ہونے پر بے خوف و خطر سزا دوں گا.... مگر یہ میری مجبوری نہیں کہ غلط گی اس افواہ کو حضورِ عالی کے گوش گزار کروں۔"

امیر اسد الدین شیر کوہ، سلطان صلاح الدین کا چچا تھا۔ سلطان نورالدین زنگی دیر تک اپنے قاضی شہر کے انکشاف پر غور کرتا رہا پھر اس نے اعلان کیا۔

"قاضی کمال اسی وقت اعلان کیا جائے کہ "دارالعدل" کے نام سے ایک شعبہ قائم کیا گیا ہے۔ اس شعبہ کے تحت عوام کے انصاف کے لیے ایک اعلیٰ عدالت بیٹھے گی جس کے ہفتہ میں تین اجلاس ہوا کریں گے۔ اس عدالت میں تمہارا سلطان یعنی نورالدین زنگی خود منصف کی حیثیت سے بیٹھے گا اور عوام کے مقدمات سُن کے فوری انصاف مہیا کرے گا۔"

ڈھنڈورچی نے پورے دمشق میں ڈھنڈورا پیٹا کہ سلطان معظم دارالعدل میں خود مقدمات سُنیں گے اور اسی وقت فیصلہ فرمائیں گے۔ بادشاہوں اور سلطنتوں کا محکمۂ جاسوسی ہر دور میں چاق و چوبند اور کمربستہ رہتا تھا اور آج بھی اسی طرح مستعد نظر آتا ہے۔ فرق یہ ہے کہ پہلے جاسوسی انسان سرانجام دیتے تھے اور اب یہی کام سلطنتوں کے جاسوسی سیارے انجام دیتے ہیں اور زیرِ زمین انجام دیا جانے والا کام بھی سیاروں کی نظروں سے بچا نہیں رہ سکتا۔

"خیر، یہ ذکر شاہی زمانہ کا اور اس زمانہ کا جب مجاہدِ اعظم سلطان صلاح الدین ایوبی تختِ دمشق پر متمکن تھا، جس کے جلال سے صرف ایشیا ہی نہیں بلکہ یورپ کے ایوانوں میں بھی زلزلہ آجاتا تھا مگر اس جلیل القدر سلطان کے محلات بھی سازشوں اور محلاتی ریشہ دوانیوں سے محفوظ نہ تھے۔ سلطان نورالدین زنگی اور قاضی کمال الدین میں جو گفتگو ہوئی اور جس کی بنا پر دمشق میں "دارالعدل" قائم ہوا تھا۔ تخلیہ میں ہونے والی گفتگو جاسوس کنیزوں اور غلاموں کے ذریعہ اسی وقت امیر الامراء اسد الدین شیر کوہ کے کانوں تک پہنچا دی گئی۔

امیر الامراء اسد الدین نے اسی وقت اپنے تمام حواریوں کو اپنے محل میں طلب کر لیا۔ ٹھیک اس وقت جب دمشق کے در و دیوار سلطان نورالدین زنگی کے "دارالعدل" کے قیام کے اعلان سے گونج اُٹھے تھے۔ اس وقت امیر الامراء اسد الدین شیر کوہ اپنے حواریوں اور طفیلی اہلکاروں پر برس رہا تھا۔

"تمہاری زیادتیوں، بدعنوانیوں اور چیرہ دستیوں نے یہ وقت دکھایا ہے کہ اب سلطان معظم بذاتِ خود تمہارے خلاف عوام کی شکایات سُنیں گے اور تمہیں کیفرِ کردار تک پہنچائیں گے۔ آخر تمہارا ظلم عوام کہاں تک برداشت کریں۔ وہ اب تک عوام کو میرا لحاظ رہا اور انہوں نے قاضی شہر کے انصاف کو آواز نہیں دی، ورنہ قاضی ہی تمہارے دماغ درست کر دیتا۔ یقین کرو کہ اگر تمہارا مقدمہ قاضی کمال کی عدالت میں پیش ہوتا تو میں بخدا اس کی عدالت میں تمہاری سفارش کرنے ہرگز نہ جاتا۔ میں قاضی کمال کی طبیعت سے واقف ہوں۔ تم لوگ کیا چیز ہو اگر قاضی کو میری کوئی کمزوری مل جائے تو وہ مجھے بھی سُولی پر چڑھانے سے دریغ نہیں کرے گا۔"

اسد الدین کے طفیلی اراکین تھر تھر کانپ رہے تھے۔ انہوں نے واقعی زیادتیاں کی تھیں۔ عوام نے اس خیال سے قاضی کی عدالت میں مقدمات درج نہیں کرائے تھے کہ اُن کے خیال میں قاضی شہر امیر الامراء کے جلال سے مرعوب ہو کر صحیح انصاف نہ کرتے اس لیے وہ گھٹ گھٹ کر رہ جاتے تھے۔ ظاہر ہے کہ اب سلطان خود مقدمہ سُنے گا اس۔ یہ کسی رُو رعایت کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا تھا۔

"امیر الامراء بہادر!" ایک طفیلی، منہ سے کہا۔ "خدا کے لیے ہمیں اس بار بچا لیجیے! ہم قسم کھاتے ہیں کہ آئندہ کبھی کسی پر ظلم نہیں کریں گے۔"

"میں.... میں تمہیں بچاؤں؟" شیر کوہ غصہ سے بولا۔ "تمہارا مقصد ہے کہ میں سلطان معظم سے یہ سفارش کروں کہ میرے ماتحت اب تک عوام کے ساتھ جو ظلم و ستم کرتے رہے ہیں اُن سے درگزر کیا جائے۔ اے عقل کے دشمنو! جلائیں سلطان سے یہ سفارش کر سکتا ہوں۔ جاؤ اور اپنے کیے کی سزا بھگتو!"

شیر کوہ کے ماتحت روتے ہوئے شیر کوہ کے قدموں پر گر پڑے۔ انہیں اپنی موت صاف نظر آ رہی تھی: "امیر الامراء! ہمیں بچا لیجیے! صرف اس دفعہ۔ آئندہ کے لیے ہم توبہ کرتے ہیں۔"

شیر کوہ جتنا بہادر اور جلالی طبیعت کا مالک تھا۔ اتنا ہی نرم دل بھی تھا۔ وہ کسی کو مصیبت میں نہیں دیکھ سکتا تھا۔ آخر اس کا دل پسیج گیا اور بولا: "دیکھو تمہاری بخشش کی صرف ایک صورت ہو سکتی ہے اور وہ صورت یہ ہے کہ تم ان تمام لوگوں کے پاس جاؤ جنہیں تمہارے ہاتھوں نقصان پہنچا ہے اور اس

بات کا امکان ہے کہ وہ سلطان کے حضور تمہارے خلاف مقدمہ پیش کریں گے۔ ان سے مل کر ہر قیمت پر صلح صفائی کرو۔ اُن سے زبانی معافی مانگو، اگر وہ رضامند نہ ہوں تو انہیں کچھ لے دے کے رضامند کرو۔ مجھے اس سلسلے میں بالکل بے بس سمجھو۔"

"ایک ماتحت نے ڈرتے ڈرتے کہا: "امیر الامراء بہادر! ہم اپنے مخالفوں کی خوشامد کریں گے تو وہ اور اکڑ جائیں گے اور اپنی قیمت بڑھا دیں گے۔"

شیرکوہ چیخ اُٹھا: "میں کہہ چکا ہوں کہ اپنے مخالفوں کو ہر قیمت پر رضامند کرو۔ خواہ اس میں تم فقیر کیوں نہ ہو جاؤ۔ تمہاری اراضی اور جائیدادیں کیوں نہ بک جائیں۔ میں صرف یہ کر سکتا ہوں کہ اگر تمہارے مخالفین کے مطالبات تمہاری استطاعت سے باہر ہیں تو میری جاگیر فروخت کر دو۔ میں اپنی جاگیر سے محروم ہو سکتا ہوں لیکن یہ نہ کہا جائے کہ میرے ماتحتوں نے کسی پر ظلم کیا ہے۔"

چنانچہ شیرکوہ کے ماتحتوں نے دوڑ دھوپ شروع کر دی۔ آئندہ نمازِ جمعہ کے بعد "دارالعدل" کی پہلی کچہری بیٹھنا تھی۔ جمعہ کو دو دن باقی تھے۔ اس دو دن کے عرصے میں بدذات اور ظالم اہلکاروں نے اُن غریب لوگوں کے گھروں کے چکر لگانا شروع کر دیے جو ستم زدہ تھے اور امیر الامراء شیرکوہ کے جاہ و جلال کی وجہ سے اس کے ماتحتوں کی شکایت قاضی شہر کے سامنے پیش نہیں کر سکے تھے۔ جان کا خوف ہو تو انسان ہر کام کرنے پر آمادہ ہو جاتا ہے۔ یہی عالم ماتحتوں کا تھا۔

وہ مظلوموں اور ستم زدہ لوگوں کو ہر طرح سے خاموش رہنے اور ان کی غلطیاں معاف کر دینے پر آمادہ کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔

اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ تمام مفلوک الحال اور بے سہارا لوگ جنہیں امیر الامراء کے ماتحتوں سے دُکھ پہنچا تھا، انہیں ستم کاروں نے صرف رقمیں دے کر خوش کیا بلکہ ان کی اس قدر خوشامد کی کہ وہ غریب اپنے کیے پر شرمندہ ہو گئے۔ امیر الامراء کے اہلکاروں نے جس دوڑ دھوپ کا تین دن تک مظاہرہ کیا۔ اس سے امیر الامراء کے ماتحتوں کے علاوہ دوسرے امراء کے بھی ہوش درست ہو گئے اور انہوں نے دل ہی دل میں فیصلہ کیا کہ وہ کسی غریب سے ستم نہ کریں گے ورنہ انہیں سلطان کے سامنے دارالعدل میں پیش ہونا پڑے گا۔

سلطان صلاح الدین نے جمعہ اور ہفتہ کے دو دن اور دارالعدل کا دربار لگایا۔ اس دربار یا عدالت میں تقریباً تما[م] ہی امراء اور وزیر شریک تھے۔ سلطان نورالدین زنگی نے ف[...] مشورے کے لیے مفتی اور قاضی شہر کو بھی عدالت میں بیٹھنے کا حکم دیا تھا مگر ہفتہ میں تین بار دارالعدل کی کچہری میں [...] ایک مقدمہ بھی پیش نہیں ہوا۔

دوسرے ہفتہ سلطان نے قاضی شہر سے فرمایا: "قا[ضی] کمال! تم تو کہتے تھے کہ امیر الامراء کے ماتحتوں نے بڑی زیادتیاں کی ہیں مگر عدالت میں تو کوئی بھی فریاد لے کر نہیں آیا۔"

قاضی شہر کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی: "عالی جا[ہ!] دارالعدل کے اعلان نے پورے دمشق میں تہلکہ مچا دیا تھا۔ زیادتی کرنے والوں کا تو کھانا پینا حرام ہو گیا تھا مگر امیر الامراء نے بھی ایسا قدم اُٹھایا کہ کوئی مظلوم "دارالعدل" نہیں پہنچ [سکا]۔"

سلطان کو کچھ اور ہی گمان ہوا۔ اس کا چہرہ متغیر ہو گ[یا]۔ "کیا تم یہ کہنا چاہتے ہو کہ شیرکوہ نے مظلوموں کو دارالعدل آنے سے روک دیا ہے؟ اگر شیرکوہ نے ایسا کیا ہے تو ہم اُسے عدالت میں طلب کریں گے۔"

"یہ نہیں ہوا عالیجاہ!" قاضی کمال نے وضاحت کی۔ "[...] شیرکوہ نے اپنے تمام ماتحتوں کو بُلا کے ان سے صاف الفاظ میں کہہ دیا کہ وہ اپنے مخالفین اور ان لوگوں سے جن پر انہوں نے زیادتی کی ہے "فوراً اور ہر قیمت پر راضی نامہ" کر لیں کیونکہ اگر ان میں سے ایک بھی "دارالعدل" پہنچ گیا۔ تو سلطان کے انصاف اور عتاب سے انہیں کوئی نہیں بچا سکے گا۔ پس تمام ظالموں اور ستم کاروں نے گھر گھر جا کر مظلوموں اور ستم زدہ لوگوں سے نہ صرف معافیاں مانگیں بلکہ اُن کے نقصانات کا پورا ازالہ کیا اور انہیں بہت کچھ دے دلا کر فریاد کرنے سے باز رکھا ہے۔" اس وضاحت پر سلطان نورالدین زنگی بھی مسکرا دیا۔

سلطان نورالدین زنگی کی وفات کے بعد جب سلطان صلاح الدین نے دارالسلطنت دمشق میں مستقل رہائش اختیار کی تو ان کے امراء نے بھی دمشق کو اپنا مرکز بنایا اور محلات تعمیر کر کے رہائش اختیار کی۔ فوجی سرداروں سے عوام کو ہر دور میں شکایت رہی تھی۔ چنانچہ سلطان صلاح الدین کے کسی سردار نے کسی عام آدمی کے ساتھ کوئی زیادتی کی۔ وہ آدمی اپنی فریاد لے کر سلطانی دربار میں پہنچا۔ اس سے آگے دو بیان ہیں۔ ایک میں کہا گیا ہے۔ سلطان نے اس کی بات نہیں سُنی اور اس کی

درسی نہ ہو سکی۔ دوسرا بیان یہ ہے کہ سلطان کسی مہم پر رہا تھا اس لیے فریادی کی دادرسی نہ کرسکا۔

ایک تیسرا بیان یہ ہے کہ شاہی دربار کے پہریداروں نے فریادی کو دربار میں گھسنے نہیں دیا اور وہ اپنی فریاد سلطان کے سامنے پیش نہ کرسکا۔ بہرحال بات کچھ بھی ہو مگر یہ حقیقت ہے کہ فریادی کی شکایت سُنی نہیں گئی اور وہ دہائیاں دیتا اور چیختا چلاتا مرحوم سلطان نورالدین زنگی کے مزار کی طرف گیا۔ اس کی دہائیوں اور واویلا میں ایسا اثر تھا کہ جو سنتا اس کے ساتھ ہو لیتا۔ اس طرح نورالدین زنگی مرحوم کے مدفن تک پہنچتے پہنچتے فریادی کے ساتھ ہزاروں آدمیوں کا انبوہ ہو گیا تھا۔

فریادی ان الفاظ میں واویلا کرتا ہوا جا رہا تھا:

"اے سلطان نورالدین! آج تمہارا انصاف کہاں ہے۔ جس ظلم کے ہم لوگ شکار ہیں اگر تم اسے دیکھ پاتے تو تمہیں ہمارے حال پر ضرور رحم آ جاتا۔"

فریادی کے ان الفاظ نے دمشق کی آبادی میں آگ سی لگا دی۔ فریادی جوں جوں آگے بڑھتا جاتا آدمیوں کی تعداد بڑھتی ہی جاتی۔ آخر داروغۂ محلات اور شہر کوتوال کو فکر پڑ گئی کہیں اُن پر بات نہ آ جائے۔ اس لیے انہوں نے سلطان کے سامنے حاضر ہو کر اُسے فریادی کے حال سے آگاہ کیا۔ سلطان نے اسی وقت فریادی کو اس کے حضور میں پیش کرنے کا حکم دیا۔

فریادی اس وقت تک کئی ہزار آدمیوں کے ساتھ نورالدین زنگی کی قبر سے اُٹھا اور اسی طرح روتا پیٹتا دربار کی طرف چلا۔ لطف یہ کہ اس کے ساتھ دو ہزار کا مجمع بھی چل رہا تھا۔ یہ سب دمشق کے عوام تھے اور فریادی کے ساتھ دربار میں اس لیے جانا چاہتے تھے کہ وہ سلطان کو انصاف کرتے ہوئے اپنی آنکھوں سے دیکھیں۔

سلطان کو اطلاع کی گئی کہ فریادی آیا ہے مگر اس کے ساتھ دو ہزار اشخاص کا جم غفیر بھی ہے۔ چنانچہ سلطان نے دربارِ عام لگنے کا حکم دیا اور خود انصاف کرنے کے لیے دربارِ عام میں پہنچا۔ سلطان نے اس کا بیان سن کے ظلم کرنے والے کو اسی وقت حاضر ہونے کا حکم دیا پھر اس سے حالات سننے کے بعد ظالم کو قرار واقعی سزا دی اور فریادی سے پوچھا کہ وہ اس فیصلہ اور انصاف سے خوش ہے کہ نہیں۔"

فریادی نے ایک ٹھنڈی سانس لی اور پھر پھوٹ پھوٹ کر رونا شروع کر دیا۔

سلطان پریشان ہو گیا۔ اس نے دریافت کیا: "اے شخص تجھ پر ظلم ہوا، تُو نے فریاد کی اور ہم نے ظالم کو شرعی سزا دی۔ کیا تو اس سزا سے مطمئن نہیں ہے؟"

فریادی نے سلطان کو جواب دیا: "اے سلطان! آپ نے میری فریاد سُنی اور ظالم کو سزا دی۔ آپ نے انصاف کے تقاضے پورے کیے ہیں اور مجرم کو اس کے ظلم کی پوری سزا ملی ہے۔"

"مگر اے شخص تو پھر بھی رو رہا ہے۔ اس کی کیا وجہ ہے؟" سلطان نے دریافت کیا۔

"میں اس وجہ سے نہیں رو رہا ہوں کہ مجھے انصاف نہیں ملا۔" فریادی نے گلوگیر آواز میں کہا: "اے سلطان! میں تو اس بادشاہ کو رو رہا ہوں جس کی موت کے بعد بھی اس کی عدالت قائم ہے۔ اور اس کے عدل کا فیض جاری ہے۔" فریادی کا اشارہ مرحوم سلطان نورالدین کی طرف تھا۔

سلطان صلاح الدین نے اس کی بات سن کر کہا: "بیشک تُو نے سچ کہا۔ ہم میں جو کچھ بھی عدل و انصاف ہے، وہ سلطان مرحوم کے فیض کا نتیجہ ہے۔"



سلطان صلاح الدین اور شام کے نصرانی فرمانرواؤں کے درمیان صلح کا معاہدہ ہو گیا تھا۔ سلطان نے اس عہد کی اپنی طرف سے پوری طرح پابندی کی لیکن قلعہ کرک کا حاکم ریجی نالڈ اپنی عہد شکنی کی عادت سے باز نہ آتا تھا۔ مسلمانوں کا وہ جانی دشمن تھا۔ اور انہیں تکلیف پہنچانے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہ جانے دیتا تھا۔ ۱۱۸۳ء پھر ۱۱۸۶ء میں ریجی نالڈ نے مسلمان قافلوں کو لوٹا اور انہیں قید کیا۔ شاہ یروشلم نے اس کی اس حرکت پر سخت احتجاج کیا اور لوٹ کا مال واپس کرنے کے لیے ریجی نالڈ کے پاس سفارت بھی بھیجی مگر اس مغرور نے سفارت کی کوئی پروا نہ کی اور شاہ یروشلم کی مسلمان ہمدردی کا مذاق اُڑایا۔

۱۱۸۶ء کے واقعہ کے وقت مسلمانوں نے ریجی نالڈ کو یاد دلایا کہ اس کا مسلمانوں کے ساتھ صلح کا معاہدہ ہے۔ اس لیے وہ انہیں قید سے آزاد کر دے لیکن ریجی نالڈ نے ان کا تمسخر اڑاتے ہوئے کہا۔

"تم لوگ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ایمان

رکھتے ہو۔ اس سے کیوں نہیں کہتے کہ وہ تمہیں چھڑائے۔"

ریجی نالڈ کی اس گستاخی کی خبر جب سلطان کو پہنچی تو اُسے سخت غصہ آیا اور اس نے اعلان کیا۔

"میں قسم کھا کر اعلان کرتا ہوں کہ اس صلح شکن کافر کو خدا نے چاہا تو میں اپنے ہاتھ سے قتل کروں گا۔"

سلطان نے بھی جہاد کا اعلان کر دیا تھا اور اسلامی علاقوں کو اپنے اپنے لشکرے کر جہاد میں شرکت کی دعوت دے دی تھی راس الماء کے مقام پر بہت سی فوجیں جمع بھی ہو گئی تھیں۔ کہ اسی دوران سلطان کو اطلاع ملی کہ مسلمانوں کا ایک قافلہ آ رہا ہے جو کہ قلعہ کرک کے قریب سے گزرے گا اور ریجی نالڈ اس قافلہ کو تباہ کرنے کا منصوبہ بنا رہا ہے۔ چنانچہ سلطان نے اپنے بیٹے الملک الفاضل کو راس الماء میں چھوڑا خود تھوڑی فوج لے کر قافلہ کی مدد کو پہنچا۔

ریجی نالڈ کو سلطان کے آنے کی خبر مل گئی۔ اس لیے وہ قلعے سے نہیں نکلا اور قافلہ بغیر کسی پریشانی کے اس علاقہ سے آگے نکل گیا۔ کہتے ہیں اس قافلہ میں سلطان کا بھانجہ حسام الدین بھی سفر کر رہا تھا۔ قافلہ کو بخیریت گزرنے کے بعد سلطان راس الماء واپس آ گیا۔ اس وقت سلطان کے لشکر میں مسلمان علاقوں سے آنے والی فوجیں شامل ہو چکی تھیں۔ سلطان نے اس لشکر کو ملک الفاضل کی زیر سرکردگی ساحل کے ساتھ ساتھ عکہ کی طرف روانہ کیا۔ یہ لشکر صفوریہ کے قریب پہنچا تھا کہ اس کی مڈبھیڑ نصرانیوں کی جماعت الداویہ اور استباریہ کی فوجوں سے ہو گئی۔ ملک العادل نے نصرانیوں کو شکست فاش سے دوچار کر کے بھگا دیا تھا۔ اس جنگ اور فتح کی خبر سن کر سلطان بھی باقی لشکر لے کر بیٹے کے پاس آ گیا پھر دونوں لشکر طبریہ کی طرف بڑھے۔

نصرانی جماعت الداویہ اور استباریہ کی شکست سے عیسائیوں میں شور مچ گیا اور ان میں صلاح مشورے شروع ہو گئے۔ طرابلس کے ریمنڈ اور یروشلم کے گائی میں... اختلاف تھا اور ریمنڈ شاہ طرابلس نے شاہ یروشلم کو چھوڑ کر سلطان سے رشتہ جوڑ لیا تھا لیکن نصرانیوں کی اس شکست نے اُسے بھی پریشان کر دیا۔ عیسائی پادریوں نے بھی اُسے بہت لعنت ملامت کی پھر ریمنڈ اور گائی ایک دوسرے سے غار یوسف کے مقام پر ملے اور ایک دوسرے سے بغلگیر ہوئے ان میں عہد و پیمان ہوئے کہ تمام نصرانی بادشاہ اور قلعدار متحدہ طور پر سلطان دمشق صلاح الدین ایوبی کا مقابلہ کریں گے

اس طرح صفوریہ کے مشہور شہر میں تمام نصرانی لشکر جمع ہوئے اور انہوں نے صلیب مقدس بلند کی۔ اس صلیب کو صلیب الصلوب بھی کہا جاتا ہے۔ اس لیے کہ اس صلیب کو اس لکڑی سے تیار کیا گیا تھا جس پر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو مصلوب کیا گیا تھا۔ صلیب مقدس کو تمام طور پر مسلمانوں کے خلاف صلیبی جنگ میں استعمال کیا جاتا تھا۔ صفوریہ میں اس وقت نصرانی لشکر کی تعداد پچاس ہزار تک پہنچ گئی تھی۔ اس میں بارہ سو نائٹس بھی شامل تھے۔

سلطان صلاح الدین بھی اپنے لشکر کے ساتھ صفوریہ پہنچا۔ اور اس نے اپنے لشکر کو طبریہ کی پہاڑی پر اُتار دیا۔ سلطان کئی روز تک اس انتظار میں رہا کہ نصرانی صفوریہ سے نکل کر مقابلہ پر آئیں لیکن نصرانی اپنی جگہ سے نہیں ہلے۔ پھر سلطان نے اپنے کچھ فوجی دستے لے کر طبریہ کی طرف روانہ ہوا۔ اس کا خیال تھا کہ نصرانی طبریہ کو بچانے کے لیے صفوریہ سے باہر نکل آئیں گے۔ کیونکہ طبریہ میں شاہ ریمنڈ والی طرابلس کی بیوی بچے موجود تھے لیکن نصرانیوں کے کانوں پر اس اطلاع پر بھی جوں نہیں رینگی۔ ادھر سلطان نے طبریہ پر حملہ کر کے شہر پر قبضہ کر لیا لیکن قلعہ اس کے قبضہ میں نہ آ سکا۔

نصرانیوں کو یہ گمان ہی نہ تھا کہ طبریہ پر سلطان کا اس آسانی سے قبضہ ہو جائے گا لیکن جب یہ بات حقیقت بن کے اُن کے سامنے آ گئی تو وہ بدحواس ہو گئے۔ شاہ یروشلم نے بڑے غصہ سے کہا "ہم طبریہ کو سلطان کے قبضہ سے آزاد کرائیں گے۔"

شاہ ریمنڈ نے والیٔ طبریہ نے نرمی سے وضاحت کی۔

"اے شاہ یروشلم! قلعہ طبریہ میں میرے بیوی بچے موجود ہیں اور قلعہ کو سلطانی فوجیں گھیرے ہوئے ہیں۔ اس صورتِ حال میں طبریہ کو بچانے کے لیے میں آپ سے زیادہ بے چین ہوں لیکن میں جانتا ہوں کہ اس وقت طبریہ آزاد کرانا ناممکن ہے اس لیے ہمیں جلدی میں کوئی قدم نہیں اُٹھانا چاہیئے۔"

"شاہ ریمنڈ! تم کیا کہہ رہے ہو" شاہ یروشلم نے اُسے گھورتے ہوئے کہا "ایک طرف تو تم کہتے ہو کہ طبریہ میں تمہارے بیوی بچے ہیں سلطانی فوجوں نے انہیں گھیر رکھا ہے۔ دوسری

تم طبریہ جانے سے ہچکچا رہے ہو، آخر یہ سب کیا ہے۔
...تے کیا ہو؟"

"اے شاہ یروشلم!" والیٔ طرابلس نے جواب دیا "میں
...ہی چاہتا ہوں جو آپ چاہتے ہیں لیکن میں یہ نہیں چاہتا
...ئی ایسا قدم اُٹھایا جائے جس سے پورا لشکر ہلاکت میں
...ئے"۔

"گویا طبریہ کو مسلمانوں سے بچانے کی بجائے ہمیں صفوریہ
...رام کرنا چاہئے" شاہ یروشلم چڑچڑا ہو گیا تھا۔

"شاہ یروشلم! آپ مجھے غلط سمجھنے کی کوشش نہ کیجیے"
...ڈ کو بھی غصہ آ گیا "آپ دراصل یہاں کے موسم اور راستوں
...شواریوں سے واقف نہیں۔ صفوریہ اور طبریہ کا درمیانی علاقہ
...ے پہاڑیوں اور اونچے نیچے پتھریلے ٹیلوں سے بھرا ہوا
...راستے میں پانی کی شدید قلت ہے"

"ریمنڈ! تم تو اس قدر مطمئن ہو جیسے تم نے سلطان سے
...لگ معاہدہ کر رکھا ہے" شاہ یروشلم نے طنزیہ انداز
...ار کیا "کیا تمہیں امید ہے کہ سلطان قلعہ پر قبضہ کے بعد
...ے بیوی بچوں سے دوستانہ سلوک کرے گا؟"

"یہ بات نہیں ہے شاہ یروشلم" ریمنڈ نے اسے سمجھانے
...شش کی "دراصل میرا یہ اندازہ ہے کہ سلطان طبریہ پر
...ہ دن تک قبضہ نہیں رکھ سکتا۔ وہ چند دنوں بعد محاصرہ
...کر واپس آ جائے گا لیکن اس وقت طبریہ پہنچ کر سلطان
...ابلہ کرنا خود کو ہلاکت میں ڈالنا ہے"

"آخر کیوں۔ یہی تو ہم معلوم کرنا چاہتے ہیں!" شاہ یروشلم
بھی اپنی بات پر اڑ گیا۔

"وجہ صاف ظاہر ہے شاہ یروشلم!" ریمنڈ نے جواب دیا۔
...ری اطلاع کے مطابق سلطان کے ساتھ اس وقت پورے
...شام کے شہزادوں اور امیروں کی فوجیں موجود ہیں۔ اس
...ے سلطان کو شکست دینا ناممکن ہے۔ ہاں طبریہ سے
...ی واپسی کے بعد قلعہ کو آسانی سے آزاد کرایا جا سکے گا"

شاہ یروشلم اور دوسرے والیوں نے ریمنڈ کی بات
...ن نہ دھرے بلکہ اس پر الٹا الزام دھر کر اس نے سلطان
...وئی معاہدہ کر لیا ہے۔ اسی لیے وہ اس قدر مطمئن ہے۔
...یروشلم اور دوسرے تمام نصرانیوں امیروں نے طبریہ کی
...بڑھنے کا فیصلہ کیا اور نصرانی لشکر صفوریہ سے نکل کے
...ی طرف روانہ ہوا۔

سلطان صلاح الدین نے طبریہ پر چھیڑ چھاڑ بھی اسی وجہ سے شروع کی تھی۔ اسے پہلے ہی امکان تھا کہ نصرانی طبریہ کو بچانے کے لیے آئیں گے اس لیے اس نے صفوریہ اور طبریہ کے راستہ میں جگہ جگہ تیرانداز دستے متعین کر دیے تھے۔ صفوریہ سے نکلتے ہی نصرانی سواروں پر مسلم تیراندازوں نے تیر برسانا شروع کر دیے۔ اس سے نصرانی سوار جن میں کثرت سے نائٹس شامل تھے، اُسے سخت نقصان پہنچا۔ سلطان طبریہ میں چند دستے چھوڑ کر اپنی خیمہ گاہ پر پہنچ چکا تھا اور اس نے فوجوں کی کمان سنبھال لی تھی۔

نصرانی لشکر کو صفوریہ چھوڑتے ہی سب سے پہلے پیاس کا سامنا کرنا پڑا۔ راستے کے چشموں پر سلطانی دستوں نے قبضہ کر لیا تھا یا انہیں برباد کر دیا تھا۔ اس لیے نصرانیوں کو پانی کی شدید قلت محسوس ہوئی، پھر بھی وہ کسی طرح لڑتے بھڑتے سلطانی لشکر گاہ کے قریب پہنچ گئے اور رات گزرنے کے بعد صبح ۲۳ ربیع الاول ۵۸۳ ہجری ۱۱۸۷ء کو نصرانیوں اور مسلمانوں کا مقابلہ ہوا۔ یہ مقابلہ لوبیا کے میدان میں ہوا تھا۔ مسلمانوں کے تیراندازوں نے اس مقابلہ میں اس قدر تیر برسائے کہ نصرانیوں کو پسپا ہونا پڑا۔

نصرانیوں نے لڑ بھڑ کر طبریہ نکل جانے کی کوشش کی لیکن سلطان صلاح الدین اپنے دستوں کے ساتھ اُن کا راستہ روک کے کھڑا ہو گیا۔ سلطان صلاح الدین خود گھوڑا دوڑا کر اپنے مختلف دستوں کے پاس جاتا اور انہیں جوش دلاتا اور ان کے حوصلے بلند کرتا۔ نصرانی فوجوں کی طرف خشک جھاڑیوں کا جنگل تھا۔ مسلمانوں نے اس جنگل میں آگ لگا دی۔ مسلمانوں کی خوش قسمتی کہ ہوا نصرانیوں کے رُخ پر چل رہی تھی۔ جنگل نے آگ پکڑتے ہی دُھواں اُگلنا شروع کر دیا۔ یہ دُھواں نصرانی فوجوں کو پریشان کرنے لگا۔

نصرانی پیاس کی شدت سے پہلے ہی بے حال ہو رہے تھے۔ آسمان سے الگ آگ برس رہی تھی۔ اس پر آنکھوں اور ناک میں گھستا ہوا دُھواں۔ اُن پر قیامت ٹوٹ پڑی تھی۔ نہ وہ پیچھے ہٹ سکتے تھے اور نہ آگے بڑھ سکتے تھے۔ جب انہوں نے دیکھا کہ اب جان بچنے کی کوئی صورت نہیں تو انہوں نے موت کی جنگ لڑنا شروع کر دی اور بھوکے شیروں کی طرح مسلمانوں کی صفوں میں گھس گئے، مگر مسلمانوں نے اُن کی ایک نہ چلنے دی۔ اگرچہ نصرانیوں نے ہتھیلی پر سر رکھ کر حملہ کیے

مسلمانوں کا گھیرا توڑنے کی کوشش کی تھی مگر انہیں کامیابی نہ ہوئی اور مسلم لشکر نے انہیں کوہ حطین تک پہنچنے سے باز رکھا۔

پھر ایک شدید جنگ کے بعد عیسائیوں کی صلیب مقدس کو ان سے چھین لیا گیا۔ مسلمان سوار نصرانیوں کی صفیں درہم برہم کرتے ہوئے گائی شاہ یروشلم کے اس جھنڈے تک پہنچ گئے۔ جو ایک اونچے مقام پر گائی کے عظیم الشان خیمے کے آگے نصب تھا۔ گائی کے جھنڈے کو گرا کر نیچے کر دیا گیا اور اس کے ساتھ ہی نصرانی فوجوں نے ہتھیار ڈالنا شروع کر دیے۔ مسلمانوں نے تمام شاہوں، امیروں اور نائٹس کو گرفتار کر لیا۔

انگریز مورخ لین پول نے اس منظر کو اس طرح بیان کیا ہے۔

"مسیحی شہسوار اس قدر کمزور ہو چکے تھے کہ وہ اپنی جانوں کو زیادہ قیمت پر فروخت نہیں کر سکے۔ انہوں نے اپنی تلواریں نیام میں ڈال لیں اور مسیحی لشکر کے چیدہ اور منتخب اشخاص قید کر لیے گئے۔ ان میں شاہ یروشلم گائی، اس کا بھائی پائلٹوں کرک کا ریجی نالڈ شتیلین کا ہمفرے۔ داویہ اور اسبتاریہ جماعتوں کے سردار اور تمام بڑے بڑے سوار گرفتار ہو گئے۔ صرف طبریہ کا فرمانروا ریمنڈ جنگ کا رنگ دیکھ کر میدان سے نکل بھاگا۔ اور گرفتاری سے محفوظ رہا لیکن وہ صلاح الدین سے اس قدر شرمندہ تھا کہ زیادہ دیر زندہ نہ رہا اور شرم سے مر گیا۔"

ابن اثیر کا بیان ہے۔ معرکہ حطین میں عیسائی مقتولین کے انبار دیکھ کر یہ اندازہ ہوتا تھا کہ نصرانیوں کا پورا لشکر قتل ہو گیا ہے لیکن جب گرفتار عیسائیوں کو دیکھا جاتا تو یوں معلوم ہوتا تھا جیسے پورا لشکر قیدی بنا لیا گیا ہے۔

دوسرا مورخ ابو شامہ لکھتا ہے کہ مسیحی لشکر کے تمام مشہور سردار مسلمانوں کی قید میں تھے اور عیسائی سپاہیوں کا یہ حال تھا کہ ایک ایک مسلمان لشکری تیس تیس عیسائی پیادوں کو خیمے کی رسی میں باندھے جانوروں کی طرح ہنکاتا پھر رہا تھا ۱۰۹۹ء (پہلی صلیبی جنگ) کے بعد اتنا بڑا کوئی معرکہ نہ ہوا تھا۔

جنگ کے خاتمے پر تمام معزز قیدیوں کو سلطان کے حضور پیش کیا گیا۔ سب سے اہم قیدی یروشلم (بیت المقدس) کا بادشاہ گائی تھا۔ وہ سر جھکائے ہوئے سلطان کے سامنے آیا۔ سلطان نے اسے اپنے برابر مسند پر بٹھا لیا، پھر تمام شاہوں، امیروں اور سرداروں کو ان کے مرتبے کے مطابق سرداروں کے درمیان کھڑے ہونے کا حکم دیا۔

شاہ یروشلم گائی کو معلوم تھا کہ سلطان نے امیر و قلعدار گرک کو اپنے ہاتھ سے قتل کرنے کا عہد کیا ہے۔ گائی کو یہ تو معلوم تھا کہ سلطان، بادشاہوں اور بڑے سرداروں کو قتل نہیں کرتا مگر اسے یہ بھی معلوم تھا کہ سلطان، ریجی نالڈ قلعدار کو کسی صورت زندہ نہ چھوڑے گا مگر گائی اسے بچانا چاہتا تھا۔ اس لیے اس نے سلطان سے درخواست کی۔

"اے شہنشاہ اور سلطان شام! ہمیں سخت پیاس محسوس ہو رہی ہے اگر سلطان ہماری پیاس بجھانے کا انتظام فرمائیں تو عین نوازش ہوگی۔"

"ہم تمہاری درخواست بخوشی منظور کرتے ہیں۔"

یہ کہتے ہوئے سلطان نے شاہ یروشلم کے لیے آب خنک (ٹھنڈا پانی) لانے کا حکم دیا۔ ٹھنڈا پانی لایا گیا تو شہنشاہ نے شاہ یروشلم کو پانی پیش کرنے کا اشارہ کیا۔ چنانچہ شیشے کے ایک قیمتی گلاس میں ٹھنڈا پانی بھر کے شاہ یروشلم کو پیش کیا گیا۔ شاہ یروشلم نے شکریہ ادا کر کے گلاس غلام کے ہاتھ سے لیا پھر شاہ یروشلم نے آدھا گلاس پانی پی کر سامنے کھڑے ہوئے قلعدار کرک ریجی نالڈ کو قریب آنے کا اشارہ کیا۔

ریجی نالڈ قریب آیا تو شاہ یروشلم نے اس سے کہا

"ریجی نالڈ! یہ باقی پانی تم پی لو۔" ریجی نالڈ نے جلدی سے شاہ یروشلم کے ہاتھ سے گلاس لیا اور منہ سے لگا لیا اور ایک ہی گھونٹ میں گلاس خالی کر دیا۔ سلطان صلاح الدین کی پیشانی پر غصے سے سلوٹیں پڑ گئیں۔ انہوں نے فرمایا۔

"شاہ یروشلم! ہم نے پانی تمہیں پینے کو دیا تھا۔ تم نے کچھ پانی ریجی نالڈ کو پلا دیا... مگر ہم نے اسے پانی پینے کو نہیں دیا تھا۔ اس لیے اس کی جاں بخشی ہم پر فرض نہیں ہوتی۔"

اس زمانے کا دستور تھا کہ بادشاہ یا خلیفہ کسی قیدی کو کھانا، پانی دینے کا حکم صادر کر دے تو پھر وہ اس قیدی کو قتل نہیں کرا سکتا تھا۔ مسلمان شاہوں کے اس دستور سے شاہ یروشلم واقف تھا۔ اس نے اسی لیے اپنا بچا ہوا پانی ریجی نالڈ کو پلا دیا تھا تاکہ سلطان اس کے قتل کا حکم صادر نہ کر سکے۔ مگر سلطان نے فوراً اس کی وضاحت کر دی۔

پھر سلطان نے تمام معزز قیدیوں کو کھانے کے لیے دوسرے خیمے میں بھیج دیا۔ واضح رہے کہ سلطان صلاح الدین کا یہ دربار میدان جنگ حطین میں ایک بڑے خیمہ میں لگا تھا۔ سلطان نے صرف شاہ یروشلم اور ریجی نالڈ قلعہ دار کرک کو اپنے پاس روک لیا تھا۔

قیدیوں کے جانے کے بعد سلطان نے ریجی نالڈ کے سامنے اس کے تمام پچھلے گناہ بیان کیے اور کہا: "اے ریجی نالڈ اس وقت میں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے مدد چاہتا ہوں۔"

سلطان کا یہ اشارہ اس واقعہ کی طرف تھا جب مسلمانوں کے ایک قافلہ کو ریجی نالڈ نے گرفتار کر لیا تھا اور قافلے والوں نے ریجی نالڈ سے رہائی کی درخواست کی تھی۔ اس گھڑی ظالم ریجی نالڈ نے قہقہہ لگا کر کہا تھا کہ تم لوگ تو محمدؐ پر اعتقاد رکھتے ہو۔ اس وقت محمدؐ کو اپنی مدد کے لیے کیوں نہیں پکارتے۔ سلطان نے اگرچہ ریجی نالڈ کو اپنے ہاتھ سے قتل کرنے کی قسم کھائی تھی لیکن اسلامی اصول کے مطابق سلطان نے پہلے اس کے سامنے اسلام پیش کیا اور جب اس نے اسلام قبول کرنے سے انکار کیا تو سلطان نے اپنے ہاتھ سے اس کا سر قلم کر دیا۔

شاہ یروشلم گائی، حاکم کرک کا یہ انجام دیکھ کر خوفزدہ ہو گیا۔ سلطان نے اسے تسلی دی: "اے شاہ یروشلم! تمہیں خوف کھانے کی ضرورت نہیں۔ بادشاہوں کا یہ دستور نہیں کہ وہ دوسرے بادشاہوں کا سر اتاریں۔ ریجی نالڈ کو تو اس کے حدود سے تجاوز کرنے کی سزا دی گئی ہے۔"

معرکۂ حطین میں شکست کے بعد شام میں نصرانی ریاستوں کا خاتمہ ہو گیا۔ نصرانیوں کے بڑے بڑے سردار اور امیر گرفتار ہو چکے تھے اور اب کوئی ایسی طاقت باقی نہ تھی جو شکست خوردہ اور عیسائیوں کے منتشر فوجیوں کو اکٹھا کرتی۔ عیسائیوں کی چھوٹی ریاستیں اور جاگیرداریاں باقی تھیں جو ساحل سمندر سے دور اندرونی علاقوں میں تھیں مگر ان کا بھی یہ حال تھا کہ جب سلطان صلاح الدین کا لشکر کسی شہر کے سامنے یا قلعہ کی فصیل کے قریب پہنچتا تو اس کی دیواریں گر جاتیں اور قلعہ اور شہر کی کنجیاں سلطان کے حوالے کر دی جاتیں۔

پورے ملک شام میں صور اور یروشلم کے علاوہ عیسائیوں کی کوئی ریاست باقی نہ تھی۔ شمال میں بیروت سے جنوب میں غازہ تک سلطان صلاح الدین ایوبی کا قبضہ ہو چکا تھا۔ پورا فلسطین سلطان کے رحم و کرم پر تھا۔ اس علاقہ کو عیسائیوں نے نوے سال پہلے مسلمانوں سے چھینا تھا اور اب یہ مسلمانوں کو مل رہا تھا۔ حطین کے قبضے کے بعد اسلامی لشکر چاروں طرف پھیلنا شروع ہو گیا۔ بہت کم قلعوں نے اس سیلاب کو روکنے کی کوشش کی تھی۔ اگر کوئی قلعہ بند ہوا بھی تو ایک ہفتہ سے زیادہ محاصرے کی تکلیف گوارا نہ کر سکا۔

سلطان نے سب سے پہلے طبریہ کی طرف کوچ کیا۔ طبریہ کے قلعہ میں ریجی نالڈ کے بیوی بچے تھے۔ انہوں نے قلعہ فوراً مسلمانوں کے حوالے کر دیا اور سلطان نے انہیں مال و متاع کے ساتھ قلعہ چھوڑنے کا پروانہ عطا کر دیا۔ اب سلطانی لشکر نے عکہ کا رخ کیا۔ یہ بحر روم پر فلسطین کی ایک بہت بڑی منڈی تھی۔ سلطانی لشکر قلعہ کے قریب پہنچا تو وہاں دو گروہ پیدا ہو گئے۔ ایک گروہ کا خیال تھا کہ قلعہ بند ہو کر مدافعت کی جائے اور یورپ کی نصرانی دنیا سے مدد مانگی جائے لیکن دوسرے گروہ کا خیال تھا کہ اسلامی لشکر سے ٹکرانا یا اس سیل گراں کے آگے بند باندھنا خود کو ہلاکت میں ڈالنے کے مترادف ہے۔ اس گروہ کی دلیل تھی کہ جب گائی شاہ یروشلم، ریجی نالڈ امیر کرک تمام شامی امیروں، ٹائنٹس اور ہاسپٹلرز کے ساتھ صلاح الدین سے شکست کھا چکا ہے تو پھر عکہ کتنی ساعتوں تک سلطان کو روک سکے گا۔

مختصر یہ کہ عکہ نے بھی قبضہ دے کر اپنی جان بچائی۔ سلطان نے عام معافی کا اعلان کیا اور فرمان جاری ہوا کہ جو لوگ عکہ میں رہنا چاہیں، ان کے جان و مال کی حفاظت کی ضمانت دی جاتی ہے۔۔۔ مگر جو لوگ عکہ چھوڑنا چاہیں، انہیں اجازت ہو گی وہ اپنے ساتھ اپنا مال و متاع لے جا سکتے ہیں۔ عام طور سے لوگوں نے عکہ چھوڑنے کا فیصلہ کیا اور اپنا مال لے کر نکل گئے لیکن یہ ایک بڑی منڈی تھی۔ اس لیے وہ تمام سامان نہ لے جا سکے۔ عکہ میں ایک مسجد تھی جو گزشتہ نوے سال سے نصرانیوں کے دور حکومت میں کلیسا (گرجا) بنا دی گئی تھی۔ سلطان نے اس مسجد کو دوبارہ مسجد کا روپ دیا اور وہاں نماز جمعہ ادا کی۔

سلطان عکہ میں ٹھہرا ہوا تھا اور اس کے بھائی بھتیجے اطراف میں فتوحات حاصل کر رہے تھے۔ سلطان کے بھائی ملک العادل نے ناصرہ، قیساریہ، حیفہ، صفوریہ اور شقیف وغیرہ کو فتح کرنے کے بعد یافا کی مشہور بندرگاہ پر قبضہ کر لیا تھا۔

دوسری سمت سلطان کا بھتیجا تقی الدین بن شاہنشاہ (یہ فرخ شاہ کا بھائی تھا) نے تبنین کا محاصرہ کیا۔ یہ سنگی قلعہ بڑا مضبوط تھا۔ قلعہ والوں نے اس کی سخت مدافعت کی۔ جب قلعہ پر قبضہ نہ ہو سکا تو تقی الدین کو اپنی مدد کے لیے سلطان کو بلانا پڑا۔ سلطان لشکر لے کر تبنین پہنچا۔ سلطان کی آمد کی خبر سُن کر قلعہ والوں کے حوصلے پست ہو گئے اور انہوں نے بغیر مزید جنگ کے قلعہ سلطان کے حوالے کر دیا۔ وہاں سے سلطان صیدا پہنچا۔ قلعہ صیدا والوں میں سلطان کے مقابلہ کی طاقت نہ تھی۔ اس لیے انہوں نے بغیر کسی جنگ کے قلعہ سلطان کے حوالے کر دیا۔

بیروت اس وقت بھی ایک مستحکم اور خوبصورت شہر تھا۔ بیروت والوں نے سخت مدافعت کی . . . لیکن جنگ شروع ہونے کے کچھ ہی دیر بعد شہر میں افواہ اُڑ گئی کہ صلاح الدین کی فوجیں ایک سمت سے شہر میں داخل ہو گئی ہیں۔ اس افواہ سے لوگوں میں سراسیمگی پھیل گئی اور انہوں نے صلح پر زور دینا شروع کیا۔ فوجی سردار انہیں ہر طرح سے مطمئن کرنے کی کوشش کرتے کہ یہ افواہ ہے اور کسی قسم کے خوف کی ضرورت نہیں، لیکن لوگوں پر خوف طاری ہو گیا۔ آخر شہر سلطان کے حوالے کرنا پڑا۔

بحرِ روم کے ساحل پر صیدا اور عسقلان دو اور بڑے شہر (بندرگاہ) تھے۔ صیدا زیادہ مستحکم تھا، اس لیے کہ صیدا میں وہ تمام عیسائی لشکر اور سردار جمع ہو گئے تھے، جنہوں نے مسلمانوں کے ہاتھوں شکست کھائی تھی۔ چنانچہ سلطان نے پہلے عسقلان کا محاصرہ کیا۔ سلطان نے عسقلان والوں کو پیغام بھجوایا کہ اگر وہ عسقلان بغیر جنگ کے حوالے کر دیں تو گائی شاہ یروشلم کو قید سے آزاد کر دیا جائے گا لیکن شہر والوں نے اس پیش کش کو قبول نہیں کیا۔ سلطان نے مجبور ہو کر فصیلِ شہر پر سنگ باری شروع کرا دی۔ اس سنگباری سے فصیل ایک جگہ سے شکستہ ہو گئی مگر مدافعت اس قدر زبردست تھی۔ اسلامی لشکر شہر میں داخل نہ ہو سکا۔ سلطان زیادہ تباہی نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اس لیے اس نے محاصرہ سخت کر دیا۔

آخر شہر والوں نے جب دیکھا کہ محاصرہ ختم نہیں ہو رہا اور اگر سلطان نے شہر پر عام حملے کا حکم دے دیا تو بڑی تباہی مچے گی۔ ادھر شاہ یروشلم انہیں برابر صلح کے پیغام بھجوا رہا تھا۔ تمام طرف سے مجبور ہو کر اور ناامید ہو کر شہر والوں نے جان اور مال کی ضمانت پر عسقلان حوالے کرنے پر آمادگی ظاہر کر دی۔ سلطان نے اُن کی شرط منظور کر لی اور عسقلان کے نصرانی اپنا سامان لے کر یروشلم چلے گئے۔

عسقلان، مصر سے قریب ترین بندرگاہ تھا۔ عسقلان کے بعد رملہ، دارُوم، غزوہ، مشہد ابراہیم اور بیت جبرئیل بھی آسانی سے فتح ہو گئے۔ حطین کی فتح کے بعد ہی مسلمانوں نے خود کو ذہنی طور پر بیت المقدس پر قبضے کے لیے تیار کر لیا تھا۔ معرکہ حطین کی خبریں اقصائے عالم اور خصوصیت سے اسلامی دُنیا میں پہنچ گئی تھیں، اور دور دراز کے علماء اور فضلاء دھڑا دھڑ عسقلان پہنچنا شروع ہو گئے تھے تاکہ سلطان کے ساتھ قدم ملا کر اس ارضِ پاک اور قدیم قبلہ میں داخل ہوں جس پر نصرانیوں نے ۱۰۹۲ عیسوی سے قبضہ جما رکھا تھا۔

عسقلان اور بیت المقدس کے درمیان کوئی ایسی رکاوٹ نہ تھی جو سلطان کا راستہ روک سکتی۔ نصرانیوں کی طاقت کا خاتمہ ہو چکا تھا اور ان کے بادشاہ اور سردار مسلمانوں کے ہاتھوں گرفتار تھے۔ اس کے باوجود سلطان بیت المقدس پر ایک دم حملہ کر کے قبضہ نہیں کرنا چاہتا تھا۔ ہر چند کہ نصرانیوں نے گزشتہ نوّے سال میں بیت المقدس کے مسلمانوں کے تمام مقاماتِ مقدسہ کی ہیئت تبدیل کر دی تھی، پھر بھی بیت المقدس مسلمانوں کا پرانا قبلہ تھا اور وہ عرصہ تک اسی کے رُخ پر نماز ادا کرتے رہے تھے۔ اس لیے وہ نہیں چاہتے تھے کہ اس ارضِ مقدس کی زمین کو انسانی خون سے آلودہ کیا جائے۔ جس طرح آج یہ نہیں چاہتے کہ خانۂ کعبہ (مکّہ) کے احاطہ میں خونریزی ہو، اسی طرح بیت المقدس کے لیے بھی احترام چاہتے تھے۔

سلطان کو یہ بھی معلوم تھا کہ شام کے ان تمام علاقوں کے نصرانی جو مسلمانوں سے شکست کھا کر اپنے اپنے شہروں اور مُلکوں سے بھاگے تھے۔ وہ تمام کے تمام بیت المقدس میں پناہ گزیں ہوئے تھے۔ ان میں امیر بھی تھے، فقیر بھی، اور بادشاہ بھی تھے اور بھکاری بھی۔ ایک اندازے کے مطابق بیت المقدس میں اس وقت مرد اور عورتوں کے علاوہ ساٹھ ہزار کا مسلح لشکر تھا۔ ہر چند کہ اس لشکر کی سلطان کو کوئی پروا نہ تھی، پھر بھی سلطان چاہتا تھا کہ اس ارضِ پاک پر بغیر خون بہائے مسلمانوں کا قبضہ ہو جائے جسے نصرانیوں نے مسلمانوں کے خون کے دریا پار کر کے حاصل کیا تھا۔

پس سلطان نے بیت المقدس کے نواح میں اپنی لشکر گاہ قائم کی اور اہلِ شہر کو پیغام بھیجا: "اے ارضِ مقدس کے نصرانی باسیو! بیت المقدس ہمارے لیے بھی اسی قدر محترم ہے جتنا کہ

دُنیا کی کسی اور قوم کے لیے ہو سکتا ہے۔ اس لیے ہم نہیں چاہتے کہ ایک صدی پہلے کی طرح ایک بار پھر بیت المقدس میں اس قدر خون بہے کہ ہمارے گھوڑے گلی کوچوں میں بہنے والے خون میں تیرنے لگیں۔ اس لیے اگر بیت المقدس بغیر خون بہائے ہمارے حوالے کر دیا جائے تو ہم نصرانیوں کی نہ صرف مال و جان کی حفاظت کریں گے بلکہ اگر وہ بیت المقدس میں مقیم رہنا چاہیں تو اُن کی حفاظت کی ذمہ داری اُٹھاتے ہیں اور اگر وہ بیت المقدس سے جانا چاہیں تو انہیں اس شہر کے برابر زمین دی جائے گی تاکہ وہ وہاں اپنی آبادیاں قائم کریں۔ انہیں بیت المقدس میں داخلہ کی عام اجازت ہو گی اور انہیں کسی قسم کی تکلیف نہیں دی جائے گی، اگر بیت المقدس والے شہر کو چھوڑ کر کہیں جانا چاہیں تو بھی انہیں اجازت ہو گی اور ان سے کوئی تعرض نہ کیا جائے گا۔"

مگر بیت المقدس کے نصرانیوں نے سلطان کی یہ باعزت پیش کش قبول نہ کی اور جواب بھجوایا "یہ کس طرح ممکن ہے کہ جس زمین پر ہمارے خداوند یسوع مسیح نے آنکھ کھولی اور جہاں وہ مصلوب ہوئے اُسے مسلمانوں کے حوالے کر دیں۔"

سلطان کو مجبور ہو کر تلوار بے نیام کرنا پڑی۔ نصرانیوں کا لشکر شہر کے اندر تھا اور فصیل شہر کے باہر بھی وہ پڑے تھے مسلمانوں سے بیت المقدس کو بچانے کے لیے کھڑے تھے۔ سلطان نے ایک شدید حملہ کر کے فصیل شہر سے باہر کے لشکر کو شہر کے اندر دھکیل دیا اور فصیل پر شدید سنگ باری کرائی، جس سے فصیل کئی جگہ سے شکستہ ہو گئی۔ جب نصرانیوں نے دیکھا کہ اب بچت کی کوئی صورت نہیں اور بیت المقدس پر مسلمانوں کا قبضہ ہو جانا یقینی ہے تو انہوں نے فوراً سلطان کی خدمت میں سفارت بھیجی۔ اس وقت سلطان نے صلح سے انکار کر دیا اور کہا۔ "اب میں تمہارے ساتھ وہی سلوک کروں گا جو تم نے آج سے نوّے سال قبل مسلمانوں سے بیت المقدس کا قبضہ لینے کے لیے کیا تھا۔"

مسلمانوں کے اس صاف جواب سے بیت المقدس کے نصرانیوں کے ہاتھ پیر پھول گئے۔ انہوں نے اپنے ایک سردار بالیان کو سلطان کے پاس بھیجا۔ اس نے سلطان کی خدمت میں عرض کیا :-

"اے سلطان عالی مقام! ہم لوگ یہ تو جانتے ہیں کہ ہم آپ کا مقابلہ نہیں کر سکتے اور آپ یروشلم پر بزور شمشیر قبضہ کر لیں گے لیکن آپ چاہتے تھے اس ارضِ پاک پر خون کا ایک قطرہ نہ گرے لیکن ہو گا یہ کہ یروشلم کے مرد اپنی بیوی اور بچوں کو قتل کر دیں گے، پھر شہر کی تمام دولت ایک جگہ جمع کر کے آگ لگا دیں گے اور مسلمانوں کے جتنے مقدس مقامات ہیں ان سب کو تباہ و برباد کر دیں گے، پھر ہم تلواریں کھینچ کر شہر کے تمام دروازے کھول دیں گے اور جب آپ شہر میں داخل ہوں گے تو وہاں آپ کو کوئی متنفس نظر نہ آئے گا اس لیے ہم اپنی بیوی بچوں کے ساتھ یروشلم کے تمام مسلمانوں کو بھی تہ تیغ کر دیں گے۔ یہاں تک کہ شہر میں آپ کو کوئی چرند پرند بھی نہیں ملے گا۔"

نصرانیوں کے انکار سے سلطان کو غصہ تو بہت آیا تھا۔ لیکن وہ بیت المقدس میں اس طرح کی بربادی بھی نہیں چاہتا تھا۔ چنانچہ سلطان نے نصرانیوں سے اس شرط پر صلح کی کہ بیت المقدس سے نکلنے والا ہر مرد دس دینار، عورت پانچ دینار اور بچہ دو دینار ادا کرے۔ اس طرح بیت المقدس سے چالیس دن کے اندر اندر جو نکل سکتا ہے نکل جائے۔ اس میعاد کے بعد جو نصرانی بیت المقدس میں پایا جائے گا اُسے غلام بنا لیا جائے گا۔

اس قرارداد کے بعد مسلمان ۲۷ رجب ۵۸۳ ہجری (ستمبر ۱۱۸۷ء) بروز جمعہ بیت المقدس میں داخل ہوئے اور اکیانوے سال بعد خدا کا یہ پاک گھر اس کے حقیقی پاسبانوں کے حوالے ہوا۔ یہ کتنا عجیب اتفاق ہے کہ ۲۷ رجب معراج نبوی کی تاریخ ہے اور معراج مبارک نے بیت المقدس کو جو نسبت ہے اس سے ہر مسلمان واقف ہے۔۔۔ مگر افسوس کہ مسلمان اس ارضِ مقدس پر قبضہ برقرار نہ رکھ سکے اور آج اس سرزمین پر نصرانیوں کے بجائے یہودی قابض ہیں اور انہوں نے وہاں کے اصل باشندوں یعنی فلسطینیوں کو دربدر کر رکھا ہے۔

بیت المقدس کے در و دیوار اور مسجد اقصیٰ کے مینار آج پھر کسی صلاح الدین کو آواز دے رہے ہیں۔ دیکھتے ہیں کہ صلاح الدین کس سرزمین سے اُٹھتا ہے۔

"قارئین کرام! اگلے چند ابواب میں اس عظیم صلیبی جنگ کا حال بیان کیا جائے گا جو سلطان صلاح الدین اور پورے دول یورپ کے نصرانیوں کے درمیان لڑی گئی۔ اس صلیبی جنگ کا نام "تیسری صلیبی جنگ" ہے۔ اسے صلاح الدین اور رچرڈ جنگ بھی کہا جاتا ہے۔

معرکہ حطین کے بعد ہی یروشلم کی قسمت کا فیصلہ ہو گیا۔ حق و باطل کے اس معرکہ میں عیسائی متحدہ طاقت کا خاتمہ ہو گیا تھا۔ ان کے تمام بڑے بڑے سردار نائٹس، ہاسپٹلرز اور ٹمپلرز یہاں تک کہ قلعے کے سردار اور والیان ریاست تک گرفتار ہو گئے تھے؛ دردہ تمام اس وقت مسلمانوں کے قبضہ میں تھے۔ سوائے کرک کے قلعہ کے والی ریجی نالڈ کے۔ یہ بدذات فرنگی، مسلمانوں کا جانی دشمن تھا۔ اس کم بخت نے مدینۃ النبی کو تباہ کر کے روضۂ رسول کو اکھاڑ پھینکنے کا ارادہ کیا تھا اور لشکر لے کر عرب کے ساحل تک پہنچ بھی گیا تھا۔ اس نے حضورِ اقدس ﷺ کی شان میں جو گستاخ الفاظ ادا کیے تھے ان کو سُن کر سلطان نے ریجی نالڈ کا سر اپنے ہاتھ سے قلم کرنے کی قسم کھائی اور اس کے بعد اپنا لشکر لے کر ریجی نالڈ سے جنگ کرنے نکلا اور آخر کار سلطان کو ایک طویل جنگ کے بعد فتح حاصل ہوئی۔ گرفتاریوں کے بعد سلطان نے باقی تمام والیان ریاست کو معاف کر دیا مگر ریجی نالڈ کو اپنی تلوار ہی سے قتل کر کے قسم پوری کی۔ سلطان نے یروشلم میں داخل ہونے کے بعد کسی قسم کی انتقامی کارروائی نہیں کی بلکہ حکم دے دیا کہ ارض فلسطین اور خاص کر بیت المقدس کے تقدس کا پورا پورا احترام کیا جائے اور جس طرح حرم مدینہ اور حرم کعبہ میں خون نہیں بہایا جا سکتا اسی طرح اگر بیت المقدس میں کسی نے نکسیر بھی پھوڑی تو وہ سزا کا مستحق ہوگا۔

مشہور ہے کہ کسی مقام کو فتح کرنا اتنا مشکل نہیں جتنا مشکل اور دشوار اس پر قبضہ برقرار رکھنا ہے۔ اس کی بہترین مثال مسلمانوں کا اکیانوے سال (۹۱) بعد بیت المقدس پر قبضہ ہے۔ کیونکہ اس قبضہ کے ردعمل پر ہی تیسری صلیبی جنگ شروع ہوئی تھی جس میں ایک طرف پورا دول یورپ یعنی انگلستان، فرانس، جرمنی، سلطنت روم مشرقی اور سلطنت روم مغربی، سسلی، قبرص۔ شام کی تمام عیسائی حکومتیں یعنی انطاکیہ، یروشلم، قیساریہ، غرض یورپ اور ایشیا کی کوئی ایسی سلطنت نہ تھی جس نے تیسری صلیبی جنگ میں براہ راست یا بالواسطہ حصہ لیا نہ ہو اور یہ پورا دول یورپ اور ایشیا کی عیسائی ریاستیں محض ایک شخص کے خلاف متحد ہوئی تھیں۔ وہ شخص تھا مجاہدِ اعظم صلاح الدین ایوبی۔ صلاح الدین ایوبی نے جس بہادری اور شجاعت سے اس متحدہ طاقت سے نہ صرف مقابلہ کیا بلکہ اُسے شکست سے دوچار کر کے واپس جانے پر مجبور کر دیا۔ اس کے ذکر سے پہلے یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ بیت المقدس اور ارضِ فلسطین کے تاریخی واقعات پر ایک طائرانہ نظر ڈال لی جائے۔

بیت المقدس، جہاں اُمتِ محمدیؐ ان گنت قربانیوں کے باوجود آج بھی بے خانماں دکھائی دیتی ہے۔ یہ دُنیا کے ان شہروں میں سے ایک ہے جنہیں نوعِ انسانی تکریم اور عزت کی نظر سے دیکھتی ہے۔ یہاں کا ذرہ ذرہ قابلِ احترام ہے۔ اللہ کے بڑے بڑے انبیاءؑ اسی سرزمین پر پیدا ہوئے۔ اور انہوں نے اللہ کی یکتائی اور وحدانیت کا درس دیا۔ مسلمان ہو کہ عیسائی یا یہودی سب کے لیے یہ یکساں طور پر متبرک مقام ہے۔ بیت المقدس مسلمانوں کا قبلۂ اول ہے۔ حضورِ اکرم نبیٔ پاک صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم ہجرتِ مدینہ کے بعد سترہ ماہ (۱۷) تک بیت المقدس کی طرف رُخ کر کے نماز پڑھتے رہے۔ حضورؐ کے سفرِ معراج کی پہلی منزل بیت المقدس ہے۔ یہیں پر حضورؐ نے تمام انبیائے کرام کی امامت فرمائی تھی اور اسی بیت المقدس میں حضرت داؤدؑ اور حضرت سلیمانؑ کا مدفن ہے۔ حضرت عیسیٰؑ کی مہد اور لحد بھی اسی مقام کو کہا جاتا ہے۔

اس بات کا خیال رکھیے کہ عیسائیوں کے عقیدے کے تحت حضرت عیسیٰؑ اسی جگہ مصلوب ہو کر یہیں دفن ہوئے ہیں جبکہ مسلمانوں کا عقیدہ ہے کہ حضرت عیسیٰؑ زندہ آسمانوں کی طرف اٹھائے گئے تھے۔

یہاں کی بلند ترین پہاڑی کا نام "زیتون" ہے جو بحیرہ روم سے چھبیس سو فٹ اور بحیرہ مُردار سے پینتیس سو فٹ بلند ہے اس طرح بحیرۂ روم کا یہاں سے فاصلہ ۳۲ میل اور بحیرۂ مُردار صرف دس میل دُور ہے۔ اس سطح مرتفع کے کئی مقامات پر چونے کا پتھر پایا جاتا ہے۔ شہر کے جنوب گلابی اور سفید رنگ کا سنگِ مرمر زمین کی بہت گہرائی تک پایا جاتا ہے۔ یہ سینا گروس یا کیدرون کا سنگِ مرمر کہتے ہیں۔ اس کے قریب ہی نرم سفید چونے کا پتھر ہے جو زمین کی چالیس فٹ گہرائی تک پایا جاتا ہے، پھر گہری چاک کی سخت سطح ہے۔ کوہِ زیتون اسی طرح کے پتھر سے بنا ہے۔

عجیب بات یہ ہے کہ یہ شہر نہ تو کسی دریا پر آباد ہے

اور نہ کسی دریا کے کنارے واقع ہے یہ بھی نہیں کہ بیت المقدس سے کوئی تجارتی شاہراہ گزرتی ہو۔ ان باتوں کی عدم موجودگی کے باوجود اس شہر میں آج تک قحط نہیں پڑا اور یہ تین ہزار سال سے موجود ہے۔ اس شہر کی آبادی کو ہزام المدراج یعنی دریائے جیحون سے لائے چشموں سے پانی حاصل ہوتا تھا۔۔ پھر یہ چشمے بیکار ہو گئے۔ گھروں میں حوض بنانے کا رواج عام تھا جس میں برسات کا پانی بھر جایا کرتا تھا اور اسے صاف کر کے استعمال کیا جاتا تھا۔

ہر سال لاکھوں کی تعداد میں یہاں زیارتوں کو دیکھنے آتے ہیں۔ زیارتوں کی تعداد اس قدر زیادہ ہے کہ گائیڈ کی مدد کے بغیر انہیں دیکھا نہیں جا سکتا۔ زائرین شہر کے گرد و نواح کو دیکھ کر حیران رہ جاتے ہیں کیونکہ شہر کے گرد و نواح میں بنجر وادیاں اور بغیر سبزے کے پہاڑیاں ہی دکھتے ہیں یہ شہر تین ہزار تین سو سال قدیم ہے۔ اس کی قسمت میں تباہی اور بربادی لکھی ہے۔ اس کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ بیس مرتبہ اس کا محاصرہ ہوا۔ اٹھارہ بار اسے از سر نو تعمیر کیا گیا۔ دو مرتبہ تو اسے زمین کے برابر کر دیا گیا تھا۔ ہادریان اور بخت نصر کے زمانہ میں اس پر سخت قیامت گزری اور اس کی اینٹ سے اینٹ بجا دی گئی۔

بیت المقدس پر چھ مذہب کے پیروکاروں نے حکومت کی۔ ایک وقت تو اس پر اس قدر سخت آیا کہ شہر میں کوئی مکان باقی نہ رہا۔ گلی کوچے برباد اور ویران ہو گئے۔ یہاں کے باشندوں کو قتل کر دیا گیا یا انہیں جنگلوں میں مار بھگایا گیا تھا۔۔۔۔

بیت المقدس کے کئی نام ہیں اور چھ مذہبی ادوار میں اس کے نام تبدیل ہوتے رہے۔ یہودی اور عیسائی اسے آج بھی یروشلم کہتے ہیں۔ اس کا پرانا نام جبیس ہے۔ حضرت داؤدؑ کے زمانہ میں اس کا نام یروشلم کیا گیا مگر یہودی ربیوں نے اس کا تعلق حضرت ابراہیمؑ سے ملانے کے لیے اس کا نام جریح بتایا اور اس میں "شلم" کا اضافہ شلم یا شالیم بادشاہ نے کیا جو دو ہزار آٹھ سال قبل مسیح (۲۰۰۸ ق م) یہاں کا حاکم تھا۔

ایک یہ بھی روایت ہے کہ قیصر ہادریان نے اسے یہودیوں سے خالی کرانے کے بعد اس کا نام "ایلیا کاپی تولینا" رکھا۔ یہ واقعہ ۱۳۰ء کا ہے۔ اس نام کا پہلا لفظ ایلیا تو باقی رہا، باقی کو بے معنی کہہ کر ختم کر دیا گیا۔۔۔ طرف رہتا ہے۔

فرنگی مصنف لکھتے ہیں کہ صلیبی دور میں یروشلم عیاشی، فحاشی اور بدکاری کا مرکز بن گیا تھا سلطان صلاح الدین نے اسے فتح کر کے عیسائیوں کو امن و امان دیا اور ان ستر ہزار مسلمانوں کے خون کا انتقام نہ لیا جو ایک صدی پہلے بیت المقدس صلیبیوں کے ہاتھوں ذبح کر دیئے گئے تھے۔

تاریخ یہ بھی بتاتی ہے کہ سلطان صلاح الدین کے فرمان کے مطابق جب بیت المقدس سے جانے والے جا چکے تو سلطان ۲۷ رجب بروز جمعہ ۵۸۳ ہجری مطابق اکتوبر ۱۱۸۷ء ہلالی پرچم اڑاتا بیت المقدس میں داخل ہوا مسجد عمر اور دیگر مقامات پر عیسائیوں نے صلیبیں جو نصب کی تھیں وہ سب اتاری گئیں اور ان کی جگہ ہلالی پرچم لہرایا گیا۔

وہ صبح جلیل
جب کفر کے علم سرنگوں ہوئے
نعمت الٰہی میں روپوش ہوئے
وہ صبح امید
اسلام کی حیات تازہ کی نوید
نور الٰہی کی درخشندہ وعید

تاریخ بتاتی ہے کہ مصر میں سلطان کا اقتدار قائم ہوتے ہی دنیائے افرنگ میں تشویش پیدا ہو گئی تھی اور اسی وقت سے اندلس، سسلی اور فرانس کی حکومتوں میں سفارتی گھوڑے دوڑنا شروع ہو گئے تھے فرنگیوں میں اتحاد تو پیدا ہو گیا لیکن انکی امداد اسی وقت پہنچی جب بیت المقدس پر اسلامی پرچم لہرا دیا گیا تھا فرنگیوں نے بوکھلا کر دمیاط پر حملہ کر دیا لیکن وہاں سے مار بھگائے گئے۔

سلطان صلاح الدین کی پیدائش قلعہ تکریت میں ۵۳۲ھ مطابق ۱۱۳۸ء میں ہوئی تھی اس کی پیدائش سے دس سال پہلے فلسطین اور شام میں لاطینی ریاست اپنے عروج پر تھی اور بالائی علاقہ یعنی الجزیرہ وغیرہ ان کی جولانگاہ بنے رہتے تھے اور مریدین سے منبر لسعر ان کے حملے ہوتے رہتے تھے جب سلطان نور الدین زنگی کی وفات کے بعد سلطان صلاح الدین تخت اقتدار پر متمکن ہوا تو فلسطین اور شام کے امرا باہم خانہ جنگیوں میں مصروف تھے مسلمانوں کا یہ مختصر علاقہ دمشق، حلب، الرہا اور موصل وغیرہ کی چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں تقسیم تھا لیکن سلطان صلاح الدین نے ۱۱۸۳ء تک دجلہ سے نیل تک تمام ریاستوں کو مفتوح یا جگز و بنا کر متحد کر دیا تھا۔

سلطان اور فرنگیوں کے درمیان لڑائی کا آغاز طبریہ کے

میدان سے ہولے جنگ طبریہ میں فرنگیوں کا جو انجام ہوا اس کا اندازہ ایک چشم دید گواہ کے بیان سے ہوتا ہے وہ کہتا ہے۔

جو شخص میدان جنگ میں پڑی لاشوں پر نظر دوڑاتا تو اسے یوں محسوس ہوتا جیسے تمام کے تمام فرنگی مارے گئے ہیں اور اگر وہ قیدیوں پر نظر ڈالتا تو ان کی کثرت سے یہ اندازہ ہوتا کہ سارے فرنگی قید ہوگئے ہیں۔

پھر سلطان نے بیت المقدس کی طرف پیش قدمی کی اور بیت المقدس پر قبضہ عیسائی ریاست کے تابوت میں آخری کیل ثابت ہوا۔ فتح بیت المقدس کے بعد غازی اسلام صلاح الدین نے مسجد اقصیٰ اور قبۃ الصخرہ کو نجاستوں سے پاک کرنے کا حکم دیا عیسائیوں نے ان کی دیواروں پر حضرت عیسیٰ اور حضرت مریم کی خیالی تصاویر بنا رکھی تھیں سلطان نے ان تصاویر کو صاف کرا کے فرش اور دیواروں کو گلاب دمشقی سے دھلوا کے پاک کرایا اور مسلمانوں کو عام حکم ہوا کہ آئندہ جمعہ کو وہاں نماز ادا کریں۔ چنانچہ ۵۸۳ھ کو قاضی محی الدین محمد بن علی الشافعی نے خطبہ دیا اور نماز پڑھائی۔ سلطان بیس روز شہر میں مقیم رہا پھر صور کی طرف روانہ ہوا۔

سلطان کے فلسطین اور بیت المقدس پر قبضہ سے پہلے وہاں کی جو حالت تھی اس کے لیے ولیم آف ٹائر کہتا ہے۔

"سارے فلسطین میں ایک عورت بھی نہیں جسے باعصمت کہا جائے۔ صلیبیوں اور گرجا کے راہبوں کی زندگی میں جو تضاد تھا اس کے بارے میں اس کا بیان ہے "عام صلیبی محنت و مشقت کی زندگی بسر کرتے تھے مگر گرجوں میں روز بروز دولت کے ڈھیر لگتے جاتے تھے اسقف اعلم ہر قلیس کے صندوق سیم و زر سے بھرتے جاتے تھے وہ دولت کا پجاری تھا اس کی زندگی حرص و ہوس کا افسانہ تھی وہ زمین جو کلیسا کی ملکیت تھی رفتہ رفتہ ہیکل کے محافظوں (ٹمپلرز اور ہاسپٹیلرز) جیسی نیم مذہبی اور نیم فوجی تنظیموں کے تصرف میں چلی گئی تھیں سرزمین قدس کے یہ خادم اس کے حقیقی مالک بن بیٹھے تھے یہ جماعتیں براہ راست پاپائے روم کے ماتحت تھیں قانون کے مجرم ان کے یہاں پناہ لے کر محفوظ ہو جاتے تھے۔"

یکم نومبر ۱۱۸۷ء کو سلطان نے اپنے لشکر کو صور کی طرف روانہ کیا اور بارہ دن بعد خود بھی بیت المقدس سے صور پہنچ گیا۔ صور بحر روم پر فلسطین کا ایک محفوظ قلعہ تھا۔ چار ماہ پیشتر بھی سلطان نے اس قلعہ کا محاصرہ کیا اور قلعہ فتح ہونے والا تھا کہ ایک ایسا واقعہ پیش آیا جس نے نہ صرف قلعہ صور کو اس وقت سلطان کے مضبوط ہاتھوں سے بچالیا بلکہ اس وقت بھی وہ اونچا پہاڑ بن کے سلطان کے راستہ میں کھڑا ہو گیا۔

سلطان صلاح الدین ایوبی کے اس دوسرے محاصرہ کا حال بیان کرنے سے پہلے قلعہ صور کے پہلے محاصرے کا حال بیان کرنا ضروری ہے اس لیے کہ قلعہ صور کے دونوں محاصروں نے نہ صرف سلطانی لشکر پر اثر ڈالا بلکہ وہ آئندہ چل کے تیسری صلیبی جنگ کے موقعہ پر صلیبیوں کے لیے بھی ایک مصیبت ثابت ہوا تھا آئیے اب ہم قلعہ صور کے پہلے محاصرہ کا مختصر حال بیان کرتے ہیں۔

بیت المقدس کی فتح سے تقریباً تین ماہ پہلے یعنی ۸ جولائی ۱۱۸۷ء کو سلطان عکہ کی فصیل کے سامنے موجود تھا پھر اس کے دو دن بعد سلطان نے عکہ کی اس مسجد میں نماز ادا کی جسے نوے سال پہلے کلیسا میں تبدیل کر دیا گیا تھا۔ مسجد کو کلیسا میں تبدیل کر دینے کے وقت سے اب تک ساحل فلسطین پر پہلی بار نماز ادا کی گئی تھی۔ سلطان نے عکہ سے بھی نہایت نرم شرطوں پر معاہدہ کر کے اسے حاصل کیا عکہ میں اس وقت چار ہزار مسلمان قید و بند کی سختیاں بھگت رہے تھے انہیں آزادی نصیب ہوئی عکہ پر قبضہ سے بحر روم کی منڈی کے دروازے مسلمانوں پر کھل گئے یہاں اس قدر دولت میسر آئی کہ سامان جنگ کی تمام کمی پوری ہوئی اور افواج کو انعام واکرام سے نوازا گیا۔

سلطان نے اندرون ملک فتوحات کے لیے الگ الگ لشکر روانہ کیے اور مصر میں اپنے بھائی ملک العادل کو اطلاع بھجوائی کہ وہ مصری لشکر لے کر فلسطین کی تسخیر میں حصہ لینے فوراً پہنچے سلطانی دستوں نے فوراً فتوحات کا آغاز کیا نیز کرتو، منصوریہ اور الفولہ تسخیر ہونے ساحل پر حیفہ اور قیاریہ کو فتح کیا گیا۔ سبقہ اور نابلس پر بھی جلدی قبضہ ہو گیا ملک العادل مصر سے روانہ ہوا اور اس نے آتے ہی قلعہ میرابیل اور یافہ لے لیا سلطان نے اس دوران تورون کا محاصرہ کرنے کے بعد فتح کیا پھر ساحل پر سرفندہ، صیدون، بیروت، جبیل فتح کیے تورون اور بیروت پر کچھ مقابلہ ہوا سلطان نے عام طور پر شہریوں کے لیے باعزت شرائط پیش کیں اور قلعے اور شہر کے دروازے کھل گئے ان فتوحات سے عیسائیوں کو یہ تجربہ ہو گیا مسلمان مجاہدین پر اعتبار کیا جا سکتا ہے۔

اس تمہید کی ضرورت اس وجہ سے محسوس ہوئی کہ قلعہ اور شہر صور کے وہ حالات بیان کیے جائیں جس کی وجہ سے دو ماہ پہلے صور فتح نہ ہو سکا تھا۔ تاریخ بتاتی ہے کہ اگر عکہ کی فتح کے فوراً بعد صور پر حملہ کر دیا جاتا تو اس کا فتح ہو جانا یقینی تھا۔ سلطان نے فلسطین کے تقریباً تمام شہر فتح کر لیے تھے صرف بحر روم کے ساحل

کے تین شہر صور، عسقلان، اور بیت المقدس باقی تھے۔ ان میں سے عسقلان اور بیت المقدس بعد میں تسخیر ہوئے مگر صور اس وقت سر نہ ہو سکا تھا۔ سلطان نے صور کا محاصرہ کر لیا تھا مگر وہ صور پر کوئی شدید حملہ نہیں کر رہا تھا وہ یہ بھی نہیں چاہتا تھا کہ صور کا محاصرہ طویل ہو۔ اس سے پہلے کئی قلعہ اور شہر بات چیت کے ذریعہ سلطان کو حاصل ہو گئے تھے۔ صور کے معاملہ میں بھی اس کی یہی پالیسی معلوم ہوتی تھی۔ صور کا فتح ہو جانا یوں بھی آسان معلوم ہو رہا تھا کہ کاؤنٹ ریمانڈ طرابلس چلا گیا تھا مگر وہ زندہ نہ رہ سکا اور جلد ہی مر گیا۔ انطاکیہ کا شہزادہ اس کا جانشین ہوا مگر وہ صور کی فوجی طاقت نہ بڑھا سکا۔

ارنول لکھتا ہے کہ جب ریجی نالڈ اور کمانڈر نے دیکھا کہ صور سے تمام نائٹس چلے گئے ہیں اور سامان رسد کی بھی کمی ہے تو ان لوگوں نے سلطان کے پاس سفارت بھیجی اور درخواست کی کہ اگر سلطان محاصرہ اٹھا لے تو دوسرے قلعوں کی طرح صور ان کے حوالے کر دیا جائے گا۔ مقصد یہ تھا کہ صور والوں کو بھی اپنا سامان لے کر نکل جانے کی اجازت دی جائے۔ سلطان پہلے ہی کئی قلعوں کے سلسلہ میں یہ رعایت دے چکا تھا اس لیے اس نے منظور کر لیا سلطان کو صور کی فتح کا اس قدر یقین ہو گیا تھا کہ اس نے قلعہ کی سفارت کے ساتھ دو اسلامی پرچم بھی بھجوائے کہ انہیں برجوں پر لگوا دیا جائے اور قلعہ والوں نے اظہار اطاعت میں اسلامی پرچم صور کے برجوں پر لہرائے تھے لیکن صور میں ایک ایسا غیر معمولی واقعہ پیش آیا جس نے نہ صرف شہر کو مسلمانوں کے ہاتھ سے بچا لیا بلکہ شام کے ساحلی علاقہ کا مستقبل بھی بدل کر رکھ دیا۔

کہتے ہیں اٹلی کا ایک مہم جو جنگ آزما نوجوان جس کا نام کونریڈ تھا جسے مانٹ فرانٹ کا حکمراں کہا گیا ہے اس نے جب اطالوی اور بیزنطینی معرکوں میں نام پیدا کیا تو وہ مشرقی سلطنت روم جس کا دارالسلطنت قسطنطنیہ تھا (قسطنطنیہ اس وقت مسلمانوں کے قبضہ میں نہیں آیا تھا) وہاں پہنچا مگر جوش جوانی میں اس نے قسطنطنیہ کے ایک شخص کو قتل کر دیا اور کئی جنگی جہاز لے کر قسطنطنیہ سے فرار ہو گیا (اس کی تفصیل بعد میں بیان ہو گی) کونریڈ نے اپنے فرار کو یہ کہہ کر چھپایا تھا وہ بیت المقدس کی زیارت کو جا رہا ہے۔ سلطان صلاح الدین کی بیت المقدس کی خبر ابھی قسطنطنیہ میں نہیں پہنچی تھی اور کونریڈ اس خیال میں تھا کہ بیت المقدس پر شاہ یروشلم لوسگنان کی حکمرانی ہے۔

کونریڈ نے اس خیال سے کہ عکہ پر عیسائیوں کا قبضہ ہے اپنے بحری بیڑے کے ساتھ عکہ کے ساحل کے قریب پہنچا۔ عکہ میں نصرانی تسلط کے دوران یہ قاعدہ تھا کہ جب کوئی جہاز عکہ کی طرف آتا دکھائی دیتا تو بندرگاہ اور شہر کی تمام گھنٹیاں جو اسی مقصد کے لیے لگائی گئی تھیں ایک ساتھ بجنا شروع ہو جاتی تھیں اور ساحل پر کھڑی ہوئی کشتیاں فوراً جہاز کی طرف استقبال اور دریافت حال کے لیے چل پڑتی تھیں کونریڈ اس سے پہلے کئی بار عکہ آ چکا تھا اور دستور سے واقف تھا۔ اس دفعہ جو اس نے عکہ کی گھنٹیاں خاموش دیکھیں اور ساحل سے کوئی کشتی بھی بحری بیڑے کی طرف آتی نہ دکھائی دی تو اس کا ماتھا ٹھنکا۔ جنگ کا تو آغاز ہو ہی چکا تھا وہ بڑا چالاک اور دور اندیش تھا وہ فوراً اپنے بحری بیڑے کو دور سمندر میں ہٹا لے گیا اور اس نے فیصلہ کیا کہ صحیح حالات معلوم کئے بغیر وہ بندرگاہ پر نہیں اترے گا۔

اس دوران مسلمانوں کی دیدبان کشتیوں نے کونریڈ کے بحری بیڑے کو آتے دیکھ لیا اور ایک مسلمان بحری افسر کشتی پر بیٹھ کے بحری بیڑے کی طرف چل پڑا۔ کونریڈ نے بھی کشتی آتی دیکھ لی اور خود بھی ایک کشتی پر بیٹھ کے دریافت حال کے لئے روانہ ہوا۔ دونوں کشتیاں سمندر کے درمیان ملیں۔

چالاک کونریڈ نے مسلمان افسر کو دیکھتے ہی پہچان لیا اور وہ سمجھ گیا کہ دال میں کچھ کالا ہے ادھر مسلمان افسر نے اپنی کشتی کونریڈ کی کشتی سے بھڑا دی اور سوال کیا۔

"یہ جہاز کہاں سے آ رہا ہے اور کس طرف جانا چاہتا ہے؟"

کونریڈ نے سنبھل کر جواب دیا "ہم سوداگر ہیں اور جہازوں پر سوداگری مال لدا ہوا ہے"

"پھر جہاز گہرے سمندر میں کیوں کھڑے ہیں۔ ساحل پر کیوں نہیں اتارتے؟" بحری افسر نے کونریڈ کو گھورتے ہوئے سوال کیا۔

"دراصل ہمارے ساتھ سوداگری سامان ہے چونکہ جنگ کا زمانہ ہے اور ہمیں یہ نہیں معلوم کہ بندرگاہ پر کس کا قبضہ ہے اور ہمارا سامان محفوظ بھی رہے گا کہ نہیں؟"

بحری افسر نے اطمینان سے جواب دیا "بے فکر ہو کے جہاز ساحل پر لے آؤ۔ عکہ پر سلطان صلاح الدین کا قبضہ ہے سلطان کے تمام مقبوضہ علاقے بالکل محفوظ ہیں عسقلان اور بیت المقدس پر بھی سلطان کا قبضہ ہو چکا ہے فلسطین کے تقریباً پورے ساحل پر مسلمان قابض ہو چکے ہیں تم بے شک اطمینان سے سامان اتارو اور اسے فروخت کرو"

"ہائے کیا یروشلم پر مسلمانوں کا قبضہ ہو گیا؟" یہ آواز

ملاحوں میں سے ایک ملاح کی تھی جو کونریڈ کی کشتی کو لائے تھے۔

مسلمان افسر کے کان کھڑے ہو گئے اور قبل اس کے کہ وہ کونریڈ سے سوال و جواب کرے اس نے ملاحوں کو واپسی کا اشارہ کیا کونریڈ کی کشتی واپس ہوئی اور بڑی تیزی سے اپنے بحری بیڑے کی طرف بھاگنے لگی۔

"احمق۔ بے وقوف۔ تجھے ذرا بھی صبر نہ ہو سکا۔ جب معلوم ہو گیا تھا کہ وہ مسلمان افسر ہے پھر اس کے سامنے رونے چلانے کی کیا ضرورت تھی"۔ کونریڈ نے ملاح کو پھٹکارا پھر کونریڈ کشتی سے جہاز پر جلدی سے اوپر چڑھا اور لنگر اٹھانے کا حکم دے دیا۔

سلمان بحری افسر پہلے تو ملاحوں کے روتے اور منہ بسورتے چہرے حیرت سے دیکھتا رہا مگر جب کونریڈ کی کشتی تیزی سے واپس ہوئی تو اسے اپنے فرض کا احساس ہوا اور وہ بھی کشتی واپس ساحل کی طرف لے چلا وہاں پہنچ کے اس نے فوجی حکام سے عیسائی بحری بیڑے کے بارے میں بات چیت کی اور دم کے دم میں چار بحری جہاز گہرے سمندر کی طرف بڑھے جہاں عیسائی بحری بیڑا لنگر انداز تھا لیکن ان کے پہنچنے سے پہلے کونریڈ اپنے بیڑے کو لے کر شمال کی طرف روانہ ہو چکا تھا سلطان صلاح الدین نے مصر سے لشکر کے علاوہ بحری بیڑے کو بھی طلب کیا تھا اور وہ بیڑہ اس وقت عکہ کے ساحل پر لنگر انداز تھا۔

کونریڈ اپنے بیڑے کے ساتھ صور کے بندرگاہ پر پہنچا یہ وہ رات تھی جس کی صبح کو صور کے شہری سلطان کو صور کا قبضہ دینے والے تھے اہل شہر نے عیسائی بحری بیڑے کو دیکھا تو ان کی خوشی کا ٹھکانہ نہ رہا اس وقت صور میں کوئی قابل ذکر سردار یا شہزادہ موجود نہ تھا شہریوں نے کونریڈ کو گھیر لیا اور اس سے درخواست کی کہ وہ صور کی کمان سنبھالے اور اسے مسلمانوں سے بچائے۔ کونریڈ دیر تک اس مسئلے پر غور کرتا رہا ادھر شہریوں کا اصرار بڑھتا رہا اور ادھر کونریڈ حالات پر غور کرتا رہا ایک طرف صور کی بلا شرکت غیرے ریاست اور امارت تھی دوسری طرف سلطان صلاح الدین سے مقابلہ۔ وہ صلاح الدین جس نے یروشلم جیسی عظیم سلطنت کو الٹ دیا تھا۔ کونریڈ نے جوا کھیلنے کا فیصلہ کیا صور میں فوجوں کی کمی نہ تھی کیونکہ جو شہر اور قلعے مسلمانوں کے قبضے میں چلے گئے تھے وہاں کے شہری اور فوجی بھاگ کے صور میں پناہ گزیں ہونے آ گئے تھے۔

کونریڈ نے سوچا کہ اگر وہ مسلمانوں کے حملے کو نہ روک سکا تو وہ اپنے بحری بیڑے میں مع اپنے ساتھیوں کے کسی اور طرف روانہ ہو جائے گا اور اگر اس نے مسلمانوں کا حملہ روک لیا تو پھر صور تو اس کے قبضہ میں رہے گا ہی اس کے علاوہ بھی وہ اور ہاتھ پیر مارے گا اور ممکن ہے کہ وہ عیسائیوں سے نکلے ہوئے علاقوں پر قابض ہو سکے مگر وہ شہریوں اور فوجیوں سے پکا عہد لینا چاہتا تھا تاکہ وہ اسے دھوکا نہ دے سکیں۔

صور کے شہریوں کی نمائندگی کوتوال شہر کر رہا تھا۔ کونریڈ نے بڑے غور و فکر کے بعد کوتوال شہر کو طلب کیا "میں صور کو بچانے کے لیے تیار ہوں۔ میں فوجیوں کو سامان حرب بھی دوں گا اور جتنی رقم کی ضرورت ہو گی میں خرچ کروں گا اس کے لیے تمہیں مجھ سے کچھ وعدے کرنا پڑیں گے"۔

"ہم آپ کی ہر شرط ماننے کے لیے تیار ہیں اور جو عہد چاہیں گے ہم وہ عہد کرنے پر بھی تیار ہیں"۔ شہر کوتوال نے بڑے وثوق کے ساتھ جواب دیا "آپ فرمائیے ہمیں کیا عہد کرنا ہے"۔

"سب سے پہلے تو آپ کو یہ عہد کرنا ہو گا کہ صور کو کسی صورت میں بھی مسلمانوں کے حوالے نہ کریں گے بلکہ اپنے خون کے آخری قطرے تک اس کی حفاظت کرتے رہیں گے"۔ کونریڈ نے انہیں بتایا۔ صور میں ایک چھوٹا پادری موجود تھا وہ آگے بڑھ کے آیا "مار کونیس کونریڈ میں صلیب پر ہاتھ رکھ کر عہد کرتا ہوں کہ صور پر قربان ہو جاؤں گا"۔ صور کے شہریوں نے کونریڈ کو پورے تعاون کا یقین دلایا۔

کونریڈ نے اس طرف سے مطمئن ہونے کے بعد کہا "اب میں سر سالار کی حیثیت سے صور کی حفاظت کروں گا لیکن یہ یاد رکھو کہ اگر میں صور کو بچانے میں کامیاب ہو گیا تو صور پر میری حکومت ہو گی ان شہزادوں اور سرداروں کو تم اپنا حاکم تسلیم نہیں کرو گے جو تمہیں دشمن کے ہاتھوں میں بے یار و مددگار چھوڑ کر چلے گئے ہیں"۔

"ہم وعدہ کرتے ہیں اور قسم کھاتے ہیں کہ صور کا حاکم سوائے مار کونس کونریڈ کے کسی اور کو نہ ہونے دیں گے"۔ پادری نے شہریوں کی طرف سے قسم کھائی اور حلف اٹھایا۔

رات یقین دہانیوں اور عہد و پیمان کے بعد کونریڈ نے ان تمام غیر مسلح فوجیوں کو مسلح کیا جو دوسرے مقامات سے شکست کھا کر صور میں پناہ حاصل کئے ہوئے تھے کونریڈ کے بحری بیڑے پر اس قدر اسلحہ موجود تھا ایک ماہ تک محاصرہ میں استعمال ہو سکتا تھا۔ فوجیوں کو مسلح کرنے کے بعد اس نے صور کے ان جوانوں کو مسلح ہونے کی دعوت دی جو مادر وطن پر قربان ہونا چاہتے تھے۔

جوق در جوق مسلح ہوئے اور انہوں نے ملک کے لیے جان
عہد کیا اس طرح صور کی وہ آبادی جو چند گھنٹے پہلے بے
رکسی میری کی حالت میں تھی ان میں بڑا جوش و خروش
لیا۔

کونریڈ نے صور کے برجوں پر دو اسلامی جھنڈے لہرائے ہوئے تھے جب اسے قلعہ والوں کی طرف سے اطمینان ہو گیا تو دونوں اسلامی جھنڈوں کو برجوں سے اتار کر خندق میں دیا صور کے قلعہ کے گرد ایک گہری خندق تھی اب کونریڈ فوج کا سپہ سالار تھا اور وہاں کا بادشاہ بھی۔ صور میں بھی کافی اسلحہ پڑا ہوا تھا کونریڈ نے اپنے آدمی لگا کر اس اسلحہ د بنایا سنگ باری کرنے والی چھوٹی بڑی جتنی منجنیقیں تھیں فصیل پر چڑھا کے ان کا رخ سلطان صلاح الدین کی نے والی فوجوں کی طرف کر دیا کونریڈ تمام رات فوج کے صیلوں کو مضبوط کرنے میں لگا رہا اور جب سویرا ہوا تو لشکر نے دیکھا کہ صور کی فصیلوں کے محافظ چاق و چوبند یں اور حملے اور جوابی حملے کے لیے بالکل تیار ہیں۔

سلطان صلاح الدین کو اطلاع دی گئی کہ صور والوں نے اسلامی رات ہونے سے پہلے برجوں پر لگا دیے تھے مگر اب وہ اتار دیے گئے ہیں اور فصیل پر فوج پھرے جانے گہری طان اپنے خیمہ سے نکل کر آگے پہنچا تو قلعہ والوں کی دیکھ کر حیران رہ گیا اس کی سمجھ میں یہی آیا کہ قلعہ کو کسی سے زبردست کمک مل گئی ہے۔ بیت المقدس پر قبضہ کو ہی روز گزرے تھے کہ اس کے دوسرے ملک سے کمک تو ابھی سوال پیدا نہ ہوتا تھا مگر یہ ضرور خیال ہوتا تھا کہ ہلاحل کئے ہوئے صور کی یہ تیاری کسی طرح ممکن نہیں۔

سلطان دوپہر تک انتظار کرتا رہا کہ شاید قلعہ کی طرف د جنبانی شروع ہو مگر اُدھر سے کوئی نہ آیا۔ سلطان نے بعد ے سوار کو قلعہ کی طرف بھیجا کہ وہ قلعہ والوں کے ارادے کے جواب لائے۔ اس سفارت کا فرض سلطان نے اپنے تقی الدین بن شاہان شاہ کے سپرد کیا۔ تقی الدین دو روز پہلے علاقوں کی فتوحات کے بعد واپس آیا تھا۔

تقی الدین نیزے پر سفید پرچم لگا کر گھوڑا اڑاتا ہوا قلعہ صور کے دروازے پر پہنچا چونکہ نیزہ پر سفید پرچم یعنی امن کا اس لیے صدر دروازے کا چھوٹا دروازہ کھول کر سفیر کو اندر تقی الدین نے اندر پہنچ کر اِدھر اُدھر نظر دوڑائیں تو گیا صدر دروازے کے اندر کی طرف سے دائیں بائیں اور سامنے کی طرف سڑکیں جا رہی تھیں اور ان سڑکوں کے دونوں طرف حد نظر تک نیزہ بردار اور شمشیر بکف سوار تھے۔ اوپر فصیلوں پر اس قدر محافظ اور تیر انداز موجود تھے جن کا شمار کرنا مشکل تھا۔

ایک سوار گھوڑا بڑھا کر تقی الدین کے پاس آیا۔

"خوش آمدید امن کے سفیر"۔ سوار نے ادب سے کہا۔

تقی الدین قلعہ کا سامان دیکھ کر حیران ہو رہا تھا۔ اس نے سوار کی طرف پلٹ کر پرعب لہجے میں کہا۔ "میں تمہارے قلعہ دار سے گفتگو کرنا چاہتا ہوں۔ مجھے اس کے پاس لے چلو۔"

"معزز سفیر۔ اب اس قلعہ کا کوئی قلعہ دار نہیں" سوار نے نہایت بے خوفی سے جواب دیا۔

"تو پھر تم مجھے اپنے سپہ سالار کے پاس لے چلو" تقی الدین کا لہجہ قدرے تحکمانہ تھا۔

"مجھے افسوس ہے سفیر کہ قلعہ کا کوئی سپہ سالار نہیں"۔ سوار بہت پرسکون اور مطمئن دکھائی دے رہا تھا۔

تقی الدین کو گمان ہوا کہ سوار شاید اس کا مذاق اڑا رہا ہے۔

وہ چڑ کر بولا "سوار تم سلطان عالی مقام کے سفیر کا مذاق اڑا رہے ہو۔ میں سلطان کا نمائندہ ہوں اور کسی ذمہ دار شخص سے گفتگو کرنا چاہتا ہوں اور تم کہتے ہو کہ یہاں کوئی نہیں پھر قلعہ کی حکومت کس کے سپرد ہے؟"

"معزز سفیر" سوار نے ٹھہرے لہجے میں کہا "آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے کہ میں آپ سے مذاق کر رہا ہوں میں سفیر اور سفارت کے رتبے سے واقف ہوں اس لئے میں نے آپ کے سوالوں کا نہایت ادب سے جواب دیا ہے۔ یہ بالکل سچ ہے کہ اس قلعہ میں نہ کوئی قلعہ دار ہے اور نہ کوئی سپہ سالار۔ جہاں تک کسی ذمہ دار شخص کا تعلق ہے تو میں آپ کو یہ بتاتے ہوئے خوشی محسوس کرتا ہوں کہ قلعہ صور اور بندرگاہ کی باگ ڈور ہمارے مارکوئیس کونریڈ کے ہاتھ میں ہے جو یہاں کے کلی طور پر مالک اور بادشاہ ہیں۔ آپ ارشاد فرمائیں تو میں آپ کو ان کے پاس لئے چلتا ہوں"۔

"ٹھیک ہے مجھے وہیں لے چلو۔"

سوار سرہلا کے آگے آگے چلنے لگا۔ تقی الدین نے اپنا گھوڑا اس کے عقب میں لگا دیا۔ سوار نے اپنا گھوڑا ایک سنگی بارہ دری کے سامنے روکا۔

"معزز ایلچی، اجازت لے کر واپس آتا ہوں"۔ سوار یہ کہہ کر بارہ دری میں چلا گیا۔

تقی الدین گھوڑے سے اتر کر اس کا انتظار کرنے

گا۔ تھوڑی دیر بعد سوار بارہ دری سے واپس آگیا۔

"آپ میرے ساتھ تشریف لائیے۔ مارکوئیس آپ کا انتظار کر رہے ہیں"۔

سوار نے تقی الدین کو اپنے ساتھ آنے کا اشارہ کیا اور سفارت کو ساتھ لے کر پھر بارہ دری میں داخل ہوا۔ راہداری میں تقی الدین کو کھڑا کر کے وہ سامنے کے کمرے میں داخل ہوا پھر فوراً ہی واپس آ کے بولا۔

"آجائیے معزز سفیر"۔

تقی الدین اور سوار دونوں آگے پیچھے کمرے میں داخل ہوئے۔ تقی الدین نے دیکھا کہ کمرے میں ایک لانبے قد کا جوان تنہا ایک کرسی پر بیٹھا ہے اس کے دائیں بائیں دو دو کرسیاں بچھی ہیں۔ اس نے کھڑے ہو کر تقی الدین کا استقبال کیا۔

"میں سلطان کے سفیر کو خوش آمدید کہتا ہوں۔ فرمائیے میں سلطان کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟"

تقی الدین نے بغیر کسی تمہید کے کہا "سلطان معظم نے دریافت فرمایا ہے کہ اسلامی جھنڈوں کو قلعہ کے برجوں سے کیوں اتار گیا ہے؟"

"سلطان سے ہماری طرف سے عرض کیا جائے کہ قلعہ پر جھنڈا اس کا لہراتا ہے جس کا قبضہ ہو۔ صور پر میرا قبضہ ہے اور میں صلیب مقدس کا پرستار ہوں اس لئے برجوں پر صلیبیں نصب کی گئی ہیں"۔ مارکوئیس کا لہجہ پرسکون تھا۔

"مگر کل تک تو صور والے صلح کے لئے بھاگ رہے تھے" تقی الدین نے حالات کی تبدیلی کا احساس کرتے ہوئے کہا "سلطان عالی مقام نے صور والوں کی جان ومال کی حفاظت کی ضمانت بھی دے دی تھی مگر اب یہ اچانک تبدیلی کیوں؟ کیا یہ وعدہ خلافی اور عہد شکنی نہیں۔ فرمانروائے قلعہ کو عہد شکنی کے انجام پر بھی نظر رکھنی چاہئے"۔

"تم صرف سفیر ہو اور ایک سفیر کو یہ سلیقہ ہونا چاہیئے کہ کسی فرمانروا سے کس طرح گفتگو کی جاتی ہے"۔ مارکوئیس نے تقی الدین کو مرعوب کرنے کی کوشش کی۔

تقی الدین نے واپس ہوتے ہوئے کہا "فرمانروا کا شکوہ بجا ہے۔ سفیر کو واقعی ایک فرمانروا سے بات کرنے کا سلیقہ ہونا چاہیئے مگر سفیر، سفیر میں بھی فرق ہوتا ہے۔ اس وقت سلطان صلاح الدین کا سفیر کوئی معمولی سفیر نہیں بلکہ سلطان کا برادر زادہ وہ محمد تقی الدین عمر ابن شاہان شاہ ہے جو ہر صلیبی حکمران، ہر فرمانروا کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے گفتگو کر سکتا ہے"۔

مارکوئیس نے چونک کے تقی الدین کو دیکھا "آپ۔ آپ سلطان کے برادر زادے ہیں میں میں اپنے الفاظ واپس چاہتا ہوں"۔

"کوئی بات نہیں مارکوئیس" تقی الدین نے بات کرنے کی کوشش کی "منہ سے نکلی بات پرائی ہو جاتی ہے تمہیں کہنا تھا وہ کہہ چکے ہو اور مجھے جو دریافت کرنا تھا اس کا مجھے جواب مل گیا اب صور کا فیصلہ نوک شمشیر سے ہی ہوگا"۔

"میں اسلامی لشکر کے ایک عظیم سردار سے پھر معا خواستگار ہوں" مارکوئیس کا لہجہ یکسر تبدیل ہو گیا تھا "ب صور کا فیصلہ نوک شمشیر سے ہی ہوگا اور میں اس سے کم طرح آمادہ بھی نہیں ہو سکتا لیکن شاہوں اور شہزادوں کی عزت صورت برقرار رہنا چاہیے۔ مجھے معلوم ہوا ہے کہ آپ کے نے کئی ممالک کے حکمرانوں اور بادشاہوں کو پابہ زنجیر کر......

"غلط بات مت کہو مارکوئیس" تقی الدین نے قطع کلا تمام نصرانی فرمانروا اور سردار ہمارے مہمان ہیں۔ ہمارا زنجیریں تو کسی معمولی مجرم کو بھی نہیں پہنواتا"۔

"سفیر۔ اگر آپ کو ناگوار گزرا ہے تو میں یہ الفاظ بھی لیتا ہوں...... مارکوئیس نے اخلاق کا مظاہرہ کیا۔ "مگر مسلم آپ اپنے سلطان کو یہ ضرور مشورہ دیجئے گا کہ وہ اب صور سے اٹھا لے کیونکہ کل تک مسلمانوں کے سامنے ہاتھ پھیلانے وا اب پہلا صور نہیں آپ نے ہماری تیاریاں دیکھ لی ہیں اگر سا سامان رسد کے ذخائر دیکھنا ہوں تو ہمارے ساتھ چلئے ہم آپ کو تیاریوں کی ایک جھلک خود بھی دکھانا چاہتے ہیں"۔

"کل کچھ زیادہ دور نہیں مارکوئیس کل تمہاری تیاریا تمہاری تلواروں کی کاٹ میدان میں دیکھیں گے" تقی الد کہتا ہوا باہر آگیا۔

اسے یہاں لانے والا سردار اس کے ساتھ ہی باہر آگیا ت الدین نے چونکہ اپنی شخصیت کا اظہار کر دیا تھا اس لیے وہ مرعوب دکھائی دے رہا تھا تقی الدین عمر اور ملک العادل د مسلم سردار تھے جن کے نام سے نصرانی سپاہی تک واقف تھے نے سلطانی سفیر اور ایک عظیم سردار کو بڑی عزت سے ر کیا۔

سلطان صلاح الدین اپنے خیمہ میں بیٹھا تقی الد واپسی کا انتظار کر رہا تھا اس کے تمام بڑے بڑے سردار بھی ساتھ بیٹھے تھے خادم نے تقی الدین کے واپس آنے کی اطلاع سلطان نے اسے فوراً طلب کر لیا۔ تقی الدین نے حاضر ہو کر

بش کیا۔

"کیسں تقی الدین قلعہ والوں کا دماغ اک دم کیسں خراب ہوگیا" سلطان نے نرمی سے دریافت کیا "یہ نصرانی آخر اس قدر بد عہد کیوں ہوتے ہیں؟"

"عالیجاہ۔ ڈوبتے کو تنکے کا سہارا" تقی الدین نے سلطان کو بتایا "صور میں اس وقت فلسطین کا کوئی نصرانی سردار یا فرمانروا موجود نہیں بلکہ ان کی جگہ یورپ کا ایک سردار یا کسی ملک کا فرمانروا مارکوئیس کونریڈ صور پر قابض ہے وہ اپنے ساتھ بڑا بس لشکر لایا ہے جو صور کی سڑکوں اور فصیلوں پر پھیلا ہوا ہے شاید اس لشکر کے زور پر صور والوں نے ہمارے پرچم اتار کر برجوں پر صلیبیں چڑھادی ہیں۔"

"اس کی طاقت کا تم نے کیا اندازہ کیا ہے" سلطان نے پوچھا۔ "کیا حطین سے زیادہ سخت مقابلہ ہوسکتا ہے؟"

سلطان کو تو صور کی طرف سے اس قدر اطمینان ہو گیا تھا کہ اس نے اسلامی جھنڈے بھی نصب کرنے کے لئے بھجوادیے تھے مگر صور والوں نے نہ صرف وہ جھنڈے برجوں سے نوچ پھینکے تھے بلکہ فصیلوں پر چڑھائی ہوئی منجنیقیں ان کے جنگی ارادوں کو ظاہر کررہی تھیں چنانچہ سلطان کو از سر نو حملہ کی تیاریاں کرنا پڑیں۔

سلطان صلاح الدین دو دن کی تیاری کے بعد صور پر شدید حملے کا حکم دے دیا ادھر صور والوں نے شہر اور قلعہ کے گرد خندق کو پہلے ہی سے گہرا کر لیا تھا صور کے تین طرف پانی تھا جو تھی سمت ایک پتلی سی زمین کی پٹی اسے سمندر سے جدا کرتی تھی۔ صور والوں نے اسے کاٹنا شروع کر دیا صلاح الدین نے یہ اطلاع ملتے ہی ایک تیر انداز دستے کو اس طرف تعینات کر دیا تھا جس نے تیروں کی بوچھاڑ کر کے خشکی کاٹنے کا کام روک دیا تھا سلطان کی فوجوں نے صور پر شدید سنگ باری کرائی۔ کئی جگہ خندقیں پاٹ کے فصیل تک پہنچنے کی کوشش بھی کی گئی مگر کونریڈ کی یورپ سے ساتھ آئی ہوئی تربیت یافتہ فوج نے ہر حملہ اور ہر کوشش ناکام بنادی۔

صور پر حملے کرتے ہوئے چار دن ہوگئے تھے لیکن صور کی مدافعت میں کوئی کمزوری پیدا نہیں ہوئی تھی۔ سلطان کا اصل مقصد "بیت المقدس" کی بازیابی تھی اس لئے وہ طویل محاصروں کے خلاف تھا پھر اس کی فوج میں بھی کچھ بے چینی پیدا ہورہی تھی نصرانیوں سے جنگ طویل سے طویل تر ہوتی جارہی تھی اور اس کے خاتمہ کے آثار نظر نہ آتے تھے شاید انہی باتوں کے پیش نظر سلطان نے صور کا محاصرہ ختم کر دیا اور لشکر لے کر عسقلان کی طرف چلا گیا۔

سلطان کے مورخ بہاء الدین نے صور سے محاصرہ اٹھانے کا یہ سبب بیان کیا ہے کہ سلطان کا لشکر شام کے تقریباً پورے ساحلی علاقے پر پھیلا ہوا تھا اور اس نے اپنی مرضی سے لوٹ مار شروع کر دی تھی اس کے علاوہ لشکر تھک چکا تھا اور جنگ ختم ہوتے نظر نہ آتی تھی لیکن یہ وجہ زیادہ معتبر معلوم نہیں ہوتی۔ بلکہ اس سلسلہ میں ابن اثیر کا بیان زیادہ قابل قیاس ہے وہ لکھتا ہے۔

"عسقلان اور یروشلم (بیت المقدس) کا فتح کرنا بھی اشد ضروری تھا کیونکہ وہ مصر اور شام کے درمیان آمد و رفت میں مزاحم ہوتے تھے۔"

سلطان صلاح الدین کے صور کا محاصرہ اٹھانے کی اصل وجہ یہی معلوم ہوتی تھی واضح رہے کہ اس وقت تک عسقلان اور بیت المقدس فتح نہیں ہوئے تھے۔ پس سلطان صور سے محاصرہ اٹھا کر مغربی سرحد کی طرف بڑھا اور رملہ، آئی بیلن اور دارم پر قبضہ کرنے کے بعد اس نے عسقلان کا محاصرہ کرنا شروع کر دیا۔ اس کے بعد کا حال یعنی عسقلان اور (بیت المقدس) کی فتح کی تفصیل ہم پہلے بیان کر چکے ہیں۔

اس جملہ معترضہ کے بعد ہم صور کے دوسرے محاصرے کی طرف پھر آتے ہیں۔ بیت المقدس اور عسقلان فتح ہو چکے تھے صور کے جنوبی قلعوں میں الشوبک، صفد، کوکب اور کرک میں برائے نام نصرانی فوج موجود تھی اور ان قلعوں پر کسی وقت بھی قبضہ کیا جاسکتا تھا لیکن پورے فلسطین میں صرف صور کا ایک ایسا قلعہ تھا جو سلطان کے قبضہ میں اب تک نہ آسکا تھا حالانکہ اس کا پہلے بھی محاصرہ کیا گیا تھا جو بعض مجبوریوں کی وجہ سے اٹھانا پڑا تھا سلطان صلاح الدین یکم نومبر ۱۱۸۷ء کو اپنی فوج صور روانہ کی پھر بارہ دن بعد خود فوج کی کمان کرنے صور پہنچ گیا۔

سلطان جتنا بڑا جنگجو اور عظیم مجاہد تھا اتنا ہی وہ دل کا نرم اور بے انتہا خدا ترس انسان تھا اس کی فتوحات کی تفصیل بڑی طویل ہے لیکن ان تمام فتوحات میں ایک بات مشترک نظر آتی ہے سلطان نے جس قلعہ یا شہر پر حملہ کیا پہلے اس کے سامنے صلح کی شرط پیش کی اس کی سب سے زیادہ نرم شرط یہ تھی کہ قلعہ دار یا فرمانروا اپنا سامان لے کر قلعہ یا شہر خالی کر دے۔ حکمرانوں کے ساتھ عام شہریوں اور فوجیوں کے لئے بھی اس کا یہی اعلان ہوتا تھا کہ وہ شہر خالی کردیں یا معمولی ٹیکس دے کر مفتوحہ شہر میں رہ سکتے ہیں اس کا نتیجہ یہ ہوا تھا کہ جو قلعہ یا شہر سلطان کے قبضہ میں آتا اس کے باسی کیا شہری اور کیا فوجی وہ سب اپنا سامان، بشور کے کسی محفوظ نصرانی قلعہ کا رخ کرتے تھے پھر جب اس قلعہ پر بھی

سلطان کا حملہ ہوتا تو وہ کسی اور قلعہ میں منتقل ہو جاتے۔

اس طرح فتح بیت المقدس کے بعد شامی ساحل پر نصرانیوں کا قریب ترین قلعہ صور تھا جہاں تمام نصرانی قلعوں کے لوگ آ کر پناہ گزیں ہو گئے تھے اب سلطان چاہتا تھا کہ نصرانیوں کے اس آخری سہارے پر قبضہ کر کے بلاد الشر میں انہیں پورے فلسطین سے بے دخل کر دے یہ بات جس طرح صلاح الدین کے ذہن میں تھی اس طرح صور والوں کو بھی یہ بات معلوم تھی کہ صرف یہی ان کا آخری سہارا ہے اور اس کی تباہی کے بعد انہیں ارض فسلطین پر کسی اور جگہ سر چھپانے کی جگہ نہ مل سکے گی۔

صور والوں کے علاوہ کونریڈ کو بھی یہ بات اچھی طرح معلوم تھی کہ صور کے ہاتھ سے نکلنے کے بعد شام و فسلطین ہی کیا اسے پورے ایشیا میں کسی جگہ بھی پناہ نہیں مل سکے گی۔ یورپ وہ یوں بھی واپس نہیں جا سکتا تھا۔ اٹلی اور قسطنطنیہ میں عیاشی اور مکاری کے ایسے ایسے کارنامے انجام دیے تھے وہاں کے لوگ اسے دیکھتے ہی قتل کر دینے پر تیار ہو جاتے اس لیے کونریڈ اس کے بحری بیڑے اور اہل صور نے صور کی دفاعی پوزیشن مضبوط کرنے میں اپنی جانیں لڑا دی تھیں۔ انہیں معلوم تھا کہ سلطان نے صور کا پہلا محاصرہ نہ معلوم کن وجوہات کی بنا پر اٹھا لیا تھا لیکن اب وہ بغیر صور حاصل کیے واپس نہ جائے گا اس لیے صور کا محاصرہ دوسرا حطین کا محاذ جنگ بن گیا تھا۔ صور کی فصیل کے گرد خندق گہری اور زیادہ چوڑی کر دی گئی تھی اور خندق کے اس پار فصیل کے آگے مٹی کے ٹیلے بنا کر ان پر تیر انداز بٹھائے گئے تھے تاکہ خندق پار کرنے والوں کو نشانہ بنائیں۔

اس طرح فصیل کے اوپر تھوڑی تھوڑی دور پر منجنیقیں لگائی گئی تھی مارکوئیس کونریڈ کا بحری بیڑا ساحل کی حفاظت کر رہا تھا صور کا دفاع اس قدر مضبوط بنا دیا گیا تھا جسے توڑنا ناممکن نظر آتا تھا صور ایک ایسے جزیرہ میں تبدیل ہو گیا جسے ایک تنگ حاکنائے کے ذریعہ خشکی سے ملایا گیا تھا۔ اس تنگ راستے کو بھی روکنے کے لیے خندق کے کنارے اور کشتیوں پر تیر انداز مقرر کئے تھے اس تنگ حاکنائے سے برابر برابر دو تین آدمیوں سے زیادہ ایک وقت میں لوگ گزر نہ سکتے تھے۔

صور پر پورے اہتمام کے ساتھ حملہ شروع کیا گیا۔ مصر، حلب اور حمص کے لشکر سلطان کے بھائی العادل، بھتیجے تقی الدین اور دو بیٹوں الفاضل اور الظاہر کی زیر کمان سلطان کی مدد کو موجود تھے۔ سلطانی لشکر کی سترہ منجنیقوں نے رات دن فصیل پر سنگ باری شروع کی۔ حاکنائے کے راستے پر بھی کچھ فوجیوں نے خندق پار کرنے کی کوشش کی مگر اس راستے کے دونوں طرف تیر انداز گھات لگائے بیٹھے تھے انہوں نے فوجیوں کی یہ کوشش بیکار کر دی۔ منجنیقوں سے پھینکے ہوئے پتھر بھی کچھ زیادہ کام نہ کرتے تھے فصیل کو سرنگ لگا کر اڑانا بھی ممکن نہ تھا کہ بیچ میں گہری خندق تھی اور خندق کے نیچے سے فصیل تک سرنگ پہنچانا بھی ناممکن تھا۔

سلطان نے جلد ہی محسوس کر لیا کہ صور پر جلد قبضہ ممکن نہیں اور اس کے حصول کے لیے ایک طویل محاصرے کی ضرورت ہو گی اسے ایک بار صور کے محاصرے میں ناکامی ہو چکی تھی نصرانیوں کا بحری بیڑا بھی ساحل پر موجود تھا سلطان نے عکہ میں ٹھہرے ہوئے اسلامی بحری بیڑے کو طلب کیا اسلامی بیڑے میں کل دس جہاز تھے اتنے ہی جہاز کونریڈ کے بھی تھے۔ اسلامی بیڑے کے اڈے سے بحری اور بری دونوں جنگیں شروع ہوئیں۔ جنگ اتنی شدید تھی کہ رات دن کی تمیز ختم ہو گئی تھی صور والوں کے ایک تو حوصلے بڑھے ہوئے تھے انہوں نے سلطان کا پہلا محاصرہ ناکام بنا دیا تھا اور دوسرے یہ کہ یہ محاصرہ ان کی موت زندگی کا مسئلہ تھا صور پر سلطان کا قبضہ اہل صور کی کھلی ہوئی موت تھی کیونکہ سلطان قبضہ کے بعد اپنی پہلی ناکامی کا حساب لے گا۔

ایک روایت یہ بھی ہے کہ صور کی تیسری سمت خشکی کی جو چھوٹی سی پٹی تھی صور والوں نے اسے توڑ کے خندق کو سمندر سے ملا دیا۔ اس طرح صور ایک جزیرہ کی صورت اختیار کر گیا اب فصیل تک پہنچنے کا سوال ہی نہ پیدا ہوتا تھا مگر اس کمی کو سلطان کے بحری بیڑے نے پورا کر دیا۔ بحری بیڑہ امیر البحر لولو کے زیر کمان تھا اس نے صور کے بحری بیڑے پر اس قدر سخت حملہ کیا کہ وہ سمندر چھوڑ کے صور کے ساحل سے آ لگا تھا اس طرح صور والوں کی بحری سرگرمیاں دفاع میں تبدیل ہو گئیں۔

کچھ امید ہو چلی تھی کہ شاید بحری بیڑے کی مدد سے صور پر قبضہ ہو جائے کہ مسلمانوں سے ایک سخت غلطی ہو گئی۔ جنگ کے دوران ایک لمحہ کی غفلت جنگ کا رخ بدل دیتی ہے۔ ہوا یہ کہ دن بھر بحری اور بری جنگ ہوتی تھی اور رات کو دونوں محاذوں پر خاموشی طاری ہو جاتی تھی لیکن درپردہ وہ تو جنگ جاری رہتی تھی۔ اس روز بھی یہی ہوا صبح سے شام تک شدید جنگ ہوتی رہی پھر رات ہوئی اور پہرے چوکی کا انتظام حسب معمول جاری ہوا۔ دیکھ بھال اور رات کو گشت کرنے والے اپنے اپنے کام اور مقام پر لگ گئے مگر مسلمانوں کی بدقسمتی کہ وہ نصف شب کے

بعد غافل ہو گئے۔ اس غفلت کے شکار بحری گشت والے ہوئے۔ اہل صور کا بحری بیڑا صرف مدافعت کر رہا تھا اور ساحل کے ساتھ لگ کر کھڑا رہتا تھا کھلے سمندر میں آنے کی اس کی ہمت نہ ہوتی تھی لیکن مارکوئیس کا بیڑہ بھی بڑے تجربہ کار لوگوں پر مشتمل تھا وہ دب کر ساحل پر آ تو گئے تھے مگر گھات میں لگے تھے اور موقعہ کی تلاش میں تھے۔

پھر اس رات انہیں موقعہ مل گیا مسلمان بحری بیڑے والے ذرا سے غافل ہو گئے کہا جاتا ہے کہ وہ سو گئے تھے مگر یہ بات قابل یقین نہیں معلوم ہوتی اس لیے کہ پہریدار خواہ خشکی کے ہوں خواہ سمندر کے۔ ان کا کام تو جاگنا ہوتا ہے بہرحال ان سے غفلت ہوئی اور اس غفلت سے دشمن نے فائدہ اٹھایا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ امیر البحر لولو کے دس جہازوں میں سے پانچ میں بیک وقت آگ بھڑک اٹھی۔ آگ بھڑکنے کا مطلب ہی یہ تھا کہ دشمن کے آدمی کسی نہ کسی طرح مسلمانوں کے بحری بیڑے تک پہنچے اور انہوں نے پانچ جہازوں میں آگ لگا دی۔

صرف آگ بجھانے کا مسئلہ نہ تھا ایک طرف تو آگ بجھانا تو دوسری طرف دشمن کے جہازوں نے ساحل سے نکل کر مسلم بحری بیڑے پر حملہ کر دیا۔ اب ایک طرف پانچ جہازوں کی آگ بجھائی جا رہی تھی تو دوسری طرف دشمن کے بحری بیڑے کا حملہ۔ مسلمان بحری بیڑہ دہرے عذاب میں مبتلا ہو گیا تھا پھر بھی امیر البحر نے پانچ جہازوں سے یعنی آدھی بحری طاقت سے مارکوئیس کی پوری بحری طاقت سے حملہ مقابلہ شروع کیا مگر کب تک آخر اسے شمال کی طرف پسپا ہونا پڑا مگر اس پسپائی میں بھی اسے زبردست نقصان اٹھانا پڑا۔

مارکوئیس کے جہاز مسلم بحری بیڑے کے دوگنے سے بھی زیادہ تھے انہوں نے شاید پورے مسلم بیڑے کو تباہ کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا اس لیے انہوں نے مسلم بیڑے کو سمندر میں چاروں طرف سے گھیر لیا اس وقت مسلمانوں کی چھوٹی چھوٹی کشتیوں اور غوطہ خوروں نے بڑا کام کیا سلطان نے چھوٹی چھوٹی تیز رفتار کشتیوں اور غوطہ خوروں کو اپنے بیڑے کی طرف روانہ کیا اور امیر البحر کو پیغام بھیجا کہ وہ باقی جہازوں کو کسی طرح بچا کر شمال کی طرف نکل جائے۔

مسلم غوطہ خور بحری بیڑے تک پہنچ گئے امیر البحر کو سلطان کا حکم بھی مل گیا مگر اسے دشمن کے بیڑے نے اس بری طرح سے گھیرا تھا کہ اسے جان بچانا مشکل ہو رہا تھا۔ اس نے فوراً اور تیزی کے ساتھ شمال کی طرف پسپائی اختیار کی۔ اس کے ساتھ اس نے دشمن کے جہازوں کا حلقہ توڑنے کی بھی کوشش کی آخر امیر البحر ایک سخت جدوجہد کے بعد ساحل کے قریب آنے میں کامیاب بھی ہو گیا۔

مسلم بحری بیڑے پر اتنا شدید دباؤ تھا کہ اس کے بنائے کچھ نہ بن پڑا تھا۔ آ با دھاپی میں اسلامی بیڑے کے تین جہاز خشکی پر چڑھ گئے دشمن تعاقب میں تھا اس نے فوراً خشکی پر چڑھتے ہوئے ان جہازوں میں بھی آگ لگا دی۔ صرف دو جنگی جہاز بچ سکے جنہیں مسلمان بیروت لے کر پہنچ سکے ظاہر ہے کہ مسلمانوں کا بحری بیڑہ تباہ ہو کر رہ گیا تھا مسلمانوں کو دونوں محاذوں پر شکست کا سامنا تھا۔ بحری طاقت تو ختم ہو گئی تھی اور خشکی کے راستے صور پر حملے کا کوئی نتیجہ نہ نکل رہا تھا۔

صور پر حملہ نے عیسائیوں کو نقصان پہنچانے کے بجائے کچھ فائدہ ہی پہنچایا تھا حالات سے ظاہر ہو رہا تھا کہ صور کے محاصرہ کو زیادہ طول دینے سے کچھ حاصل نہ ہوگا چونکہ یہ مسئلہ گہری سوچ اور فکر کا تقاضا کرتا تھا اس لیے سلطان نے مجلس شوریٰ طلب کر لی۔ سلطان کے لشکر میں دو طرح کی افواج تھیں ایک تو وہ سلطان کے مفتوحہ علاقوں مثلاً، حلب، حمص، موصل، حماۃ، اور مصر سے آئی تھیں یہ افواج اپنے اپنے علاقائی فرمارواؤں اور گورنر کے زیر کمان تھیں ان لوگوں کے دلوں میں اپنے علاقوں سے محبت اور فرمانرواؤں کی عزت کا خیال تھا اس کے علاوہ وہ یہ بھی جانتے تھے کہ یہ اسلام اور عیسائیت کی جنگ ہے جو مسلمانوں کے لیے جہاد تھا اس لیے یہ لوگ سر سے کفن باندھ کے لڑتے اور شہادت کی دل میں آرزو رکھتے تھے۔

دوسری فوج غیر مستقل رضاکاروں پر مشتمل تھی ان افواج کی تعداد مستقل افواج سے بھی زیادہ تھی ان کی بہادری اور شجاعت پر کوئی شبہ نہیں کیا جاسکتا اور بعض اوقات تو یہ اس قدر سرفروشانہ انداز میں یلغار کرتے تھے کہ سلطان دیکھتا رہ جاتا تھا یہ لوگ اگرچہ جہاد کے جذبہ سے بھی سرشار تھے لیکن ان کی جنگ کا طریقہ کچھ مختلف تھا یہ رضاکار افواج یلغار، جنگ اور فتح کے قائل تھے یہ فتح حاصل کرنے کی دھن میں پہاڑوں سے ٹکرا جاتے تھے تیروں کی بارش میں بے دھڑک کود جاتے میدان جنگ میں اپنے مدمقابل کو زیادہ دیر نہ ٹھہرنے دیتے تھے لیکن یہ طویل محاصرہ سے کاہل اور کسی حد تک پست ہمت ہو جاتے تھے فصیلیں کا انتظار کھڑے کھودنا اور مورچوں میں چھپے رہنا انہیں قطعی پسند نہ تھا۔

ان افواج میں سب سے بڑا عیب یہ تھا کہ خراب موسم خاص طور پر موسم سرما اور برف باری کے زمانہ میں انہیں باہر

میدان میں گھمسان لڑنا کے بیٹھنے سے الجھن ہوتی تھی۔ کٹائی اور بوائی کے زمانہ میں یہ لوگ اپنے بال بچوں اور یار دوستوں میں بیٹھنا زیادہ پسند کرتے تھے اور اگر ان پر زور ڈالا جاتا تو ان کے باغی ہونے کا خدشہ پیدا ہو جاتا تھا۔ چنانچہ کچھ ایسی ہی صورت حال سلطان کی شوریٰ میں پیش آئی۔

"میرے سردارو اور جاں نثارو" سلطان کا دل افسردہ تھا اور اس کے الفاظ سے اس کا اظہار ہو رہا تھا۔ "ہمارے آدمیوں کی ذرا سی غفلت سے ہمارا مضبوط اور عظیم بیڑا برباد ہو گیا۔ تعجب ہوتا ہے کہ اس قدر ہوشیار بحری عملہ کس طرح سو گیا دشمن نے ہمارے پانچ جہازوں پر قبضہ کر لیا (ایک بیان میں یہ بھی ہے کہ پانچ جہازوں میں آگ نہیں لگی تھی بلکہ کونریڈ کے جہازوں نے ان پر قبضہ کر لیا تھا۔

"عالیجاہ" سلطان کا سپہ سالار اور بھائی ملک العادل سینہ تان کر بولا "انسان غلطی کا پتلا ہے آج تک ہمارے بحری بیڑے نے کسی سے شکست نہیں کھائی تھی مگر پتا نہیں انہیں کیسے نیند آ گئی اور وہ دشمن کی طرف سے کس طرح اتنے غافل ہو گئے کہ پانچ جہازوں کو اس وقت خبر ہوئی جب ان پر دشمن قبضہ کر چکا تھا۔

والی موصل نے اور زیادہ جوش سے کہا۔ "کوئی بات نہیں عالیجاہ۔ جنگ میں فتح و شکست کے پیمانے بدلتے ہی رہتے ہیں بیس جنگوں کے بعد اگر ایک جنگ میں ہمیں نقصان اٹھانا پڑے تو اس پر افسوس نہ ہونا چاہیے۔ صور کا ہم اب بھی محاصرہ کئے ہوئے ہیں اور اہل قلعہ میں ہمت نہیں کہ وہ باہر نکل کر جنگ کر سکیں بحری بیڑے کی تباہی کا نقصان ہم جلد ہی پورا کر لیں گے چند ہی دنوں میں نیا بیڑا تیار ہو جائے گا پھر سمندر میں انہیں دوبارہ شکست دیں گے صور پر قبضہ اس لیے بھی ضروری ہے کہ ساحل فلسطین پر یہ آخری بندرگاہ ہے جہاں سے عیسائیوں کو سمندری راستے سے کمک مل سکتی ہے"۔

ایک سردار نے دبے الفاظ میں کہا "محترم ملک العادل نے صحیح فرمایا۔ ہم جلدی ہی نیا بحری بیڑہ تیار کر لیں گے اس وقت موسم بھی خراب ہے اور برف باری شروع ہونے والی ہے اس موسم میں ہمارے گھوڑے بیمار ہو جاتے ہیں"۔

یہ دراصل فرار کا اظہار تھا لشکر کے بعض سردار جنہیں غیر منظم رضاکاروں کی حمایت حاصل تھی۔ رضاکار خود سلطان سے گفتگو نہ کر سکتے تھے چنانچہ انہوں نے اپنی آواز ان سرداروں کے ذریعہ دربار میں پہنچائی جو خود بھی اپنے گھر جانا چاہتے تھے۔

جب بات نکل ہی پڑی تو ایک دوسرے سردار نے اس ذرا اور کھل کے بات آگے بڑھائی سردار نے ٹھیک ہے۔ موسم میں گھوڑے بیمار ہو جاتے ہیں پھر سردی بھی سخت شروع ہو گئی ہے پورے لشکر کو اس قلعہ کے محاصرے میں لگا کے بٹھا دینا کچھ مناسب نہیں معلوم ہوتا۔ ہم سلطان کے حکم کی ہر حال میں تابعداری کریں گے۔ سلطان نے مشورہ طلب کیا ہے تو میں نے کہا ہے ورنہ میری وہی رائے ہے جس کا حکم سلطان صا[illegible] فرمائیں گے۔

سلطان نہایت خاموشی سے سردار کی باتیں سن رہا [illegible] مندرجہ بالا سرداروں کی باتوں سے اس نے سمجھ لیا کہ رضاکاروں کی رائے میں محاصرہ اٹھا کر واپس جانا چاہیے مگر اس نے کوئی تبصرہ [illegible] کیا لیکن ملک العادل سے برداشت نہ ہو سکا وہ تڑپ کے بولا۔

"عالیجاہ" مجھے ان سرداروں پر افسوس ہوتا ہے جو میدان جنگ میں بزدلی کی باتیں کرتے ہیں" سلطان نے محسوس کر لیا کہ بات بگڑ رہی ہے اور اگر اس نے دخل نہ دیا تو ملک العادل کسی کسی سردار سے لڑ پڑے گا۔ سلطان نے اپنا ہاتھ بلند کر دیا اس کا مطلب یہ تھا کہ سب لوگ خاموش ہو جائیں کیونکہ وہ خود بولنے والا تھا۔

سلطان نے اپنے سرداروں پر طائرانہ نظر ڈالی پھر کہا "ہم نے مجلس مشورت میں مختلف سرداروں کی باتیں سنیں اور خیالات کا اندازہ لگایا۔ مصر، شام، اور الجزیرہ کی افواج کو ان کے مقامات پر واپس جانے کا حکم دیا جاتا ہے صور کا محاصرہ تا حکم ثانی ختم کیا جاتا ہے کوئی فوری ضرورت ہوئی تو انہیں طلب کر لیا جائے گا" سلطان کے مختصر حکم نے تمام لوگوں کے منہ بند کر دیے سلطان نے محاصرہ اٹھانے کی کوئی وجہ نہیں بتائی۔ اندازہ یہی ہے کہ رضاکاروں کی گھر واپس جانے کی زبردست خواہش نے سلطان کو اس طرح کا فیصلہ کرنے پر مجبور کیا ہو گا مگر یہ ضروری نہیں کہ سلطان کی واپسی کی صرف یہی وجہ ہو اس کے علاوہ بھی اور وجوہات موجود تھیں بہرحال مورخوں نے سلطان کے اس اقدام کی تعریف نہیں کی ابن اثیر کا لہجہ بہت سخت ہے اس نے نہ صرف سخت الفاظ میں اس فیصلہ کی مذمت کی ہے بلکہ وہ اس قدر شدت پسند ہو گیا کہ اس نے سلطان کے اس اقدام کو حقارت کی نظر سے دیکھا ہے۔

o-o-o-o

صور کا محاصرہ ختم کر دیا گیا مصر الجزیرہ اور شام کی فوجیں روانہ ہو گئیں پھر سلطان کا خیمہ سمیٹ لیا گیا اور سامان بار کیا گیا قلعہ صور کے

برجوں اور فصیل پر لوگ گردن جھکائے بڑی حیرانی اور دلچسپی سے یہ منظر دیکھ رہے تھے مارکوئیس نے اگرچہ سخت مقابلہ کیا تھا۔ مسلمانوں کا اسلامی بیڑہ تباہ ہو گیا تھا لیکن کونزیڈ کو پھر بھی یقین نہ تھا اس نے مرج کرطین کے واقعات سن رکھے تھے اور یہ بھی معلوم تھا کہ سلطان جب کسی قلعہ کا محاصرہ کرتا ہے تو جب تک اس کا سر نہیں جھکا دیتا اس وقت تک محاصرہ ختم نہیں کرتا۔

مگر اب تو بالکل خلاف امید بات ہو رہی تھی۔ یہ ٹھیک تھا کہ اس سے پہلے بھی صور کا محاصرہ ختم کیا گیا تھا لیکن اس وقت حالات کچھ اور تھے اب تو سلطان، بیت المقدس پر قبضہ بھی کر چکا تھا۔ ساحل روم کی سب سے بڑی عیسائی ریاست یروشلم کا خاتمہ ہو چکا تھا۔ سلطان کو فوری طور پر کوئی ایسی مہم بھی درپیش نہ تھی کہ وہ صور سے اٹھا کر اپنا لشکر کسی اور جگہ لے جاتا اہل قلعہ خوش تھے بہت خوش تھے مگر ان کے دل اب بھی دھڑک رہے تھے ایک چور تھا ایک خوف تھا جو ان کے دل میں بیٹھا ہوا تھا۔

پھر جب سلطانی لشکر کے بار برداری کا آخری چھکڑا بھی وہاں سے روانہ ہو گیا اور صور کے جاسوس بیس میل تک سلطان صلاح الدین اور اس کے لشکر کا پیچھا کر کے واپس نہ آ گئے اس وقت تک ان کے دل کی دھڑکنیں قابو میں نہ آئیں حالانکہ اب سلطان کی فی الحال واپسی کا کوئی امکان نہ تھا لیکن کونزیڈ اور اس کے سرداروں کے ہونٹوں پر اب بھی پپڑیاں جمی ہوئی تھیں اور آنکھوں میں ایک نامعلوم خوف تیر رہا تھا۔

سلطان صلاح الدین کی واپسی کے آٹھ روز تک قلعہ صور میں کسی کے لبوں پر مسکراہٹ نہیں کھیلی اور نہ کوئی قہقہہ فضاؤں میں ابھرا کہتے ہیں کہ وقت بڑا مرہم ہے آہستہ آہستہ قلعہ کی رونقیں واپس آنے لگیں۔ سرسراتے لباسوں نے ہواؤں میں سرمستیاں بکھیرنا شروع کیں۔ آنکھوں کے کھب کٹورے چھلکنے لگے اور الھڑ جوانیاں سہارے تلاش کرنے لگیں۔ اگرچہ مذہبی تہذیب میں الھڑ جوانی ایک جنس کمیاب اور نایاب ہوتی ہے یروشلم یا صور اگرچہ مغربی ممالک نہ تھے لیکن وہاں نصرانیت کا دور دورہ تھا جس میں شراب و شباب کی ہمیشہ سے فراوانی رہی ہے۔ محاصرہ اور جنگ نے شوخ جوانیوں کی گردنیں جھکائے رکھی تھی مگر اب تو جنگ دور جا چکی تھی محاصرہ ختم ہو گیا چنانچہ بیباک نظروں میں پھر گردش پیدا ہوئی صور کے قلعہ اور شہر میں دزدیدہ نظروں اور لغزیدہ قدموں کی نمائش لگنا شروع ہو گئی تھی۔

مثل مشہور ہے کہ جو مذہب بادشاہ کا وہی رعایا کا کونزیڈ اس وقت صور کا بلاشرکت غیرے بادشاہ تھا۔ بوہمنڈ اور اس کے بیٹے ریمنڈ نے صور کو اس وقت بے یارومددگار چھوڑا تھا جب سلطان صلاح الدین، بیت المقدس میں داخل ہوا تھا۔

ایک مغربی مؤرخ کے مطابق شمالی شام کی نصرانی ریاستوں کے حکمران سلطان سے دوستی کے خواہشمند تھے۔ طرابلس بھی ایسی ہی ریاستوں میں شامل تھا بوہمنڈ طرابلس کا شہزادہ تھا اور ریمنڈ اس کا بیٹا ان دونوں کو مرج کرطین میں شکست ہوئی تھی وہ دونوں بھاگ کے طرابلس چلے گئے۔ صور کا علاقہ انہی کی زیر کمان تھا لیکن انہیں اپنی جان کی پڑی تھی وہ صور کی کیوں پرواہ کرتے یہ دونوں باپ بیٹے اس قدر تنگ نظر اور سنگدل تھے کہ بیت المقدس سے زرفدیہ ادا کرنے والے جب چند قافلے طرابلس پہنچے تو انہیں طرابلس میں داخل نہیں ہونے دیا گیا اور صاف کہہ دیا گیا کہ ان کے پاس سامان رسد اتنا نہیں ہے کہ وہ انہیں طرابلس میں جگہ دے کر ان کے آنسو پونچھ سکیں۔

جب طرابلس کے حکمرانوں کی طرف سے ان پریشان حال لوگوں کو جو ان کے بھائی تھے ایسا سخت جواب دیا گیا تو ان پناہ ڈھونڈنے والوں کے دلوں پر کیا گزری ہو گی اس کا ذکر تو ایک طرف رہا خود طرابلس کے محافظوں پر اپنے حکمرانوں کے اس جواب کا یہ غلط اثر ہوا کہ فصیل کے دروازوں کے پہریداروں نے باہر نکل کر پناہ مانگنے والوں پر حملہ کیا اور وہ یروشلم (بیت المقدس) سے جو کچھ رقم یا زیورات بچا کے لائے تھے وہ سب ان سے چھین لیا بیت المقدس سے آنے والوں کے ساتھ ریاست انطاکیہ اور دوسری نصرانی ریاستوں نے بھی اسی قسم کا سلوک کیا۔

کہنے کا مقصد یہ ہے کہ صور کی حفاظت کا کسی نے بھی انتظام نہیں کیا اس لیے اب مارکوئیس اگر خود کو صور کا حکمران سمجھتا تھا تو وہ یقیناً اس کا اہل تھا مگر اس وقت ہم صور کو مارکوئیس کے اتفاقی پس منظر میں دیکھنا چاہ رہے ہیں مارکوئیس اوائل عمر ہی سے ایک آوارہ اور عشرت پسند جوان تھا اس کے اور بھی عیب تھے مگر ان عیوب کے باوجود وہ ایک بہت بڑا جنگجو بہادر اور بڑے درجے کا مکار اور شاطر بھی تھا شاید یہی وجہ تھی کونزیڈ نے اپنے بچپن کے ایام آوارگی ہی میں بحری تربیت حاصل کر لی تھی اور رومتہ الکبریٰ، فرانس، یونان وغیرہ کی بحری جنگوں میں اپنی بہادری کے جوہر دکھا کر بڑا نام پیدا کر لیا تھا۔ ۱۱۸۵ء کے آخری دنوں میں مارکوئیس پانچ چھ بحری جہازوں کے بیڑے کا کپتان بن گیا تھا کونزیڈ چونکہ کافی مشہور ہو چکا تھا اس لیے جب وہ اٹلی کی ایک چھوٹی ریاست مانس اسٹرٹ پہنچا تو اسے لوگوں نے

مارکونیس کا زیادہ وقت بحری جہازوں اور بحری جنگوں میں گزرا تھا اس لیے وہ اپنی عیاشی اور مکاری کی اس جبلت کو استعمال نہیں کر سکا تھا جو دوران جنگ اس کے دل میں کلبلاتی رہتی تھی مانس اسٹریٹ میں اس کا اس قدر شاندار استقبال کیا گیا جس کا وہ تصور بھی نہیں کر سکتا تھا بوڑھوں نے کونزیڈ کو دعاؤں کے ہار پہنائے۔ جوانوں نے اس کی بہادری کے گیت گائے مگر عورتوں نے تو کونزیڈ کے راستوں میں اپنی آنکھیں بچھا دیں۔ ان عورتوں میں جوان عورتیں بھی تھیں اور جوانی میں قدم رکھنے والی دوشیزائیں بھی۔ یہاں تک کہ وہ لڑکیاں جو جوانی کی حدود سے ابھی دور تھیں وہ بھی مارکونیس پر ٹوٹی پڑتی تھیں۔

مارکونیس بلا کا حسین اور جاذب نظر جوان تھا اس کا چوڑا سینہ مضبوط دست و بازو اور ہنستی ہوئی نیلی آنکھیں مخالف صنف کو متاثر اور مرعوب کرنے میں بڑی ماہر تھیں۔ بحری زندگی کی سختیوں اور مسلسل جنگوں نے اس کے چہرے پر تجربے کی لکیریں ڈال دی تھیں لیکن اپنے استقبال کو آنے والی خواتین، دوشیزاؤں اور نوجوان لڑکیوں کو دیکھ کر اس کا چہرہ کھل اٹھا تھا اور کلفت اور کوفت کی تمام پرچھائیاں ختم ہو گئی تھیں اور کونزیڈ برسوں کی بھوکی بلکہ بوالہوس نظروں کو قابو میں رکھنے کی ناکام کوشش میں مصروف تھا۔

استقبال کے اس ہجوم میں نہ جانے کہاں سے ایک کم سن لڑکی لوگوں کو ہٹاتے ہوئے اس کے سامنے آکھڑی ہوئی۔ مارکونیس کونزیڈ کی نظریں لڑکی کے چہرے پر پڑیں تو جیسے وہیں جم کے رہ گئیں۔ بڑی بڑی روشن آنکھیں۔ دراز قد اور متناسب اعضاء جو تناسب سے زیادہ رعنائی کے پیکر تھے۔ کونزیڈ کا شاطر اور چالاک دماغ اس ماہ پارہ کو دیکھ کر حیران رہ گیا وہ دنیا دنیا گھوما ہوا تھا مگر اس لڑکی کی معصومیت نے اس پر کچھ ایسا اثر کیا کہ وہ بوکھلا گیا اور یہ بھی بھول گیا کہ اس کے استقبال کو آنے والے سینکڑوں لوگ اس کے منتظر تھے۔

کونزیڈ نے جلدی سے خود کو سنبھالا اور مجمعے پر ایک مسکراتی نظر ڈالی مگر دل تھا کہ بے ساختہ اس لڑکی کی طرف کھنچا جا رہا تھا لڑکی اب تک اس سے صرف ایک گز کے فاصلہ پر کھڑی تھی اور حیران نظروں سے اس شخص کو دیکھ رہی تھی جس کے استقبال کے لیے اتنے بہت سے آدمی جمع ہوئے تھے کونزیڈ آخر دل کے ہاتھوں مجبور ہو گیا اور اس نے ایک قدم آگے بڑھ کے پوچھا۔

"کہ لڑکی تمہارا کیا نام ہے؟"

لڑکی کا رنگ حیا سے لال بھبوکا ہو گیا۔ اس نے گھبرا[...] میں کہا۔ "استاریا۔"

اس کے ساتھ ہی اس نے گردن گھما کر پیچھے دیکھا او[ر] ادھیڑ عمر شخص کا ہاتھ پکڑ کے بولی "یہ ہیں میرے پاپا۔"

اتنے میں پیچھے سے ایک زبردست ریلا آیا لڑکی اپنے پاپا[...] چمٹ گئی جب ریلے کا زور کم ہوا تھا تو لڑکی کے پاپا نے در[...] کیا۔ "مارکونیس آپ کس جگہ ٹھہریں گے؟"

"امیر البحر کنگیری کے گھر ٹھہروں گا"۔ مارکونیس نے جلدی [...] جواب دیا۔

"برائے مہربانی آپ رات کے کھانے کی دعوت ق[...] فرمائیے۔ میں آپ کو لینے آؤں گا" پھر ایک دوسرا ریلا آیا[...] ایک زور کا دھکا لگا اور وہ چند قدم پیچھے ہٹ گیا۔

"ٹھیک ہے۔ میں انتظار کروں گا" نہ جانے کیسے مارکو[...] کی زبان سے نکل گیا۔

وہ رات بڑی سہانی تھی مارکونیس کونزیڈ کے [...] میں بھی نہ تھا کہ اس کی مانس اسٹریٹ میں پہلی شام دنیا[...] ایک حسین ترین حسینہ کے ساتھ گزرے گی۔ کتنی خوبصور[ت] ہے استاریا۔ کونزیڈ نے سوچا پھر کسی حسین خیال سے مسکرا اٹھا۔ بوڑھا امیر البحر تمام دن اس کا دماغ چاٹتا رہا تھا وہ چاہتا تھا کہ کونزیڈ اپنے کارناموں کی تفصیل اس انداز میں بیان کرے وہ اس بحری جنگوں میں اپنی جوانی تلاش کر سکے امیر البحر اگرچہ کا[...] بوڑھا ہو گیا تھا لیکن جب کوئی مہمان اس کے یہاں آتا تو اک[...] جوان ہو جاتا اور اس صورت میں کہ آنے والے کا تعلق فوج سے [...] تو پھر امیر البحر کی جوانی کے ساتھوں ساتھ اس کا بچپن بھی کھ[...] ہوا ساتھ چلا آتا۔

امیر البحر کی مہمان نوازی کا دور دور تک شہرہ تھا۔ مارکونیس کونزیڈ کے لیے نہ تو امیر البحر اجنبی تھا اور نہ یہ مانس اسٹریٹ کا شہر۔ یہ دونوں ہی اس کے دیکھے بھالے تھے کونزیڈ بچپن ان سڑکوں اور گلیوں میں آوارہ گردی کرتے گزرا تھا پھر و[ہ] ایک طویل عرصے کے لیے مانس اسٹریٹ چھوڑ گیا مانس اسٹریٹ چھوڑنے کے بعد ہی اس کی تقدیر بدلی تھی وہ ایک کمزور[...] نوبالغ لڑکے کی صورت میں یہاں سے نکلا تھا اور سات سال بعد جب وہ بحری طوفانوں سے لڑتا بھڑتا واپس آیا تھا تو اس کی ٹوپی[...] اور سینے پر شجاعت اور بہادری کے کتنے ہی نشان اور تمغے آویزاں تھے اس نے بحری جنگوں میں اتنا نام کمایا تھا کہ ہر شہر اس کے[...]

استقبال کو گھروں سے نکل پڑے تھے اور امیر البحر نے اسے خط لکھ کر اس بات پر آمادہ کر لیا تھا کہ وہ اپنی تعطیل کے چند دن اس کے بنگلے پر ضرور گزارے گا۔

ابھی گلیوں اور بازاروں کے قمقمے روشن ہی ہوئے تھے کہ امیر البحر کے بنگلہ کے سامنے ایک بند گاڑی رکی۔ مارکوئیس کا دل بلیوں اچھلنے لگا۔ اس کا دل چاہا کہ وہ دوڑ کے باہر جائے اور اپنی محبوبہ دلنواز کی راہ میں پلکوں کا فرش بچھائے مگر وہ دل پکڑ کے رہ گیا امیر البحر پہلے ہی اس پر ناراض ہو رہا تھا کہ اس نے ایک اجنبی کی دعوت کیوں قبول کی اب اگر وہ اٹھ کے استقبال کے لیے باہر جاتا تو پتا نہیں امیر البحر کتنی آفت کرتا۔ اسی وقت ملازم نے اندر آکر بتایا:

"آقا ایک بند گاڑی میں مہمان آئے ہیں"

"کتنے مہمان ہیں؟" امیر البحر نے چڑچڑے لہجے میں سوال کیا۔

"صرف دو ہیں میرے آقا۔ ایک ادھیڑ عمر آدمی ہے اور ایک گڑیا جیسی لڑکی" ملازم نے کہا۔

"لڑکی..... لڑکی کون ہے۔" اور اس نے کونزیڈ کی طرف والیہ نظروں سے دیکھا۔

"لڑکی کا نام استاریا ہے۔ وہ مجھے لینے آئے ہیں امیر البحر" مارکوئیس نے بڑے مضطرب لہجے میں جواب دیا۔

"تم نے کسی لڑکی کا ذکر تو نہیں کیا تھا مارکوئیس؟" امیر البحر نے خواہ مخواہ جرح شروع کر دی۔

مارکوئیس کونزیڈ کو غصہ آگیا مگر اس نے ضبط کیا اور امیر البحر کو کوئی جواب نہ دیا۔ بوڑھا امیر البحر سمجھ گیا کہ اس کے مہمان کو یہ پوچھ گچھ ناگوار گزری ہے اس نے نرمی سے کہا۔ "کونزیڈ میں نے اس لیے پوچھا کہ جب ایک ادھیڑ عمر آدمی موجود ہے تو پھر لڑکی کو اس کے ساتھ آنے کی کیا ضرورت تھی ممکن ہے کہ وہ تمہیں مسحور کرنا چاہتی ہو" مارکوئیس کونزیڈ چڑ کے بولا۔

"مجھے اجازت دیجئے امیر البحر کہ میں باہر جا کر اپنے میزبان سے یہ کہہ دوں کہ میں ان کے ساتھ نہیں جا سکتا۔"

"کیوں..... کیوں مارکوئیس تم ان کی دعوت کیوں رد کر رہے ہو" امیر البحر نے پریشان ہوتے ہوئے پوچھا۔

"اس لیے کہ آپ نہیں چاہتے کہ میں ان کے گھر جاؤں۔" مارکوئیس کا لہجہ اور الفاظ صاف ظاہر کر رہے تھے کہ مارکوئیس کو سخت غصہ آگیا ہے۔ امیر البحر نے چونک کے پہلے مارکوئیس کو دیکھا پھر کوئی پہلو بدل کر بولا۔

"مارکوئیس مجھے افسوس ہے کہ تم مجھے غلط سمجھ رہے ہو۔ میزبان تو دراصل میں تمہارا ہوں۔ اس لیے کہ میرا فرض ہے کہ جب تک تم مانس اسٹریٹ کی حدود میں ہو میں تمہاری حفاظت کروں بہرحال میں پھر معذرت خواہ ہوں مگر جانے سے پہلے یہ تو بتاتے جاؤ کہ تم اپنے اس میزبان کے گھر کتنی دیر ٹھہرو گے اور اگر خدانخواستہ تمہیں دیر ہو جائے تو تمہیں کس جگہ تلاش کیا جائے۔ میرا مطلب ہے کہ تم اپنے میزبان کا پتا مجھے بتاتے جاؤ۔"

"پتا تو میں خود بھی نہیں جانتا" مارکوئیس نے گھبرا کے کہا "دراصل وہاں اس قدر بھیڑ بھاڑ تھی کہ میں اپنے میزبان کا نام تک نہ پوچھ سکا انہوں نے مجھے دعوت دی میں نے قبول کر لی انہوں نے پوچھا میرا قیام کہاں ہوگا۔ میں نے آپ کے بنگلہ کا نام بتا دیا۔ بس یہی باتیں ہوئی تھیں۔ چونکہ انہوں نے مجھے لے جانے کی خدمات اپنے سر لے لی تھیں اس لیے مجھے کچھ زیادہ فکر نہ تھی" امیر البحر مسکرایا اس کی مسکراہٹ بڑی معنی خیز تھی

"مارکوئیس جاؤ۔ مگر استاریا کے گھر سے جلد واپس آنے کی کوشش کرنا۔"

امیر البحر نے لفظ استاریا پر کافی زور دیا تھا مارکوئیس کچھ خجل سا ہو گیا اور چپ چاپ اٹھ کر باہر نکل آیا۔ پاپا اور استاریا گاڑی سے اترے کھڑے تھے مارکوئیس کو آتے دیکھ کے استاریا آگے بڑھی اور بڑی بے تکلفی مگر نخرے سے بولی۔

"جائیے مارکوئیس ہم آپ سے نہیں بولتے۔ اتنی دیر کر دی آپ نے آنے میں" مارکوئیس اس کی سادگی مگر پرکاری پر حیران رہ گیا پہلی ملاقات کے پہلے ہی جملے میں استاریا نے مارکوئیس کا دل جیت لیا تھا اسے یوں محسوس ہوا جیسے وہ استاریا کو بہت دنوں سے جانتا ہے اس نے نظریں اٹھا کر پاپا کی طرف دیکھا وہ مسکرا رہے تھے۔

استاریا کے پاپا نے قریب آتے ہوئے کہا "مارکوئیس اس کی باتوں کا برا نہ مانیے گا۔ ابھی نادان ہے یہ۔"

"نادان!" مارکوئیس نے لفظ کو دہرایا۔ "ہاں ہاں۔ آپ نے ٹھیک فرمایا مگر استاریا ہے بہت اچھی۔"

استاریا نے بات اچک لی "میں آپ کو اچھی لگتی ہوں"

"ہاں بہت اچھی" یہ کہتے ہوئے مارکوئیس پر سرشاری کا عالم طاری ہو گیا۔

"ہائے آپ بھی مجھے بہت اچھے لگتے ہیں"۔ پھر استاریا پاپا کی طرف دیکھ کے بولی "کیوں پاپا۔ مارکوئیس اچھے ہیں نا؟"

"ہاں ہاں اچھے ہیں استاریا۔ پاپا نے بیٹی کے سر پر ہاتھ رکھ

دیا۔

"صرف اچھے نہیں بہت اچھے ہیں پاپا۔" اسٹاریہ نے اٹھلا کر کہا۔

"کیوں نہیں میری گڑیا۔ تیرے مارکوئیس بہت اچھے ہیں۔" اس کے ساتھ ہی پاپا آبدیدہ ہو گئے۔

مارکوئیس پریشان ہو گیا "یہ آپ کو کیا ہو گیا؟"

اسٹاریا نے جھٹ اپنے رومال نکالا اور پاپا کے ہاتھ میں پکڑا دیا۔ "پاپا۔ اتنا نہ یاد کیا کرو ماما ماریہ کو۔"

"کیا ہوا تمہاری ماما کو؟" مارکوئیس نے گھبرا کے پوچھا۔

پاپا نے اسٹاریا کا ہاتھ پکڑ کے کھینچا اور رندھے گلے سے بولے۔ "چلو گاڑی میں بیٹھو یہاں کب تک کھڑی باتیں کرتی رہو گی۔" باتوں کا سلسلہ ختم ہو گیا۔ مارکوئیس کو اسٹاریا کی باتیں بہت اچھی لگیں پیاری پیاری بھولی بھالی باتیں۔

جس گھر کے سامنے ان کی گاڑی رکی اس کے باہر کی طرف ایک خوبصورت سائبان تھا گاڑی کو آتا دیکھ کر دور برآمدے میں بیٹھا چوکیدار بھاگ کے آیا اور لکڑی کا بڑا گیٹ کھل گیا۔

اسٹاریا باتیں کرنے کے لیے بہت بے چین ہو رہی تھی مگر پاپا نے اسے راستہ میں گفتگو سے منع کر دیا تھا کیونکہ راستہ خراب تھا اور گاڑی جھٹکے کھا رہی تھی اندر پہنچتے ہی اسٹاریا نے سوال جڑ دیا۔

"آپ کب تک یہاں رہیں گے؟"۔

"جب تک تم کہو گی"۔ مارکوئیس کو زیدٹ کے منہ سے جیسے الفاظ پھسل پڑے۔

اسٹاریا نے رک کر مارکوئیس کو دیکھا پاپا اس کے ساتھ ہی برآمدے کی سیڑھیاں چڑھ رہے تھے ان کے قدم بھی رک گئے۔

اسٹاریا بھولے پن سے بولی۔ "میں تو چاہتی ہوں کہ آپ ہمیشہ میرے ساتھ رہیں۔ اپنے گھر بھی نہ جایا کریں بس میرے پاس رہا کریں۔"

مارکوئیس کے جذبات میں تلاطم پیدا ہو گیا تھا اس کی زندگی میں بہت سی عورتیں آئی تھیں لیکن ان کی گفتگو کا انداز بڑا محتاط اور تاجرانہ ہوا کرتا تھا یہ بے باکی، سادگی اور روانی کسی کے لہجہ میں نہ تھی۔

پاپا نے پھر اسٹاریا کو گھسیٹا "اندر چل کے بیٹھو پھر باتیں کر لینا۔"

اسٹاریا پاپا کے ساتھ گھسٹتی چلی گئی تھی سی گڑیا کی طرح جیسے بچے گھسیٹتے پھرتے ہیں اسٹاریا جسامت اور شکل و صورت میں بھی گڑیا ہی لگتی تھی ہلکی پھلکی بھرے بھرے سا بدن، حلقوں میں تیزی سے گردش کرتی ہوئی آنکھیں۔

"کدھر ہو ماریہ۔ دیکھو مہمان آئے ہیں۔" اسٹاریا کے پاپا نے برآمدے میں پہنچ کے آواز لگائی ماریہ کے نام پر مارکوئیس چونک پڑا۔ "اسٹاریا۔ تمہاری ماما کا کیا نام تھا؟"

"ان کا نام ماریا تھا۔" اسٹاریا نے بتایا۔

"اندر آجاؤ بیٹے مارکوئیس کو زیدٹ۔" یہ آواز اسٹاریا کے پاپا کی تھی وہ راہداری کا دوسرا دروازہ کھولے کھڑے تھے اور مارکوئیس کو ڈرائنگ روم میں آنے کی دعوت دے رہے تھے۔ مارکوئیس اور اسٹاریا ڈرائنگ روم میں پہنچے اور آمنے سامنے کوچوں پر بیٹھ گئے۔ مارکوئیس کو اپنا سوال یاد آ گیا "تمہاری ماما اب کہاں ہیں اسٹاریا؟"

"مر گے وہ۔ آپ اتنی جلدی بھول گئے" اسٹاریا ہنس پڑی اور اس کے منہ سے جیسے سینکڑوں پھول جھڑ گئے۔ "انہیں مرے ہوئے بارہ تیرہ سال ہو گئے۔ میں اس وقت دودھ پیتی بچی تھی جب ان کا انتقال ہوا۔"

"مگر تمہارے پاپا نے انہیں ابھی آواز دی تھی" مارکوئیس نے اپنی الجھن کا اظہار کیا۔

"پاپا نے" اسٹاریا سوچتے ہوئے بولی "کیسے آواز دی تھی؟" اسٹاریا کو کچھ بھی یاد نہ آیا وہ تو اس وقت مارکوئیس سے باتوں میں محو تھی وہ دنیا و مافیہا سے بالکل بے خبر تھی۔

مارکوئیس نے اسے یاد دلایا۔ "اسٹاریا ابھی تمہارے پاپا ماریہ، ماریہ پکار رہے تھے۔"

"اچھا" اسٹاریا نے پھر ایک بھرپور تبسم بکھیر دیا۔ "پاپا کو دراصل ماما سے اس قدر محبت تھی انہوں نے اپنے دوستوں سے درخواست کی تھی کہ اگر انہیں ماریہ نام کی کوئی ملازمہ ملے تو وہ ضرور بتائیں کچھ ہی دن بعد پاپا کو یہ ملازمہ مل گئی اور پاپا اسے گھر لے آئے۔ جب سے ہی ہمارے گھر میں ماریہ کے آگے پیچھے کوئی نہیں۔ یہاں آئی تو بس یہیں کی ہو کر رہ گئی۔ اس کا نام بھی ماریہ ہے اور مجھے اپنی بیٹی کی طرح چاہتی ہیں پاپا کہتے ہیں بیٹی اسٹاریا مجھے اپنی ماں مل گئی مگر میں اب تک اکیلا ہوں۔ پاپا نے میری وجہ سے دوسری شادی نہیں کی۔ کتنے پیارے ہیں میرے پاپا؟"

"تم بھی تو کتنی پیاری ہو اسٹاریا؟" مارکوئیس نے چھیڑ خانی کا آغاز کیا۔

"میں....." اسٹاریا نے آنکھیں پھیلا کے مارکوئیس کو

دیکھا۔

"ہاں تم۔ اسٹاریا تمہیں اس کا احساس نہیں کہ تم کتنی پیاری اور کتنی خوبصورت ہو؟" تجربہ کار اور بوالہوس مارکونیس کو زیڈ نے دوشیزاؤں کی فطری کمزوری سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کی۔

ماہرین نفسیات کہتے ہیں کہ بارہ اور سولہ سال کے درمیان کی لڑکیاں دراصل پکے آم کے مانند ہوتی ہیں ان کے ذرا ہاتھ لگے یا سہارا ملے تو وہ آم کی طرح ٹوٹ کے گود میں گر جاتی ہیں ان دنوں میں لڑکیوں کی اٹھتی جوانی ہوتی ہے وہ حسین حسین خواب دیکھتی ہیں اور مضبوط بازوؤں میں سمٹنا چاہتی ہیں اس لیے اس عمر کو بھی عمر کہا جاتا ہے مغربی ملک میں اس عمر کی لڑکیوں سے شریف لڑکے دور بھاگتے ہیں اس لیے کسی غلط قدم کے نتیجے میں لڑکے کو کئی سال کی سزا ہو جاتی ہے۔

مگر یہاں تو معاملہ ہی الٹا تھا مارکونیس کو زیڈ کو شرافت تو چھو کر بھی نہ گزری تھی اسے ایسی کلیوں کو چھیڑنے میں لطف آتا تھا۔ اس عمر تک پہنچتے پہنچتے نہ معلوم اس نے کتنے شگوفوں کو مسلا تھا اور کتنے گھر خراب کیے تھے۔ بس اسٹاریا نے جب مرد، مرد بھی جوان اور جوان بھی وجیہہ اور خوبصورت کی زبان سے اپنی تعریف سنی تو اس پر سرور سا طاری ہو گیا اور اس کی آنکھیں جیسے جھکنے لگیں۔

"مارکونیس تم کتنے اچھے ہو"۔ اس کے ساتھ اسٹاریا کھڑی ہو گئی اور اس کے دونوں ہاتھ غیر ارادی طور پر مارکونیس کی طرف اٹھ گئے اور پھر اسٹاریا، مارکونیس کے مضبوط بازوؤں میں سمٹ گئی۔ اس کی سانس تیز ہو گئی اور سر کو زیڈ کے سینے سے لگ گیا۔

اچھا ہوا کہ اس وقت ماریہ ڈرائنگ روم کا پردہ اٹھا کر اندر آ گئی اسٹاریا اور کو زیڈ سنبھل کے بیٹھ گئے۔

"ماریہ بلاتے ہوئے بولی کھانا لگا دیا ہے آپ تشریف لے آیئے مارکونیس کو زیڈ۔ صاحب انتظار کر رہے ہیں"۔

"ماما ماریہ ہم ابھی آتے ہیں" اسٹاریا بچوں کی طرح کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ ماریہ نے کھانے کے کمرے میں پہنچ کے اسٹاریا کے پاپا کو چونکا دیا؟ صاحب اسٹاریا اور مارکونیس کا کتنا اچھا جوڑ ہے

"کیا کہہ رہی ہو ماریہ۔ یہ کس طرح ممکن ہے؟" پاپا بے یقینی کے انداز میں بولے۔

"کیوں ممکن نہیں صاحب" ماریہ نے پاپا کو حیرانی سے دیکھا؟ مارکونیس لمبا، چوڑا جوان ہے۔ خوبصورت نہیں۔ کیا عیب ہے اس میں؟"

پاپا نے جانے کیا سوچنے لگے ماریہ ان کا منہ تکتی رہی تھی پاپا جب نہیں بولے تو اس نے خود ہی کہا۔ "آپ چپ کیوں ہیں صاحب کہیں مارکونیس شادی شدہ تو نہیں؟"

"یہ تو پتہ نہیں۔ میں نے ابھی اس سے بات ہی نہیں کی۔" پاپا افسردگی بولے۔

"صاحب آپ بات کریں یا نہ کریں لیکن یہ ضرور خیال رکھیں کہ اسٹاریا بی بی، مارکونیس کو پسند کرنے لگی ہیں" تجربہ کار ماریہ نے صاف صاف بتا دیا۔

"کیا تمہیں یقین ہے ماریہ؟" پاپا نے تصدیق چاہی۔

"صاحب آپ یقین کر سکتے ہیں میں نے ان دونوں کو پیار کی باتیں کرتے دیکھا ہے"۔ ماریہ نے کھلے الفاظ میں تصدیق کر دی۔

"میرا بھی یہی خیال ہے" پاپا متفکر تھے۔ "کاش یہ ممکن ہوتا"۔

اسٹاریا اور مارکونیس ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے کھانے کے کمرے میں داخل ہوئے اور پاپا کی بات ادھوری رہ گئی۔

اسٹاریہ نے ہنستے ہوئے کہا؟ پاپا میں مارکونیس کے ساتھ بیٹھ جاؤں؟

"ضرور بیٹھنا اسٹاریا" پاپا نے بڑے پیار سے کہا؟ "مگر پہلے مارکونیس میرے پاس بیٹھیں گے مجھے ان سے کچھ ضروری باتیں کرنا ہیں"۔

"پاپا۔ آپ..... اور اسٹاریا منہ بناتی اور اٹھلاتی ہوئی میز کے دوسری جانب بیٹھ گئی۔

مارکونیس پاپا کے برابر بیٹھا۔ اسٹاریا تو کچھ نہ کہہ سکی تھی مگر مارکونیس کو زیڈ ضرور سمجھ گیا تھا کہ پاپا اس وقت خود ہی اس کے لیے اسٹاریا کا پیغام دیں گے۔ کھانا شروع ہو گیا ماریہ میز سے ذرا دور کھڑی تھی۔ اسٹاریا اور مارکونیس کی نظریں بار بار ملتی اور جدا ہوتی رہیں وہ آنکھوں ہی آنکھوں میں باتیں کر رہے تھے اور ان باتوں پر دور کھڑی ماریہ نگران تھی پاپا بھی کبھی کبھی کن انکھیوں سے دیکھ لیتے تھے۔

کھانا ختم ہونے پر تھا کہ پاپا نے مارکونیس سے اچانک سوال کیا۔ "مارکونیس کیا اسٹاریا تمہیں اچھی لگتی ہے؟"

مارکونیس کے ہاتھ سے لقمہ چھوٹ گیا۔ اس نے بڑی حیرانی سے پاپا کو دیکھا اس نے کچھ کہنا چاہا مگر الفاظ ساتھ چھوڑ گئے۔ چند لمحوں بعد پاپا نے اپنا سوال دہرایا۔

"کیا اسٹاریا تمہیں پسند ہے؟"

"محترم" آخر مارکوئیس نے زبان کھولی "ایسی چیز کو سب ہی اچھا کہیں گے۔ استاریا جس گھر جائے گی وہ گھر روشن ہو جائے گا۔"

"یہ میرے سوال کا جواب نہیں مارکوئیس" پاپا کا لہجہ ذرا تلخ ہو گیا تھا۔

مارکوئیس پریشان ہو گیا" اور کیا سوال تھا آپ کا محترم؟"۔

"میرا سوال یہ ہے کہ کیا تمہیں استاریا بہت پسند ہے؟" پاپا نے تقریباً چیختے ہوئے کہا۔

استاریا گھبرا کے کھڑی ہو گئی "پاپا۔ مارکوئیس ہمارے مہمان ہیں آپ کس طرح بول رہے ہیں ان کے ساتھ۔ پاپا آپ مہمان کی توہین کر رہے ہیں"۔

"نہیں استاریا میں کوئی توہین نہیں کر رہا" پاپا نے خود کو سنبھالتے ہوئے کہا" شاید تم لوگ سوچ رہے ہو کہ میں پاگل ہو گیا ہوں۔ یہ بات بھی نہیں۔ میں مارکوئیس سے یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ وہ تمہیں کس حد تک پسند کرتے ہیں"۔

"پاپا میں بتاتی ہوں آپ کو" استاریا نے باپ کو اپنی طرف متوجہ کر لیا" مارکوئیس مجھے اتنا ہی پسند کرتے ہیں جتنا میں انہیں پسند کرتی ہوں۔ میں نے مارکوئیس سے شادی کرنے کا فیصلہ کیا ہے آپ ہمیں اجازت دیجئے"۔

پاپا نے زہرخند کیا" اتنی دیر سے یہی تو میں پوچھ رہا ہوں ایک رئیس باپ کے جب اک ہی بیٹی ہو تو اس کی پریشانیاں کس قدر بڑھ جاتی ہیں میں تو خود تمہاری شادی جلد از جلد کرنے کا خواہشمند ہوں"

استاریا نے جلدی سے باپ کے گلے میں بانہیں ڈال دیں پھر مارکوئیس کی طرف دیکھتے ہوئے بولی" اس کا مطلب ہے کہ مارکوئیس کو پاپا بھی پسند کرتے ہیں"۔

"مارکوئیس ایک خوبصورت جوان ہیں۔ بحری جنگوں میں انہوں نے بڑا نام پیدا کیا ہے انہیں پسند نہ کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا" پاپا نے بڑے خلوص سے کہا۔

"پھر تو ہم شادی کر سکتے ہیں" "کیوں نہیں؟" استاریا کی آنکھیں خوشی سے چمکنے لگی تھیں۔ "ہاں..... ہاں بالکل شادی کر سکتے ہیں"۔ مارکوئیس کے دل میں لڈو پھوٹنے لگے۔

استاریا بچوں کی طرح کودتی ہوئی ماریہ کے پاس پہنچی جو اب تک وہیں میز کے دائیں کنارے پر کھڑی تھی اس نے ماریہ کے گلے میں بانہیں حمائل کر دیں اور اسے چومتے ہوئے بولی۔ "ماما ماریہ جلدی جلدی انتظام کرو۔ ہم آج ہی شادی کریں گے"۔

"شہزادی استاریا" پاپا کی رعب دار آواز نے کھانے کے کمرے میں خاموشی طاری کر دی۔ اس قدر خوش نہ ہو کہ بعد میں پڑے"۔

"پاپا"

"بزرگ محترم"

"صاحب؟"

پاپا کے علاوہ کمرے میں تین متنفس تھے اور تینوں حیر پریشان کسی کو خیال بھی نہ تھا کہ پاپا اس شادی میں روڑ اٹکائیں گے جب کہ مارکوئیس کوزیڈ کو وہ خود بھی پسند کر لگے تھے اور ابھی ابھی انہوں نے صاف الفاظ میں اس کا اظہا تھا۔

"میرے بچو" پاپا نے بڑے کرب سے استاریا اور اس محبوب مارکوئیس کو مخاطب کیا" میری وفادار ملازمہ ماریہ جس میری بیٹی استاریا کو اپنی ماں کی کمی محسوس نہ ہونے دی وہ گو دے گی کہ میں استاریا کو کس قدر چاہتا ہوں میں نے آج تک ا کی کوئی خواہش رد نہیں کی پھر اس وقت ایک ظالم باپ کی طر میں اس کی کوزیڈ کے ساتھ شادی سے کیوں انکار کر رہا ہوں نہیں۔ میں کوزیڈ کو پسند نہیں کرتا۔ کوزیڈ کا تعلق بھی سرزمین سے ہے ہم میں کوئی فرقہ وارانہ اختلاف بھی نہ کوزیڈ ایک عظیم جوان ہے اس نے ملک و ملت کے لیے بی بہا خدمات انجام دی ہیں ماریہ بھی کوزیڈ کی مداح ہے میرے بچو۔ ان تمام باتوں کے باوجود میں استاریا کو کوزیڈ شادی کی اجازت نہیں دے سکتا۔ میں مجبور ہوں"

"میرے آقا۔ میرے صاحب جی۔" ماریہ بے چین ہو بولی" مارکوئیس مجھے پسند ہیں آپ بھی انہیں پسند کرتے ہیں میں آپکو یقین دلاتی ہوں کہ استاریا بھی مارکوئیس کو دل گہرائیوں سے پسند کرتی ہے پھر وہ کون سی مجبوری ہے جو آپ ان کی شادی سے روکتی ہے کیا آپ اپنی مرحوم بیوی کی ر سے شرمندہ ہونا چاہتے ہیں؟"۔

"ماریہ تم مجھے غلط نہ سمجھو" پاپا نے اسی عالم کرب م جواب دیا" مجھے اپنی پیاری بیٹی استاریا کے لیے پیارے کوزیڈ بہتر اور کون شوہر مل سکتا ہے کوزیڈ کا خسر ہونے پر فخر سے بلند کر سکوں گا۔ لیکن میں مجبور ہوں میں ہی نہیں بلکہ تم یہ سن کے میری طرح مجبور ہو جاؤ گے کہ استاریا کی عمر اس وق تیرہ سال سے کم ہے اور اس کم عمر میں شادی ہونے پر چرچ (مانس اسٹیمپٹ کا پادری) استاریا اور مجھے مجرم گردانے گا

کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہ رہیں گے"۔

چرچ کا نام سن کر سب کی گردنیں جھک گئیں۔ اس زمانہ میں ہر ملک میں برسر اقتدار دو طاقتیں ہوتی تھیں۔ ایک بادشاہ کی طاقت اور دوسرے لارڈ پادری کی طاقت۔ لارڈ پادری کے سامنے بادشاہ وقت بھی چوں نہ کر سکتا تھا شادی بیاہ تو خالص مذہبی معاملہ تھا اور اس میں صرف مانس اسٹریٹ کے لارڈ پادری کا حکم مانا جاتا تھا۔ نصرانیوں میں کم سنی کی شادی چرچ کے قانون کے مطابق ایک بہت بڑا گناہ اور جرم تھا اور اس جرم کی سزا سات سال کی باشقت قید تک ہو سکتی تھی۔

چرچ کا نام سن کے سب کی زبانیں بند ہو گئیں۔ ماریہ کا رنگ فق ہو گیا اور استاریا کے تو آنسو نکل آئے اور وہ ماریہ کے گلے لگ کر سسکیاں بھرنے لگی۔

پھر ایک طویل خاموشی کے بعد مارکوئیس نے کہا "پاپا مجھے اس بات کی بہت خوشی ہے کہ آپ سب لوگ مجھے پسند کرتے ہیں۔ اس وقت چرچ کا قانون ہمارے راستہ کی دیوار بن رہا ہے۔ اس سلسلے میں، میں یہ عرض کروں گا کہ اگر استاریا میرا ساتھ دے تو میں چرچ سے شادی کی اجازت حاصل کر سکتا ہوں"۔

استاریا کے بجائے ماریہ نے جواب دیا "مارکوئیس آپ قطعی فکر نہ کیجئے۔ استاریا آپ کا گلے گلے پانی میں بھی ساتھ دیں گی"۔

استاریا نے فوراً جذباتی انداز میں ماریہ کی تائید کی "پیارے مارکوئیس۔ میں تو تمہارے لیے اپنی جان بھی دے سکتی ہوں"۔

استاریا کی آواز بھرا گئی اور وہ سسکیاں لیتی دوبارہ ماریہ کے گلے لگ گئی۔

پاپا نے فوراً اپنی صفائی پیش کی "مارکوئیس میری طرف سے بالکل اطمینان رکھنا۔ اگر تم مانس اسٹریٹ چرچ سے اجازت حاصل کر لو گے تو مجھے استاریا کو تمہارے ساتھ رخصت کرتے ہوئے بہت خوشی ہو گی"۔

"ٹھیک ہے پاپا" مارکوئیس کو زیڈ بہت مطمئن تھا "ہمیں چرچ کے قانون کا پیٹ بھرنا ہو گا۔ اجازت خواہ لارڈ پادری دے یا کوئی اور پادری"۔

کو زیڈ جانے کے لیے تیار ہو گیا "اب مجھے اجازت دیجئے پاپا۔ رات کافی گزر چکی ہے"۔ استاریا تیز قدموں سے کو زیڈ کے پاس آئی۔ اس نے کو زیڈ کا ہاتھ پکڑ کر محبت سے دبایا۔

"اب کب آؤ گے مارکوئیس؟" وہ بہت جذباتی ہو رہی تھی۔

"جب تم کہو؟" کو زیڈ مسکرا رہا تھا۔

"میں تو کہتی ہوں جانے کی ضرورت ہی نہیں۔ یہیں سو جاؤ" استاریا نے بڑے پیار سے کہا۔

"مت گھبراؤ استاریا۔ وہ وقت بھی بہت جلد آئے گا" مارکوئیس دروازے کی طرف بڑھا۔

"میں تمہیں پہنچانے چلوں گا مارکوئیس" پاپا نے پیش کش کی۔

"نہیں پاپا۔ آپ اس وقت کہاں جائیں گے۔ آپ کی گاڑی مجھے چھوڑ آئے گی"۔

مارکوئیس نے بڑے اخلاق سے پاپا کو روکنے کی کوشش کی۔ اسی وقت استاریا نے پیش کش کر دی "پاپا مارکوئیس کو میں چھوڑ آتی ہوں"۔

"تم" مارکوئیس نے حیرانی سے کہا "آدھی رات گزر چکی ہے استاریا"۔

"تو کیا ہوا۔ گاڑی میں جانا ہے اور گاڑی ہی میں واپس آنا ہے" استاریا نے اتنی محبت سے کہا کہ مارکوئیس مزید انکار نہ کر سکا۔

مارکوئیس تو دل میں خوش ہوا کہ بند گاڑی میں استاریا سے گفتگو بھی کر سکے گا اور کچھ گرمجوشی کا اظہار بھی کرے گا۔ پاپا نے استاریا کے جانے پر کوئی اعتراض نہ کیا۔ رات بھیگ چکی تھی اس لیے سردی بھی چمک اٹھی تھی مارکوئیس اور استاریا نے تیز برانڈی کا ایک ایک پیگ چڑھایا اور بند گاڑی میں جا کے بیٹھ گئے۔

مارکوئیس بڑا عیاش تھا وہ ہر وقت ایک نئی عورت بدلتا تھا مگر استاریا کی صورت میں اسے نہ معلوم کیا چیز نظر آئی کہ اس نے اسے بیوی بنانے کا فیصلہ کیا۔ یہ فیصلہ اس نے اس وقت کیا جب پاپا نے استاریا کی کمسنی کا رونا رو کر شادی سے انکار کیا تھا اسی وقت کو زیڈ نے فیصلہ کیا کہ وہ استاریا سے شادی کر کے کچھ دن سکون سے گزارے گا۔

٭

مارکوئیس کو زیڈ جیسے آوارہ مزاج لوگ فطری طور پر دھن کے بہت پکے ہوتے ہیں اس کے ماضی کے بارے میں کچھ زیادہ حال تو معلوم نہ ہو سکا سوائے اس کے کہ وہ ایک آوارہ مزاج مگر بہادر جوان تھا۔ دھن کا پکا شاید اسے اس لیے کہا گیا کہ وہ اپنی عسکری اور بحری زندگی میں ایک اڑیل جوان مشہور تھا اور اسی اڑیل پن کی وجہ سے اس نے بحری لڑائیوں میں نمایاں مقام

حاصل کیا تھا اس نے چار پانچ سال پہلے مانس اسٹریٹ کو بھی اس وجہ سے خیرباد کہا تھا کہ اس کی آوارگی حد سے بڑھ گئی تھی اور لوگ اس سے بات کرنا بھی پسند نہیں کرتے تھے۔

پھر جب اس نے بحری سفر اختیار کیا تو اس کے جوہر کھلے۔ کہنے کو تو وہ بحری فوج کا ایک عام ملاح تھا مگر جب پہلی بحری جنگ کے دوران اس کا سینیئر ملاح مارا گیا تو اس نے اپنے جہاز کی کمان بغیر کسی کے حکم کے خود سنبھال لی۔ بحری بیڑے کا کپتان دوسرے جہاز پر تھا اس نے بیڑے کو خطرے میں محسوس کرتے ہوئے پسپائی کا سگنل دیا مگر کوزیڈ نے اس کے حکم کی کوئی پروا نہ کی اور اپنے جہاز کو لے کر قریب ترین دشمن جہاز پر نہ صرف زبردست تیر برسائے بلکہ تلوار کھینچ کر مخالف جہاز پر چڑھ گیا اور زبردست دوبدو جنگ کے بعد اس جہاز پر قبضہ کر لیا دشمن بیڑے کا کپتان ایسا گھبرایا کہ اپنے جہاز کی مدد کرنے کے بجائے وہ باقی جہازوں کو لے کر بھاگ کھڑا ہوا۔

مارکونیس کوزیڈ کی یہ ایک بے مثال بہادری تھی چنانچہ کپتان کی سفارش پر کوزیڈ کو بحری بیڑے کے نائب کپتانوں میں شامل کر لیا گیا اگلے دو سالوں میں کوزیڈ نے اسی قسم کے اور بہادرانہ مظاہرے کیے اور وہ ترقی کرتے کرتے کپتان کے عہدہ تک پہنچ گیا۔ کوزیڈ ایک اعلیٰ عہدے پر فائز تھا لیکن شراب و شباب کی کمزوریاں اس سے ظاہر ہوتی رہتی تھیں۔ خوبصورت عورت کو دیکھ کر وہ بے قابو ہو جایا کرتا تھا کئی موقعوں پر وہ اپنی بری حرکتوں کی وجہ سے قتل ہوتے ہوتے بچا مگر اپنے ملک اور قوم کے لیے اس قدر کارنامے انجام دے رہا تھا کہ کوئی عدالت اس پر ہاتھ نہ ڈال سکی بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ جج اپنے ایک بہترین ہیرو کو قانون پر قربان نہ کر سکے اور وہ ہر بار بچتا رہا۔

پھر جب مارکونیس کوزیڈ وطن واپس آیا تو اس کارنامے اس سے پہلے وہاں پہنچ چکے تھے کوزیڈ دراصل وطن اس لیے آیا تھا کہ اپنے پرانے دوستوں سے ملے اور ان راہوں پر چلے جن راہوں میں اس کا بچپن گم ہوا تھا وہ ان لوگوں سے بھی آنکھیں ملانا چاہتا تھا۔ جنہوں نے اسے ذلیل کر کے دربدر کر دیا تھا مگر وطن پہنچ کے اسے معلوم ہوا کہ اس کا مقام اس قدر بلند ہو چکا ہے کہ دشمن اس سے آنکھ ملانے کی بھی جرأت نہیں کر سکتے مگر کوزیڈ کو گھومنے پھرنے یا پرانے دوستوں سے ملاقات کی فرصت ہی نہ ملی وہ اسٹریا کے چکر میں ایسا پھنسا کہ اسے کسی اور طرف کا دھیان ہی نہ رہا ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کوزیڈ کو اسٹریا سے واقعی محبت ہو گئی تھی اور اس کے وطن آنے کا مقصد اسٹریا اور صرف اسٹریا کا حصول تھا۔

مارکونیس جس ریٹائرڈ امیر البحر کے بنگلے پر مقیم تھا وہ بیچارہ کوزیڈ کی روش دیکھ کے کڑھتا رہتا تھا۔ کوزیڈ کا اس بنگلے پر قیام برائے نام ہی تھا۔ منہ ہاتھ بھی مشکل سے دھوتا پھر کپڑے پہنتا اور نکل جاتا۔ امیر البحر اسے ٹکر ٹکر دیکھتا رہتا مگر منہ سے کچھ نہ بولتا۔ اسے کوزیڈ کے مزاج کا کچھ کچھ اندازہ پہلے ہی روز ہو گیا تھا جب کوزیڈ جانے کے لیے تیار تھا اور امیر البحر اسے باتوں میں لگائے ہوا تھا اس روز کی تلخی امیر البحر کو اب تک یاد تھی اس لیے کہ وہ کوزیڈ کو جاتے وقت ٹوکتا اور نہ رات گئے واپس آنے پر کوئی سوال و جواب کرتا۔

امیر البحر نے سوچا تھا کہ کوزیڈ کی مصروفیت دو چار دن میں ختم ہو جائے گی پھر وہ کوزیڈ سے تفصیلی گفتگو کرے گا امیر البحر اتنے بڑے بنگلے میں چار ملازموں کے ساتھ تنہا رہتا تھا اس کے ایک بیٹا اور ایک بیٹی تھی جو بال بچوں والے تھے اور الگ الگ اپنے اپنے گھروں میں رہتے انہیں جب کبھی اپنے کاموں سے فرصت ملتی تو وہ ایک دن کے لیے باپ کے پاس آ جاتے تھے مگر تین دن سے زیادہ وہ کبھی نہ ٹھہرتے تھے۔

امیر البحر نے کتابوں سے دوستی کر لی تھی اور خاندانی رئیس ہونے کی وجہ سے معقول جائداد اور زمین اس کے حصہ میں آئی تھی پھر بھی وہ خود کو کسی نہ کسی کام میں مصروف رکھتا اور ایک متوازن زندگی گزارنے کا عادی ہو چکا تھا مطالعہ کے شوق نے اس کی زندگی میں رکھ رکھاؤ اور توازن پیدا کیا تھا۔ دوستوں کی وہ بہت قدر کرتا اور باہر سے آنے والے کاروباری یا غیر کاروباری دوست اس کے یہاں ہفتوں اور مہینوں ٹھہرے رہتے تھے۔

امیر البحر نے بڑی مہمان نواز طبیعت پائی تھی۔ جب کوئی بڑا آدمی اس شہر میں آتا تو خواہ شناسائی ہو یا نہ ہو امیر البحر اسے اپنے بنگلے پر ضرور مدعو کرتا۔ اسی شوق نے اسے مجبور کیا تھا کہ وہ مارکونیس کو اپنے گھر قیام کرنے کی دعوت دی تھی اور مارکونیس نے اسے اس خیال سے قبول کر لیا تھا وہ اس کا ہم پیشہ تھا مگر مارکونیس نے پہلے ہی دن سے اسٹریا کا گھر ایسا دیکھا تھا کہ اسے کسی اور جگہ چین ہی نہ ملتا تھا امیر البحر کے بنگلے پر تو وہ رات کے صرف چند گھنٹے گزارنے آیا کرتا تھا۔

مگر اس صبح اسے بڑا تعجب ہوا جب اسے ایک ملازم نے بڑی رازداری سے بتایا "آقائے محترم۔ آج آپ کے مہمان اب تک اپنے کمرے میں ہیں۔"

"کیا۔ کیا کہا تم نے مارکونیس اپنے کمرے میں ہے؟"

امیر البحر نے اس طرح پوچھا جیسے کوئی بہت غیر معمولی بات ہو گئی ہو۔

"جی آقا۔ وہ اپنے کمرے میں ہیں اور آپ سے ملاقات کے لیے آنے والے ہیں" ملازم نے ایک اور انکشاف کیا "انہوں نے مجھے بلا کے پوچھا تھا کہ کیا امیر البحر جاگ رہے ہیں"۔

امیر البحر کے لیے یہ خبر اس سے زیادہ حیرت ناک تھی اس کے لیے مارکونیس کی ذات بڑی پراسرار تھی آج تک اس کے گھر کوئی ایسا شخص نہیں آیا تھا جو مارکونیس کی طرح مہمان ہوتے ہوئے اپنے میزبان سے اس قدر بے تعلق اور اجنبی رہا ہو۔ دن اور رات کے کھانے کا تو کوئی سوال نہ پیدا ہوتا کہ مارکونیس کھانے کے دونوں اوقات میں بنگلہ میں موجود ہی نہ ہوتا تھا امیر البحر کو صرف یہ یاد تھا کہ مارکونیس کو زینڈ نے صرف ایک صبح اس کے ساتھ ناشتہ کیا تھا ورنہ وہ ناشتہ سے بہت پہلے بنگلہ سے نکل جایا کرتا تھا ان حالات میں اسے یہ معلوم ہوتا کہ مارکونیس اس وقت تک یعنی دن چڑھے تک بنگلہ میں موجود تھا اور اس نے امیر البحر کے متعلق دریافت بھی کیا ہے۔ بوڑھے امیر البحر نے مارکونیس کی روش میں ایک دم اس تبدیلی سے یہ اندازہ لگایا تھا کہ مارکونیس کو آج اس سے کوئی کام ضرور پڑا ہے۔

امیر البحر ایسے ہی خیالوں میں الجھا ہوا کتاب پڑھ رہا تھا خیالات کے ہجوم میں اس سے پڑھا کب جا رہا تھا کتاب تو اس نے بس یونہی کھول لی تھی کہ اس کے کمرے کے باہر کسی کے چلنے کی چاپ ہوئی۔ اس نے نظریں اٹھائیں تو مارکونیس کو دروازے میں کھڑا پایا۔ مارکونیس شاید اندر آتے ہوئے کچھ ہچکچا رہا تھا چند لمحے دونوں ایک دوسرے کو دیکھتے رہے پھر خود مارکونیس نے گفتگو میں پیش قدمی کی۔

"محترم امیر البحر۔ کیا میں آپ کے خیالوں میں حل ہو سکتا ہوں؟"۔

جہاندیدہ امیر البحر مسکرایا "مارکونیس۔ خیالوں پر قبضہ تو جوانوں کا ہوتا ہے ہم تو اس دنیا سے بہت دور نکل آئے ہیں"۔

یہ کہتے ہوئے امیر البحر اٹھا اور دروازے پر جا کر مارکونیس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ "جوان عمر مارکونیس فوجی تو بہت سادہ اور بے تکلف ہوتے ہیں تمہیں میرے پاس آنے کے لیے اجازت کی کیا ضرورت ہے مہمان تو گھر کا ایک فرد ہوا کرتا ہے"۔

امیر البحر اس طرح ہاتھ میں ہاتھ ڈالے مارکونیس کو کمرے میں لے آیا امیر البحر کا یہ کمرہ مہمان خانہ بھی تھا اور لائبریری بھی۔ اس وسیع و عریض کمرے میں دو شیشے دار الماریاں رکھی تھیں اور ایک کونے میں گول میز اور کرسی بچھی ہوئی تھی امیر البحر شاید اس میز پر لکھنے کا کام کرتا تھا مارکونیس کے لیے یہ کمرہ بالکل نیا تھا یہی ایک کمرہ کیا مارکونیس کے لئے امیر البحر کا پورا بنگلہ ہی اجنبی تھا اس لیے کہ وہ صبح کو بنگلہ سے نکلتا تو کافی رات ڈھلے واپس آتا تھا اسے تو صرف اس کمرے کا پتا تھا جس میں وہ سوتا تھا۔

امیر البحر نے مارکونیس کے سامنے بیٹھتے ہوئے کہا "آج سویرے سویرے شہزادے کو ہماری یاد کیسے آ گئی۔ مارکونیس ایک ہفتہ سے زیادہ تمہیں ہمارا مہمان ہوئے ہو گیا ہے مگر تم نے آج تک مجھے میزبانی کا شرف نہیں بخشا اس میں شاید میری بھی کچھ خطا ہے اس لیے کہ میزبان میں ہوں۔ صبح کو تمہاری مزاج پرسی کے لیے مجھے تمہارے پاس آنا چاہیے میں اس کی کوشش بھی کی لیکن صبح کو تم اس جلدی میں ہوتے ہو کہ میں تمہیں اب تک روک نہ سکا۔ خیر چھوڑو ان باتوں کو میزبان پر یہ واجب نہیں کہ وہ مہمان کے سامنے اپنی داستان لے کے بیٹھ جائے"۔

"محترم بزرگ" مارکونیس نے بڑے مہذب طریقے سے کہا "مجھے افسوس ہی نہیں بلکہ میں آپ سے شرمندہ ہوں کہ اتنے دنوں آپ کا مہمان رہنے کے باوجود ابتک آپ سے کوئی تفصیلی گفتگو نہ کر سکا حالانکہ آپ کے یہاں قیام کرنے کا عزم اس لیے کیا تھا کہ ہم پیشہ ہونے کی وجہ سے ہماری طبیعتوں میں بھی ہم آہنگی ہو گی اس طرح دو دیوانے مل جائیں گے تو اچھی گزرے گی مگر کیا عرض کروں یہاں آ کے کچھ ایسا الجھ گیا ہوں کہ کسی اور بات کا وقت ہی نہ مل سکا"۔

"کوئی بات نہیں مارکونیس" امیر البحر نے ہنس کے کہا "جوانی دیوانی ہوتی ہے اور اندھی بھی اس دشت بلاخیز سے ہم بھی گزر چکے ہیں۔ بتاؤ میں تمہاری کیا خدمت کر سکتا ہوں؟"

مارکونیس نے چونک کر امیر البحر کو دیکھا پھر احساس شرمندگی سے سر جھکایا "محترم معلوم ہوتا ہے آپ تمام باتوں سے آگاہ ہیں" ۔ مارکونیس آگے کچھ نہ کہہ سکا۔

"مارکونیس۔ نہ تم نے کچھ بتایا ہے اور نہ میں نے اس کی کھوج کی ہے" ۔ امیر البحر کے چہرے پر اب بھی مسکراہٹ تھی "مگر قیاس بھی کوئی چیز۔ اندازے اگرچہ اندازے ہوتے ہیں مگر وہ کبھی کبھی سچ بھی ہو جاتے ہیں۔ اگر تفصیل سے بتاؤ گے تو شاید میں کوئی مشورہ دے سکوں"۔

"بزرگ محترم" مارکونیس نے درد دل بیان کرنے کے لیے بہت سے ابتدائیہ جملے سوچے تھے مگر اس وقت وہ سب کچھ

سنبھل گیا تھا بہرحال اس نے جس طرح سے بھی ہو سکا اپنا اور استاریا کا مسئلہ بیان کرنے کا آغاز کیا۔

"آپ کا قیاس اور اندازہ بالکل درست ہے۔ میں اتنے دنوں بعد وطن یہ سوچ کے آیا تھا کہ کچھ دنوں پرانے دوستوں کے ساتھ گھوموں پھروں گا مگر استاریا کو دیکھتے ہی راستے سے بھٹک گیا اور اب اس طرح پھنس گیا ہوں کہ نہ آگے بڑھ سکتا ہوں اور نہ پیچھے قدم ہٹائے جا سکتے ہیں"۔ مارکوئیس نے رک کر پیشانی کا پسینہ صاف کیا حالانکہ ابھی خاصی سردی ہو رہی تھی اور پسینہ آنے کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔

امیر البحر نے بزرگانہ نصیحت کی۔ "مارکوئیس اس قدر پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ تمہیں اپنی جنگی زندگی میں اس سے کہیں زیادہ خطرناک موقعے پیش آئے ہوں گے پس جس طرح تم نے ان خطرات کا مقابلہ کیا اُسی طرح اب بھی ثابت قدم رہو اور صرف یہ خیال رکھو کہ فوجی کا قدم جب ایک بار آگے بڑھ جاتا ہے تو اس کے پیچھے آنے کا تصور ہی غلط ہے۔ تمہیں تو آگے اور آگے ہی بڑھنا ہے خواہ سر رہے یا کٹ جائے"۔

امیر البحر کے آخری جملے سے مارکوئیس میں جیسے جان پڑ گئی۔ وہ پرعزم لہجے میں بولا۔ "محترم بزرگ۔ آپ نے مجھے ایک نیا حوصلہ دیا ہے میں تو پریشان ہو گیا۔ کچھ سمجھ میں نہ آ رہا تھا کہ کیا کروں۔ کدھر جاؤں"۔

"شاباش مارکوئیس۔" امیر البحر نے اسے اور سہارا دیا۔ "تمہارے چہرے پر ایک سپاہیانہ شان دیکھ کے مجھے بہت خوشی ہوئی۔ ہاں اب بتاؤ تمہیں کیا پریشانی ہے۔"

عاشق کو اگر کوئی ہمدرد اور دمساز مل جائے تو وہ دل کھول کے رکھ دیتا ہے۔ مارکوئیس کے عشق عاشقی کا یہ پہلا ڈرامہ نہ تھا۔ اس سے پہلے بھی وہ نہ معلوم کتنے گل کھلا چکا تھا مگر وہ تمام کھیل یا کھیل تماشے تھے۔ محبت کی یہ بازیاں وہ اپنی لاابالی طبیعت کے تحت کھیلتا تھا۔ اس میں اس کے خلوص کو کوئی دخل نہ ہوتا۔ رہا محبت کا سوال تو مارکوئیس اس لفظ کے صحیح مفہوم سے بھی واقف نہ تھا۔ اس کے خیال میں محبت یہ تھی کہ کسی لڑکی یا عورت کے ساتھ دو چار دن، ہنسی خوشی گزارے پھر دونوں کے راستے الگ ہو گئے۔ استاریا کے معاملہ میں بھی مارکوئیس کو زیدہ کا پہلے یہی خیال تھا کہ وہ اس رنگ کلی سے دو چار دن یا ہفتہ دو ہفتے کھیلے گا پھر رخ بدل کے کسی اور شمع کا پروانہ بن جائے گا۔

ہم! سوچنے لگے مارکوئیس۔ امیر البحر نے اس کے خیالات کا سلسلہ منقطع کر دیا۔ "مجھے یہ تو معلوم ہے کہ وہ رئیس زادی جس کا نام شاید استاریا ہے اس کا کوئی چکر ہے شاید میرا یہ خیال بھی درست ہے کہ وہ لڑکی بھی تمہیں پسند کرتی ہے پھر یہ کون رقیب پیدا ہو گیا جس نے تمہیں پریشان کر کے رکھ دیا؟"۔

"محترم۔ آپ نے صحیح فرمایا۔ استاریا مجھے پسند کرتی ہے اور میری کسی بات سے انکار نہیں کرے گی"۔

"مارکوئیس نے ایک ٹھنڈی سانس لی۔ اس کا باپ بھی میری مخالفت نہیں کرے گا بلکہ میری مدد کرنے پر آمادہ ہے"۔

"پھر تو کوئی مشکل ہی نہیں مارکوئیس"۔ امیر البحر نے پرسکون لہجے میں کہا۔ "باپ بیٹی راضی۔ ادھر تم رضامند۔ پھر تمہیں کون روک رہا ہے۔ مجھے اس کا نام بتاؤ میں اس کا خاتمہ کرا دوں گا۔؟"

مشکل تو یہ بھی ہے محترم۔ مخالف وہ ہے جس پر نہ میں قابو پا سکتا ہوں اور نہ آپ۔ "اور مارکوئیس کو زیدہ نے شروع سے آخر تک تمام واقعات بیان کر دیے۔

اصل مسئلہ استاریا کا لڑکپن اور کمسنی ہے۔ کسی نابالغ لڑکی سے شادی کرنا بہت بڑا جرم تھا اور اس کی کسی طرح معافی نہ ہو سکتی تھی امیر البحر بھی فکر مند ہو گیا۔

دیر تک خاموشی طاری رہی۔ مارکوئیس، امیر البحر کے چہرے پر نظریں گاڑے اتار چڑھاؤ دیکھ رہا تھا۔ آخر امیر البحر نے کہا۔

"میں گزشتہ دس سال سے کسی دوسرے شہر نہیں گیا۔ اس شہر میں بھی میں سوائے خاص خاص تقریبوں کے اور کہیں نہیں جاتا مگر اب مجھے دوسرے شہر جانا پڑے گا۔ بغیر باہر گئے کام سیدھا نہ ہو گا"۔

مارکوئیس اس کی باتوں سے الجھ رہا تھا۔ اس کے خیال میں امیر البحر کی یہ باتیں موضوع سے کوئی تعلق نہ رکھتی تھیں۔ آخر اس سے کہہ ہی دیا۔

"میں آپ کی بات نہیں سمجھ سکا۔ آپ باہر کس لیے جانا چاہتے ہیں اور اس کا اس مسئلہ سے کیا تعلق ہے؟"۔

"تعلق کیوں نہیں ہے مارکوئیس۔" امیر البحر نے متانت سے جواب دیا۔ "میں تمہارے ہی کام کے لیے باہر جاؤں گا۔ صرف میں نہیں بلکہ تم بھی میرے ساتھ ہو گے اور استاریا اور اس کے پاپا بھی ہمارے ساتھ چلیں گے۔ ایک اچھا دورہ ہو گا یہ"۔

"مارکوئیس پھر کچھ نہ کہہ سکا۔ اس نے ملتجی نظروں سے امیر البحر کو دیکھتے ہوئے کہا۔ "محترم۔ براہ کرم اپنی بات کی

...احت فرمائیے۔ میری سمجھ میں کچھ بھی نہیں آیا؟"

"...کے بحریہ کے نوجوان افسر۔ تمہیں اس سلسلہ میں زیادہ ...غ سوزی کی ضرورت نہیں۔" امیر البحر نے بڑی بے تکلفی ...ے کہا۔ "کچھ ضروری باتیں میں تمہیں سمجھائے دیتا ہوں۔ اس ...ے زیادہ سمجھنے کی تمہیں ضرورت بھی نہیں۔ جزیرہ ...سلی (اسقلیہ) کا لارڈ پادری میرا دوست ہے۔ دوست اس طرح ہے ...بچپن میں ہم دونوں ایک ہی اسکول میں پڑھتے تھے پھر اس ...کے والدین مع اپنے گھر بار کے ہمیشہ کے لیے سسلی منتقل ہو ...ئے۔ اس طرح ہم دونوں جدا ہو گئے۔ بچپن کی اس جدائی کے بعد ...ریباً چالیس سال بعد میرا اتفاقیہ سسلی جانا ہوا اور ایک اتوار جب ...دت کے لیے بڑے گرجے میں گیا تو میرا بچپن کا یار مجھے لارڈ ...پادری کے روپ میں نظر آیا۔ عبادت کے بعد میں اس پاس کرے ...گیا پھر میرا سامنا ہوتے ہی اس نے مجھے بالکل اس طرح پہچان لیا ...س طرح میں نے چالیس سال بعد اسے لارڈ پادری کے روپ میں ...پہچانا تھا۔

اس نے ایک ہفتہ تک مجھے سسلی میں روک کے رکھا پھر اس ...وعدہ کے ساتھ رخصت ساتھ کیا کہ میں دوسرے تیسرے سال اس ...سے ملنے آیا کروں گا۔ میں نے اس سے کیا ہوا وعدہ یاد رکھا اور اب ...دوسرے تیسرے تو نہیں ہاں پانچویں چھٹے سال اس سے ملاقات کے ...لیے سسلی جاتا ہوں اس سے ملے ہوئے تقریباً پانچ سال ہو چکے۔ اس ...زمانہ اس سے ملاقات بھی ہو جائے گی اور تمہارا کام بھی بن جائے ...گا۔"

مارکوئیس بہت بے چین تھا۔ اس نے پوچھا۔ "کیا لارڈ ...پادری چرچ کا قانون توڑ کے استاریا سے میری شادی کر دیں ...گے؟"

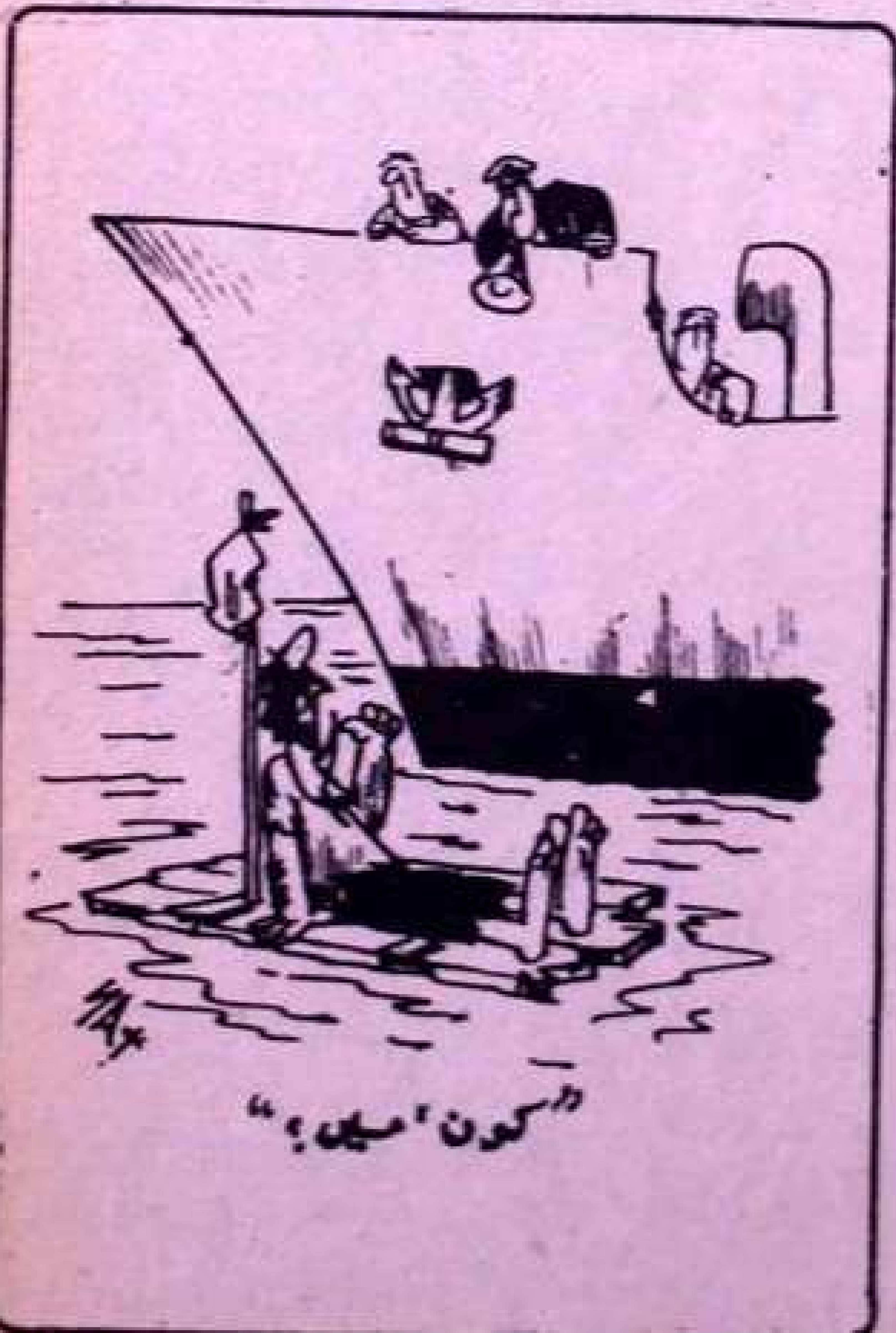
"میرا خیال ہے کہ وہ مجھ سے انکار نہیں کرے گا۔" ...امیر البحر نے وثوق سے کہا۔ "ہم ایک دوسرے سے بہت بے ...تکلف ہیں جب میں وہاں جاتا ہوں تو ہم دونوں اپنے بچپن کی ...یادیں دہراتے ہیں اس دوران میں بہت سی ناشائستہ باتیں بھی ...کر ڈالتے ہیں۔ مجھے اس سے پوری امید ہے۔"

مارکوئیس نے امیر البحر کو تو جواب نہ دیا مگر اپنے طور پر ...اس مسئلے کے تمام پہلوؤں پر غور کرتا رہا۔ سب سے پہلا سوال تو یہ ...تھا کہ استاریا کے پاپا کو کیا ضرورت پڑی ہے وہ استاریا کو ساتھ لے ...کے سسلی کا طویل سفر اختیار کریں۔ دوسری بات یہ کہ سب سسلی ...پہنچ بھی گئے مگر امیر البحر کے خیال کے برعکس لارڈ پادری نے ...اس غیر قانونی کام میں ہاتھ ڈالنے سے انکار کر دیا تو کیا ہو گا۔

کونریڈ کی پاپا اور استاریا کے سامنے کیا عزت رہ جائے گی۔ یہ دونوں سوال بہت اہم تھے اور عقل کوئی معقول جواب دینے سے قاصر تھی۔

مارکوئیس کو امیر البحر کے بنگلہ پر دیر لگی تو وہاں استاریا پریشان ہو گئی۔ استاریا اس پر ایسی فریفتہ ہو گئی تھی کہ صبح سے رات گئے تک مارکوئیس سے چمٹی رہتی بلکہ اس نے تو مارکوئیس پر اپنا سب کچھ نچھاور کر دیا تھا۔ کونریڈ بڑا چالاک اور شاطر تھا۔ اس کی کسی عورت سے دوستی، صرف ایک ملاقات تک محدود رہتی پھر وہ اس عورت کو اپنے گلے اور ذہن سے اس طرح اتار پھینکتا جس طرح پرانی جوتی پھینکی جاتی ہے مگر استاریا اس کے گلے میں ایسی پڑی تھی جسے وہ کوشش کرنے کے باوجود الگ نہ کر سکا۔

استاریا تھی بھی ایسی ہی خوبصورت، اس کی شربتی آنکھیں ہر وقت شراب میں ڈوبی رہتیں۔ مست چال اور مست سراپا۔ کونریڈ سے چند ملاقاتوں ہی میں وہ بند کلی سے ایک مہکتا لہکتا، کھلا ہوا گلاب نظر آنے لگی تھی۔ امڈتی جوانی اور چڑھتے شباب کی مثال اس پر صادق آتی تھی۔ کونریڈ اس کی نظروں میں ڈوب گیا تھا اور استاریا اس کے رگ و پے میں سما گئی تھی۔



"کون، میں؟"

اسٹاریا باہر گیٹ پر کھڑی تھی کونزیڈ فکر مند سا واپس آیا۔ اسٹاریا نے بے دھڑک اس کی گردن میں دونوں ہاتھ ڈال کے اس کا منہ چوم لیا۔ مغربی تہذیب میں سر عام بوس و کنار بھی کوئی عیب نہ تھا اسٹاریا تو اپنے مکان کے گیٹ پر تھی۔ سامنے سے گزرتے ہوئے دو ایک جوڑوں نے والہانہ محبت کے اس بیباک اظہار کو دیکھا بھی مگر وہ سوائے مسکرانے کے اور کوئی تاثر نہ دے سکے۔ "اتنے افسردہ کیوں ہو کونزیڈ۔ میں تمہارے ساتھ ہوں اور ہمیشہ ساتھ رہوں گی۔ چرچ اگر اجازت نہیں دیتا ہے تو نہ دے۔ ہمیں ساتھ رہنے سے تو کوئی نہیں روک سکتا۔ اسٹاریا نے بڑی مستقل مزاجی سے کونزیڈ کو تسلی دی۔

اسٹاریا نے ٹھیک کہا تھا یورپ میں جوان یا نوجوان لڑکی لڑکا ایک ساتھ رہ سکتے ہیں۔ خواہ وہ کتنے ہی دن رہیں اس طرح رہتے ہوئے وہ بال بچوں والے بھی ہو جاتے تھے مگر مغربی تہذیب نہ انہیں ٹوک سکتی ہے اور نہ کوئی اعتراض کر سکتا ہے۔ مادر پدر آزادی شاید اسی کو کہتے ہیں پھر اسے شادی کرنے میں اس قدر بے چینی اور جلدی کیوں ہے۔ اسٹاریا کے پاپا بھی ان کے ناجائز (جوان کے خیال میں جائز تھے) تعلقات پر کوئی اعتراض نہ کیا تھا۔

"عجیب بات تھی کہ جو لٹ رہی تھی جس کی جوانی برباد ہو رہی تھی جس نے اپنا متاع زندگی برباد کر دیا تھا وہ تو بالکل مطمئن تھی مگر جوانی کا لٹیرا، حسن کا وہ ڈاکو جو اسٹاریا سے پہلے کتنے غنچوں اور پھولوں کی کچی پکی پنکھڑیوں کو نوچ چکا تھا۔ جو اس بات پر قادر تھا کہ جب چاہتا اپنے بحری بیڑے کو لے کر کسی طرف نکل جاتا مگر اسٹاریا کی محبت کی زنجیر نے کچھ ایسے اسے جکڑا تھا کہ وہ اسٹاریا کو چھوڑ کے کہیں جانے پر آمادہ نہ نظر آتا تھا۔

"کونزیڈ، اسٹاریا کی کمر کے گرد ہاتھ ڈال کر مکان میں گیا۔ پاپا تمام باتوں سے واقف تھے وہ بھی کونزیڈ کی طرح پریشان تھے۔ اسے دیکھتے ہی پاپا نے سوال کیا۔

"کیا ہوا بیٹے کونزیڈ۔ کوئی کام بنا؟"۔

"آپ فکر نہ کیجئے کام ہو جائے گا۔ کچھ پریشانی ضرور اٹھانی ہوگی"۔

کونزیڈ نے پاپا کو مطمئن کرنے کے لیے کہہ دیا حالانکہ اسے خود کچھ زیادہ امید نہ تھی چرچ کے قوانین بہت سخت ہوتے تھے چرچ کی طاقت بادشاہ وقت کے برابر ہوتی تھی لارڈ پادری کے معاملہ میں بادشاہ چوں چرا کرنے کا قطعی مجاز نہ تھا۔

"اسٹاریا نے مارکوئیس کونزیڈ کو ہنسانے اور اس کا غم دور کرنے کی بہت کوشش کی مگر اس کا غنچۂ دل نہ کھل سکا۔ وہ اس قدر افسردہ تھا کہ یوں معلوم ہوتا تھا کہ بس اب رونے والا ہے۔

اسٹاریا کو غصہ آگیا۔ "تم عجیب آدمی ہو کونزیڈ۔ مجھ سے عمر میں کتنے بڑے ہو مگر بچے بنے جا رہے ہو۔ میں مطمئن ہوں۔ مجھے کوئی فکر نہیں اور تم ہو کہ پاگل ہوتے جاتے ہو"۔

"اسٹاریا! تم چرچ کی طاقت کو نہیں جانتیں۔ کونزیڈ نے افسردگی سے کہا۔ "اگر انہیں شبہ ہوگیا تو ہم عمر بھر شادی نہیں کر سکیں گے"۔

"میں تمہارے ساتھ عمر بھر رہنے کو تیار ہوں"۔ اسٹاریا نے اکڑ کے کہا "چرچ ہمیں الگ تو نہیں کر سکتا"۔

"اسٹاریا معاملے کی اہمیت کو سمجھنے کی کوشش کرو"۔ مارکوئیس بے بسی سے بولا۔ "اچھا اب ان باتوں کو چھوڑو اور غور سے سنو۔ امیر البحر کنگیری نے ایک ترکیب بتائی ہے"۔

"یہ امیر البحر کنگیری کون ہیں"۔ اسٹاریا نے اس کی بات کاٹ دی۔

"ارے یہ وہی امیر البحر کنگیری ہیں جن کے بنگلہ پر میں ٹھہرا ہوا ہوں"۔ مارکوئیس نے بتایا۔ ان کے پیچھے ہی پاپا بھی آگئے۔ مارکوئیس کونزیڈ نے امیر البحر کنگیری کی وہ تمام باتیں دہرائیں جو انہوں نے اس سلسلہ میں کہیں تھیں۔ مارکوئیس چونکہ خود اس مسئلہ میں پیش پیش تھا اس لیے اس نے پاپا کو اس طرح سمجھایا کہ وہ سسلی جانے پر آمادہ ہو گئے۔ اسٹاریا کو کونزیڈ نے سمجھا بجھا کے راضی کر لیا۔ دوسرے دن امیر البحر کنگیری کے بنگلہ پر ایک خصوصی میٹنگ ہوئی جس میں کونزیڈ کے علاوہ اسٹاریہ اور پاپا شریک ہوئے

پھر اس سے اگلے دن امیر البحر کنگری، مارکوئیس کونزیڈ، اسٹاریا اور پاپا ایک بحری جہاز پر سسلی کی طرف جا رہے تھے۔ یہ جہاز مارکوئیس کونزیڈ کے بحری بیڑے کا سب سے زیادہ تیز رفتار جہاز تھا۔

مارکوئیس اور اسٹاریا کی محبت کا کیا انجام ہوا۔ آیا کہ چرچ سے ان کو اجازت ملی کہ نہیں۔ سفر کے دوران ان کو کیا کیا مشکلات پیش آئیں یہ سب جاننے کے لیے آئندہ ماہ تک انتظار۔

فتح بیت المقدس کے بعد دوسرے سال سلطان صلاح الدین کو تین اہم فتوحات حاصل ہوئی تھیں، یعنی کوکب، صفد اور الکرک۔ ان قلعوں کی فتح کی وجہ سے مصر اور عرب کے دوستوں پر اور دریائے اردن کی وادی میں سوداگروں کے قافلے بغیر روک ٹوک کے گزر سکتے تھے۔ حاجی کعبہ اور روضۂ رسولؐ پر جانے والوں کو کوئی ٹیڑھی نظر سے دیکھنے کی جرأت نہ کر سکتا تھا لیکن فلسطین اور شام کے ساحل کی ان فتوحات کے مقابلہ میں صور پر فرنگیوں کے قبضہ سے سلطان کو جو نقصان پہنچا اس کا اندازہ کرنا بھی مشکل ہے۔

بیت المقدس (یروشلم) کا اسقف اعظم جب بیت المقدس پر سلطان صلاح الدین ایوبی کے قبضہ کی خبر لے کر یورپ پہنچا تو وہاں کے ہر دربار، شہر، قریے اور بستیوں میں کہرام مچ گیا۔ ایک مغربی مورخ لکھتا ہے:-

"یروشلم کی چھوٹی سی سلطنت لاطینی کلیسا اور لاطینی لوپ کی مشرقی ممالک میں ایک بیرونی چوکی کی حیثیت رکھتی تھی۔ یہ دور اول کے ان صلیبی بہادروں کی تخلیق تھی جن کے کارنامے متعدد رزمیہ داستانوں کے موضوع بن چکے تھے۔ یہ ان پراسرار مشرقی ممالک کی سرحد پر واقع تھی جہاں سیم وزر کی فراوانی تھی۔ فلسطین مغربی عیسائیت کے تخیل اور اعتقاد کا محرک بھی تھا اور مرکز بھی۔"

یورپ کے ہر ملک میں ایک اور صلیبی جنگ کا جوش و جذبہ پیدا ہو گیا۔ نائنس (خدائی فوجدار) نے صلیبی جنگ کو دینی ہم کا مرکز اور مدعا بنا لیا۔ روم کے پوپ اعظم نے فرمان جاری کیا کہ جو شخص اس مقدس جنگ میں دامے، درمے اور سخنے شرکت کرے گا اس کے تمام اگلے پچھلے گناہ معاف ہو جائیں گے۔ فرانس اور برطانیہ جو مدتوں سے ایک دوسرے کے دشمن چلے آ رہے تھے۔ انہوں نے فوراً صلح کر لی۔ ہر جگہ رضاکاروں کی بھرتی شروع ہو گئی۔ لوگ مقدس جنگ کے لئے چھاؤنیوں میں جمع ہونا شروع ہو گئے۔ جنگی اخراجات کے لئے چندہ جمع ہونے لگا۔ عورتوں نے اپنے قیمتی زیورات بیچ کر چندہ دیا۔ ہر شخص کی دولت پر "صلاح الدین ٹیکس" لگ گیا۔ شاعروں نے جنگی ترانے لکھے۔ گانے والوں نے یہ ترانے گلیوں گلیوں پھیلائے۔ اور لوگوں کو جمع کر کے سنائے۔

پادریوں، شاعروں اور گویوں نے عوام کے دلوں کو تو جوش و جذبہ سے بھر دیا لیکن مقتدر طبقہ مصلحتوں میں الجھا رہا۔ فرانس اور انگلستان میں سفارتی گھوڑے تو بہت دوڑے مگر فلسطین میں صلیبی جنگ کے لئے لشکر کی روانگی میں تاخیر پر تاخیر ہوتی رہی۔ فرانس اور انگلستان کے پرانے جھگڑے ایک بار پھر اٹھ کھڑے ہوئے۔ جنہیں نپٹاتے نپٹاتے ۱۱۸۹ء کا پورا سال گزر گیا۔ سب سے پہلے جس یورپی حکمراں کا لشکر صلیبی جنگ کے لئے فلسطین روانہ ہوا وہ جرمن کا شہنشاہ فریڈرک باربروسہ تھا مگر اس کی قسمت میں صلیبی جنگ میں شرکت کرنا نہیں تھا۔ شہنشاہ فریڈرک اپنا لشکر لے کر براستہ یونان آیا تھا مگر یہ بوڑھا شہنشاہ دریائے "سالف" پار کرتے ہوئے ڈوب کے مر گیا اس کا لشکر بھی تباہی کا شکار ہو گیا اور صرف دو ہزار کی قلیل تعداد اس کے بیٹے کی سرکردگی میں ساحل فلسطین تک پہنچ سکی۔

سلطان صلاح الدین ایوبی نے فرنگیوں کے تمام ساحلی قلعے اور علاقے ایلہ سے بیروت تک فتح کر لئے تھے۔ ان کے درمیان صرف صور (قلعہ اور شہر) حائل تھا جہاں سلطان نے بعض مصلحتوں کی وجہ سے محاصرہ اٹھا لیا تھا۔ صور پر اٹلی سے آئے ہوئے مارکوئیس کانریڈ کا قبضہ تھا۔ سلطان صفد اور کوکب فتح کرنے کے بعد بیت المقدس پہنچا۔ بیت المقدس میں سلطان نے عید الاضحیٰ تک قیام کیا پھر قربانی کی رسم ادا کرنے کے بعد عکہ واپس گیا اور وہاں موسم سرما کے آخر تک مقیم رہا۔

موسم بہار میں سلطان نے قلعہ شقیف کا رخ کیا۔ یہ قلعہ فرنگی حاکم میدا، ارناط کے ماتحت تھا۔ مشہور تھا کہ ارناط تمام فرنگی حاکموں میں سب سے ذہین، چالباز اور مکار حاکم تھا۔ جب سلطان قلعہ شقیف کے قریب مرج العیون پہنچا تو ارناط خود ہی سلطان کی بارگاہ میں حاضر ہو کر سلام بجالایا۔

سلطان نے اسے دیکھ کر دریافت کیا۔ "ارناط تمہارے آنے کا کیا مقصد ہے۔ کیا تمہیں معلوم نہیں کہ ہم تمہارے قلعہ پر قبضہ کرنے جا رہے ہیں۔ تم ہماری طلبی کے بغیر ہمارے پاس آنے کی پاداش میں قتل بھی کئے جا سکتے ہو؟"

"سلطان معظم! میں اسی لئے تو دربار سلطانی میں خود حاضر ہو گیا ہوں کہ آپ کو شقیف جانے کی زحمت سے محفوظ رکھوں۔ جلاد کو میرے قتل کا حکم دیجئے۔ میں اپنی زندگی سے پہلے ہی تنگ آ چکا ہوں۔ آپ کے ہاتھ سے قتل ہوں گا تو میری روح کو سکون ملے گا کہ میرا قتل ایک عادل سلطان کے ہاتھوں سے ہوا ہے۔"

ارناط اگرچہ فرنگی تھا لیکن اسے عربی زبان پر بڑا عبور حاصل تھا اور وہ مسلمانوں کی تہذیب و تمدن سے بھی پوری طرح واقف تھا۔ اسے یہ بھی معلوم تھا کہ سلطان حد درجہ رحمدل ہے اور لوگوں پر احسان کر کے خوش ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ ارناط گفتگو کرنے اور دوسرے سے اپنی بات منوانے میں بھی کمال رکھتا تھا۔

"ارناط ہمیں خوشامد ہرگز پسند نہیں۔ صاف صاف بیان کرو تم کیا چاہتے ہو؟" سلطان نے ذرا سخت لہجہ میں کہا۔

"اے سلطان عالی مقام!" ارناط نے زبان دانی کا تیر چلایا۔ "میں جانتا ہوں کہ خوشامد سے ظالم بادشاہ خوش ہوتا ہے اور جھوٹ سے سنگدل کو موم کیا جاتا ہے مگر ایک عادل سلطان ان دونوں عیبوں سے پاک ہوتا ہے۔ سلطان کو سچ پسند ہے اس لئے میں حضور عالی کی خدمت میں صرف سچ عرض کروں گا۔"

ارناط، سلطان کے چہرے پر اپنی زباندانی کا تاثر دیکھنے کے لئے ذرا رکا اور اس کی طرف دیکھا لیکن سلطان کا چہرہ سپاٹ تھا اور اس پر کوئی تاثر نہ تھا۔

"سلطان معظم!" ارناط نے پھر کہنا شروع کیا۔ "صور کے حاکم مارکوئیس کونریڈ نے میرے بیوی بچوں کو مجھ سے چھین لیا ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ میرے اہل و عیال کو وہ صرف اس صورت میں واپس کرے گا جب اسے یقین ہو جائے گا کہ میں اس کے ساتھ مل کر سلطان معظم سے جنگ کروں گا۔ میں کونریڈ سے ایک سے زیادہ بار انکار کر چکا ہوں۔ اس لئے نہیں کہ سلطان کا حلیف یا دوست ہوں بلکہ اس لئے کہ سلطان کے لشکر سے ٹکرانا خود کو موت کے منہ میں دینے کے مترادف ہے۔ کونریڈ اس وقت آپ کی شان میں گستاخی کرتا ہے لیکن جلد یا بدیر وہ بھی دوسرے بادشاہوں اور سرداروں کی طرح آپ کی قید میں ہوگا۔"

ارناط نے کچھ ایسے جذباتی انداز میں گفتگو کی کہ سلطان کو اس پر رحم آ گیا۔ انہوں نے کہا۔ "مگر تم ہمارے پاس کیوں آئے ہو؟ ہم کیا کر سکتے ہیں۔ تمہارے لئے؟"

"اے شاہوں کے شاہ!" ارناط نے پھر لفاظی شروع کی۔ "میں صور جانا چاہتا ہوں تاکہ کونریڈ کا اعتماد حاصل کر کے اپنے بچوں کو اس کے چنگل سے نکال سکوں۔ تو سلطان کی بندہ پروری ہوگی میں اپنے بچوں کو صور سے نکال کر واپس آتے ہی قلعہ شقیف آپ کے حوالے کر دوں گا۔"

"ارناط۔ ہم محسوس کرتے ہیں کہ تم اس وقت مصیبت میں ہو۔" سلطان کے نرمی سے کہا۔ "اور اگر تم ہمیں دھوکہ دے رہے ہو تو اس سے تمہارا ہی نقصان ہوگا۔ بتاؤ تمہیں کتنا وقت درکار ہے؟"

"صرف تین ماہ سلطان معظم!" ارناط نے جواب دیا۔ "میں بچوں کو صور سے واپس لا کے قلعہ آپ کے حوالہ کر دوں گا اور اپنی گزر اوقات کے لئے آپ ہی کہ زیر سایہ کسی قلعہ میں رہ کر آپ کی خدمات بجالاتا رہوں گا۔"

"خیر یہ تو بعد کی باتیں ہیں۔" سلطان نے مشفقانہ انداز میں کہا۔ "تم مطمئن ہو کے صور جاؤ اور اپنے بچوں کو حاصل کرنے کی کوشش کرو۔ تین ماہ تک قلعہ شقیف پر کوئی حملہ نہ ہوگا۔"

سلطان کی اس شفقت اور مہربانی سے یہ بھی ظاہر ہوتا تھا کہ سلطان کا محکمہ جاسوسی کچھ زیادہ فعال نہ تھا ورنہ وہ سلطان کو یہ ضرور بتاتا کہ صور کے حکمران مارکوئیس کونریڈ اور قلعہ شقیف کے ارناط میں بڑی گہری دوستی ہے۔ ارناط کے بیوی بچوں کو صور میں روکنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ ارناط نے تو جان بوجھ کے اپنے اہل خانہ کو صور میں چھوڑ رکھا تھا اس لئے کہ اس وقت نصرانیوں کے لئے صور سے زیادہ محفوظ او کوئی جگہ نہ تھی۔

ارناط لپانک صور پہنچا تو مارکوئیس کونریڈ اسے دیکھ کر بہت حیران ہوا اس نے پوچھا۔ "اے حاکم انطاکیہ کیا آپ کے قلعہ شقیف پر سلطان کا قبضہ ہو گیا؟"

"نہیں۔" ارناط مختصر جواب دے کر مسکرانے لگا۔

مارکوئیس اور زیادہ حیران ہوا۔ "اس وقت آپ کہاں سے تشریف لا رہے ہیں؟"

"قلعہ شقیف سے۔" ارناط نے جواب دیا۔ وہ بدستور مسکرا رہا تھا۔

مارکوئیس چڑ گیا۔ "آپ مجھ سے مذاق فرما رہے ہیں حاکم انطاکیہ میں نے سنا ہے کہ سلطان نے قلعہ شقیف کا محاصرہ کر لیا ہے لیکن آپ شقیف ہی سے آ رہے ہیں جبکہ آپ یہ بھی فرما رہے ہیں کہ شقیف پر سلطان کا قبضہ نہیں ہے۔ ان باتوں میں سے کونسی بات سچ ہے اور میں کس پر یقین کروں؟"

"کسے جواں مرد مارکوئیس!" ارناط سنجیدہ ہو گیا۔ "آپ میری تمام باتوں پر یقین کر سکتے ہیں۔ یہ درست ہے کہ سلطان اپنا لشکر لے کر شقیف پر قبضہ کرنے کے لئے روانہ ہوا تھا لیکن میں نے اسے شقیف سے پہلے ہی روک لیا اور اس سے یہ وعدہ لے لیا کہ وہ قلعہ شقیف پر آئندہ تین ماہ تک حملہ نہیں کرے گا۔"

"آپ کی باتیں بہت الجھی ہوئی ہیں حاکم انطاکیہ!" مارکوئیس نے ناگواری کے انداز میں کہا۔ "آپ نے اسے کیا گھول کر پلایا تھا۔"

"کسے نصرانیوں کے محافظ۔ میں نے سلطان سے جھوٹ بولا تھا۔" ارناط نے اپنی خباثت سے پردہ اٹھایا۔ "میں سلطان کے پاس غمگین صورت بنا کر گیا تھا میں نے اسے بتایا کہ میں اس کی اطاعت پر تیار ہوں لیکن میرے بیوی بچے صور میں مارکوئیس کے پاس قید ہیں اگر میں شقیف پر آپ کا قبضہ کرائے دیتا ہوں تو مارکوئیس میرے بیوی بچوں کو مار ڈالے گا۔ اس لئے آپ مجھے اتنی مہلت دیجئے کہ میں صور سے کسی طرح اپنے اہل خانہ کو لے آؤں۔ بس سلطان نے مجھے تین ماہ کی مہلت دے دی۔"

"یہ تو تعجب کی بات ہے۔" مارکوئیس نے حیرانگی کا اظہار کیا۔ "کیا سلطان اس قدر بھولا ہے۔ کہ اسے آپ کے فریب پر ذرا بھی شبہ نہ ہوا؟"

"مارکوئیس کونریڈ۔ آپ جانتے ہیں جنگ اور محبت میں ہر بات جائز ہے۔ میں عربی زبان اور ادب سے اچھی طرح واقف ہوں پھر سلطان کی سب سے بڑی کمزوری اس کی رحمدلی ہے۔ میں نے اس کی اس کمزوری سے فائدہ اٹھایا اور سلطان کو یہ یقین دلانے میں کامیاب ہو گیا کہ میرے بال بچے صور میں ہیں اور ان کی جان خطرے میں ہے۔ اس طرح میں نے اس کے جذبہ ترحم کو جھنجھوڑ دیا اور وہ مجھے مہلت دینے پر آمادہ ہو گیا۔" ارناط نے غرور سے گردن اکڑائی جیسے اس نے کوئی قلعہ سر کیا ہو۔

"شاباش ہے فرمانروائے انطاکیہ۔" مارکوئیس نے اس کی تعریف کی۔ "آپ کی عقل و فراست کی داد دینا چاہیئے۔"

مارکوئیس خود ایک چالباز اور فریبی انسان تھا۔ اس نے بظاہر تو ارناط کی تعریف کی مگر دل میں یہ فیصلہ کیا کہ ایسے چالاک اور عیار آدمی پر کبھی اعتبار نہیں کرنا چاہیئے۔ کیونکہ ایسا آدمی کسی بھی وقت دھوکہ دے سکتا ہے۔

"مگر تمہارے اہل خانہ ہیں کہاں؟" مارکوئیس نے اچانک پوچھا۔

"وہ بہت آرام سے ہیں میں نے انہیں انطاکیہ بھجوا دیا ہے۔" ارناط نے ہنستے ہوئے کہا۔

"تعجب ہے کہ سلطان کو تمہاری باتوں پر ذرا بھی شبہ نہ ہوا۔" مارکوئیس نے ایک بار پھر ارناط کی حیرت انگیز چالاکی پر اظہار تعجب کیا۔

"سلطان کو تعجب ہوتا بھی کیسے۔" ارناط نے ڈینگ ماری۔ "میں نے سلطان کو یقین دلایا تھا کہ میں بال بچوں کو حاصل کرنے کے بعد نہ صرف قلعہ شقیف اس کے حوالے کر دوں گا بلکہ اس کی اطاعت قبول کر کے پوری عمر اس کے قدموں میں گزار دوں گا۔"

مارکوئیس کونریڈ ذہنی طور پر پریشان ہو گیا۔ ارناط کی چالاکی سے اسے خوف محسوس ہونے لگا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ ارناط جیسا چالاک آدمی قلعہ صور میں ٹھہرے کیونکہ وہ کسی وقت بھی بے وفائی کر سکتا تھا۔ چنانچہ اپنے جذبات دباتے ہوئے مارکوئیس نے اس سے دریافت کیا۔

"بہت خوب آپ تو بہت کام کے آدمی ہیں۔ فرمائیے میں آپ کے لئے کیا کر سکتا ہوں؟"

"یہ تو آپ کو سوچنا ہے کہ میں کس کام آ سکتا ہوں۔" چالاک ارناط نے کہا۔ "سنا ہے کہ یورپ کے لشکر بیت المقدس کو آزاد کرانے یہاں پہنچ رہے ہیں۔ ان کا یہ جذبہ قابل تعریف ہے۔ میں بھی اسی جذبہ کے تحت آپ کے پاس آیا ہوں۔ آپ مجھے جس کام پر لگائیں گے اس میں جان لڑا دوں گا۔"

اچانک ایک ہوش ربا حسینہ کمرے میں داخل ہوئی۔ ارناط نے للچائی نظروں سے اسے دیکھا۔ حسینہ کی نظریں ارناط سے ملیں تو وہ شرما کے واپس جانے لگی۔

"ٹھہرو، ٹھہرو مرینہ۔" مارکوئیس نے اسے روکا۔

مرینہ، مارکوئیس کی آواز پر رکی اور واپس آ کر اپنی جگہ پر کھڑی ہو گئی۔

"مرینہ۔ یہ ہیں پرنس ارناط۔ انطاکیہ کے فرمانروا۔ صلیبی جنگ میں حصہ لینے شقیف سے تشریف لائے ہیں۔" مارکوئیس نے تعارف کرایا۔

اب مرینہ نے ارناط کو ذرا دلچسپی سے دیکھا۔ ارناط نے اس بات کا انتظار کیا کہ مارکوئیس کونریڈ اس کا تعارف بھی کرائے گا مگر مارکوئیس نے شاید اس سے گریز کیا۔ ارناط سے صبر نہ ہو سکا۔

اس نے خود ہی پوچھ لیا۔

"کے فرمانروائے صور۔ آپ نے میرے متعلق تو مرینہ کو بتادیا مگر ان کے بارے میں کچھ نہیں فرمایا؟"

مارکوئیس کونریڈ نے ارنلا کو تیز نظروں سے دیکھا۔

"یہ میری مہمان ہیں۔ قسطنطنیہ سے صلیبی جنگ میں حصہ لینے میرے ساتھ آئی ہیں۔"

"مرینہ، آپ کے جذبہ کی جس قدر بھی تعریف کی جائے وہ کم ہے۔" ارنلا نے براہ راست مرینہ سے گفتگو شروع کر دی۔

مارکوئیس کو ارنلا کا یہ انداز بالکل پسند نہ آیا۔ وہ بڑا شدت پسند انسان تھا۔ عورت کے معاملہ میں تو وہ کسی کی رعایت نہ کرتا تھا۔ مرینہ در اصل مارکوئیس کی داشتہ تھی جسے وہ قسطنطنیہ سے بھاگتے وقت اپنے ساتھ لے آیا تھا۔

قارئین کی دلچسپی کے لئے قسمت آزما مارکوئیس کونریڈ کے کچھ اور حالات بیان کئے جاتے ہیں۔

مانس اسٹریٹ کا ریٹائرڈ امیر البحر کنگیری، مارکوئیس کونریڈ، استاریا اور اس کے پاپا کو لئے ہوئے صقیلہ پہنچا۔ ان لوگوں نے راستہ میں کہیں قیام نہیں کیا تھا۔ امیر البحر کنگیری نے صقیلہ کے بشپ سے اپنی دوستی کا جو دعویٰ کیا تھا وہ سچ ثابت ہوا۔ صقیلہ کا بشپ وہاں کا بطریق (لارڈ پادری) تھا لیکن اس نے امیر البحر کنگیری کا بڑا پر جوش استقبال کیا۔ بشپ، امیر البحر کو دیکھتے ہی کھڑا ہو گیا۔ اور اتنے جوش اور جذبہ سے بغلگیر ہوا کہ کونریڈ حیران رہ گیا۔ اسے امید بندھ چلی کہ صقیلہ کا بطریق ضرور اس کا کام کر دے گا۔

بطریق مطالعہ میں معروف تھا جب اسے اطلاع دی گئی کہ مانس اسٹریٹ سے امیر البحر کنگیری ملاقات کے لئے آئے ہیں۔ بطریق امیر البحر کا نام سن کے ایسا بد حواس ہوا کہ بغیر جوتے پہنے، ننگے پیر بھاگ کے اپنے مطالعہ کے کمرے سے باہر آگیا اور اس قدر ولولہ سے کنگیری سے ملا کہ سب ہی بے خود رہ گئے۔ جب دیر تک ایک دوسرے سے چمٹے رہنے کے بعد دونوں کے جذبات میں کچھ ٹھہراؤ پیدا ہوا تو وہ الگ ہوئے اور سب کو اپنے مطالعاتی کمرے میں لے گئے۔ یہ کمرہ در اصل ایک چھوٹا سا ہال تھا۔

سامنے کی دیوار پر حضرت عیسیٰؑ اور حضرت بی بی مریم کی (تصوراتی) تصویریں آویزاں تھیں۔ ان کے نیچے کتابوں کی دو الماریاں تھیں پھر کچھ نوادرات تھے جو آتشدان کے دونوں کونوں پر خوبصورتی سے سجائے گئے تھے۔ ایک گول میز کے گرد بہت سی کرسیاں بچھی تھیں۔ بشپ اپنے دوست سے مل کر بہت خوش نظر آ رہا تھا۔ کرسیوں پر بیٹھنے سے پہلے امیر البحر کنگیری نے کہا۔

"لارڈ پادری، میں پہلے اپنے دوستوں کا تعارف تو کرا دوں؟"

"ضرور، ضرور، کیوں نہیں" بطریق نے خوشگوار لہجے میں کہا۔

امیر البحر نے تعارف کرانا شروع کیا۔ اس نے استاریا کے پاپا کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"یہ بزرگ میرے دوست ہیں اور یہ بچی استاریا ہے۔"

"اور یہ جوان تمہارا داماد ہے،" بطریق نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ "کیوں مکمل ہو گیا نا تعارف؟"

امیر البحر کنگیری نے کوئی جواب نہیں دیا اس کا سر جھک گیا۔

بطریق نے اس کی طرف دیکھا تو چونک کر پوچھا۔

"کیا ہوا کنگیری۔ تم نے سر کیوں جھکا لیا؟"

اس وقت استاریا کے پاپا نے وضاحت کرنے کا ارادہ کیا لیکن امیر البحر کنگیری نے اسے اشارے سے روک کر خود جواب دیا۔

"پیارے دوست۔ یوں تو استاریا میری بھی بیٹی ہے کیونکہ یہ میرے بزرگ کی اکلوتی اولاد ہے۔ رہی میری وہ بیٹی جسے تم نے بارہ تیرہ سال پہلے مانس اسٹریٹ میں میرے گھر دیکھا تھا۔ وہ اور اس کی ماں دونوں ہی مجھے تنہائیوں کا داغ دے کر ہمیشہ کے لئے چلی گئیں۔"

امیر البحر کنگیری کی آنکھوں سے دو آنسو ٹپک پڑے جنہوں نے سب کو مغموم کر دیا۔

بطریق نے گلوگیر آواز میں کہا۔ "مجھے بہت افسوس ہے کنگیری۔ میں تو سمجھا تھا کہ یہ وہی گڑیا ہے جسے میں نے تمہاری بیوی کی گود میں انگوٹھا چوستے دیکھا تھا۔"

"خیر اب پرانی باتوں کو یاد کرنے سے کیا فائدہ۔" امیر البحر نے کہا۔ "گئے دن واپس نہیں آتے۔"

"میں اس بات کو نہیں مانتا۔ کنگیری!" بطریق نے کہا۔ "ہمارا ماضی ہی تو ہمارا اصل سرمایا ہے۔ اسی کے زور پر ہم بڑھاپے کے بے کیف دن گزارتے ہیں۔ ہاں تم کسی کام کے بارے میں کہہ رہے تھے پہلے وہ بیان کرو پھر اطمینان سے گفتگو ہوگی۔"

کنگیری نے مارکوئیس کی طرف اشارہ کیا۔ "یہ جوان بڑا جوشیلا ہے اور ملک و قوم کے لئے ہر وقت جان دینے کے لئے آمادہ رہتا ہے اور یہ بچی میرے دوست کی بیٹی ہے اس کی عمر ابھی تیرہ سال بھی نہیں ہوئی۔"

"اور یہی بات تم لوگوں کی پریشانی کا سبب ہے۔" جہاندیدہ بطریق نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ "یہ بچی ابھی

نابالغ ہے اور یہ جوان بہت پر جوش ہے۔ بس یہی تمہاری مشکل ہے جس کے لئے تم اتنی دور سے آئے ہو۔ اس کے علاوہ تو کوئی اور پریشانی نہیں؟"

امیر البحر نے اسے حیران نظروں سے دیکھا۔ "پریشانی تو انہی دونوں کی ہے مگر تم مجھے بات تو پوری کرنے دو۔"

"بات وات کچھ نہیں۔ میں سب سمجھ گیا۔" بطریق نے بڑے اطمینان سے کہا۔ "یہاں ان کی شادی نہیں ہو سکتی تھی اور اس لئے تم انہیں لے کے میرے پاس آئے ہو۔ کیوں یہی بات ہے نا؟"

"بالکل یہی بات ہے مگر تمہیں کیسے معلوم ہوا۔ میں نے تو ابھی تمہیں پوری بات بتائی بھی نہیں؟" امیر البحر کنگیری کی حیرت اور زیادہ بڑھ گئی۔

"تمہیں اور کچھ بتانے کی ضرورت نہیں۔" بطریق نے اسے اطمینان دلا دیا۔ "یہ کام تو سمجھو بس ہو گیا بلکہ آج ہی ہو جائے گا۔ اس کے علاوہ کچھ اور ہو تو بتاؤ؟"

استاریا اور اس کے پاپا کے چہرے کھل اٹھے تھے۔

بطریق تھوڑی دیر کے لئے باہر گیا پھر واپس آ کر بتایا۔ "ایک گھنٹہ میں معززین شہر یہاں جمع ہو جائیں گے۔ ان کے جمع ہوتے ہی تمہارا کام ہو جائے گا۔"

امیر البحر کا حیرانی سے منہ کھل گیا۔ "کیا واقعی یہ کام اتنی جلدی ہو جائے گا؟"

"مگر میں نے..."

امیر البحر نے کچھ وضاحت کرنے کی کوشش کی لیکن بطریق نے اسے روک دیا۔ "اب اس موضوع پر کوئی گفتگو نہیں ہو گی۔ تم پندرہ سال بعد آئے ہو میں ایک منٹ کو بھی ضائع نہیں کرنا چاہتا۔ تم مجھ سے باتیں کرتے رہو۔ دن بھر رات بھر۔"

امیر البحر کنگیری استاریا اور پاپا کو اس کے جذبات سے بڑی خوشی ہوئی۔ یہی دوستی کو وہ آج اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے۔

کچھ دیر بعد اطلاع آئی کہ مہمان بڑے ہال میں جمع ہو گئے ہیں۔ بطریق کھڑا ہو گیا اس کے ساتھ ہی یہ لوگ بھی کھڑے ہو گئے۔

"آپ لوگ بیٹھے رہیں۔ میں انتظامات پر ایک نظر ڈال کر ابھی آتا ہوں۔"

بطریق یہ کہہ کر باہر چلا گیا اور یہ لوگ باتیں کرتے رہے۔ استاریا کے پاپا نے خیال ظاہر کیا۔ "لارڈ پادری بہت بااثر معلوم ہوتے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ یہ کام ضرور ہو جائے گا۔"

امیر البحر کنگیری نے زور دے کر کہا۔ "ہو جائے گا کیا معنی! کام تو ہو گیا۔ مہمان آ چکے ہیں بس رسم ادا ہونا ہے۔"

پاپا نے جواب دیا۔ "کیا یہ بہتر نہ ہو گا کہ جب لارڈ پادری انتظامات دیکھ رہے ہیں ہم استاریا کے لئے شادی گون لے آئیں۔"

پاپا کی بات ختم نہ ہوئی تھی کہ گرجا کی دو ننیں آئیں جن کے ہاتھوں میں دو خوان تھے ایک نن نے کہا۔

"یہ دولہا دلہن کا لباس ہے۔ برابر کے کمرے میں جا کے تبدیل کر لیجئے۔ لارڈ پادری پندرہ منٹ بعد آپ لوگوں کو بلائیں گے۔"

ننوں کے جانے کے بعد امیر البحر اور پاپا نے اٹھ کے خوان پوش اٹھا کے دیکھا تو خوان میں دلہن کے لئے شادی کا سفید گون رکھا تھا اور دوسرے میں دولہا کے کپڑے تھے۔ پہلے مارکوئیس نے کپڑے تبدیل کئے پھر استاریا نے کپڑے اٹھا لئے تھے۔ کہ دونوں ننیں آ گئیں۔ وہ اپنے ساتھ استاریا کو کمرے میں لے گئیں اور دس منٹ بعد اسے دلہن بنا کر لے آئیں۔ اور جب دولہا دلہن بطریق کے پاس پہنچے تو ہال میں موجود تمام لوگ کھڑے ہو گئے۔ استاریا اور کونریڈ کی شادی کی رسم ادا ہوئی پھر حاضرین نے پھولوں کے گلدستے پیش کر کے انہیں مبارکباد دی۔ آخر میں دولہا دلہن اور خاص خاص مہمانوں کو بطریق کی طرف سے عشائیہ دیا گیا۔ اور یہ محفل ہنستے بولتے نصف شب کے قریب اپنے اختتام کو پہنچی۔ مہمانوں کے جانے کے بعد جب امیر البحر، مارکوئیس کونریڈ، استاریا اور پاپا رہ گئے تو بطریق کے اس کام کو سرانجام دینے کی خوب خوب تعریفیں ہوئیں۔ مارکوئیس استاریا کے لئے چرچ کی ننوں نے ایک کمرہ سجا دیا۔ امیر البحر بطریق اور پاپا ایک ہی کمرے میں لیٹ گئے۔ پاپا کو بہت دنوں کے بعد اطمینان اور سکون حاصل ہوا تھا اس لئے وہ تکیہ پر سر رکھتے ہی سو گئے۔ مگر امیر البحر اور بطریق نے ماضی کا دفتر کھولا تو پھر رات گزر گئی مگر ان کی باتیں ختم نہ ہوئیں۔

آخر کھڑکی سے آتی ہوئی سورج کی کرنوں نے انہیں صبح ہونے کی خبر دی۔

----o----

سسلی میں ایک ہفتہ گزارنے کے بعد یہ لوگ پھر مانس اسٹریٹ واپس آ گئے۔ مارکوئیس کونریڈ کی یہ محبت یا عشق بہت کامیاب رہا۔ وہ رشتۂ ازدواج میں منسلک ہو گئے۔ اور ان کی شادی پر کوئی اعتراض نہ کر سکتا تھا۔ امیر البحر کنگیری بڑا بااثر انسان تھا اس نے اپنے حلقوں میں یہ مشہور کر دیا تھا کہ مارکوئیس نے سسلی

کے گرانڈ چرچ میں لسٹاریا سے شادی کی ہے۔ چرچ کے قانون کے مطابق یہ شادی ناجائز تھی کیونکہ لسٹاریا ابھی تیرہ سال کی بھی نہ ہوئی تھی مگر کسی کو کیا پڑی تھی وہ یہ تحقیق کرتا پھرے۔

مگر وہ جو کسی نے کہا ہے کہ چور گیا چوری سے نہ کہ ہیرا پھیری سے۔ مارکوئیس کونریڈ کی آنکھوں کو لسٹاریا کے معصوم حسن نے چکا چوند کر دیا تھا اور وہ اس کی محبت میں کچھ ایسا گرفتار ہوا تھا کہ شادی کر کے ہی دم لیا۔ ان کی شادی کو دو ماہ تو ایسے گزر گئے کہ وقت کا پتہ ہی نہ چلا۔ لیکن جب مارکوئیس نے لسٹاریا کے گھر سے نکل کے کوچہ و بازار کو دیکھا اور اپنے نام کی وجہ سے اسے اعلیٰ سوسائٹی کی پذیرائی ملی تو اس کے خیالات بدلنا شروع ہو گئے۔

ادھر لسٹاریا کو سب سے پہلے کونریڈ سے یہ شکایت پیدا ہوئی کہ اس نے اسے گھر میں چھوڑ کے باہر کہیں جانا شروع کر دیا۔ لسٹاریا کو دراصل یہ معلوم ہی نہ تھا کہ مرد گھر میں بیٹھنے کے بجائے باہر کا انسان ہے۔ اس نے اپنی زندگی میں سب سے پہلے اپنے باپ کو دیکھا تھا جو اسے بے انتہا چاہتا تھا۔ انہوں نے لسٹاریا کی وجہ سے دوسری شادی نہیں کی تھی۔ ملازمت وہ نہ کرتے تھے۔ اس لئے کہ ان کے پاس اتنی دولت تھی کہ تمام عمر رئیسانہ ٹھاٹ باٹ سے رہ سکتے تھے۔ اس لئے وہ دن بھر گھر میں گھسے رہتے اور لسٹاریا کی ناز برداری کرتے رہتے۔ دوسرا مرد لسٹاریا کی زندگی میں مارکوئیس کونریڈ تھا جس نے لسٹاریا کو سر پہ بٹھا لیا تھا۔ یہاں تک کہ لسٹاریا اپنے پاپا سے کہیں زیادہ مارکوئیس کونریڈ کو چاہنے لگی تھی۔

مارکوئیس کے رویہ میں اس تبدیلی پر لسٹاریا نے پہلے تو چار چھ دن منہ پھلایا۔ اس کا خیال تھا کونریڈ حسب معمول اس کی خوشامد کر کے منائے گا مگر جب مارکوئیس نے بے پروائی برتی تو اس کے تن بدن میں آگ لگ گئی اور ایک دن وہ شیرنی کی طرح دھاڑ کر مارکوئیس کے سامنے کھڑی ہو گئی۔ مارکوئیس کو تو شہر میں اور بہت سے سہارے مل گئے تھے اور اس نے اب راتیں بھی باہر گزارنا شروع کر دی تھیں۔ اس لئے اس نے لسٹاریا کو ترکی بہ ترکی جواب دیا۔ اور اس کے دو چار تھپڑ بھی جما دیئے۔

اس طرح بات بڑھی اور اتنی بڑھی کہ مارکوئیس نے سٹاریا کے گھر رہنا بھی چھوڑ دیا۔ اب لسٹاریا کی آنکھیں کھلیں اس مارکوئیس کی خوشامد شروع کر دی مگر مارکوئیس کونریڈ کو ، کوئی پرواہ نہ تھی۔ پھر اس سے اگلے ماہ مارکوئیس کانریڈ ی بیڑا لے کر کسی نامعلوم سفر پہ روانہ ہو گیا۔ اس نے چلتے سٹاریا سے ملنے کی بھی کوشش نہ کی اور نہ پھر کبھی روانگی کے بعد لسٹاریا کو اطلاع بھیجی کہ وہ کہاں اور کس حال میں ہے۔

---o---

سلطان کو صور کے بارے میں برابر اطلاعات مل ر تھیں کہ وہ فلسطین اور شام کے تمام بھگوڑے نصرانی بادشاہ، امی نائٹس اور لشکری اکٹھا ہو رہے ہیں بلکہ یورپ کے ملکوں بھی لوگ وہاں آ رہے ہیں۔ صور میں نصرانیوں کے اجتماع کا مقصد بیان کیا گیا کہ وہ بیت المقدس کو مسلمانوں سے دوبارہ وا لینا چاہتے ہیں۔ انطاکیہ کا پرنس ارناط سلطان سے تین ماہ مہلت لے کر صور گیا تھا تاکہ وہ اپنے بال بچوں کو حاکم صو مارکوئیس کونریڈ سے آزاد کرا کے دوسری جگہ پہنچا دے۔

آخر ٹھیک تین ماہ بعد پرنس ارناط سلطان کے پاس وا آیا۔ اس کا چہرہ اترا ہوا تھا اور پریشان نظر آتا تھا۔ سلطان نے ا فکر مند دیکھ کر نرمی سے دریافت کیا۔

"کیا تم اپنے بیوی بچوں کو کسی محفوظ جگہ پہنچا دیا؟"

ارناط نے روہانسی آواز میں جواب دیا۔ "سلطان معظم! حا صور مارکوئیس کونریڈ بہت بدمعاش اور کوتہ آدمی ہے۔ تین تک میں اس کی خوشامد کرتا رہا مگر وہ اپنے کمینے پن سے باز نہ آ اور یہی کہتا رہا کہ ارناط تو سلطان کا آدمی ہے اس لئے تم پہ اعتبا ہر گز نہیں کیا جا سکتا اور نہ تیرے اہل و عیال تجھے واپس مل سک ہیں۔"

سلطان کا دماغ پہلے ہی پرنس ارناط کی طرف سے مشکوک ہو گیا تھا اسے بتایا گیا تھا کہ صور میں اس وقت فتح بیت المقد کے موقع پر آزاد کئے ہوئے تمام بادشاہ اور امیر و سردار اکٹھے ہو ہیں اور اب وہ سلطان کے خلاف ایک متحدہ محاذ بنا کر یروشلم واپس لینے کی تدبیریں کر رہے ہیں۔ پرنس ارناط بھی ان لوگوں دوست ہے اور سلطان کو اہل و عیال کا فریب دے کر صور گیا تاکہ مارکوئیس کونریڈ سے اسلامی لشکر کی جاسوسی کرے۔

سلطان صلاح الدین نے قدرے تیخ لہجہ اختیار کیا۔

"آخر صور والوں نے تمہارے بیوی بچوں کو کیوں روک رکھا ہے۔ انہیں اس سے کیا حاصل ہو گا۔"

"سلطان معظم! مارکوئیس کونریڈ کے خیال میں میں شا علاقوں کا ایک بااثر شہزادہ ہوں اور اگر میں چاہوں تو سلطان لشکر ایک طویل عرصے تک شمال میں الجھائے رکھ سکتا ہوں۔ اس وہ میرا تعاون چاہتا ہے۔ مگر میں نے اس سے صاف انکار کر د ہے۔" پرنس ارناط نے افسردہ لہجے میں جواب

"کیوں تم نے کیوں انکار کر دیا؟" سلطان کا لہجہ کچھ سخت ہو گیا

اس نے عالیجاہ کہ میں آپ کی وفاداری کا حلف اٹھا چکا ہوں۔ اب میں ان لوگوں سے کس طرح تعاون کر سکتا ہوں؟"

پرنس ارناط نے ایک بار پھر اپنی چرب زبانی کا جادو چلانے کی کوشش کی۔ اسے عربی زبان و ادب پر کافی عبور حاصل تھا اس نے گفتگو کے دوران عربی زبان کے بعض محاورے بے تکلف استعمال کر رہا تھا۔

سلطان نے دیکھا کہ ارناط گول مول باتیں کر رہا ہے تو اس نے سخت لہجے میں کہا۔

اب تم ہم سے کیا چاہتے ہو کیوں واپس آئے ہو ہمارے پاس؟"

پرنس ارناط نے خوشامدانہ لہجے میں کہا۔

"سلطان معظم نے پہلے بھی میرے اوپر رحم فرمایا ہے اور اب بھی مجھے سلطان سے رحم کی امید ہے عالیجاہ مجھے مزید تین ماہ کی مہلت عطا فرمائیں تو میں اس عرصہ میں مار کونیس کو ضرور رضامند کر لوں گا۔"

"پرنس ارناط تمہیں تین ماہ کی اور مہلت دی جا سکتی ہے بشرطیکہ تم ہماری ایک بات پر عمل کرو۔" سلطان نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔

ارناط خوش ہو گیا۔ اس نے بڑی گہری چال چلی تھی۔ وہ سلطان سے مہلت مانگنے اس لئے آیا تھا کہ اگر سلطان اس کی مظلومی سے فریب کھا گیا تو مہلت کے اس عرصے میں وہ صور میں جمع ہونے والوں کو اس بات پر آمادہ کرنے کی کوشش کرے گا کہ وہ صور سے باہر نکل کے سلطان پر حملہ کریں اس طرح شاید نصرانی کامیاب ہو جائیں اور ارناط کا قلعہ شقیف محفوظ رہے گا۔ مگر صور میں اس بار کونیس کو زیڈ نے گھاس نہیں ڈالی اور اس نے ارناط کو ایک خوفناک آدمی سمجھتے ہوئے اس سے کنارہ کشی اختیار کر لی۔ ارناط نے پھر بھی ہمت نہ ہاری اور صور میں رہتے ہوئے جوڑ توڑ کرتا رہا اور مدت ختم ہوتے ہی سلطان کو پھر فریب دینے آ گیا۔ سلطان نے مزید مہلت پر آمادگی کا اشارہ کیا تو فوراً بول اٹھا۔

"عالیجاہ آپ آقا ہیں اور میں آپ کا غلام۔ آقا غلام کو حکم دیا کرتے ہیں کوئی شرط نہیں لگاتے۔ آپ میری مہلت کی مدت میں مزید اضافہ فرما رہے ہیں آپ حکم دیجئے میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں۔ آپ مجھے ہمیشہ اپنا تابعدار پائیں گے؟"

"ٹھیک ہے پرنس ارناط سلطان نے بالکل واضح الفاظ میں کہا تم اپنے حاکم قلعہ دار شقیف کے نام ایک خط لکھ کر وہ قلعہ کا قبضہ ہمیں دے دے۔ ہم تمہیں تین ماہ کی اور مہلت دے دیں گے۔"

سلطان کی شرط سن کر پرنس ارناط کا رنگ فق ہو گیا۔ اس کا خیال تھا کہ سلطان جو بھی شرط لگائے گا وہ اسے فوراً تسلیم کر لے گا اور اس سے مزید مہلت حاصل کر کے پھر صور چلا جائے گا لیکن یہاں تو کایا پلٹ کے رہ گئی تھی۔ سلطان نے جو شرط لگائی تھی اس سے نہ تو وہ انکار کر سکتا تھا اور نہ اقرار۔ انکار اور اقرار تو الگ رہا وہ اس قابل بھی نہ رہا تھا کہ اپنی زبان کھول سکے۔ اس کے ساتھ ہی سلطان کے سامنے خاموش رہنا بھی ناممکن تھا۔

بولو ارناط۔ کیا جواب ہے تمہارا؟" سلطان کی تیوریوں پر بل پڑ گئے تھے اور لہجہ خالص شاہانہ ہو گیا تھا۔

پرنس ارناط اب بھی خاموش تھا۔ اس کی سمجھ میں نہ آ رہا تھا کہ کیا جواب دے۔

"ارناط" سلطان کو پوری طرح جلال آ گیا۔ "کیا تمہیں نہیں معلوم کہ ہمارے سوال کا جواب نہ دینے والے کی زبان تراش دی جاتی ہے۔"

"عالیجاہ۔ سلطان معظم۔ مجھے معلوم ہے۔" ارناط نے خوفزدہ لہجے میں جواب دیا۔ "لیکن سلطان معظم اگر قلعہ شقیف پر آپ کا قبضہ ہو گیا تو مار کونیس کو زیڈ میرے بال بچوں کو سولی چڑھا دے گا۔"

ارناط۔ کیا تم اپنے بال بچوں سے صور میں ملے تھے؟" سلطان نے ایک غیر متوقع سوال کیا۔

ارناط گھبرا گیا۔ "جی عالیجاہ۔ جی ہاں وہ بہت پریشان ہیں کہتے ہیں ہمیں اس قید خانہ سے جلدی چھڑاؤ ورنہ ہم مر جائیں گے۔"

"ارناط۔ پرنس ارناط۔" سلطان شیر کی طرح دہاڑا۔ "ہم اپنے دشمن پر بھی کرم نوازی سے باز نہیں آتے۔ لیکن تھا کہ اگر تم اپنے جرم کا اقبال کر لیتے تو ہم تمہیں اس وقت بھی معاف کر دیتے لیکن تم نے ہماری نوازشوں کا منہ چڑایا ہے۔ ہمارے شاہانہ الطاف کی توہین کی ہے۔"

"سلطان عالی مقام" ارناط کے ذہن میں آ گیا کہ ضرور کسی نے مخبری کی ہے اور اس کا بھانڈا پھوٹ گیا ہے پھر بھی اس نے خوشامد کا دامن نہیں چھوڑا۔ "خادم آپ کی توہین کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ عالیجاہ۔ اور مجھے امید ہے کہ اب بھی مجھ سے جو غلطی ہوئی ہے اسے بھی اپنے کرم کی بارش سے پاک کر دیں گے۔"

سلطان میں بہت تحمل تھا۔ اسے غصہ بھی کم آتا تھا لیکن جب کبھی جلال آ جاتا تو پھر اس کا سنبھالنا مشکل ہوتا تھا۔ سلطان نے بڑے سخت لہجہ میں کہا۔

"تو مردود ہے۔ ارناط۔ دور ہو جا ہماری نظروں کے سامنے سے

اگر ہم نے تجھے ایک بار مہلت نہ دی ہوتی تو اس وقت تجھے قتل کرا دیا ہوتا۔ تیرے اہل و عیال انطاکیہ میں محفوظ ہیں تو ہمیں فریب دے کر صور گیا تاکہ ان احسان فراموشوں سے ملاقات کرے جن کی ہم نے جاں بخشی کی تھی۔ اب وہ پھر ہمارے مقابلہ پر کھڑے ہونے کی فکر کر رہے ہیں لیکن ان بھگوڑوں کو ہم پھر شکست دیں گے۔ اور ان کا غرور ہمیشہ کے لئے ختم ہو جائے گا۔"

سلطان صلاح الدین ایوبی کو معلوم ہو گیا تھا کہ یورپ سے برابر نصرانی صور میں آ آ کر جمع ہو رہے ہیں اور شاہ یروشلم جسے سلطان نے اس کی ملکہ سبل کی آہ و زاری پر آزاد کر دیا تھا وہ بھی صور میں پہنچ گیا ہے۔ سلطان نے پہلے ارادہ کیا کہ وہ قلعہ صور پہنچ کر ایک بار پھر اس کا سختی سے محاصرہ کرے لیکن قلعہ شقیف بھی ایک بہت اہم قلعہ تھا اس لئے وہ اسے بھی نہیں چھوڑنا چاہتا تھا چنانچہ سلطان نے اس وقت تک انتظار کیا جب تک ارناط واپس نہیں آیا۔ ارناط کا پورا کچا چٹھا سلطان کو معلوم ہو چکا تھا لیکن ارناط کے آنے پر اس نے بڑے تحمل کا ثبوت دیا اور پہلے اس کی فریب کاری کی باتیں سنیں پھر اس کے جھوٹ کا بھانڈا پھوڑ دیا۔

پرنس ارناط ادھر ادھر کے حیلے بہانے کرتا اور کسی طرح قلعہ شقیف سلطان کے حوالے کرنے پر آمادہ نہ ہوا۔ سلطان نے اسے قید کرا کے دمشق بھجوا دیا۔ اب سلطان خود لشکر لے کر قلعہ شقیف کی طرف چلا۔ اسی دوران اس نے کچھ لشکر شمال کی جانب روانہ کیا۔ اس لئے کہ اسے اطلاع ملی تھی کہ صور کا نصرانی لشکر قلعہ سے نکل کر صیدا کی طرف بڑھا ہے۔ چنانچہ سلطان کے بھیجے ہوئے لشکر سے نصرانیوں کا سامنا ہوا مسلمانوں نے ایک شدید لڑائی کے بعد نصرانیوں کو صور کی طرف مار بھگایا۔ اس جنگ میں نصرانیوں کے بہت سے شہسوار (نائٹ) مسلمانوں کے ہاتھوں گرفتار ہوئے لیکن سلطان کا ایک آزاد کردہ غلام (حولی) جو شہسواروں میں ایک اعلیٰ مقام رکھتا تھا وہ نصرانیوں کا مقابلہ کرتا ہوا شہید ہو گیا۔

سلطان کو اس جنگ کی اطلاع ملی تو فوراً اس طرف روانہ ہوا۔ سلطان نے وہاں ایک ہفتہ سے زیادہ قیام۔ ایک دن ایسا ہوا کہ سلطان گھوڑے پر سوار ہو کے دشمن کے مورچوں کو دیکھنے کے لئے چلا۔ اس کی فوج دور دور تک پھیلی اور مورچے بنائے پڑی ہوئی تھی۔ بعض مورچہ بند فوجیوں کی نظر سلطان پر پڑی تو وہ سمجھے کہ سلطان حملہ کے لئے آگے بڑھ رہا ہے اس لئے وہ بھی مورچے چھوڑ کر آگے بڑھنے لگے سلطان کو جب اس غلط فہمی کی اطلاع ملی تو وہ فوراً واپس آیا اور ان مورچہ بند فوجیوں کی طرف سوار روانہ کئے جو مورچے چھوڑ کر آگے بڑھ گئے تھے۔

قبل اس کے کہ سلطانی سوار آگے بڑھنے والوں تک سلطان کا حکم لے کر پہنچیں ان کا سامنا نصرانیوں سے ہو گیا تھا اور ان میں شدید جنگ شروع ہو گئی نصرانیوں نے سلطانی لشکر آتے دیکھا تو بہت پریشان ہوئے۔ ان کا خیال تھا کہ یہ سلطان کے ہراول دستے ہیں اور اس کے پیچھے سلطان کا اصل لشکر ہو گا مگر جلد ہی ان کی غلط فہمی دور ہو گئی ان جاسوسوں نے واپس جا کر بتایا کہ اسلامی فوج کے یہ دستے کسی غلط فہمی کی بناء پر اپنے مورچوں سے آگے بڑھ آئے ہیں۔ اور ان کا تعلق سلطان کے اصل لشکر سے نہیں ہے۔

اس خبر کے ملتے ہی نصرانیوں نے اپنی کمین گاہوں سے نکل کر مسلمانوں پر طوفانی حملہ کر دیا مسلمانوں نے پوری قوت سے اس حملہ کو روکا۔ ان کا خیال تھا سلطانی لشکر کوئی دم میں ان کی مدد کو آ جائے گا لیکن جب انہیں کسی طرف سے کمک نہ پہنچی تو انہوں نے خود کو گھیرنے والے نصرانیوں کا حلقہ توڑ کر نکل جانے کی کوشش کی مگر وہ اس میں کامیاب نہ ہو سکے اور بجائے ہتھیار ڈالنے کے بہتر تمام مجاہد اسلام کی آن پر قربان ہو گئے۔

سلطان نے اس شکست کا بدلہ فوراً ہی لے لیا وہ لشکر کا ایک حصہ لے کر شمال کی طرف چلا۔ ان نصرانی افواج پر شاہین کی طرح جھپٹا جو اپنی فتح کا جشن منانے کی تیاریاں کر رہے تھے انہوں نے مسلمانوں کے دوسرے فوجی دستوں کو دیکھا تو فوراً صفیں ترتیب دے لیں۔ انہیں اپنی پہلی فتح کا زعم تھا اس لئے وہ بگل بجا کر مسلمانوں پر حملہ آور ہوئے شیر اسلام اور مجاہد اعظم سلطان صلاح الدین ایوبی اور اس کے دستوں نے نصرانیوں کو کاٹ کے رکھ دیا اور میدان جنگ نصرانیوں کے سورماؤں کی لاشوں سے پٹ گیا۔

یہاں سے سلطان عکہ کی طرف روانہ ہوا کیونکہ اسے برابر خبریں مل رہی تھیں یورپ سے آنے والے جنگجو صور میں اکٹھے ہو رہے تھے اور صور والے اس لشکر سے عکہ پر حملہ آور ہونے والے ہیں۔ جیسا کہ پہلے عرض کیا گیا ہے کہ بیت المقدس پر مسلمانوں کے قبضہ کے بعد یروشلم کا لارڈ بشپ (بطریق اعظم) اپنے ساتھ اسرائیل کے شکست خوردہ نصرانیوں کی ایک کثیر تعداد کے ساتھ یورپ روانہ ہو گیا ان لوگوں نے خود کو مظلوم ظاہر کرنے کے لئے سیاہ لباس زیب تن کیا تھا۔ یورپ پہنچنے کے بعد بطریق اعظم اور اس کے چیلے یورپ کے تمام ملکوں میں پھیل گئے اور وہاں انہوں نے یروشلم (بیت المقدس) کی تباہی و بربادی کے فرضی قصے بیان کر کے عیسائیوں کے جذبات بھڑکانے شروع کر دیے۔

اس طرح پورے یورپ اور جزائر برطانیہ تک میں مسلمانوں اور سلطان صلاح الدین ایوبی کی فتوحات کو غاصبانہ ظالمانہ اور متشددانہ انداز میں اس طرح پیش کیا گیا کہ پورا یورپ

ت المقدس کی واپسی کے لئے سر سے کفن باندھ کر اُٹھ کھڑا ہوا۔
ین نے صلیبی جنگ میں حصہ لینے کے لئے اپنے مذہبی جوش
وش کا اس طرح اظہار کیا کہ انہوں نے اپنے زیورات بیچ کر اس
رقم "صلاح الدین" فنڈ میں جمع کرا دی۔ صلاح الدین فنڈ بطریق
م نے رقم اکٹھا کرنے اور سلطان صلاح الدین ایوبی کی عظمت کو
نے کے لئے قائم کیا تھا۔ اس فنڈ میں اس قدر رقم اکٹھا ہو گئی
س کا سنبھالنا مشکل ہو گیا۔

سلطان کے خلاف پروپیگنڈے میں اُس وقت اور زیادہ
ی آ گئی جب یروشلم کے بطریق اعظم کو "روم" کے گرانڈ فادر
شیر باد حاصل ہو گئی۔ روم کا گرانڈ فادر جسے پوپ اعظم کہا جاتا
وہ دنیائے نصرانیت کا بے تاج بادشاہ تھا۔ اس کا حکم عیسائیوں
لئے خدا کے حکم کا درجہ رکھتا تھا۔ پوپ نے اعلان کیا کہ جو
لم کی جنگ میں کسی طور بھی حصہ لے گا اس کے تمام پچھلے
معاف ہو جائیں گے اور اگر وہ جنگ میں کام آیا تو وہ شہادت
درجہ پر فائز ہو گا روی پوپ یعنی پاپائے اعظم نے اس صلیبی
پر یورپ کے ہر فرد کے لئے فرض قرار دیا اور فرمان جاری کیا
لوگ جو اس مذہبی جنگ میں حصہ لینے کے لئے بوجہ بیماری
ی اور سبب یروشلم نہیں جا سکتے وہ اپنے خرچ پر کسی دوسرے
کو جنگ میں بھیج کر اس کا ثواب حاصل کر سکتے ہیں اس طرح
پ کے تمام ملکوں میں جس کر فرانس، جرمنی، انگلستان اور
وغیرہ کے صلیبیوں کا ایک سیلاب تھا فصیل فلسطین کی
ب رواں دواں تھا۔

صرف ایک سال پہلے یعنی ۱۱۸۸ء میں شاہ یروشلم اور اس
دس ساتھیوں کو طرطوسہ کے مقام پر سلطان کی خدمت میں
کیا گیا تھا۔ وہ وہ تمام بادشاہ امرا اور نصرانی سردار تھے جو معرکہ
ن میں شکست کھا کر مسلمانوں کے ہاتھوں گرفتار ہوئے تھے۔
سب کی بیگمات نے یروشلم میں سلطان کے حضور پیش ہو
اپنے وارثوں کی رہائی کی درخواست کی تھی اور رحمدل سلطان
ح الدین نے ان آہ و بکا کرتی ہوئی خواتین سے وعدہ کیا تھا کہ اگر
کے لواحقین گرفتار ہو کے قید میں ہیں تو انہیں رہا کر دیا جائے
چنانچہ سلطان نے طرطوسہ میں اپنا وہ وعدہ پورا کیا جب ان
الی گرفتار شدگان نے سلطان کے سامنے ہتھیار نہ اُٹھانے کی
کھائی تو انہیں باعزت طریقے سے رہا کر دیا گیا۔

اس طرح مارکوئس آف مانٹ فیرٹ کو اس کے بیٹے کے
صور بھیج دیا گیا۔ ہنری آف تورون اپنی والدہ یعنی ریجنٹ
سوی کے پاس چلا گیا شاہ یروشلم اور اس کا بھائی ماسٹر آف دی
ل، ملکہ سبل سے آ ملے۔ ان سب لوگوں نے سلطان کے خلاف

[illegible]

جرمن قیدی وقار و اطمینان، خاموشی و سنجیدگی کے ساتھ بیٹھے رہتے تھے، وہ خوش ضرور نظر آتے تھے، مگر خوف و ہراس کے آثار ان کے چہرے سے نمایاں نہ ہوتے تھے، وہ نہ سگرٹ مانگتے تھے نہ کھانا، اگر کسی نے دے دیا تو شکریہ کے ساتھ قبول کیا اور مزے سے بیٹھے بیٹھے سگرٹ حالانکہ کے عام پیتے تھے لیکن اگر سگرٹ انہیں پیش کیے جاتے تو اظہار شکر کے بعد قبول نہ کرتے۔ اس کے برعکس اطالویوں کی حالت سخت ابتر تھی خوف و ہراس ان کی ایک ایک رگ سے فوارے کی طرح ابلتا نظر آتا تھا۔ لرزتے اور کانپتے، روتے اور چلاتے اور جب انہیں سلامتی جان کے متعلق یقین ہو جاتا تو پھر کھانے سے زیادہ سگرٹوں کے لیے گڑگڑانے لگتے اور جب ازراہ ترحم انہیں سگرٹ دیئے جاتے تو لوٹ کی لت آپس میں چھینا جھپٹی اور دھینگا مشتی کرتے۔
بالشہ سر بہ گریبان کر دینے کا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہندوستانی سپاہیوں میں جرمنوں کے لیے بے حد عزت تھی۔
(جنگ کے رنگ)

تلوار نہ اٹھانے کی قسم کھائی تھی لیکن رہائی کے پاتے ہی طرابلس اور انطاکیہ کی شکستوں کا بدلہ لینے کی تدبیروں میں مصروف ہو گئے ان لوگوں نے سلطان سے جو قول و قرار اور عہد و پیماں کئے تھے فلسطین کے موجودہ بطریق نے انہیں اس سے بری الذمہ قرار دے دیا۔ یہ سب لوگ ملکۂ یروشلم سبل اور شاہ یروشلم سکائی لوسگان کے جھنڈے تلے جمع ہوئے اور صور کی طرف سے پیش قدمی شروع کی۔

حاکم صور مارکوئیس کونریڈ کو ان شکست خوردہ لوگوں کے آنے کی اطلاع ملی تو اُس نے صور کے دروازے اُن پر بند کر دیے ۔ مارکوئیس کا یہ اقدام اس لئے درست تھا کہ یہ لوگ اپنی جان بچانے کے لئے صور کو خالی کر کے بھاگ گئے تھے۔ اُس وقت مارکوئیس کونریڈ نصرانیوں کے لئے فرشتہ بن کے مدد اپنے بحری بیڑے کے ساتھ صور پہنچا تھا اور محض اُس شخص کی حکمت عملی کی وجہ سے آج صور نصرانیوں کے قبضے میں تھا۔ ان لوگوں کو جب صور میں داخلہ نہ ملا تو یہ بد عہد فوجی بھگوڑے جن کے اقتدار کو مارکوئیس کونریڈ نے تسلیم کرنے سے انکار کر دیا تھا، پہلے صور کے قلعہ کے باہر خیمہ زن ہوئے پھر جب آہستہ آہستہ وہاں کئی ہزار شکست خوردہ نائٹ بھی اکٹھا ہو گئے اور ان کی تعداد

گئی ہزار تک پہنچ گئی تو یہ بحیرہ روم کے کنارے کنارے عکہ کی طرف اس طرح گامزن ہوئے کہ ان کے متوازی سمندر میں اٹلی سے آنے والا مدد گو نیس کا بحری بیڑا چل رہا تھا۔ یہ بحری بیڑا شاہ یروشلم کی درخواست پر انہیں عکہ تک بحفاظت پہنچانے پر تیار ہوا تھا۔

جب احسان فراموشوں اور بد عہدوں کا یہ قافلہ آہستہ آہستہ عکہ کے قریب پہنچا تو دیکھا کہ عکہ پر مسلمانوں کا قبضہ تھا اور اس کے ارد گرد مسلمانوں کی حفاظتی چوکیاں بھی تھیں مغربی مؤرخوں کے مطابق شاہ یروشلم کے ساتھ آنے والی فوج کی تعداد صرف نو سو تھی (۹۰۰) جن میں شہسواروں کی تعداد سات سو تھی لیکن یہ تعداد کسی صورت درست نہیں معلوم ہوتی تھی اس لئے صور سے عکہ تک مسافرت کے دوران ان مسلمان چوکیوں سے جھڑپیں ہوتی رہی تھیں جو دیکھ بھال اور عکہ کے بیرونی دفاعی مورچوں کا کام دیتی تھیں۔

جوں ہی یہ لوگ عکہ کے قریب پہنچے شاہ یروشلم کی مدد کے لئے یورپ سے صلیبی لشکر سے بھرے ہوئے پچاس جہاز آ پہنچے۔ ان جہازوں پر ڈنمارک اور فریز لینڈ کے سپاہی سوار تھے جن کی تعداد میں اختلاف پایا جاتا ہے مغرب والوں نے ان کی تعداد اکیس ہزار بتائی ہے جبکہ بہاء الدین جو کہ مسلمانوں کا سوانح نگار ہے اس کا اندازہ چھبیس ہزار کا ہے جس میں نائٹس کی تعداد دو ہزار تھی اس لشکر میں مشہور نائٹ جیمز آف آدسیز اور بشپ آف بیورائس بھی شامل تھے۔ مغرب والوں نے حسب عادت اسلامی لشکر کی تعداد کو بہت بڑھا چڑھا کر بیان کیا ہے۔

ابن خلدون کا بیان ہے کہ تمام فرنگیوں نے متفقہ طور پر عکہ کی طرف روانگی اور اس پر قبضہ کرنے کا فیصلہ کیا۔ چنانچہ فرنگی ۶ رجب ۵۸۵ھ (۱۱۸۹ء) کو عکہ کی طرف چلے۔ یہ لوگ ساحلی راستے سے جا رہے تھے اور ان کا بحری بیڑہ ان کی حفاظت کے لئے ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔ مسلمان فوجیں اپنے اپنے مقام پر ان پر چھاپے مارتی رہیں تاہم فرنگیوں کا یہ لشکر عکہ کے قریب پہنچ گیا۔ وہ آٹھ دن بعد یعنی ۱۵ رجب کو عکہ پہنچے تھے۔

خود سلطان صلاح الدین فرنگیوں کے اس عظیم الشان لشکر کو راستہ میں روک کر جنگ کرنا چاہتا تھا لیکن اس کے سردار راستہ میں حملہ کرنے کے حق میں نہ تھے۔ ان کا یہ خیال تھا کہ راستہ تنگ اور دشوار گزار ہے چنانچہ سلطان نے متبادل راستہ اختیار کر لیا اور جب وہ دوسرے راستے سے عکہ پہنچا تو فرنگی فوجیں اس سے پہلے وہاں پہنچ چکی تھیں فرنگیوں نے بحری راستہ گھیر لیا تھا اس وجہ سے سلطان بحری راستہ نہ اختیار کر سکا۔

سلطان نے فرنگیوں کے سامنے محاذ قائم کیا پھر اطراف و جوانب میں مسلمانوں کو دعوتِ جہاد بھجوائی جس کے جواب میں موصل، دیار بکر، سنجار اور الجزیرہ وغیرہ سے فوجیں آ گئیں سلطان صلاح الدین کا بہادر بھتیجا تقی الدین حمات سے لے کر پہنچ گیا اور مظفر الدین کوکبری حران اور الرہا سے فوجیں لے کر آ گیا اُدھر فرنگیوں کو بحری راستہ سے دھڑا دھڑ کمک پہنچ رہی تھی اِدھر سلطان کے پاس بری راستوں سے فوجیں آ رہی تھیں یوں دونوں طرف سے معمولی جھڑپیں ہوتی رہیں لیکن سلطان نے رجب کے باقی ایام میں کوئی جنگ نہیں کی۔

محاذ کی صورتحال یہ تھی کہ عکہ پر مسلمانوں کا قبضہ تھا اور عکہ کے سامنے خشکی کے تمام راستوں پر فرنگیوں کا لشکر پھیلا ہوا تھا جنہوں نے آگے پیچھے کتنے ہی مدافعتی مورچے قائم کر رکھے تھے۔ پھر اس سے آگے سلطان کا لشکر تھا۔ اس طرح فرنگیوں نے خشکی کی جانب سے پوری طرح عکہ کو گھیر رکھا تھا اور محاصرہ کرنے والے فرنگیوں کی تعداد اس قدر زیادہ تھی کہ نہ تو سلطان کے لوگ گھیرا توڑ کر عکہ میں داخل ہو سکتے تھے اور نہ عکہ کے مسلمان فرنگیوں کا گھیرا توڑ کر باہر نکل سکتے تھے۔

یروشلم (بیت المقدس) کا آخری بادشاہ کا نام گائی ڈی لوزینان تھا۔ اُس سے پہلے یروشلم کے آٹھ بادشاہ گزرے تھے جنہوں نے ۱۰۹۸ء سے ۱۱۸۷ء یعنی سلطان صلاح الدین ایوبی کے بیت المقدس پر قبضہ تک حکومت کی تھی۔ یہ تقریباً ایک صدی کا عرصہ ہوتا ہے۔ ایک طویل زمانہ میں یروشلم میں اور شام کی دوسری نصرانی حکومتوں نے مسلمانوں پر کیا کیا ستم نہ توڑے۔ مسلمانوں کی تہذیب، مسلمانوں کا تمدن، اور روایات کو مٹانے اور ان کا مذاق اڑانے کے کیا کیا طریقے نہ اختیار کئے گئے اس کا تصور کرنے ہی سے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ مگر ملت محمدی اس قدر سخت جان ہے کہ اغیار کے ظلم و ستم اسے ختم نہ کر سکے۔

یہ ٹھیک ہے کہ بعض مسلم بادشاہوں نے اسلامی سلطنت کو بہت وسعت دی لیکن اس دور ابتلا اور مسلمانوں کی غلامی کو ختم نہ کر سکے۔ عباسی خلفاء کے بغداد، سلاطین سلجوق (السلجوق) مصر کے فاطمی خلفاء بھی بیت المقدس کو آزاد نہ کرا سکے موصل کے عماد الدین زنگی نے اپنی تمام عمر نصرانیوں سے نبرد آزمائی میں گزاری اور الرہا پر قبضہ کیا۔

الرہا پر قبضہ ہی دراصل فتح بیت المقدس کی طرف پہلا قدم تھا اسی عماد الدین زنگی کے زمانے میں نصرانیوں کے بادشاہ قسطنطنیہ نے پوری تیاریوں کے ساتھ شام پر حملہ کیا مگر شاہ قسطنطنیہ کو عماد الدین کے مقابلہ پر منہ کی کھانی پڑی اور

...نے میدان جنگ میں پورا جنگی سامان چھوڑ کے رات کے
...ے میں بھاگ کھڑا ہوا۔

امیر عمادالدین زنگی کی شہادت کے بعد اس کا بیٹا سلطان
...ین زنگی بر سرِ اقتدار آیا شام کی تمام نصرانی سلطنتوں سے
...ر بر سرِ پیکار رہا اس جگہ اس بات کی وضاحت ضروری ہے کہ
نورالدین زنگی کے والد امیر عمادالدین زنگی کو اس کے
...نے ایک محاصرہ کے دوران خیمہ میں سوتے ہوئے شہید
...تھا۔

اس عمادالدین زنگی اور نورالدین زنگی کے زمانے میں
...لدین کا چچا اسدالدین شیر کوہ سپہ سالار کے عہدے تک پہنچا
...ح الدین کو صلاح الدین بنانے میں اسدالدین شیر کوہ اور
نورالدین کی کوششوں اور تربیت کو بڑا دخل حاصل ہے۔
صلاح الدین کو خدا تعالیٰ نے یہ اعزاز بخشا کہ اس نے تقریباً
...دی بعد بیت المقدس کو نصرانیوں کے ظالمانہ ہاتھوں سے
...لیا بیت المقدس (یروشلم) کے چھن جانے کی خبر یورپ
...پہنچی تو وہاں گھر گھر کہرام مچ گیا۔
تاریخ بتاتی ہے کہ جب شکست خوردہ بیت المقدس سے
...ان کا ایک گروہ مغرب کی طرف روانہ ہوا۔ یہ لوگ جہاں
پہنچتے وہاں یہ پیغام دیتے۔
افسوس! اے عالم مسیحیت افسوس، دشمن یروشلم پر قابض
ہے، مقدس صلیب کھو گئی اور ہماری فوج برباد ہو گئی۔
اس طرح تمام پادری اور راہب تمام مسیحی دنیا کا دورہ
کے لئے نکل کھڑے ہوئے انہوں نے مقدس باپ کی دہائی
...ے کر لوگوں کو جنگ پر اُبھارا۔ بیت المقدس کا طریق جس
...اتھ سلطان صلاح الدین نے بڑا مشفقانہ سلوک کیا تھا وہ
...کے ملکوں میں اپنی جوں سال بیٹی کو لئے لئے گھومتا
...اس کے ہاتھ میں ایک تصویر ہوتی تھی جس میں حضرت
...علیہ السلام پر زخمی حالت میں ایک مسلمان کو اُن پر حملہ
...دکھایا گیا تھا۔
آخر یہ آگ بھڑک اُٹھی۔ نصرانی بادشاہ جرمنی فریڈرک
...ان پر اس قدر غصہ آیا کہ اور اُس نادان نے سلطان کو ایک خط
...جس میں تحریر کیا۔
میں شاہ فریڈرک فرمانروائے جرمنی، صلاح دین (
...والے مسلمانوں کو صرف صلاح دین کے نام سے پکارتے
...کو مطلع کرتا ہوں کہ اگر یروشلم عیسائیوں کے حوالے نہیں
...تو اپنے پورے لشکر کے ساتھ اُسے سزا دینے کے لئے پہنچ
...گا۔

سلطان نے شاہ جرمنی کے اس خط کا کوئی اثر نہ لیا لیکن
یورپ میں ایک خوفناک جنگ کی تیاریاں زور و شور سے شروع
تھیں اس میں ہر عیسائی نے حصہ لیا یہاں تک کہ عورتیں تک
سپاہی بن گئیں۔ پس قیصر جرمنی فریڈرک، شاہ انگلستان رچرڈ
اوّل اور ڈیوک آف آسٹریا اپنی فوجوں اور صلیبی رضاکاروں کے
ساتھ سلطان صلاح الدین سے جنگ کرنے کے لئے روانہ ہوئے اور
یہ تیاری تھی تیسری صلیبی جنگ کی۔
اِس جنگ کی اِس زور و شور سے تیاریاں ہوری تھیں کہ اس
کے مصارف کے لئے انگلستان اور فرانس میں "عشرِ صلاح دین"
یعنی صلاح الدین ٹیکس لگا دیا گیا پادریوں نے فتویٰ دے دیا ہے
کہ جو شخص اس کارِ خیر میں حصہ نہیں لے گا وہ مسیحیت سے
خارج ہو جائے گا۔
مشہور مورخ گبن نے لکھا ہے:
"صلاح الدین نے یورپ سے اپنی عظمت کا جو خراج اس
ٹیکس کی شکل میں لیا وہ آج تک کسی تاجدار کو نصیب نہیں
ہوسکا۔ رچرڈ نے مصارفِ جنگ کے لئے اپنی جاگیر بیچ دی بڑے
بڑے عہدوں کو نیلام کیا۔ رچرڈ کہتا تھا کہ اگر کوئی خریدار ہو تو
لندن تک بیچنے کو تیار ہوں۔"
جو لوگ خود کسی وجہ سے شریک نہ ہوئے انہوں نے اپنے



"کیا تم یہ بورڈ نہیں پڑھ سکتے؟"

خرچ پر اپنی جانب سے آدمی بھیجے۔ عورتوں نے اپنی اکلوتی اولادوں کو نذر کر دیا۔ بہر حال دو سال کی زبردست تیاری کے بعد یہ لشکر فلسطین کی طرف بڑھا۔ مؤرخوں نے اس لشکر کی شان میں یوں قصیدہ خوانی کی ہے۔

یہ فوج نہیں تھی۔ ہتھیاروں اور سپاہیوں کا ایک سیلاب تھا جو عربوں کو خس و خاشاک کی طرح بہا دینے کے لئے اُمڈ آیا تھا۔

اس لشکر کی تعداد بعض مؤرخین نے چھ لاکھ اور بعض نے دس لاکھ لکھی ہے جتنے یورپی اور مسیحی سربراہ اس جنگ میں شامل تھے اس سے پہلے کسی جنگ میں شریک نہیں ہوئے تھے اور اس متحدہ طاقت کا مقابلہ صرف اور صرف سلطان صلاح الدین کو کرنا تھا۔

قیصرِ جرمنی فریڈرک جس نے سلطان صلاح الدین کو دھمکی آمیز خط لکھا تھا، وہ صرف ایشیائے کوچک تک پہنچ سکا جہاں دریائے سالس کو عبور کرتے ہوئے ڈوب کر مر گیا خدا نے شاید یہ اس کا انجام اس وجہ سے کیا کہ اس نے بھی فرعون کی طرح غرور کیا تھا جس کے نتیجے میں وہ بھی دریائے نیل میں ڈوب کر مرا تھا قیصرِ جرمنی کی فوج کا صرف ایک حصہ اور بعض کے مطابق صرف دو سو لشکری ارضِ فلسطین پہنچ سکے باقی یا تو واپس چلے گئے یا راستے کے مصائب کا شکار ہو گئے۔

آسٹروی، اطالوی، برطانوی، اسپانوی، فرانسیسی اور جرمن غرض یہ کہ یورپ کے ہر ملک اور ہر خطے کے صلیبی ارضِ فلسطین کی طرف رواں دواں تھے۔

اس دوران سلطان قلعہ شقیف کے محاصرے میں مصروف رہا۔ اور تین ماہ بعد قلعہ شقیف پر مسلمانوں کا قبضہ ہو گیا۔ مغرب والوں نے سلطان کے اس اقدام کو نافہمی پر محمول کیا ہے قلعہ صور کے محاصرہ سے دستکش ہونے پر بھی مغرب والوں نے سلطان کو کم فہم ظاہر کرنے کی کوشش کی ہے سلطان کے بعض اُمرا اور خود سلطان کا سوانح نگار بہاء الدین قلعہ صور سے محاصرہ اٹھانے کو اچھی نظر سے نہیں دیکھتا دراصل یہ الزامات سلطان کو محض بدنام کرنے کے لئے لگائے جاتے ہیں۔ یہ ٹھیک ہے کہ سلطان نے صور سے محاصرہ اٹھالیا اور یہ بھی ٹھیک ہے کہ صور سے محاصرہ اٹھانے نے شکست خوردہ نصرانی سرداروں، نائٹس ٹیمپلرز اور بادشاہوں کو موقع دیا کہ وہ سنبھل سکیں اور اپنی طاقت کو مضبوط کر سکیں لیکن سلطان کے معترضین یہ اندازہ نہیں لگا سکتے تھے کہ سلطان صلاح الدین کو کچھ ہی عرصہ بعد پورے یورپ کے شاہوں اور شہنشاہ کے مشترکہ لشکر کے سامنے سینہ سپر ہونا تھا جو بیت المقدس کو

مسلمانوں سے واپس لینے کے لئے ارضِ فلسطین کی طرف روانہ ہو رہے تھے ان کے تو تصور میں بھی یہ بات نہ آسکتی تھی کہ سلطان کو دس لاکھ نصرانیوں کے مشترکہ لشکر کا مقابلہ کرنا ہوگا لیکن سلطان صلاح الدین کی دُوربین نظروں نے آنے والے وقت کو دیکھ لیا تھا اس لئے ایک طرف تو سلطان رضاکار لشکر کو اور دوسری طرف سلطانی افواج کو کچھ عرصہ آرام دے کر انہیں ایک خوفناک جنگ کے لئے تیار کرنا چاہتا تھا اس لئے وہ قلعہ صور اور قلعہ شقیف کے محاصروں میں اپنی فوج کو اُلجھا کر ان میں بے دلی اور کاہلی پیدا کرنا نہیں چاہتا تھا۔

قلعہ صور کے باہر یورپ سے آنے والے صلیبی جنگجو اکٹ ہو رہے تھے۔ ارضِ شام اور ارضِ فلسطین کے تمام بھگوڑے او شکست کا داغ اُٹھائے نصرانی لشکری اور بادشاہ بھی قلعہ صور کے باہر اکٹھا ہو چکے تھے۔ سلطان نے بھی تمام مسلمان علاقوں سے اسلامی لشکر کو از سرِ نو طلب کر لیا تھا۔ سلطان کے جاسوسوں نے اطلاع دی تھی کہ یورپ کے نصرانیوں کا یہ سیلاب عکہ کی طرف کوچ کرنے کا ارادہ کر رہا ہے۔

"عالی جاہ! ایک جاسوس نے دست بستہ عرض کیا۔ "نصرا لشکر میں اس وقت شاہ فرانس، شہنشاہ اطالیہ، شاہ آسٹریا، قیص جرمنی اور شاہ انگلستان بذاتِ خود موجود ہیں۔ نائٹس اور ہاسپٹلر کی اتنی کثیر تعداد موجود ہے کہ ان کی ایک الگ فوج تیار کی سکتی ہے یورپ سے آنے والوں کا سلسلہ ابھی ختم نہیں ہ ہے۔ بلکہ ہزاروں کی تعداد میں صلیبی روزانہ صور پہنچ ر ہیں۔"

سلطان کے پاس اُس وقت اسلامی لشکر کے تقریباً تین درج سردار موجود تھے۔ اس نے مناسب نہ سمجھا کہ تمام سرداروں سامنے اس اہم مسئلہ پر گفتگو کرے۔ چنانچہ اس نے اپنے بھتیجے تقی الدین اور موصل، دیار بکر سنجلو الجزیرہ کے سرداروں کو روک باقی سرداروں کو رخصت کر دیا۔

"میرے جانباز اور جانثار! عام سرداروں کے جانے کے بعد سلطان نے اپنے ان خاص سرداروں کو مخاطب کیا۔ "تم لوگوں کو ہو گا کہ قلعہ صور سے محاصرہ اٹھاتے وقت ہمارے سرداروں میں اختلاف پیدا ہوا تھا۔ جہاں تک سلطانی لشکر کے سرداروں کا سو تھا تو انہوں نے اپنی جانیں تخت دمشق کے لئے وقف کر ہیں لیکن رضاکاروں کی کیفیت ان سے مختلف ہے چونکہ انہیں گھر بار چھوڑے چھ ماہ سے زیادہ عرصہ ہو چکا تھا اس لئے انہیں دن کے لئے گھر بھیجنا ضروری تھا اور میں نے صور کا محاصرہ کر کے ان کو رخصت دے دی۔ اس رخصت کا یہ نتیجہ ہے کہ آ

وہ تمام لشکری خوشی خوشی واپس آگئے ہیں بہر حال یہ تو ایک پرانی بات تھی اب مسئلہ اُس جنگ کا جو ہمیں درپیش ہے۔ اس سلسلے میں آپ کے مشورے کی ضرورت ہے۔"

سب سے پہلے تقی الدین بولا۔ "عالی جاہ تقی الدین سلطان کے ہر حکم کی تعمیل اپنا ایمان سمجھتا ہے اس لئے میں سلطان کو مشورہ دینے کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔"

تقی الدین کے بعد مظفر الدین کوکبری نے اپنے خیالات کا اظہار کیا مظفر الدین الجزیرہ اور حران سے لشکر لے کر آیا تھا۔ "عالی مقام سلطان۔ میں نے سنا ہے کہ یورپ سے آنے والے نصرانی لشکروں کی مجموعی تعداد لاکھوں تک پہنچ گئی ہے اس کا یہ مطلب نہیں کہ میں نصرانیوں سے ڈرتا ہوں بلکہ میرا مقصد یہ ہے کہ اتنے بڑے لشکر سے لڑنے میں کم از کم مجھے ضرور لطف آئے گا۔"

سلطان نے اپنے سرداروں پر ایک طائرانہ نظر ڈالتے ہوئے کہا "تاجِ دمشق کے جانثارو۔ نصرانی لشکر کی تعداد خواہ کتنی کیوں نہ ہو ہمیں اپنے بہادروں پر فخر ہے میرا ایمان ہے کہ جن جانبازوں نے بیت المقدس سے نصرانیوں کو بے دخل کیا ہے وہ ان کو دوبارہ اُس ارضِ پاک میں قدم نہیں رکھنے دیں گے جو نبیوں اور پیغمبروں کی سرزمین کہلاتی ہے ہم انشاء اللہ نصرانیوں کو ایک بار پھر اُسی طرح شکست دیں گے جس طرح انہیں حطین میں شکست سے دوچار کیا تھا۔"

ہر طرف آمین ثم آمین کی صدائیں بلند ہوئیں۔

سلطان نے ذرا رک کے کہا۔ "اس وقت مسئلہ یہ درپیش ہے کہ نصرانی لشکر صور سے عکہ کی طرف کوچ کرنے والا ہے۔ سوال یہ ہے کہ کیا یہ بہتر ہوگا کہ لشکر کثیر کو عکہ کے راستہ میں اس پر حملے کر کے جنگ شروع کر دیں یا پھر انہیں عکہ پہنچنے کا موقع فراہم کریں۔ تاکہ ان کی پوری طاقت ایک جگہ اکٹھا نہ ہو جائے اور نصرانی لشکر سے ہماری پہلی جنگ ہی آخری جنگ ہو۔"؟

سلطان کے بھائی ملک العادل نے سر کو ذرا خم کر کے جواب دیا "عالی جاہ ہم وفاداروں کی جانیں اور تختِ دمشق پر نثار ہم لوگ اپنے آپ کو ایسے اہم معاملات میں اُلجھانا نہیں چاہتے ہمیں تو صرف آپ کا حکم چاہئے۔"

ملک العادل نے جو سلطانی لشکر کا سپہ سالار بھی تھا اُس نے جو صلاح مشورے سے دامن بچایا تو مظفر الدین کوکبری کو موقع مل گیا اس نے فوراً کہا۔

"سلطانِ معظم! سپہ سالار ملک العادل نے سچ کہا کہ ہم لوگ صرف حکم کے بندے ہیں جنگی حکمتِ عملی تو ہمیشہ سلطان نے ترتیب دی اور اُسی پر عمل کر کے ہم نے معرکہ حطین سر کر کے بیت المقدس کا راستہ کھولا تھا۔ اب بھی جو حکمت عملی آپ ترتیب دیں گے ہم آنکھیں بند کر کے اس پر عمل پیرا ہوں گے۔"

جس طرح نصرانیوں کا قلعہ صور بہت مضبوط اور ناقابلِ تسخیر سمجھا جاتا تھا اسی طرح عکہ کا قلعہ مسلمانوں کا ایک بہت بڑا گڑھ تھا سلطان صلاح الدین نے پیش بندی کے طور پر سردار قراقوش کو بلا کر عکہ کا دفاع اس کے سپرد کیا تھا۔ ایک پرانا سردار مشطوب پہلے ہی سے عکہ میں موجود تھا۔ آخر سلطان کو اطلاع ملی کہ نصرانی لشکر عکہ کی طرف روانہ ہو گیا ہے۔ سلطان نے محسوس کر لیا تھا کہ اس کے سردار خود کو اُس کی حکمت عملی کے اس قدر تابع سمجھتے ہیں کہ وہ سلطان کے کسی اقدام کی مخالفت نہیں کر سکتے۔

صور اور عکہ کے درمیان سلطان کی بہت سی فوجی چوکیاں تھیں نصرانی لشکر جس چوکی کے قریب سے گزرتا مسلم چوکی کے محافظ دستے اس پر حملہ کرتے نصرانی لشکر کی تعداد بہت زیادہ تھی اس لئے سلطانی دستے اس لشکر کو روک تو نہ سکتے تھے لیکن جس قدر جانی نقصان پہنچا سکتے تھے وہ انہوں نے پہنچایا نصرانی لشکر ساحل کے ساتھ چل رہا تھا اور اُسے سمندر میں اپنے محافظ بحری بیڑے کا تعاون حاصل تھا۔ یہ راستہ بہت کم چوڑا تھا شاید اسی وجہ سے سلطان نے اس لشکر پر راستے میں روک حملہ کرنے کی بجائے اُسے عکہ جانے دیا۔

بحری راستہ غیر محفوظ تھا اس لئے سلطان نے خشکی کا راستہ اختیار کیا سلطان کا لشکر روانہ ہوا تو اس شان سے کہ وہ دن بھر سفر کے بعد رات کو کہیں منزل نہ کرتا بلکہ رات دن سفر کرتا ہوا صرف تین دن بعد شقیف سے عکہ پہنچ گیا۔ اس نے عکہ کے سامنے والی پہاڑی پر اپنا کیمپ لگا دیا اُس وقت تک شاہ یروشلم گائی لوسگان، عکہ شہر کے بالمقابل تل مصلعین پر اپنے خیمے لگا چکا تھا۔ سلطان چاہتا تھا کہ وہ نصرانی لشکر کے پہلو سے نکل کر اُس سے آگے نکل جائے اور عکہ کا محاصرہ کرنے والے نصرانی لشکر کا محاصرہ کر لے۔ اس حکمت عملی کی تکمیل کے لئے اس نے اپنے مورچوں کو دریائے بیلس سے آگے بڑھ کر العیاضیہ کی پہاڑیوں تک وسیع کر دیا اور تل قیصان پر اپنا ہیڈ کوارٹر بنایا پھر آئندہ ماہ سلطانی لشکر عکہ سے اور زیادہ شمال میں ساحل تک پھیل گیا۔

عکہ کا شہر اور بندرگاہ اپنے محل وقوع کے لحاظ سے ایک خاص اہمیت کا حامل تھا۔ عکہ کا شہر ایک حاکنانے پر واقع ہے جو جنوب میں پانی کے اندر چلی گئی ہے۔ شمال اور مغرب کی سمت یہ انتہائی محفوظ ہے۔ اس کے گرد برج اور فصیلیں ہیں جو اسے خشکی

کی طرف سے محفوظ کرتے ہیں۔ جنوب اور مغرب میں سمندر کی وجہ سے اس پر حملہ نہیں کیا جاسکتا۔ شمال مشرق میں ایک عظیم برج معلون تھا۔ اس کا نام معلون اس وجہ سے پڑا کہ یہ یہودہ کی ریشہ دوانیوں کی آماجگاہ تھا۔

اسی طرح بندرگاہ کی حفاظت کے لئے برج مگس تھا۔ مشہور تھا کہ یہاں پر ایک بہت بڑا مذبح تھا۔ جہاں مکھیاں بھنبھنایا کرتی تھیں۔ پھر اس جگہ برج تعمیر ہوا اور اس نے برج مگس "مکھیوں کا برج" کا نام پایا۔ شہر کی فصیل سے عکہ کا بڑا میدان دکھائی پڑتا تھا۔ بیس میل لمبا یہ میدان شمالاً جنوباً پھیلا ہوا تھا۔ دریائے بیلس کی دو بڑی شاخیں، پھر ان شاخوں کی بے شمار شاخیں اس میدان کو سیراب کرتی ہیں۔ جنوب میں دریائے کشون بہتا ہوا حیفہ کے قریب سمندر میں گرتا ہے۔ سمندر کے اندر پانچ میل کے فاصلہ پر نیچی نیچی پہاڑیاں ہیں جو مورچوں کا کام دیتی ہیں پھر دو میل پیچھے کی طرف کوہ تسیاں کا سلسلہ تھا جو میدان کی مشرقی سرحد پر واقع تھا جو موسم سرما میں ملیریا سے محفوظ رکھتا اور فوج کے لئے کمین گاہ اور معائنہ چوکی کا کام دیتا تھا۔

سلطان صلاح الدین نے رجب المرجب کے باقی دن بالکل پرسکون طریقے سے گزارے۔ پھر جب شعبان کا مہینہ شروع ہوا تو سلطان نے حملہ کا حکم دیا۔ دن بھر شدید جنگ ہوتی رہی۔ ایک طرف پورا یورپ دوسری طرف سلطان کا اکیلا لشکر پھر بھی اسلامی لشکر نے تمام دن نصرانیوں کو دبائے رکھا۔ رات ہوئی تو دونوں لشکر اپنے اپنے ٹھکانوں پر واپس ہوئے۔ سلطانی لشکر نے رات میں بھی کمر نہیں کھولی اور صف بندی میں رہا۔ صبح ہوتے ہی لشکر اسلام بڑے استقلال کے ساتھ میدان جنگ میں آیا۔ دوسری دن سلطان کے بھتیجے تقی الدین نے ایسا زبردست حملہ کیا کہ دشمن کے چھکے چھوٹ گئے اور نصرانیوں میں پسپائی کے آثار پیدا ہوئے۔

قلعہ اور شہر عکہ پر دونوں لشکروں کے صف بندی کی صورت کچھ اس طرح تھی کہ قلعہ عکہ میں صرف چار ساڑھے چار ہزار کا اسلامی لشکر تھا۔ جس کے سپرد شہر اور قلعہ کی حفاظت تھی۔ قلعہ کے باہر دو طرف خشکی اور دو طرف سمندر تھا۔ خشکی کی سمت نصرانیوں کا لشکر لاکھوں کی تعداد میں صفیں باندھے کھڑا تھا۔ نصرانی لشکر ایک طرف تو سلطانی لشکر سے نبرد آزما تھا دوسری طرف قلعہ کے دروازہ کے سامنے ہجوم در ہجوم جمع تھا تاکہ قلعہ کا لشکر باہر نہ نکل سکے۔ سلطان کو حسام الدین اور قراقوش نے مطلع کیا تھا کہ قلعہ میں سامان رسد بہت تیزی سے ختم ہو رہا ہے۔ اس اطلاع نے سلطان کو پریشان کر دیا تھا۔

مغربی مؤرخین نے صلیبی جنگ کی تفصیل بیان کرنے میں ہمیشہ بددیانتی سے کام لیا ہے۔ نصرانیوں کو اگر ذرا سی کامیابی حاصل ہوتی تو وہ خوب بڑھا چڑھا کے فتح کا ڈھنڈورا پیٹتے مگر مسلمانوں کے کارناموں کو ہمیشہ دھندلا دیتے اور غلط تاویلیں پیش کر کے حقیقت کو چھپانے کی کوشش کرتے۔

۲۳۔ ۱۵ ستمبر کو دوپہر کے وقت تقی الدین نے جو سلطانی لشکر کے میمنہ (دایاں بازو) کی کمان کر رہا تھا، نعرہ تکبیر بلند کر کے نصرانیوں پر ایسا طوفانی حملہ کیا کہ دشمن اسے نہ روک سکا اور کائی کی طرح پھٹ گیا۔ تقی الدین فوراً دشمن کی صفوں میں داخل ہو گیا اور اس نے ان کے درمیان راستہ بنانا شروع کر دیا۔ یہ بات بعد میں کھلی کہ سلطان نے تقی الدین کو حکم دیا تھا کہ آج اسے دشمن کی صفوں میں گھس کے عکہ کی فصیل شہر تک ضرور پہنچنا ہے۔

تقی الدین میمنہ کے ساتھ نصرانی صفوں میں داخل ہوا تو سلطان پسپا ہوتے ہوئے نصرانیوں پر جا پڑا۔ سلطان قلب فوج کی کمان کر رہا تھا۔ وہاں سے وہ اپنے محافظ دستے اور قلب لشکر کے ساتھ تقی الدین کے ساتھ ہی نصرانی صفوں پر حملہ آور ہوا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دشمن کی فوجوں کے درمیان اسلامی لشکر گاہ سے عکہ کی فصیل شہر تک ایک چوڑا راستہ بن گیا۔ جب ایک تیز رو پہاڑی دریا میدان میں آتا ہے تو وہ زمین (خشکی) کو دو حصوں میں تقسیم کرتے ہوئے اپنے لئے ایک راستہ بنا لیتا ہے۔ اور خشکی اسے راستہ دینے پر مجبور ہو جاتی ہے۔ یہی عالم اس دن دوپہر کو صلیبی جنگ کا تھا۔ دس لاکھ کے نصرانی لشکر کے درمیان میں سلطانی لشکر نے بزور شمشیر ایک اتنا چوڑا راستہ بنا لیا تھا جس سے اونٹوں کی قطار گزر سکتی تھی۔ راستہ بننے کے بعد سلطان نے جو خود اس راستہ کے درمیان کھڑا تھا، تقی الدین کو حکم دیا۔

"تقی الدین، لشکر گاہ میں اطلاع بھیجو کہ فوجی سامان سے لدے ہوئے اونٹوں کو اس راستے سے عکہ پہنچایا جائے۔"

تقی الدین نے بڑے فخر سے گردن اٹھا کر راستے کے دونوں طرف پھیلے ہوئے لاکھوں نصرانیوں کو دیکھا پھر سر جھکا کے کہا۔

"عالی جاہ! خادم تعمیل ارشاد کے لئے خود لشکر گاہ میں جا رہا ہے۔"

تقی الدین نے لشکر گاہ کا رخ کیا اور سلطان گھوڑے بڑھا کر فصیل شہر کے دروازے سے گزر کر شہر میں پہنچا۔ قلعہ دار سردار قراقوش نے سلطان کو سلام پیش کیا اور کہا۔

"سلطان کا عکہ میں تشریف لانا مبارک ہو۔ سلطانی لشکر کے حوصلے بلند ہوں۔"

سلطان گھوڑا چھوڑ کر فصیل شہر پر چڑھا۔ قراقوش اس کے پیچھے تھا۔ سلطان نے نظریں گھما کر دیکھا تو تاحد نظر نصرانی لشکر

صفیں باندھے موجود تھے۔ اس وقت بھی جنگ ہو رہی تھی لیکن یہ جنگ سمٹ کر سلطانی خیمہ گاہ سے فصیل شہر عکّہ تک نصرانی فوج کے درمیان بنے ہوئے راستے تک محدود تھی اس راستہ کے دونوں طرف سلطانی دستے آہنی دیوار بنے کھڑے تھے اور نصرانیوں کے زبردست حملوں کو پسپا کر کے راستہ برقرار کئے ہوئے تھے۔ وہ منظر بھی کیا عجب ہوگا کہ سلطان صلاح الدین فصیل شہر سے نصرانیوں کے درمیان بنے ہوئے راستے پر نظریں جمائے کھڑا ہے اور راستے کے آغاز پر سردار تقی الدین گھوڑے پر سوار موجود ہے اور لشکر گاہ سے سامان حرب اور رسد کے بھرے ہوئے اونٹ عکّہ کی طرف رواں دواں ہیں۔

ایک انگریز مؤرخ کہتا ہے کہ اس وقت تک صلیبی لشکر پوری طرح عکّہ کی ناکہ بندی کے قابل نہ تھا۔ اس نے یہ کہہ کر اپنی یہ خفت مٹانے کی کوشش کی ہے کہ سلطان نے صلیبی لشکر کے درمیان اپنی طاقت کے زور پر ایک اتنا چوڑا راستہ بنا لیا تھا جس سے اونٹ سامان رسد لے کر سلطانی لشکر گاہ سے عکّہ کے شہر اور قلعہ کے محصورین کے لئے سامان پہنچاتا رہا۔

اس راستہ کے شروع میں تقی الدین کی آواز بار بار بلند ہوتی۔

"شاباش بہادرو۔ اپنا کام جاری رکھو۔"

دوسری طرف سے سلطان کی آواز ابھرتی۔

میرے جاں نثارو۔ تم اپنی شجاعت اور بہادری کی ایک داستان رقم کر رہے ہو جس کی مثال تاریخ عالم میں موجود نہیں۔"

سلطان صلاح الدین ایک طرف تو اپنے بہادروں کو ایک ناقابل یقین کارنامہ انجام دینے پر انہیں شاباش دے رہا تھا تو دوسری طرف اس کی نظریں عکّہ کی دفاعی انتظامات پر تھیں۔ وہ اہم مورچوں اور برجوں پر حسب ضرورت فوجی دستے مقرر کر رہا تھا اور سردار ان کو ضروری ہدایات دیتا جا رہا تھا کیونکہ یہ دفاعی انتظامات ایک طویل عرصہ کے لئے تھے۔ اور سلطان کو خود یقین نہ تھا کہ وہ کس وقت تک عکّہ سے رابطہ برقرار رکھ سکے گا۔ اندھیرا پھیلتے ہی سلطان نے کردوں کے سردار حسام الدین کو طلب کیا اور کہا۔

"حسام الدین۔ اگرچہ عکّہ کا دفاع ایک طویل عرصہ تک کام دے سکے گا پھر بھی ہم چاہتے ہیں کہ تم اپنے دستوں کے ساتھ قلعہ عکّہ کے دفاع میں قراقوش کا ہاتھ بٹاؤ۔"

"جو حکم عالی جاہ" کردوں کے سردار نے سر کو ذرا سا خم کر کے جواب دیا۔ "میرے بہادر کرد عکّہ کے دفاع پر قربان ہونے پر فخر کریں گے۔"

کردوں کے یہ جنگجو دستے کئی بار آزمائش سے گزر چکے تھے۔ ان کی صفت یہ تھی کہ جب انہیں حملے کا حکم دیا جاتا تو یہ برق بن کر دشمن پر گرتے تھے اور اگر دفاع کا کام سونپا جاتا تو یہ اپنے مقام پر اس طرح چپک جاتے کہ دیکھنے والوں کو بھی شبہ ہوتا گویا وہ اپنے ذاتی گھر کی حفاظت کر رہے ہیں۔ یہ روایت بھی مشہور ہے کہ کرد قبائل اپنے مورچوں میں اپنی قبریں پہلے ہی سے کھود لیتے تھے۔

اندھیرا پھیلنے سے پہلے سلطان نے قلعہ عکّہ میں ضروری اشیا کا اتنا بڑا ذخیرہ جمع کر دیا کہ اگر محاصرہ ایک سال تک جاری رہتا تو بھی قلعہ کو باہر سے کسی قسم کے سامان کی ضرورت نہ ہوتی۔ اس اہم کام کی تکمیل کے بعد سلطان، تقی الدین اور راستہ بنانے والا لشکر سلطانی خیمہ گاہ کی جانب اس طرح لوٹ گیا جیسے کچھ ہوا ہی نہیں مگر معرکہ عکّہ کی تاریخ میں یہ بات جلی حروف میں رقم کر دی گئی کہ تیسری صلیبی جنگ کے دوران ایک ایسا موقعہ بھی آیا کہ سلطان صلاح الدین عکّہ کے مسلمان محصورین کو صلیبیوں کے اور محاصرہ کرنے والوں کے درمیان راستہ بنا کر سامان رسد سے بھرے ہوئے اونٹ قلعہ عکّہ میں پہنچائے اور صلیبیوں کا لشکر منہ دیکھتا رہا۔

عکّہ کا محاصرہ طول کھینچتا چلا جا رہا تھا۔ صلیبیوں نے لاکھ سر مارا، سینکڑوں تدبیریں کیں لیکن عکّہ کے ساڑھے چار ہزار محصورین روز اول کی طرح جمے رہے۔ عکّہ کا قلعہ تو ایک طرف رہا صلیبی سورما اپنے ہزاروں حملوں کے باوجود شہر کی فصیل تک بھی نہ پہنچ سکے۔ مسلمانوں کے لئے یہ بہت آسان تھا کہ وہ قلعہ کے دروازے کھول کے لڑتے بھڑتے اور نصرانیوں کی صفیں توڑتے ہوئے سلطانی لشکر سے آملتے یا سلطانی لشکر پہلے کی طرح دشمنوں کی صفوں میں ایک بار پھر راستہ بنا کے قلعہ تک پہنچتا اور قلعہ والوں کو اپنی حفاظت میں قلعہ سے نکال کر اسلامی خیمہ گاہ تک لے آتا مگر نہ قلعہ والوں نے ناپسند کیا اور نہ سلطان نے قراقوش یا کردوں کے سردار حسام الدین کو قلعہ چھوڑنے کا حکم دیا۔

محاصرے کی مدت جتنی طویل ہوتی جا رہی تھی۔ اس اعتبار سے مخالف لشکر کی دشمنی، تنگ نظری اور نفرت میں کمی ہو رہی تھی۔ یہ بات نہیں کہ نصرانی اور مسلمان آپس میں دوست ہو گئے تھے کیونکہ ان دونوں قوموں، دونوں مذہبوں اور دونوں کے تمدن اور روایات میں بعد المشرقین تھا۔ دونوں ایک دوسرے کے ازلی اور ابدی دشمن تھے۔ نصرانی (عیسائی) تثلیث پرست تھے یعنی وہ تین خداؤں کو ملا کر ایک خدا بناتے تھے۔ ان کا ایک خدا تو حضرت عیسیٰ تھے جنہیں نصرانی خدا کا بیٹا کہتے تھے۔ ان کا دوسرا خدا حضرت بی بی مریمؑ تھیں جن کے بطن سے حضرت عیسیٰ پیغمبر

باپ کے پیدا ہوئے تھے۔ اور تیسرا خدا ان دیکھا خدا تھا جو ان کے خیال میں حضرت عیسیٰ کا باپ تھا۔ ان تینوں کو ملا کے وہ ایک خدا کو تسلیم کرتے تھے۔ لیکن مسلمان صرف خدائے واحد کی پرستش کرتے ہیں۔

سلطانی لشکر کا نصرانیوں کے درمیان راستہ بنا کر عکہ میں سامان حرب اور فوجی کمک پہنچانے کا واقعہ اس قدر حیرت انگیز ہے کہ اس پر مغربی ممالک کے لوگ یقین کرنے پر قطعی آمادہ نہ ہوتے لیکن اس واقعہ کا بڑا تفصیلی احوال بہاء الدین نے لکھا ہے جو سلطان صلاح الدین کا نہ صرف سوانح نگار بلکہ ایک مستند مؤرخ بھی تسلیم کیا جاتا ہے۔ بہاء الدین خود بھی سلطان کے ساتھ نصرانیوں کے درمیان بنائے جانے والے راستے سے قلعہ عکہ گیا تھا۔ بہاء الدین نے اس کی تفصیل لکھی ہے لیکن اس کا ایک جملہ معرکہ عکہ کی تاریخ کا حصہ بن گیا وہ لکھتا ہے۔

"میں بھی دوسرے جانبازوں کی طرح دیوار پر چڑھا اور سب سے پہلے جو چیز میرے ہاتھ لگی وہ میں نے اٹھا کر دشمنوں پر کھینچ ماری"

بہاء الدین کی تحریروں کو مغربی مؤرخ بھی تسلیم کرتے ہیں اس لئے انہیں بہاء الدین کا یہ تاریخی جملہ اپنے بیانات میں شامل کرنا پڑا۔

اگر دو جانی دشمن زیادہ عرصہ تک قریب قریب رہیں تو ان کے درمیان بھی ایک معاندانہ قسم کی رفاقت پیدا ہو جاتی ہے اور وہ ایک دوسرے سے نفرت کرنے کے باوجود بعض مشاغل میں ایک دوسرے کا ساتھ دینے لگتے ہیں۔ عکہ کے محاذ پر کچھ اسی طرح کے واقعات مسلمان اور نصرانی لشکروں میں بھی دیکھنے میں آتے ہیں۔ وہاں اکثر ایسا ہوتا کہ مسلمان اور عیسائی لڑتے لڑتے رک جاتے اور اپنے بچوں کو دوسرے مذہب کے بچوں کے ساتھ کشتی لڑتے ہوئے دیکھنے لگتے۔ جب دو مخالف بچے ایک دوسرے سے گتھم گتھا ہو جاتے تو لشکر بھی جنگ بھول کے بچوں کی کشتی دیکھنے لگتے اور ان کی حوصلہ افزائی بالکل اسی طرح کرتے جیسے مرغ باز، مرغ لڑاتے ہوئے اپنے اپنے مرغوں کا حوصلہ بڑھانے کے لئے آوازیں لگاتے ہیں۔

دونوں طرف کے فوجی روزانہ کی جھڑپوں کے اس قدر عادی ہو گئے تھے کہ اکثر لڑتے لڑتے رک جاتے اور آپس میں روزمرہ کی گفتگو شروع کر دیتے یا پھر اپنے بچوں کو مرغ کی طرح بغلوں میں دبا کر لے آتے اور انہیں لڑا کے لطف اٹھاتے۔ اس کے باوجود ان کے دل کی کدورتیں ختم نہ ہوتی تھیں۔ اور وہ اکیلے دو کیلے ایک دوسرے کی گردن اتارنے سے قطعی دریغ نہ کرتے۔

اس طرح کی چھوٹی موٹی جھڑپوں میں تقریباً بیس دن گزرے اور ستمبر کا مہینہ ختم ہو کے اکتوبر آ گیا۔ ۴ اکتوبر ۱۱۸۹ء کو نصرانیوں میں حرکت پیدا ہوئی۔ ان کا لشکر ساحل سمندر سے ہر نعمین تک دو میل کی لمبائی میں عکہ کے گرد نیم دائرے کی شکل میں صف در صف پھیل گیا۔ میمنہ پر یروشلم کا شاہ گائی لوسگنان تھا شاہ گائی اپنی شکست اور مسلمانوں کے ہاتھوں اپنی گرفتاری بھول چکا تھا۔ اور اس سلطان کے مقابلے پر نکلا تھا۔ جس نے اسے اس شرط پر رہا کیا تھا کہ وہ آئندہ سلطان کے خلاف کبھی تلوار بلند نہ کرے گا۔ دراصل شاہ یروشلم کو زندگی بھیک میں ملی تھی۔ شاہ کی ملکہ سبل نے سلطان کے سامنے پیش ہو کے اپنے شوہر کی زندگی کی بھیک مانگی تھی۔ جو سلطان نے اسے بخش دی تھی۔ مگر وہ شاہ یروشلم بے غیرتی سے سر بلند کئے سلطان کے خلاف نصرانیوں کے میمنہ (دایاں بازو) کی کمان کر رہا تھا۔

نصرانیوں کے لشکر کے سب سے آگے حسب معمول تیر انداز دستے تھے۔ اس کے بعد گھڑ سوار اور پیادے تھے۔ شاہ گائی کے آگے ریشمی چھتر کے سائے میں انجیل مقدس تھی۔ قلب لشکر میں مارکوئس کونریڈ اور لوئیس کو کمان تھی۔ دوسری طرف اسلامی لشکر میں قلب کی کمان سلطان صلاح الدین کے ہاتھ میں تھی۔ سلطان کے دائیں جانب اس کے دو بیٹے افضل اور ظاہر تھے۔ میسرہ پر دیار بکر کی افواج تھیں اور میمنہ پر شامی شام کی تجربہ کار فوجیں تھیں جن کی کمان تقی الدین کے سپرد تھی۔

سلطان کے بائیں جانب کرد قبائل، سنجاہ کی سپاہ اور حران کے گھبری سپاہی تھے۔ میسرہ میں شیر کوہ کے زمانہ کے وہ ملک تھے جنہوں نے مصر فتح کیا تھا۔ سلطان نے تمام اہم اور پرخطر مورچوں پر تجربہ کار افواج تعینات کی تھیں لیکن قلب فوج جس میں وہ خود موجود تھا وہاں سلطان کے حفاظتی دستوں کے ساتھ الجزیرہ اور کردستان کے کم تجربہ کار دستے مقرر کئے تھے۔

نصرانیوں نے طلوع آفتاب کے چار گھنٹے بعد سلطانی لشکر کے میمنہ پر زبردست حملہ کیا۔ اس حصہ کی کمان سلطان کے برادر زادہ تقی الدین کے ہاتھ میں تھی۔ اس نے طے شدہ منصوبہ کے تحت پسپا ہونے کا مظاہرہ کیا۔ جب تقی الدین پسپا ہوتا ہوا خیمہ گاہ تک پہنچ گیا تو سلطان نے اس کی مدد کو قلب فوج سے کچھ دستے روانہ کئے۔ دشمن نے قلب فوج کو کمزور دیکھ کر سوار اور پیادوں سے حملہ کر دیا۔ سلطان نے حملہ آوروں کو اندر آنے کے لئے جگہ دی۔ حملہ آوروں میں سواروں کی کثرت تھی وہ اپنے زور میں مسلمانوں کو دباتے چلے گئے۔

سلطان نے اس کمزوری سے فائدہ اٹھایا اور حملہ آور سواروں

اور پیادہ فوج کے گرد گھیرا ڈال کر انہیں قتل کرنا شروع کر دیا۔ عکہ والوں نے بھی قلعہ سے نکل کر حملہ آوروں پر حملہ کر دیا۔ اس طرح حملہ آوروں کو واپس جانے یا بھاگنے کا موقعہ نہ مل سکا اور نصرانیوں کو شکست فاش ہوئی۔ اس لڑائی میں مارکوئیس کونریڈ مرتے مرتے بچا۔ اگر شاہ یروشلم اس کی مدد نہ کرتا تو وہ ختم ہو گیا ہوتا۔ اس جنگ میں اینڈرو برونے بھی مارا گیا۔ اس سے بڑا نقصان ماسٹر آف دی ٹیمپل کا تھا۔ اس کا نام جیرالڈ آف رائڈ فرڈ تھا۔ جو عکہ کے میدان میں مارا گیا۔ یہ شخص بڑا کینہ پرور تھا اور اس کی ہوس رانیوں نے نصرانیوں کے درمیان بڑا تفرقہ پیدا کیا تھا۔ مشہور ہے کہ ماسٹر آف دی ٹیمپل کی ہوس کا شکار بہت سے امراء کی بیگمات ہوئی تھیں اور اس شخص نے اپنے بہت سے مخالفین کو موت کے گھاٹ اتروا دیا تھا۔

مغرب کے مؤرخوں نے اس جنگ کے بارے میں یہ بھی انکشاف کیا ہے کہ اس میں نصرانی عورتیں بھی زرہ بکتر پہن کے مسلمانوں کے مقابلے پر لڑی تھیں زرہ بکتر میں ان کا جسم چھپا ہوا تھا اس لئے پہچان میں نہ آیا۔ پھر جب وہ گرفتار ہوئیں تو عقدہ کھلا کر مردوں کے لباس میں وہ عورتیں تھیں لیکن یہ بات مہمل اور لغو ہے اس لئے کہ مسلم مورخین خصوصاً بہاؤالدین جو ہمیشہ سلطان کے ساتھ رہتا تھا اور ابن خلدون نے اس کا کوئی ذکر نہیں کیا۔

نصرانی مؤرخوں نے اس جنگ میں عیسائی مقتولین کی تعداد صرف پندرہ سو بتائی ہے جبکہ بہاؤالدین جو اس جنگ کا عینی شاہد ہے اس نے عیسائی مقتولین کا کم از کم اندازہ چار ہزار لگایا ہے۔ مسلمان شہداء میں کردوں کا ایک لیڈر، ایک دوسرا امیر اور صرف ایک سو پچاس سپاہی شامل تھے۔

سلطان نے عکہ کی پہلی بڑی جنگ میں عظیم فتح حاصل کی تھی مگر اس کو کیا کہا جائے کہ دشمن قوم کے مورخ مسلمانوں کی ہر فتح کی غلط تاویلیں پیش کر کے اسے شکست سے بدلنے کی کوشش کرتے ہیں۔ انہیں سلطان کی اس روز روشن کی طرح واضح فتح سے انکار کرنے کی تو جرأت نہ ہوئی مگر انہوں نے حسب عادت غلط تاویلوں کا سہارا لیا۔ ان کے بیان کے مطابق سلطان نے فتح حاصل کرنے کے باوجود اس سے کوئی فائدہ نہ اٹھایا اگر سلطان چاہتا تو فوری حملہ کر کے نصرانیوں کی طاقت کا ہمیشہ کے لئے خاتمہ کر سکتا تھا لیکن سلطان نے دشمن پر حملہ کرنے کے بجائے اپنا مقدمہ سرداروں کے سامنے پیش کیا۔ اس نے بڑے بڑے سرداروں کی مجلس مشاورت منعقد کی اور انہیں مخاطب کیا۔

"میرے وفادارو۔ دشمن دین اور دشمن خدا ہمارے ملک

میں گھس آیا خدا کا شکر ہے کہ آفتاب فتح ہمارے سر پر چمک رہا ہے۔ ہم نے دشمن کے لشکر کو تیار فصلوں کی مانند کاٹ ڈالا ہے۔ باقی لشکر، جو رہ گیا ہے انشاءاللہ اسے بھی ہم برباد کر کے رکھ دیں گے آپ کو علم ہے کہ مصر سے الملک العادل کمک لے کر آ رہا ہے اگر مصر سے کمک آنے تک دشمن اپنے مورچوں پر قابض رہا تو اس کی طاقت بڑھ سکتی ہے۔ اب آپ اپنی رائے ظاہر کیجئے کہ اس موقع پر جنگ بہتر ہو گی یا کمک کا انتظار۔"

یہاں اس بات کا اظہار ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ۲ اکتوبر کو اچانک نصرانیوں نے ایک بڑی جنگ کا ڈول ڈالا تھا۔ اس وقت ان کا انداز جارحانہ تھا۔ لیکن جب سلطان نے ان کے حملے کو روک کر جوابی حملہ کیا تو ان کے قدم میدان سے اکھڑ گئے اور وہ چار ہزار لاشیں میدان میں چھوڑ کر اپنے مورچوں میں جا چھپے۔

اگلے دن جب سلطان لشکر لے کر میدان میں اترا تو اسے بتایا گیا کہ نصرانی لشکر نے اپنے گرد گہری خندق کھود لی ہے اور وہ کل کی طرح حملہ کرنے کے بجائے خندق میں چھپ کے مدافعت کرنا چاہتے ہیں۔ اس اہم موقع پر سلطان نے مندرجہ بالا تقریر کی تھی۔

سلطان کا یہ دستور تھا کہ وہ حکمت عملی خود تیار کرتا تھا لیکن اس سے پہلے تمام سرداروں کو جمع کر کے ان کی رائے معلوم کرتا تھا۔ مجلس مشاورت کے اختتام میں سلطان نے جو تقریر کی تھی اس کے آخری جملہ میں سلطان نے اس بات کا عندیہ دیا تھا۔ کہ اگر شکست خوردہ لشکر کو سنبھلنے کا موقعہ دیا گیا تو ان کی طاقت بڑھ جائے گی۔ اس سے ظاہر ہوتا تھا کہ سلطان فوری حملے کے حق میں ہے مگر مجلس مشاورت کا جو نتیجہ نکلا وہ اس کے خیال

کے بالکل برعکس تھا یعنی فوراً حملہ سے گریز کیا جائے اور فوجوں کو آرام دیا جائے۔ اس فیصلہ کو دشمنان اسلام نے غلط اور غیر دانشمندانہ قرار دیا ہے۔ ان کے خیال میں سلطان اگر فوری طور پر نصرانی لشکر پر حملہ آور ہو جاتا تو نصرانیوں کو سنبھلنے کا موقعہ نہ تھا اور سلطان کو حطین کی طرح "فتح عظیم" کا موقعہ ہاتھ لگتا۔

سلطان کے پیش نظر صرف عکہ کا محاصرہ ہی نہ تھا۔ عکہ میں صرف ساڑھے چار ہزار مسلمان محصور تھے جن کے پاس مہینوں بلکہ برسوں کے لئے سامان رسد موجود تھا اس کے علاوہ سلطان کو اپنے لشکر پر بجا طور پر ناز تھا اور اسے امید تھی کہ اگر آئندہ کسی موقع پر عکہ والوں کے پاس کسی طرح کی کمی ہوئی تو وہ ایک بار پھر دشمن لشکر میں راستہ بنا کر عکہ کے قلعہ میں سامان پہنچا سکتا ہے اور اگر اس نے ضروری محسوس کیا تو وہ عکہ خالی کر کے اپنے آدمیوں کو بآسانی قلعہ سے واپس لا سکتا ہے۔

آخر سلطان نے فیصلہ کر دیا اور فیصلہ یہ تھا کہ ملک العادل کی کمک کا انتظار کیا جائے اور لشکر کو آرام کرنے کے لئے رخصت دی جائے۔ اگر عکہ کے حالات پر غور کیا جائے تو یہ بات سمجھ میں آ جاتی ہے کہ سلطان عکہ کے محاذ سے کیوں واپس ہوا جبکہ اس نے نصرانیوں کے خلاف ایک بڑی فتح حاصل کی تھی۔ سلطانی فوجیں گزشتہ پندرہ ماہ سے مسلسل جنگ و جدل کی حالت میں چلی آ رہی تھیں جس سے ان میں تھکن پیدا ہونا ایک فطری عمل تھا۔ دوسری بات یہ تھی کہ نصرانیوں سے جو معرکے ہوئے تھے اس میں دشمن کے مقتولین کی تعداد دس ہزار تک پہنچ گئی تھی اور ان کی بے گور و کفن لاشیں میدان میں پڑی سڑ رہی تھیں۔ ان کی عفونت نے فضا کو متعفن کر دیا تھا۔ سلطان پر درد قولنج کا پہلے بھی حملہ ہوا تھا۔ اور اب پھر اس کے آثار پیدا ہو رہے تھے۔

سلطان کی عمر پچاس کے اوپر ہو چکی تھی وہ اگرچہ مضبوط اعصاب کا باہمت اور حوصلہ مند انسان تھا لیکن موسموں کی سختی گرمی، سردی، بارش، میدان اور کبھی سخت چٹانیں، اسے دھوپ میں گھنٹوں کھڑے ہو کر لشکری کام کی دیکھ بھال کرنا پڑتی تھی۔ ان تمام باتوں نے اس کی صحت پر برا اثر ڈالا تھا۔ سلطان کے اطباء اسے آرام کا بار بار مشورہ دیتے تھے۔

اکتوبر کے مہینے میں سلطانی لشکر طے شدہ منصوبہ کے تحت عکہ کے شمال میں پہاڑیوں سے واپس ہونا شروع ہوا۔ سلطان کی یہ مراجعت عارضی تھی۔ اس لئے کہ بارشیں شروع ہو چکی تھیں۔ اور موسم بہار تک جنگ کے لئے میدان بیکار ہو چکا تھا۔ سلطان اگرچہ واپس ہو گیا تھا لیکن عکہ کے گرد اس کی مدافعتی اور دیکھ بھال کرنے والی چوکیاں قائم تھیں۔

ادھر سلطان نئی فوج بھرتی کرنے میں مصروف تھا۔ مصر سے سلطان کا بھائی ملک العادل کمک لے کر پہنچ گیا تھا۔ زمینی فوج کے علاوہ مصر سے پچاس جہازوں کا ایک بحری بیڑہ بھی آیا تھا جس کی کمان اس دور کے عظیم امیر البحر لولو کے ہاتھ میں تھی۔ اس بحری بیڑے سے دس ہزار کے قریب ملاح ساحل پر اتر گئے تھے جو نصرانیوں سے چھیڑ چھاڑ کرتے رہتے تھے۔ بارش کی وجہ سے علاقہ میں اس قدر کیچڑ ہو گیا تھا کہ دست بدست لڑائی ممکن نہ تھی پس جنگ کا کوئی موقعہ نہ آیا۔

اسی دوران سلطان پھر واپس آیا۔ اس نے عکہ کے دفاع اور سامان رسد کا معائنہ کیا پھر اپنے دستے لے کر الخروبہ چلا گیا اور موسم بہار کا انتظار کرنے لگا کیونکہ بہار سے پہلے سڑکیں سفر کے لئے ناکارہ رہتی تھیں۔ یہ وہی وقت تھا جب قیصر جرمنی فریڈرک اپنے لشکر کے ساتھ اس ارادے سے چلا تھا کہ ارض فلسطین پہنچ کر سلطان کو سزا دے اور بیت المقدس کو مسلمانوں کے ہاتھوں سے واپس لے لیکن اس کی یہ آرزو پوری نہ ہو سکی اور وہ دریا عبور کرتے ہوئے ڈوب کے مر گیا اور اس کی آرزو بھی اسی کی طرح تہہ آب چلی گئی۔

سلطان کو قیصر جرمنی فریڈرک کے مرنے کی اطلاع آرمینیا کے کیتھولک باشندوں نے پہنچائی تھی۔ یہ لوگ مشرقی روم یعنی قسطنطنیہ کے رومی شہنشاہ کے حامی تھے۔ اور اس کے ساتھ ہی سلطان کے بھی وفادار تھے۔ ان لوگوں نے سلطان کے حضور پیش ہو کے عرض کیا۔

"اے مسلمانوں کے عظیم سلطان قسمت نے قیصر جرمنی فریڈرک کا ساتھ نہیں دیا اور وہ دریائے سالس پار کرتے ہوئے ڈوب کر مر گیا۔"

"قیصر جرمنی کے ساتھ کتنا لشکر آیا تھا؟" سلطان نے دلچسپی سے پوچھا۔

پچاس ہزار۔ کیتھولک۔۔۔۔ قاصد نے انکشاف کیا۔

انگلش

شاہد نے اسکول سے آتے ہی امی جان کو کہا "ممی! پلیز کم ہیر۔" امی نے خوشی سے کہا تمہارے شاہد تمہیں خوب انگلش بولنا آ گئی ہے۔ یہ بتاؤ جب مجھے گھر سے باہر بھیجنے کا ارادہ ہو تو تم کیا کہو گے۔ شاہد کافی دیر غور کرتا رہا۔ پھر دوڑ کے گیٹ سے باہر نکل گیا۔ بلانے کا اشارہ کرتے ہوئے بلند آواز میں بولا۔ "ممی! پلیز کم ہیر۔"

ٹیلی پیتھی موجودہ دور میں ٹیلی فون، وائرلیس، ریڈیو، مائکرو ویو سسٹم اور ٹیلی ویژن وغیرہ کی معجزہ نمایاں شرح ہیں، ابھی بہت کم لوگ اس بات سے واقف ہیں کہ حیاتِ انسانی بھی ایک خودکار برقی نظام سے متحرک ہے اور انسان ذہن اور روح کی ان دیکھی برقی قوت سے عمل پیرا ہے۔ ٹیلی پیتھی بھی کوئی جادو کا علم نہیں بلکہ ایک نظام ہے۔ ایک سسٹم ہے جس کے ذریعہ ایک انسان اپنے ذہن کو مطلوبہ انسان کے ذہن سے میلوں کی دوری پر بھی جوڑ سکتا ہے۔ بالکل اسی طرح جیسے ایک طاقت ور ٹرانسمیٹر کے ذریعہ رابطہ قائم کیا جاسکتا ہے۔

یہ فن مسلسل مشق اور صحیح طریقہ کار پر عمل کر کے کوئی بھی حاصل کر سکتا ہے۔ ٹیلی پیتھی کے فن اور مشق کے ذریعہ بہت سے لوگوں نے کشف و کرامات دکھانے کی حد تک شہرت پائی ہے۔ زیر نظر ناول ایک ایسے ہی انسان کی آپ بیتی ہے۔ میری رائے میں ہر شخص اپنی روح کی برقی طاقت اور ذہن کے کنٹرول سسٹم پر قابو پا کر ٹیلی پیتھی کا ماہر بن سکتا ہے۔ میری نظر میں کتاب والا، پہاڑی بھوجلہ دہلی سے شائع شدہ کتاب ٹیلی پیتھی گائڈ ایک مکمل ہدایت نامہ ہے۔

محی الدین نواب

مانسٹرٹ کا مارکوئیس کونزیڈ عشرت پسند نہیں بلکہ عیاش ذہن اور اوباش طبیعت کا مالک تھا۔ وہ حسن کو اسیر کرنے کے لئے باقاعدہ منصوبہ بناتا اور اس منصوبہ پر احتیاط سے عمل کر کے محبوب کو اپنے دام میں لے آتا۔ اٹلی کی استاریا جیسی درجنوں دوشیزاؤں کی جوانیاں وہ برباد کر چکا تھا۔ استاریا سے شاید اسے عشق ہو گیا تھا۔ جبھی اس نے اسے حاصل کرنے کے لئے سسلی کا سفر اختیار کیا اور وہاں کے اسقف (پادری) نے اس کی مشکل آسان کر دی۔

لیکن بے جوڑ ذہنوں کی یہ گاڑی زیادہ دیر نہ چل سکی اور مانسٹرٹ کا عیاش مارکوئیس کونزیڈ دلنشیں استاریا کو اسی حالت میں چھوڑ کر کسی نئے عشق اور مہم کے لئے جہاز پر سوار ہو گیا۔ مارکوئیس کونزیڈ نے اپنے اس سفر کے لئے بھی پہلے سے منصوبہ بندی کر لی تھی۔ اس نے اونچے طبقے کے بعض لوگوں کو اپنا ہم خیال بنا لیا تھا۔

اور ایک دن مارکوئیس کونزیڈ نے اچانک محفل میں اعلان کیا کہ وہ کروسیڈ (مذہبی اور صلیبی جنگ) کے لئے فلسطین جا رہا ہے۔ سب نے اس کی تعریف کی۔

ایک بولا۔۔۔ "مارکوئیس کونزیڈ جواں مرد ہے اور اس کا رجحان ہمیشہ مردانگی کی طرف رہتا ہے۔"

دوسرے نے اور کھل کے تعریف کی۔ "کیوں نہیں مارکوئیس نے اتنی شہرت آخر کس لئے حاصل کی ہے۔ ایسے بہادروں کو صلیبی جنگ میں ضرور حصہ لینا چاہیے۔"

"میں آپ کے ساتھ چلوں گا مارکوئیس۔" ایک شخص نے مارکوئیس سے کہا۔

"ضرور ضرور۔۔۔۔ یروشلم کو تمہارے جیسے جوانوں کی ضرورت ہے۔" مارکوئیس کونزیڈ نے اسے حوصلہ دیا۔ "میں تمہارے جذبہ کی قدر کرتا ہوں۔ تم چلو اور اپنے دوستوں کو بھی یروشلم کی زیارت اور ایک مذہبی فریضہ ادا کرنے کی دعوت دو۔ تمہارے تمام اخراجات اور اگر تم اپنے گھر کے واحد کفیل ہو تو تمہارے گھر والوں کے اخراجات بھی ہماری ذمہ داری ہے۔"

مانسٹرٹ کی ریاست میں مارکوئیس کونزیڈ کی اس بات نے آگ سی لگا دی۔ مارکوئیس ایک جنگجو کی حیثیت سے پہلے ہی وہاں معروف تھا۔ اب وہ اس قدر مشہور ہوا کہ چند دنوں میں اسے تقریباً دو سو جوانوں کا تعاون حاصل ہو گیا۔

مارکوئیس کے پاس خود بھی کافی رقم تھی۔ اس کے علاوہ "کروسیڈ" کے نام پر اس نے ریاست کے امیروں اور تاجروں سے بہت سی رقم بٹور لی اور پھر ایک دن اس نے

روانگی کا اعلان کر دیا۔ اس کی بیوی استاریا کو مارکوئیس کی تمام کارروائیوں کی اطلاع تھی۔ اس کا یہ بھی خیال تھا کہ مارکوئیس، یروشلم جانے سے پہلے اس سے ملنے ضرور آئے گا۔ میاں بیوی کے تعلقات میں کشیدگی ہو ہی جایا کرتی ہے۔ اس لئے اس کے باپ نے ان کے جھگڑے میں دخل نہ دیا۔

مگر جب اسے مارکوئیس کی روانگی کی تاریخ کا علم ہوا تو وہ گھبرا گیا۔ اس کے خیال میں مارکوئیس اور اس کی بیوی استاریا کے تعلقات اس قدر خراب نہ ہوئے تھے کہ وہ ہمیشہ کے لئے الگ ہو جاتے۔ استاریا بھی کچھ چپ چپ دکھائی دے رہی تھی۔ اس شادی میں خود استاریا کا زیادہ دخل تھا۔ اس لئے وہ باپ سے شکوہ بھی نہ کر سکی۔

استاریا کا باپ اسی ادھیڑ بن میں مبتلا تھا کہ استاریا اس کے سامنے آ کر بیٹھ گئی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو بھرے تھے۔

"کیا بات ہے بیٹی! تم بہت افسردہ دکھائی دے رہی ہو۔؟" باپ کا دل بھر آیا تھا۔

"بابا! میں کیا کروں؟ میری سمجھ میں کچھ نہیں آتا۔" استاریا باپ کے کاندھے سے لگ کے رونے لگی۔

"بیٹی! میں نے تمہارے معاملات میں اس لئے دخل نہ دیا کہ مارکوئیس کو شاید ناگوار گزرے مگر اب تو پانی سر سے اونچا ہو گیا ہے۔" اس کے باپ نے بڑے افسوس سے کہا۔

"میں کیا کروں بابا۔ مجھے کچھ بتایئے۔؟" استاریا پیہم سسکیاں بھر رہی تھی۔ "آپ ہی مارکوئیس کو سمجھایئے۔"

"میں کیسے سمجھاؤں استاریا وہ یہاں آئے تو۔۔۔" بابا کا لہجہ بھی افسردہ ہو گیا "اب تو وہ جانے والا ہے۔"

"مجھے لے چلئے اس کے پاس۔" استاریا بے چین ہو گئی۔ "میں اس سے معافی مانگ لوں گی۔ خوشامد کروں گی اس کی۔ وہ جہاں جانا چاہتا ہے ضرور جائے مگر مجھے اس طرح تو نہ چھوڑے۔"

"اچھا استاریا۔" انہوں نے کہا۔ "آج پہلے میں اس سے ملنے کی کوشش کروں گا۔ پھر تمہیں لے کے جاؤں گا۔"

استاریا کی ساری اکڑ نکل گئی تھی۔ اس نے سوچ لیا تھا کہ مارکوئیس سے معافی مانگ لے گی آخر وہ اس کی بیوی ہے۔ اس کے بابا تو صبح ہی صبح مارکوئیس کو زیڈ سے ملنے ساحل پر چلے گئے۔ اور استاریا دوپہر تک انہی خیالوں میں الجھتی رہی۔

اس کے بابا دوپہر کے بعد آئے، تو منہ لٹکائے ہوئے تھے استاریا، وہ چہرے ہی سے پہچان گئی کہ دال میں کچھ کالا ہے۔ مگر وہ تھی عقلمند اور بڑی صبر والی۔ اس لئے خاموش رہی۔

بابا نے غم بھری آنکھوں سے بیٹی کو دیکھا۔

"بیٹی وہ تمہیں دھوکا دے گیا۔ انسان نہیں شیطان تھا وہ۔"

استاریا نے پہلے تو بابا کو حیران نظروں سے دیکھا پھر ان کے گلے میں ہاتھ ڈال کے جھول گئی۔

"بابا۔۔۔۔۔۔ بابا۔۔۔۔۔۔"

اور استاریا بے ہوش ہو گئی۔

شام کو جب اسے ہوش آیا تو بابا نے بتایا۔ "وہ تو کل شام کو چلا گیا تھا یہاں سے میں نے جہاز کے دفتر میں اس کے بارے میں پوچھا تو اس کا نام سن کے سب نے کانوں کو ہاتھ لگائے اور جب میں نے بتایا کہ مارکوئیس کو زیڈ میرا داماد ہے۔ دو ماہ بیشتر اس نے میری بیٹی سے شادی کی ہے تو انہیں بڑی حیرانی ہوئی۔ انہوں نے بتایا وہ روز ہی کسی نہ کسی لڑکی سے شادی رچاتا ہے اور صبح کو دھکے دے کر اسے نکلوا دیتا ہے۔۔۔"

"اب کیا ہو گا بابا؟" استاریا کے پیروں تلے سے زمین نکل گئی۔ "ہم چرچ میں شکایت تو کر سکتے ہیں۔۔؟"

بابا نے ذرا رک کے جواب دیا۔ "کوئی فائدہ نہیں کیونکہ چرچ کے قانون کے مطابق تم اس وقت بھی شادی کی عمر کو نہیں پہنچی ہو۔"

استاریا گھبرا گئی۔ "ٹھیک ہے بابا۔ اس نے مجھے چھوڑا ہے تو میں بھی اس کا نام نہ لوں گی۔ خداوند یسوع نے چاہا

تو کتے کی موت مارا جائے گا۔"

اسٹاریا کا بابا بیٹی سے کیا کہتا۔ مارکوئیس سے شادی اسٹاریا کی مرضی بلکہ ضد سے ہوئی تھی۔ اسٹاریا روتی تو اس کا دل بھی رونے لگتا مگر سوائے صبر کے اور کوئی چارہ نہ تھا۔

مارکوئیس کو زیڈ کو اٹلی کا ساحل چھوڑے ہوئے ایک ہفتہ گزرا تھا۔ اسٹاریا نے خود کو ایک کمرے میں قید کر لیا تھا۔ ایک دن اچانک دروازے پر دستک ہوئی دروازہ کھولا تو باہر بابا کو ادھیڑ عمر کا ایک آدمی کھڑا دکھائی دیا۔ اس کے ساتھ ایک نو عمر لڑکی تھی۔ آنے والے بابا کو مجبور نظروں سے دیکھ رہے تھے اور بابا ان کے بارے میں سوچ رہے تھے کہ وہ کون ہو سکتے ہیں۔؟

"میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں۔؟" انہیں خاموش دیکھ کے بابا کو پوچھنا پڑا۔

"ہم مظلوم ہیں۔ مسافر ہیں۔" آنے والے مرد نے آنسو پیتے ہوئے کہا۔

"کھل کے گفتگو فرمائیے۔" بابا نے انہیں تسلی دی۔ "ہم اگرچہ خود پریشان ہیں مگر آپ کی مدد کرنے کی ضرور کوشش کریں گے۔"

"آپ مارکوئیس کو زیڈ کو جانتے ہیں۔" نووارد نے امید بھرے لہجے میں کہا۔

"ہاں۔ میں جانتا ہوں۔" بابا نے چونک کر جواب دیا۔

آنے والے نے اس لڑکی کی طرف دیکھا جو اس کے ساتھ آئی تھی۔ اور شاید اس کی بیٹی تھی۔ لڑکی نے اشاروں ہی میں جواب دیا جسے اسٹاریا کا بابا نہ سمجھ سکا۔

"کیا میں اپنی بیٹی کے ساتھ اندر آسکتا ہوں؟" آنے والے نے ڈرتے ڈرتے سوال کیا۔

"ضرور۔ آپ اندر آسکتے ہیں۔" بابا نے جواب دیا۔ "ہم لوگ بالکل بے ضرر ہیں آپ اطمینان سے گفتگو کر سکتے ہیں۔"

باپ بیٹی اندر آگئے۔ بابا نے انہیں ڈرائنگ روم میں لے جاکر بٹھا دیا۔

"میرا نام ہیڈلے ہے۔" آنے والے نے اپنا تعارف کرایا۔ "اور یہ میری بیٹی ہے اسٹاریا۔"

"جی۔" بابا کرسی سے اچھل پڑے۔ "کیا نام بتایا آپ نے؟"

"اسٹاریا۔" ہیڈلے نے اپنی بیٹی کا نام دہرایا۔ "مگر آپ اس قدر حیران کیوں ہوئے؟"

بابا نے خود کو سنبھالا اور بولے۔ "دراصل میرے بھی ایک بیٹی ہے اور اس کا نام بھی اسٹاریا ہے۔"

ہیڈلے نے پوچھا۔ "آپ کی بیٹی کا یہ نام اصلی ہے یا کسی نے آپ کو رکھنے کو کہا تھا۔؟"

"میں آپ کا مطلب نہیں سمجھ سکا۔؟" بابا نے جواب دیا۔ "اولاد کا نام والدین خود رکھتے ہیں۔ دوسرے نہیں رکھا کرتے۔ خیر چھوڑیے ناموں کو ایک نام کے کئی افراد ہو سکتے ہیں۔"

ہیڈلے نے بیٹی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "میں مارکوئیس کو زیڈ کے بارے میں کچھ پوچھنا چاہتا ہوں۔ کیا آپ بتا سکیں گے۔؟"

بابا نے ایک ٹھنڈی سانس لی۔ "مسٹر ہیڈلے۔ اگرچہ مارکوئیس کے بارے میں گفتگو کرنا کم از کم میرے لئے مناسب نہیں لیکن آپ کی باتوں سے معلوم ہوتا ہے مارکوئیس کو زیڈ نے آپ کو بھی تکلیف پہنچائی ہے۔ آپ پوچھئے۔ مارکوئیس کے بارے میں جو کچھ مجھے علم ہے اسے بتانے میں کوئی دریغ نہ کروں گا۔"

ہیڈلے تیار ہو کے بیٹھ گیا اور اس کی بیٹی نے اس طرف کان لگا دیئے۔ ہیڈلے نے پوچھا۔ "مارکوئیس کو زیڈ سے آپ کی ملاقات کب ہوئی تھی۔؟"

بابا نے سوچتے ہوئے جواب دیا۔ "تقریباً ڈیڑھ ماہ پہلے۔"

"ڈیڑھ ماہ پہلے۔" ہیڈلے نے یہ الفاظ دہرائے پھر صاحب خانہ کو مشکوک نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ "مگر مجھے تو معلوم ہوا کہ مارکوئیس کو زیڈ آپ کے ساتھ اس مکان میں رہتا ہے۔"

"آپ نے ٹھیک سنا۔" بابا نے جواب دیا۔ کو زیڈ

میرے پاس ہی رہتا تھا لیکن اب اس نے ادھر آنا بھی چھوڑ دیا ہے۔"

"کیا آپ اس کا سبب بتانا پسند فرمائیں گے۔؟" ہیڈلے نے سپاٹ لہجے میں سوال کیا۔

"یہ میرا ذاتی مسئلہ ہے مسٹر ہیڈلے۔" بابا کو غصہ آ گیا۔

ہیڈلے کا منہ اتر گیا۔ عاجزی سے بولا۔ "آپ ناراض نہ ہوئیے۔ دراصل پریشانی نے مجھے حواس باختہ کر دیا ہے۔۔"

اس وقت مسٹر ہیڈلے کی بیٹی جس کا نام بھی استاریا تھا اس نے بڑی افسردگی سے پوچھا۔ "انکل! کیا آپ یہ بتانا پسند کریں گے کہ مارکوئیس کونزیڈ اس وقت کہاں ہوں گے۔؟"

"شاید میں تمہیں نہ بتا سکوں۔" بابا نے نرمی سے کہا۔ "لیکن پہلے تم مجھے یہ بتاؤ کہ مارکوئیس کونزیڈ نے تمہارے ساتھ کیا فریب کیا ہے۔؟"

"یہ ۔۔۔ یہ میرے والد بتائیں گے۔" مہمان استاریا نے باپ کی طرف دیکھا۔

"سنئے میرے بھائی۔" ہیڈلے نے بابا کو اپنی طرف متوجہ کر لیا وہ فریبی۔ دغا باز میری بیٹی کو چار مہینے سے شادی کا فریب دے رہا ہے۔ میری معصوم بیٹی نے اس کے فریب میں آ کر اپنا سب کچھ اس کے حوالے کر دیا۔

بابا اس کی بات سن کے سناٹے میں آ گئے۔ اب ان کی آنکھیں کھلیں کہ مارکوئیس واقعی ایک فریبی اور چالاک انسان ہے۔ بابا یہ خیال تھا کہ مارکوئیس کونزیڈ اور ان کی بیٹی استاریا کے باہمی اختلاف میں استاریا کی بھی کچھ نہ کچھ ضرور غلطی ہو گی ورنہ شوہر اپنی ۔۔ بیوی کو اس طرح بغیر اطلاع دیئے چھوڑ کر سمندر پار کس طرح جا سکتا تھا۔

مسٹر ہیڈلے نے پھر بات شروع کی۔ "اس نے میری بیٹی کو کھلا دھوکا دیا ہے۔ وہ میری بیٹی سے جواہرات کے دو قیمتی ہار یہ کہہ کر لے گیا ہے کہ مذہبی جنگ کے لئے رقم کی ضرورت ہے اور اٹلی کی تمام خواتین نے اپنے تمام قیمتی زیورات جنگی چندے میں دے دیئے ہیں۔"

بابا کی زبان اب بھی نہ کھل سکی وہ دراصل مارکوئیس کونزیڈ کی فریب کاریوں میں الجھے ہوئے تھے اور یہ سوچ رہے تھے کہ یہ ان کا اور ان کی بیٹی کا تنہا غم نہیں بلکہ اس فریب کار نے معلوم نہیں کتنے گھر اجاڑے تھے!

"آپ اب بھی خاموش ہیں۔" ہیڈلے نے انہیں چونکا دیا۔ "مجھے جواہرات اور زیورات کے جانے کی فکر نہیں۔ ہاں اگر آپ مجھے مارکوئیس کونزیڈ کا صحیح صحیح پتا دیں تو اس سے مل کے شاید میں اپنی معصوم بیٹی کا مستقبل سنوار سکوں۔؟"

"مسٹر ہیڈلے۔" بابا نے جب سر اٹھایا تو ہیڈلے نے دیکھا کہ ان کی آنکھوں میں آنسو بھرے ہوئے تھے۔ "کاش میں اس کا پتہ آپ کو بتا سکتا۔ آپ کی بیٹی استاریا اس لئے مظلوم ہے کہ مارکوئیس کونزیڈ اس کی عزت لوٹ کے بھاگ گیا ہے اور میری بیٹی جس کا نام بھی استاریا ہے وہ اس لئے مظلوم ہے کہ مارکوئیس کونزیڈ نے اس سے شادی کی ہے اور اب جبکہ میری بیٹی کے شکم میں ایک ننھی جان پرورش پا رہی ہے تو اس کا باپ اپنے تمام جہازوں کے ساتھ اٹلی کا ساحل ہمیشہ کے لئے چھوڑ گیا ہے۔

بابا کے اس انکشاف پر مسٹر ہیڈلے اور ان کی بیٹی استاریا حیران ہو گئی۔

مسٹر ہیڈلے بولے۔ "ہم تو آپ کے پاس اپنا درد لے کے آئے تھے۔ مگر معلوم ہوا کہ آپ تو ہم سے زیادہ زخمی ہیں۔

ان کی گفتگو کے دوران استاریا اندر سے اٹھ کے ان کے پاس آ کے ایک ستون کی آڑ میں کھڑی ہو گئی تھی۔

بابا نے استاریا کو ستون کی آڑ میں کھڑے دیکھا تو محبت سے آواز دی۔

"استاریا بیٹی ادھر آؤ۔"

استاریا ستون سے ہٹ کے باپ کے پاس آ گئی۔ بیٹھنے سے پہلے اس نے مسٹر ہیڈلے کو ادب سے سلام کیا۔ انہوں نے استاریا کو دعا دی۔

بابا نے تعارف کرایا۔ "ان سے ملو بیٹی۔ یہ تمہاری ہم نام ہیں۔ اور یہ ہیں مسٹر ہیڈلے۔ ان کے والد۔ یہ بتاتے ہیں۔۔۔۔۔"

"آپ ٹھہرئیے بھائی صاحب۔" مسٹر ہیڈلے نے قطع کلامی کی۔ "میں اس کی تفصیل بتاتا ہوں۔ دو تین ماہ پہلے مارکوئیس کونزیڈ سے ایک محفل میں میری ملاقات ہوئی۔ یہ اتفاقیہ ملاقات نہ تھی بلکہ اس کا اہتمام میری بیٹی نے خود کیا۔ آپ تو جانتے ہی ہیں جوان بیٹی کا باپ کس قدر پریشان ہوتا ہے۔ دو سال پہلے میری بیوی نے اس دنیا سے منہ موڑ لیا اور باپ کے ساتھ ساتھ ماں کی ذمے داریاں بھی مجھ پر آپڑیں۔

جب میری بیٹی نے مارکوئیس کونزیڈ کو مجھ سے ملایا تو اسے دیکھ کر اور اس کی اعلیٰ درجے کی گفتگو سن کر میری آنکھیں چمک اٹھیں۔ جب مجھے یہ معلوم ہوا کہ مارکوئیس کونزیڈ اب تک غیر شادی شدہ ہے اور میری بیٹی میں دلچسپی بھی لے رہا تو میری مسرت کا کوئی ٹھکانہ نہ رہا۔

مارکوئیس کونزیڈ سے پہلی ملاقات کے بعد جب میں گھر واپس آیا تو خوشی سے میرے پیر زمین پر نہ پڑتے تھے پھر گریٹا بھی رات گئے واپس آگئی۔۔۔"

"گریٹا۔ یہ گریٹا کون ہے مسٹر ہیڈلے۔" بابا نے پریشان ہو کے پوچھا۔

"یہ۔۔۔ یہی تو ہے گریٹا۔" مسٹر ہیڈلے نے اپنی بیٹی کی طرف اشارہ کیا۔ "میری بیٹی کا اصل نام گریٹا۔ استاریا کا نام تو اس کو مارکوئیس کونزیڈ کے کہنے سے دیا تھا۔"

"اس نے یہ نام رکھنے کو کیوں کہا تھا؟" بابا نے دلچسپی سے پوچھا۔

"مارکوئیس کونزیڈ نے کہا تھا کہ استاریا اس کی پہلی محبت تھی جس کا ایک حادثہ میں انتقال ہو گیا تھا۔" مسٹر ہیڈلے نے بتایا۔ "یہ کہنے کے بعد مارکوئیس کونزیڈ نے مجھ سے درخواست کی تھی کہ میں اسے گریٹا کے بجائے استاریا کے نام سے پکار سکوں۔ میں نے اسے اس شرط پر اجازت دی کہ گریٹا کو کوئی اعتراض نہ ہو۔ گریٹا نے اسے اجازت دیدی تب سے مارکوئیس نے گریٹا کو استاریا کہنا شروع کیا۔"

اصلی استاریا اپنی جگہ سے اٹھ کے گریٹا کے پاس آئی۔ دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا پھر وہ ہاتھ پھیلا کے اس طرح ایک دوسرے سے لپٹ گئیں جیسے مدت سے بچھڑے دوست ملتے ہیں۔

"انکل ہیڈلے۔" استاریا، گریٹا سے الگ ہو گئی۔ "آپ کو اختیار ہے کہ آپ گریٹا کو گریٹا کے نام سے پکاریئے یا استاریا کے فرضی نام سے۔ یوں نام کے بدل جانے سے تقدیر تو نہیں بدلا کرتی۔ ہم دونوں کی تقدیریں بھی یکساں ہیں۔ مارکوئیس کونزیڈ نے ہم دونوں ہی کو دھوکا دیا ہے۔"

گریٹا نے باپ سے کہا۔ "میرے پیارے باپ۔ اب میں آپ کو کبھی پریشان نہیں کروں گی اگر کسی وقت بہت پریشانی ہوئی تو اصلی استاریا سے ملنے چلی آیا کروں گی۔"

استاریا جواب دینا چاہتی تھی کہ اس کا باپ بول پڑا۔ "مسٹر ہیڈلے اور بیٹی گریٹا۔ میں نے جہاں تک معلومات حاصل کی ہیں ان سے صرف یہ معلوم ہو سکا ہے کہ مارکوئیس کونزیڈ اپنے چودہ (جہازوں کی تعداد میں اختلاف ہے) جہازوں کے ساتھ رومی شہنشاہ اسحاق کے دربار میں حاضری کے لئے قسطنطنیہ گیا ہے۔ اس سے آگے کچھ نہ معلوم ہو سکا۔ ممکن ہے کہ شہنشاہ قسطنطنیہ سے ملاقات کے بعد اٹلی واپس آجائے یا پھر کروسیڈ (صلیبی جنگ) میں حصہ لینے کے لئے فلسطین چلا جائے۔"

گریٹا چیخ پڑی۔ "قسطنطنیہ جائے یا فلسطین میرے لیے تو وہ مر چکا ہے اب اگر وہ واپس بھی آیا تو میں اسے منہ نہ لگاؤں گی۔ وہ میری پیاری سہیلی استاریا کا جائز اور قانونی شوہر ہے۔ میں اپنی سہیلی کے حق پر ڈاکا ڈالنے کا تصور بھی نہیں کر سکتی۔"

استاریا نے گریٹا کو اپنی طرف کھینچ کے اس کا منہ چوم لیا۔ "گریٹا۔ میں خداوند یسوع مسیح کی قسم کھا کر کہتی ہوں کہ اگر مارکوئیس کونزیڈ اطالیہ واپس آگیا تو میں چرچ

میں اس کے خلاف مقدمہ دائر کروں گی کہ اس نے مجھے شادی سے پہلے بھی دھوکا دیا اور بعد میں بھی۔"

اس موقع پر اسٹاریا کے باپ نے اسے ٹوکا۔ "کیا کہہ رہی ہو بیٹی! ہم مارکوئیس کوزیڈ کے خلاف چرچ میں مقدمہ نہیں کر سکتے؟"

"کیوں نہیں کر سکتے بابا۔" اسٹاریا بڑے جوش سے بولی۔ "میں لارڈ پادری کے سامنے اس بات کا اعتراف کر لوں گی کہ اس کے گناہ میں، میں بھی شریک تھی لیکن سسلی جا کے شادی کرنے کا فیصلہ مارکوئیس کوزیڈ کا تھا اور وہی مجھے اور آپ کو ورغلا کے سسلی لے گیا تھا۔"

مسز ہیڈلے نے کان کھڑے کئے۔ "کیا مارکوئیس اور اسٹاریا کی شادی سسلی میں ہوئی تھی۔؟"

"جی ہاں سسلی میں ہوئی تھی اور اس میں بھی مارکوئیس کوزیڈ کی ایک چال تھی۔" اسٹاریا کے بابا نے جل کے کہا۔ "مگر اب ان باتوں کو کریدنے سے کیا فائدہ۔ مارکوئیس ہماری دسترس سے بہت دور ہو چکا ہے۔

گریٹا کے دل میں ایک چبھن سی تھی وہ چاہتی تھی اسٹاریا یا اس کا باپ اس بات کی وضاحت کرے کہ مارکوئیس کوزیڈ اور اسٹاریا کی شادی مانسٹریٹ کے بجائے سسلی جا کر کیوں کی گئی۔ اسٹاریا کے باپ نے محسوس کر لیا کہ اسٹاریا اور مارکوئیس کوزیڈ کی شادی کے بارے میں آنے والے باپ بیٹی کے دل میں کچھ شکوک و شبہات ہیں اس لئے انہوں نے خود ہی یہ بات صاف کر دی۔

مسز ہیڈلے۔ اس وقت ہم اور آپ دونوں ایک ہی کشتی میں سوار ہیں۔ اس لئے میں آپ کے دل میں اٹھتے ہوئے شبہات کو دور کر دینا بہتر سمجھتا ہوں۔ دراصل جب مارکوئیس کوزیڈ کا ہمارے گھر آنا جانا ہوا اور اس نے اسٹاریا سے تعلقات بڑھانا شروع کئے تو میں نے اسٹاریا کو بتایا کہ وہ اپنے تعلقات کو ایک حد کے اندر رکھے ورنہ اسے نقصان پہنچ سکتا ہے۔ میں اپنی بیٹی کا باپ ہونے کے علاوہ دوست بھی ہوں اور میری بیٹی ہر اچھی بری بات مجھ سے نہایت بے تکلفی سے کہہ دیتی ہے۔

"میرے اس بروقت اعتراض پر اسٹاریا نے مجھے بتایا کہ وہ تعلقات کی حد عبور کر چکی ہے۔ مارکوئیس کوزیڈ کا دل صاف ہے اور وہ اس سے شادی کرنے کی درخواست کرنے والا ہے۔ اس وقت میں نے اسٹاریا کو بتایا کہ اس کی شادی مارکوئیس سے فی الحال نہیں ہو سکتی کہ اس کی عمر چرچ کے قانون کے مطابق ابھی شادی کے قابل نہیں۔ میرے اس جواب پر اسٹاریا چپ ہو گئی۔ اس نے مارکوئیس کوزیڈ سے ملنا بھی چھوڑ دیا اور ہر گھڑی اداس رہنے لگی۔

"اسٹاریا میری اکلوتی اولاد ہے۔ مجھے اس سے بہت زیادہ محبت ہے اس کی افسردگی سے میں بھی افسردہ ہو گیا۔ میں خود چاہتا تھا کہ اسٹاریا اور مارکوئیس کی شادی ہو جائے مگر میں مجبور تھا۔ چرچ کا قانون تو شہنشاہ بھی نہیں توڑ سکتا تھا پھر بھلا میں کیا کر سکتا تھا۔ پھر بھی میں نے ہمت نہیں ہاری اور اس کوشش میں لگ گیا کہ کسی طرح دونوں کی شادی ہو جائے۔

"مصیبت کے وقت لوگ یار دوستوں کی طرف بھاگتے ہیں۔ ایک ریٹائرڈ کرنل میرے دوست تھے میں اسٹاریا کو ان کے پاس لے گیا تھا۔ انہوں نے اسٹاریا کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ مجھے تسلی دی اور کہا کہ مجھے، اسٹاریا اور مارکوئیس کو ان کے ساتھ سسلی چلنا ہو گا کیونکہ یہ کام وہیں ہو سکے گا۔

"مختصر یہ کہ ہم سب سسلی پہنچے۔ میرے دوست نے وہاں کے چرچ کے لارڈ پادری سے گفتگو کی۔ وہ میرے دوست کے بچپن کا ساتھی تھا۔ اس طرح اس کی مدد سے اسٹاریا اور مارکوئیس کی شادی ہوئی وہاں سے واپسی پر مارکوئیس مشکل سے ایک ماہ ٹھیک رہا اس کے بعد اس نے رنگ بدلنا شروع کیا۔ وہ میرے پاس ہی ٹھہرا ہوا تھا مگر رات کو اکثر غائب رہنے لگا۔ میاں بیوی میں اس بات پر کئی بار اختلاف ہوا۔ باپ ہونے کی حیثیت سے میں ہمیشہ اسٹاریا کو ڈانٹتا اور سمجھاتا رہتا۔

"مگر مارکوئیس کے دل میں تو چور تھا۔ اس لئے وہ

ایک دن کچھ کہے سنے بغیر چپکے سے رخصت ہو گیا۔ اس کے دوستوں نے یہی بتایا کہ وہ کروسیڈ میں حصہ لینے فلسطین گیا ہے لیکن اس کے ایک دوست نے جو کسی وجہ سے اس سے خفا ہو گیا تھا اس نے مجھے صاف بتایا کہ مارکوئیس کونزیڈ نے شہنشاہ قسطنطنیہ سے خط و کتابت کی تھی اور اب وہ شہنشاہ کے بلانے پر قسطنطنیہ گیا ہے۔"

مسٹر ہیڈلے اور گرسٹا رخصت ہو گئے۔ وہ دونوں افسردہ آئے تھے اور افسردہ ہی واپس گئے۔ ان کی افسردگی میں تو کوئی کمی نہ ہوئی مگر انہیں ایک ہمدرد گھرانہ مل گیا۔ گرسٹا اور استاریا میں خوب دوستی ہو گئی۔

---------o---------

کونزیڈ کے ساتھ ایک چھوٹا سا بحری بیڑہ تھا جس پر جہازوں کے عملے کے علاوہ بارہ سو جنگجو اور مہم جو جوان سوار تھے۔ یہ خبر سچ تھی کہ مارکوئیس اور شہنشاہ قسطنطنیہ کے درمیان خط و کتابت ہوئی تھی۔ چونکہ اٹلی اور قسطنطنیہ کے الگ الگ دو شہنشاہ تھے اس لئے مارکوئیس اور قسطنطنیہ کی خط و کتابت بہت خفیہ ہوتی تھی اور دونوں طرف کے خطوط اس کے خاص قاصد لاتے اور لے جاتے تھے۔

سلطنت روما کے دو شہنشاہ تھے۔ ایک شہنشاہ سلطنت روما شرقی، دوسرا شہنشاہ سلطنت روما غربی کہلاتا تھا۔ شرقی شہنشاہ کو بازنطینی شہنشاہ کے نام سے بھی پکارا جاتا تھا اسی طرح مغربی شہنشاہ کو شہنشاہ رومۃ الکبریٰ بھی کہا جاتا تھا۔ اس کی تفصیل کچھ اس طرح ہے کہ سلطنت روما جس کا دارالسلطنت اٹلی کا شہر روم تھا وہ یورپ کی سب سے بڑی اور طاقتور حکومت تھی۔ پس روم کا شہنشاہ، مطلق العنان ہی نہیں تھا بلکہ اس نے خدا کے اختیارات بھی سنبھال رکھے تھے۔ شہنشاہ کو خدا کے اوتار کا نام دے کر اس کے اختیارات لامحدود کر دیئے گئے تھے۔

مارکوئیس کونزیڈ نے بازنطینی شہنشاہ کو اپنے جنگی کوائف لکھتے ہوئے تحریر کیا تھا کہ اس نے اپنی زندگی کروسیڈ (صلیبی جنگ) کے لئے وقف کر دیا ہے۔ اس کے علاوہ اس نے اب تک شادی نہیں کی ہے اور اس نے فیصلہ کیا کہ اگر اسے کروسیڈ میں کامیابی حاصل ہوئی اور اس کی کوششوں سے یروشلم مسلمانوں سے آزاد ہو گیا تو وہ وہاں سے کامیاب واپسی پر مانسٹرپٹ جانے کے بجائے قسطنطنیہ میں مستقل طور پر مقیم ہو گا۔ بشرطیکہ شہنشاہ نے اسے قسطنطنیہ میں رہائش کا پروانہ عطا کیا۔

مارکوئیس کونزیڈ نے اپنی ذاتی قابلیت جنگی اور بحری اہلیت کی بنا پر کئی جنگوں میں حصہ لیا تھا اور شہرت بھی اس قدر حاصل کی تھی کہ جب مارکوئیس کونزیڈ کا پہلا خط اس کے سامنے پیش کیا گیا تو اس نے شہرت کی بنا پر مارکوئیس کونزیڈ کو پہچان لیا۔ اس کی بدقسمتی اور مارکوئیس کونزیڈ کی خوش قسمتی کہ شہنشاہ اسحاق کے ایک جوان بہن جو شہزادی اسحاقیہ کے نام سے جانی جاتی تھی، قسطنطنیہ میں کنواری بیٹھی ہوئی تھی شہزادی کی عمر پچیس سال کے قریب تھی اور اسے اب تک کوئی رشتہ نہ ملا تھا۔

شہنشاہ اسحاق کو جب مارکوئیس کونزیڈ کا پہلا خط ملا جس میں اس نے اشارتاً اپنے کنوارے ہونے کا ذکر کیا تھا تو وہ خط شہنشاہ نے اپنی بہن کو قصداً پڑھنے کے لئے دیدیا۔ شہزادی کی ایک سہیلی کچھ عرصہ اٹلی میں رہ چکی تھی۔ اس نے شہزادی اسحاقیہ کے سامنے مارکوئیس کونزیڈ کی حیرت انگیز شخصیت اور دلچسپ باتوں کا کچھ اس انداز سے تذکرہ کیا تھا کہ شہزادی اس پر ان دیکھے عاشق ہو گئی تھی۔

اب اس کے بھائی شہنشاہ نے اسے مارکوئیس کونزیڈ کا اچانک خط دیا اور اس نے آخر میں مارکوئیس کونزیڈ کا نام پڑھا تو وہ مارکوئیس کے تصور میں ایسی کھوئی کہ صبح سے دوپہر تک ایک ہی جگہ بیٹھی رہی۔ مارکوئیس کونزیڈ نے اس خط میں سوائے قسطنطنیہ آنے کے اور کوئی بات نہ لکھی تھی لیکن شہزادی اسحاقیہ کے تصور میں مارکوئیس کونزیڈ کی خیالی تصویر گردش کرنے لگی۔

مارکوئیس کونزیڈ نے قسطنطنیہ آنے کی تاریخ کا کوئی ذکر نہ کیا تھا۔ لیکن شہزادی اسحاقیہ اس کے آمد کا اس طرح انتظار کر رہی تھی جیسے مارکوئیس نے اسے اپنے

آنے کی اطلاع دی ہو۔ وہ روزانہ شہنشاہ سے ایک دو بار مارکوئیس کی آمد کے بارے میں ضرور سوال کرتی تھی۔

مارکوئیس کونزیڈ میں بہن کی اتنی دلچسپی محسوس کر کے شہنشاہ بہت خوش تھا۔ وہ شہزادی اسحاقیہ کی طرف سے بہت پریشان رہتا تھا۔ شہزادی کی عمر بڑھتی جارہی تھی اور اس کے لئے کوئی رشتہ نہ مل رہا تھا۔ یہ نہیں کہ شہزادی خوبصورت نہ تھی۔ وہ نہایت حسین و جمیل دوشیزہ تھی۔ بڑی بڑی نرگسی آنکھیں، گول چہرہ شہابی رنگت، دراز قامت اور متناسب بدن۔ شہزادی اسحاقیہ کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی وہ شہنشاہ قسطنطنیہ کی چھوٹی بہن تھی۔ اس کی یہی خوبی اسے دوسری لڑکیوں سے ممتاز کرتی تھی۔

پندرہ سولہ سال کی عمر میں شہزادی اسحاقیہ کے کئی رشتے آئے۔ اس میں کچھ رشتے معقول اور شاہی معیار پر پورے بھی اترتے تھے۔ لیکن اس وقت شہزادی چھوٹی بچی تصور کی جاتی تھی۔ وہ بچکانہ کھیل کھیلتی اور بچکانہ ضد کرتی تھی۔ شہنشاہ نے یہ کہہ کر رشتوں سے انکار کر دیا کہ ابھی شہزادی بہت کمسن ہے اور یہ اس کے کھیل کود کے دن ہیں اور کئی سال اسی ٹال مٹول میں گزر گئے۔ پھر جو رشتے آئے وہ شہزادی اسحاقیہ نے خود ناپسند کر دیئے۔ وہ لاڈ و پیار میں بہت ضدی اور خودسر ہو گئی تھی اس لئے اس کی نظر میں کوئی لڑکا جچتا ہی نہ تھا۔ اب جو اطالیہ سے مارکوئیس کونزیڈ کا خط آیا تو جیسے شہزادی کے خزاں رسیدہ گلستان میں اچانک بہار آگئی اور اسکے افسردہ چہرے پر رونق آگئی۔

پھر دوسرا خط قاصد لے کر آیا۔ اس میں مارکوئیس کونزیڈ نے شہنشاہ کو اطلاع دی تھی کہ وہ اطالیہ کے ساحل سے روانہ ہو چکا ہے اور کسی وقت بھی قسطنطنیہ پہنچ سکتا ہے۔ شہزادی اسحاقیہ نے یہ خط پڑھا تو وہ جھوم اٹھی

شہنشاہ اسحاق نے شہزادی اسحاقیہ کو شام کے وقت اپنے کمرہ خاص میں طلب کیا۔

"شہزادی تم نے مارکوئیس کونزیڈ کا خط پڑھ لیا۔؟" شہنشاہ اسحاق نے مسکراتے ہوئے دریافت کیا۔

"جی شہنشاہ بھائی۔ خط پڑھ لیا میں نے۔

"کب آرہے ہیں شہزادے کونزیڈ؟"

"شہزادی۔ مارکوئیس کونزیڈ شہزادے نہیں بلکہ امیر البحر ہیں۔ چودہ پندرہ بحری جہازوں کے افسر اعلیٰ۔" شہنشاہ نے وضاحت کی۔

"مجھیں جانتی ہوں شہنشاہ بھائی۔" شہزادی نے اٹھلا کے کہا۔ "ہمارے مارکوئیس کونزیڈ شہزادوں سے کسی طرح کم ہیں کیا! میں تو انہیں شہزادوں سے زیادہ اہم سمجھتی ہوں۔"

"بے شک۔ بے شک۔" شہنشاہ نے تعریف کے انداز میں کہا۔ "مارکوئیس کانزیڈ بہت خوبیوں کا مالک جوان ہے۔ میں نے بہت لوگوں سے اس کی تعریف سنی ہے۔"

شہنشاہ نے انتظار کیا کہ شاید شہزادی کچھ کہے گی لیکن وہ خاموش بیٹھی رہی۔

شہنشاہ نے شہزادی کو کریدا۔ "کیوں شہزادی مارکوئیس کونزیڈ کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے۔؟"

"یوں تو مجھے وہ پسند ہیں مگر فیصلہ تو میں دیکھ ہی کے کروں گی۔" شہزادی اسحاقیہ نے سر جھکا کے کہا۔

"خوبصورت ہے۔ شجاع ہے۔ مشہو ہے۔ کم عمر ہے۔ غیر شادی شدہ ہے۔ اب دیکھنے کی کونسی بات رہ جاتی ہے۔" شہنشاہ نے شہزادی کو مجبور کر دیا۔

میں انہیں پسند کرتی ہوں لیکن ان کی پسند بھی تو معلوم کرنا ہوگی۔" شہزادی نے جواب دیا۔

شہنشاہ نے بڑے تکبر سے کہا۔ مارکوئیس کونزیڈ کے لئے یہ کیا کم اعزاز ہوگا کہ اس کے گھر ایک شہنشاہ کی بہن ہوگی۔"

"بے شک شہنشاہ بھائی آپ نے درست فرمایا۔"

شہنشاہ نے اس وقت زیادہ گفتگو مناسب نہ سمجھی۔ شہنشاہ اگر چاہتا تو اپنے کسی امیر یا وزیر سے شہزادی کی شادی بڑی آسانی سے کر دیتا لیکن شہنشاہ کسی شہزادے کی نسبت کا انتظار کرتا رہا پھر یہ ہوا کہ کئی شہزادوں کے رشتے آئے لیکن ان میں سے بعض کو شہنشاہ نے نامنظور کیا اور جنہیں

شہنشاہ نے پسند کیا وہ شہزادی اسماقیہ کی نظروں میں نہ سما سکے اور انہیں ناکام ہونا پڑا۔

پھر شہزادوں کے رشتے آنا بند ہو گئے۔ امیروں، وزیروں نے اس لئے رشتہ نہ بھیجا کہ وہ شہزادی کی اعلیٰ دماغی یا بدمزاجی سے واقف تھے۔ شہنشاہ اور شہزادی نے مارکوئیس کو زیڈ سے اس لئے امید وابستہ کر لی تھی کہ وہ اگرچہ شہزادہ نہ تھا لیکن اس نے اپنی شجاعت اور بیدار مغزی سے اس جوانی میں کئی اہم بحری معرکے جیتے تھے اور شہزادوں سے کہیں زیادہ عزت اور شہرت حاصل کی تھی۔ اس لئے انہوں نے اپنے طور پر مارکوئیس کو زیڈ کو شہزادوں کا درجہ عطا کر دیا تھا۔

شہنشاہ کو مارکوئیس کو زیڈ اور شہزادی اسماقیہ کی شادی کا اس قدر یقین ہو گیا تھا کہ اس نے مارکوئیس کو زیڈ کے قسطنطنیہ میں قیام و طعام کے ذمے داری شہزادی کے سپرد کر دی تھی۔ شہزادی کو مارکوئیس کی مہمان نوازی کی ذمے داری ملی تو اس نے فوراً ہی شاہانہ قسم کی تیاریاں شروع کر دیں۔ یورپ کے بڑے بڑے بادشاہ اور والیان ریاست سیر و تفریح کے لئے قسطنطنیہ آیا ہی کرتے تھے شہزادی کو نئے نئے لوگوں سے ملنے کا شوق تھا اس لئے وہ مہمان نوازی کے کاموں میں دلچسپی لیتی تھی اور انتظامات کے سلسلہ میں ہر جگہ موجود رہتی تھی۔ اب تو اسے خود ہی میزبان کا درجہ دیدیا گیا تھا۔ چنانچہ شہزادی اسماقیہ نے فوراً انتظامات شروع کر دیئے۔

شہزادی کو سب سے بڑی فکر تھی کہ مارکوئیس کو زیڈ کہیں اچانک ساحل پر نہ پہنچ جائے۔ شہزادی دراصل مارکوئیس کا ساحل سمندر پر شاہانہ استقبال کرنا چاہتی تھی۔ شہزادی نے دو تیز رفتار کشتیاں دور سمندر میں بھجوادیں۔ ان کشتیوں کی ذمہ داری تھی کہ وہ مارکوئیس کو زیڈ کے بیڑے کی تصدیق کرتے ہی فوراً شہزادی کو مطلع کر دیں تاکہ شہزادی ساحل سمندر پر پہنچ کر مارکوئیس کو زیڈ کو خوش آمدید کہہ سکے۔

شہنشاہ اپنی بہن کی خاطر مارکوئیس کو زیڈ کے استقبال کیلئے خود بھی ساحل سمندر پر جانے کے لئے آمادہ تھا مگر شہزادی نے اسے روک دیا تھا شاہی خاندان اور امرائے سلطنت کو جب معلوم ہوا کہ شہنشاہ قسطنطنیہ ایک معمولی بحری بیڑے کے امیر البحر کے استقبال کے لئے ساحل پر جانے کا ارادہ رکھتا ہے تو وہ لوگ فوراً شہزادی اسماقیہ کے پاس پہنچ گئے۔

"شہزادی عالیہ، ہمیں معلوم ہوا ہے کہ شہنشاہ عالی مقام کسی امیر البحر کے استقبال کے لئے، بندرگاہ پر تشریف لے جانے کا ارادہ رکھتے ہیں۔؟" ایک امیرزادے نے شہزادی سے قدرے تلخ لہجے میں سوال کیا۔

شہزادی کو اس کا انداز ناگوار گزرا۔ اس نے بھی اسی سختی سے جواب دیا۔ "معزز امرائے سلطنت۔ مجھے خوشی ہے کہ آپ میرے انتظامات دیکھنے کے لئے یہاں تشریف لائے۔ جہاں تک شہنشاہ کے استقبال کے لئے ساحل پر آنے کا سوال ہے اس کے لئے میں افسوس کے ساتھ آپ کو مطلع

عادت

ڈاکٹر صاحب ایک مریض کو دیکھتے ہی بولے "آپ کو تو عینک کی بہت عرصے سے ضرورت ہے لیکن آپ آج نظر ٹیسٹ کرانے آئے ہیں۔"

"کمال ہے!" مریض نے حیران ہوتے ہوئے کہا "آپ کو یہ بات میرا معائنہ کرنے سے پہلے ہی معلوم ہو گئی۔ آپ یقیناً بے پناہ تجربہ کار ہیں۔"

"تجربے کی تو اس میں کوئی خاص بات نہیں۔ ورنہ، آپ بورڈ پڑھ لیتے۔ میں تو ماہر امراض نسواں ہوں" ڈاکٹر صاحب نے جواب دیا۔

اگر تم لوگوں کے جنازے میں شرکت نہیں کرو گے تو وہ تمہارے جنازے میں شرکت نہیں کریں گے۔
(ایک افریقی کہاوت)

کرتی ہوں کہ نہ تو میں شہنشاہ کی افسر بکار خاص ہوں کہ اس قسم کی اطلاعات آپ کو فراہم کر سکوں اور نہ مجھ میں یہ ہمت ہے کہ میں شہنشاہ کے کہیں آنے جانے پر پابندی لگا سکوں۔"

وفد بنا کے آنے والے امرا اور ان کے عزیز و اقارب اپنا سا منہ لے کے رہ گئے امرا اور شاہی خاندان کے افراد کا یہ وفد چپ چاپ واپس چلا گیا۔

شہزادی حرم سرا شاہی پر پہنچی تو اسے بتایا گیا کہ شہنشاہ دوپہر کے کھانے کے بعد آرام فرما رہے ہیں شہزادی کو اپنی نادانی پر افسوس ہوا۔ دوپہر کے کھانے کے بعد وہ خود بھی آرام کرتی تھی۔ اسے یہ پہلے ہی سوچ لینا چاہئے تھا کہ یہ وقت شہنشاہ کے آرام کا ہے۔ شہزادی واپس جانے کے بجائے برابر کے کمرے میں بیٹھ گئی اور غلام کو کھانا لگانے کا حکم دیا۔ کھانے کا وقت اگرچہ گزر چکا تھا لیکن ناظم مطبخ شہزادی سے انکار نہ کر سکتا تھا۔ اس نے فسٹول میں انتظام کیا اور خود شہزادی کو اطلاع دینے پہنچا۔

"شہزادی عالیہ۔ کھانا لگ چکا ہے۔ آپ تشریف لے چلئے۔"

شہزادی، ناظم کو تحسین آمیز نظروں سے دیکھتے ہوئے کھڑی ہو گئی۔

"شاید تم نے ہماری بھوک کا اندازہ کر لیا ورنہ اتنی جلدی کھانا تیار نہیں ہو سکتا تھا۔" اور شہزادی ناظم کے پیچھے کھانے کے کمرے کی طرف چل پڑی۔

ناظم نے چلتے ہوئے کہا۔ "شہزادی عالیہ۔ شاہی محلات کے ملازم خاص کر شاہی خوابگاہ اور شاہی مطبخ کے داروغہ صرف حکم سنتے ہیں اور اس پر عمل کرنے دوڑ پڑتے ہیں۔ ان کی مجال نہیں کہ تعمیل حکم میں لیت و لعل کریں یا بہانے تراشیں۔ یہ تو دن کا وقت ہے اگر شاہی مطبخ سے نصف شب کے بعد کھانا طلب کیا جائے تو صرف چند لمحوں میں تیار کر کے پہنچا دیا جائے گا۔"

کھانے کے بعد شہزادی نے وہیں ایک کمرے میں تھوڑی دیر آرام کیا۔ اسے امیروں پر سخت غصہ آ رہا تھا۔ اس لئے اسے پوری طرح نیند بھی نہ آسکی۔ مگر یہ اس کی خوش قسمتی تھی کہ شہزادی کے ساتھ ہی شہنشاہ بھی بیدار ہو گیا۔

"شہنشاہ معظم، شہزادی عالیہ کو یاد فرما رہے ہیں۔" ایک کنیز نے حاضر ہو کر شہزادی کو اطلاع دی۔

شہزادی نے حیرت بھری نظروں سے کنیز کو دیکھا۔ "شہنشاہ بھائی کو کیسے معلوم ہوا کہ ہم ان سے ملنے آئے ہیں۔؟"

کنیز نے ادب سے جواب دیا۔ "شہنشاہ کا حکم ہے ان کے صبح کو بیدار ہونے پر یا دوپہر کے سونے کے بعد ان کے اٹھنے پر انہیں پہلے یہ بتایا جائے ان کے محو خواب ہونے کے دوران کون کون اشخاص ان سے ملاقات کے لئے آئے تھے۔ چنانچہ شہنشاہ نے فوراً طلب کر لیا۔"

کنیز کے اس جواب سے شہزادی کا آدھا غصہ ٹھنڈا ہو گیا۔ اسے شہنشاہ روم شرقی کی بیدار مغزی اور دور اندیشی سے بڑی مسرت ہوئی۔ شہزادی نے بھائی کو سلام کیا تو اس نے شکوہ کیا۔

"شہزادی تم آئی تھیں تو ہمیں بیدار کر لیا ہوتا۔ انتظار کرنے کی کیا ضرورت تھی۔؟"

"شہنشاہ بھائی۔" شہزادی نے بات بنائی۔ "کوئی ایسی خاص بات نہ تھی کہ میں آپ کو نیند سے بیدار کرتی۔ بس یونہی آگئی تھی۔"

پھر کچھ دیر شہزادی اور شہنشاہ مارکوئیس کو زینڈ کے بارے میں ذاتی طور سے گفتگو کرتے رہے۔ شہزادی کا جی چاہا وہ ساحل پر آنے والے امیروں کو بے نقاب کر کے انہیں سزا دلانے کی کوشش کرے مگر پھر یہ سوچ کے اس نے اپنا ارادہ بدل دیا کہ ایسے خوشی کے موقعہ پر کوئی ناخوشگوار واقعہ نہیں ہونا چاہیے۔

--------o--------

قسطنطنیہ کا خوبصورت شہر بحر اسود کے کنارے شاخ زریں پر آباد ہے۔ شاخ زریں خشکی کی وہ تکونی پٹی جو سمندر میں دور تک چلی گئی ہے اس کے تین اطراف میں سمندر

اور ایک جانب خشکی ہے۔ اسی لئے قسطنطنیہ جو ایک نہایت مضبوط قلعہ کی پناہ میں تھا اسے ناقابل تسخیر سمجھا جاتا تھا کیونکہ اس پر حملہ کرنے کے لئے بحری جہازوں کی ضرورت تھی لیکن جس بحری راستے سے بیرونی جہاز بحر اسود میں آسکتے تھے اسے بازنطینی (شہنشاہ روم مشرقی) جہازوں نے گھیر رکھا تھا۔ باہر سے آنے والے تمام جہازوں کو بحر اسود سے گزرنا پڑتا تھا اور جب تک کوئی جہاز بحر اسود میں داخلے کا پروانہ حاصل نہ کر لیتا اس کا داخل ہونا ناممکن تھا۔ بحر اسود میں داخل ہونے کا راستہ ایک تنگ درّے سے گزرتا تھا جسے درہ دانیال کہا جاتا ہے۔

ایک شام شہزادی اسحاقیہ استقبالی انتظامات دیکھ کے آرہی تھی۔ وہ ابھی اپنی چار گھوڑوں کی بگھی میں آکے بیٹھی ہی تھی کہ ایک غلام بھاگتا ہوا بگھی کے پاس پہنچا۔ شہزادی کا دل زور سے اچھلا۔

"کیا بات ہے تم پریشان کیوں ہو؟"۔ شہزادی نے نرمی سے دریافت کیا۔

"شہزادی عالیہ۔" اس نے تیز تیز سانسوں کے درمیان کہا۔ وہ۔ بحری بیڑا آگیا جس کا انتظار تھا۔"

"آگیا۔ کہاں ہے وہ۔؟" شہزادی اچھل کے بگھی سے اتر پڑی۔

"جی وہ ابھی سمندر میں ہے۔ ایک کشتی یہ خبر لے کر ساحل پر آئی ہے۔"

شہزادی واپس ساحل پر آگئی۔ وہاں وہ قاصد موجود تھا جو بحری بیڑے کی خبر لایا تھا اس نے شہزادی کو بتایا کہ بحری جنگی جہازوں کا ایک بیڑا دور سمندر میں ٹھہرا ہوا ہے۔ اس نے اپنے دو ملاح ساحل کی طرف بھیجے تھے کہ وہ ساحلی دفتر سے بحری بیڑے کے آنے کی اجازت لے کر آئیں۔ ہم نے انہیں روک کے تحقیقات کی تو معلوم ہوا بیڑے کے امیر البحر کا نام مارکوئیس ہے اور انہوں نے ہمارے شہنشاہ کو خط بھی بھیجے تھے۔

"ہاں ہاں وہی ہیں۔" شہزادی خوش ہو گئی۔

شہزادی نے اسی وقت استقبال کا انتظام کرنے والوں کو وہیں طلب کر لیا۔

اور انہیں جلدی جلدی ہدایات دے کر کام میں لگا دیا۔ پھر ایک آدمی کو بادشاہ کی طرف اور دوسرے کو وزیر اعظم کی طرف روانہ کیا تاکہ وزیر اعظم استقبال میں شریک ہونے والے امراء اور وزراء کو لے کر ساحل پر پہنچ جائیں۔

شہزادی اس کام سے فارغ ہوئی تھی کہ اسے مطلع کیا گیا کہ بحری بیڑے کا ایک جونیئر افسر آیا ہے۔ اور وہ ساحل پر کسی ذمے دار آدمی سے بات کرنا چاہتا ہے۔

شہزادی نے اس افسر کو ایک آدمی بھیج کے وہیں بلوایا۔

شہزادی کے نام پر وہ چونکا۔ "یہ شہزادی کون ہیں۔ اور مجھے کیوں بلوا رہی ہیں۔"

"شہزادی قسطنطنیہ ہمارے شہنشاہ کی بہن ہیں۔"

"اچھا تو شہنشاہ کی بہن ہیں؟" بحری افسر نے خود کلامی کے انداز میں کہا۔

یہ کہہ کے بحری افسر واپس ساحل کی طرف چلنے لگا

"شہزادی سے ملاقات نہیں کیجئے گا۔" غلام نے بڑی ہی عاجزی سے کہا۔

"نہیں بھائی۔ اب شہزادی سے ملاقات کی ضرورت نہیں۔" بحری افسر کے چہرے پر اب بھی مسکراہٹ تھی۔

"کیوں ملاقات کی ضرورت کیوں نہیں۔" غلام گھبرا گیا۔

"تم شہزادی سے کہہ دینا کہ شہنشاہ کے مہمان دو گھنٹے بعد ساحل پر پہنچ جائیں گے۔"

اور غلام تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا واپس ہو گیا۔

ٹھیک دو گھنٹے بعد مارکوئیس کا بحری بیڑا ساحل سے لگ گیا۔ سورج غروب ہو چکا تھا۔ مگر ساحل پر مشعلوں کی اس قدر تیز روشنی تھی کہ دن کا گماں ہوتا تھا۔ شہزادی نے پچھلے دو گھنٹوں میں مشرقی سلطنت روما کے تمام مقتدر لوگوں کو مارکوئیس کو زیڈ کے استقبال کے لئے ساحل سمندر پر بلا لیا تھا۔ شہزادی اسحاقیہ وزیر اعظم کے ساتھ استقبال کے

لئے سب سے آگے کھڑی تھی۔

شہزادی اسماقیہ کو اسے پہچاننے میں کوئی دقت نہ ہوئی۔ مارکوئیس کونزیڈ کے چہرے کی ہلکی سی مسکراہٹ اور ناپ ناپ کے قدم رکھنے کا انداز پکار پکار کے کہہ رہا تھا کہ وہ اس بحری بیڑے کا امیر البحر ہے اس کے سینے پر لطالا (اٹلی) کا بحری نشان بھی جگمگا رہا تھا۔

عمر رسیدہ وزیر اعظم نے آگے بڑھ کے مارکوئیس سے مصافحہ کیا اور شہزادی سے تعارف کرایا۔

"آپ ہیں شہزادی اسماقیہ۔ شاہی خاندان کی سب سے عظیم اور محترم خاتون۔"

مارکوئیس کونزیڈ کا دل شہزادی کو دیکھتے ہی مچل گیا تھا۔ اس نے جذبات انگیز لہجے میں کہا۔ "خوش قسمت ہوں کہ مجھے قسطنطنیہ میں سب سے پہلے شہزادی سے ملاقات کا شرف حاصل ہوا۔"

شہزادی، مارکوئیس کونزیڈ کی وجاہت اور مہذب انداز سے مرعوب ہو گئی تھی۔ اس نے کچھ بولنے کی کوشش کی مگر زبان ساتھ نہ دے سکی۔

شہزادی اسماقیہ، مارکوئیس کونزیڈ سے کچھ اس درجہ مرعوب ہوئی کہ اسے بالکل چپ لگ گئی۔ بندرگاہ پر تمام بڑے بڑے امراء اور وزراء اور عمائدین سلطنت مارکوئیس سے ملاقات کے لئے آئے تھے۔ مارکوئیس کونزیڈ ان سے بڑے اخلاق اور مہذب طریقہ سے ملا اور ہنس ہنس کے گفتگو کرتا رہا مگر اس تمام عرصے میں شہزادی بالکل خاموش رہی۔

استقبال کی رسومات ختم ہو گئیں۔ وزیر اعظم نے سب کو باری باری رخصت کر دیا اب جو اس نے نظریں گھما کر شہزادی اسماقیہ کو دیکھا تو وہ مارکوئیس کونزیڈ کے ساتھ کھڑی دکھائی دی۔ تجربہ کار وزیر اعظم کے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ پیدا ہوئی پھر وہ آہستہ آہستہ وہاں سے چلا گیا۔

شہزادی اسماقیہ اور مارکوئیس کونزیڈ باتوں میں ایسے مشغول ہوئے کہ انہیں یہ بھی خبر نہ ہوئی کہ عمائدین سلطنت کب واپس گئے؟ اور وزیر اعظم ان پر مسکراتا ہوا وہاں سے کس وقت رخصت ہوا؟ ان کی باتیں ختم ہونے کا نام ہی نہ لیتی تھیں۔ آخر ان دلچسپ باتوں میں ساحل کا شاہی منتظم حائل ہوا۔ اسے شہزادی نے کچھ فرائض سونپ دیئے تھے۔ اس وقت وہ ان فرائض کی ادائیگی کے بعد شہزادی کو اس کی اطلاع دینے حاضر ہوا تھا۔

"شہزادی عالیہ! معافی چاہتا ہوں۔ مخل انداز ہونے کی گستاخی پر۔"

شہزادی نے پلٹ کے دیکھا۔ "کہو کیا بات ہے۔؟"

"شہزادی عالیہ! مہمان رخصت ہو چکے ہیں۔ کھانے کا وقت ہو رہا ہے۔" منتظم نے تفصیل بتائی۔

"ہمارے معزز مہمان مارکوئیس کونزیڈ کے ساتھی کہاں ہیں۔" شہزادی نے سوال کیا۔ "انہیں کوئی تکلیف نہ ہو۔"

"تکلیف کیسے ہوگی شہزادی عالیہ، مارکوئیس کونزیڈ آپ کے مہمان ہیں۔ میں نے آپ کے محل کے برابر والے محل میں معزز مہمان کے قیام کا انتظام کرایا ہے۔" ناظم نے جواب دیا۔

"اور مارکوئیس کے بحری لشکر کے لئے کہاں انتظام کیا ہے؟" شہزادی نے دریافت کیا۔

"لشکریوں کے لئے محل کے پاس باغ اور محل کے باہر مشرقی میدان میں خیمے لگوا دیئے گئے۔" ناظم نے فخر سے کہا۔

"ٹھیک ہے۔ اب تم جا سکتے ہو۔" شہزادی نے ناظم کو رخصت کرنا چاہا۔

"بہتر ہے شہزادی عالیہ۔" ناظم نے کہا۔ "لیکن میں تو آپ کو لینے آیا ہوں۔"

"کیوں۔ کیا ضرورت پڑ گئی ہماری؟" شہزادی مسکرائی۔

"میں آپ کو مطلع کرنے آیا ہوں کہ کھانا تیار ہو چکا ہے۔" ناظم نے بتایا۔ "آپ محل میں کھانا تناول فرمائیں گی یا یہیں انتظام کیا جائے؟"

شہزادی نے مارکوئیس کی طرف دیکھا۔ کیا خیال ہے مارکوئیس کونزیڈ۔ کھانا سمندر کے کنارے کھایا جائے یا محل چلیں؟"

"میں کیا کہہ سکتا ہوں اس سلسلہ میں میں تو شہزادی قسطنطنیہ کے حکم کا تابع ہوں۔"

شہزادی نے ناظم سے کہا۔ "ہم محل جا رہے ہیں۔ وہیں کھانا کھائیں گے۔"

ناظم نے جانے سے پہلے پھر سر جھکا کر کہا۔ "شہنشاہ معظم نے خواہش کی ہے کہ مہمانوں کے کھانے سے فارغ ہونے کے بعد شہزادی عالیہ، شہنشاہ معظم سے ملاقات فرمائیں۔"

"اچھا۔ یہ حکم ہے۔" شہزادی گھبرا گئی۔ "شہنشاہ نے کوئی اور بھی حکم دیا ہے؟"

"غلام کو اس کے علاوہ کسی اور بات کی خبر نہیں۔" ناظم نے اپنی مجبوری کا اظہار کیا۔ "مجھے صرف اتنا ہی بتایا گیا تھا۔"

شہزادی اسماقیہ کو مارکوئیس کونریڈ اس قدر پسند آیا تھا کہ وہ اس سے ایک لمحہ جدا نہیں ہونا چاہتی تھی۔ چنانچہ وہ مارکوئیس کونریڈ کو اپنی ہی بگھی میں بٹھا کے محل میں لائی۔

کھانے کے بعد شہزادی اور مارکوئیس کی گفتگو کا سلسلہ پھر طویل ہو گیا مگر شہنشاہ کا بلاوا آ گیا۔ شہزادی، شہنشاہ کے سامنے پہنچی تو مسرت سے اس کا چہرہ کھلا ہوا تھا۔ شہنشاہ اسے مسرور دیکھ کر بہت خوش ہوا۔

"کہو شہزادی۔ تم نے مارکوئیس کونریڈ کو کیسا پایا۔؟" شہنشاہ نے اسے دیکھتے ہی پوچھا۔

"شہنشاہ بھائی۔ میں مارکوئیس کی کیا تعریف کروں۔ وہ تو حیرت انگیز انسان ہے۔ نہایت مہذب ہے انتہا خوش مزاج ہوشیار، تجربہ کار، اعلیٰ نسب اور خوبصورت"

"بس بس۔ زیادہ تعریف کی ضرورت نہیں۔" شہنشاہ نے اس کی بات کاٹ دی۔ "اس کا مطلب یہ ہے کہ مارکوئیس تمہارے معیار پر پورا اترا۔ پھر کیا خیال ہے۔ شہزادی نے کہا؟"

"کس بارے میں شہنشاہ بھائی؟" شہزادی نے خود کو

قرض خواہ

ملک کے ایک بہت بڑے سرمایہ دار نے اپنے ایک دوست سے کہا "دیکھو عزیز بھائی! کبھی چھوٹا موٹا قرض مت لو ورنہ قرض خواہ تمہیں ادائیگی کے لئے مسلسل پریشان کریں گے۔ اگر ترقی کرنا ہے تو بھاری قرض حاصل کرو مثلاً ایک کروڑ، دس کروڑ، پچاس کروڑ پھر قرض خواہ تمہاری سلامتی، صحت اور خیریت کے لئے ہر وقت دعاگو رہیں گے اور اگر کبھی کسی قرض خواہ کا صبر جواب دے جائے تو فوراً امراض قلب کے کلینک میں داخل ہو جاؤ۔ قرض خواہ پھر تمہاری سلامتی کے لئے نہ صرف یہ کہ خود دعا کرے گا بلکہ اس کے بال بچے، جملہ اہل خاندان اور اس کی کمپنی کے تمام ملازمین دن کی روشنی اور رات کی تاریکی میں بھی دعائیں کریں گے اور ضرورت پڑنے پر تمہیں مزید قرض دینے کے لئے تیار رہیں گے۔

سنبھالتے ہوئے کہا۔

"یہی کہ تمہیں اور مارکوئیس کو ہمیشہ کے لئے ایک کر دیا جائے۔" شہنشاہ نے بات بالکل صاف کر دی۔

شہزادی نے حیا سے گردن جھکالی۔

"دیکھو شہزادی۔" شہنشاہ نے سمجھانے کے انداز میں کہا۔ "خوش بختی صرف ایک بار دروازے پر دستک دیتی ہے۔ اگر تمہاری مرضی ہو اور تم اس کی طرف سے مطمئن ہو تو ہم اس سے کل ملاقات کے دوران اس کا عندیہ معلوم کریں۔"

"مگر شہنشاہ بھائی۔" شہزادی نے دبی آواز میں کہا۔ "مارکوئیس کونریڈ کا ارادہ کروسیڈ میں حصہ لینے یروشلم جانے کا ہے۔ شاید وہ ابھی کسی اور بات پر آمادہ نہ ہو۔ آپ بات کیجئے تو بہت سنبھل کے اور سوچ کے۔"

سوچا سمجھا کیا تھا۔ دوسرے دن شہنشاہ نے دربار خاص میں مارکوئیس کونریڈ کو بازیابی کا شرف بخشا اور قسطنطنیہ آنے پر اپنی خوشنودی کا اظہار کیا۔ اس دن شہنشاہ

نے دربار جلدی ختم کر دیا پھر تنہائی میں، مارکوئیس سے گفتگو شروع کی۔

شہنشاہ نے مارکوئیس سے سپاٹ لہجے میں دریافت کیا۔ "مارکوئیس کونریڈ، قسطنطنیہ سے آگے کدھر جانے کا ارادہ ہے۔؟"

"عالیجاہ! غلام نے آپ کو خط سے مطلع کیا تھا کہ قسطنطنیہ سے میں فلسطین جاؤں گا اور کروسیڈ میں حصہ لوں گا۔"

مارکوئیس کونریڈ نے جان بوجھ کے آدھی بات کی مگر شہنشاہ نے اس سے فوراً فائدہ اٹھایا۔

"مارکوئیس۔ ہمیں جہاں تک یاد پڑتا ہے تم نے اپنے خط میں کچھ اور بھی لکھا تھا؟"

مارکوئیس انجان بن گیا۔ "غلام کو اور کچھ یاد نہیں پڑ رہا۔" پھر اس نے اپنے ماتھے کو انگلیوں سے اس طرح دبایا جیسے کچھ یاد کرنے کی کوشش کر رہا ہو۔

"یاد کرو مارکوئیس۔" شہنشاہ نے اسے یاد دلایا" تم نے قسطنطنیہ میں مستقل رہائش کا خیال ظاہر کیا تھا۔"

شہنشاہ درست فرما رہے ہیں۔ مارکوئیس نے فوراً جواب دیا۔ "مجھے یاد آ گیا۔ میں نے جو فیصلہ کیا تھا اس پر اب بھی قائم ہوں۔"

"ہم بھی یہی چاہتے ہیں مارکوئیس۔" شہنشاہ نے گمبھیر لہجے میں کہا۔

"ہمارا خیال ہے کہ شہزادی نے تمہیں پسند کر لیا ہے اور شاید تم نے بھی۔ ہمارا خیال ٹھیک ہے نا مارکوئیس؟"۔

"شہنشاہ معظم! شہزادی عالیہ میں اس قدر خوبیاں ہیں جس کے بیان سے میری زبان قاصر ہے۔" مارکوئیس کونریڈ نے ٹھہر ٹھہر کے کہنا شروع کیا۔

"وہ شخص واقعی دنیا کا سب سے زیادہ خوش قسمت انسان ہو گا جسے شہزادی عالیہ اپنا شریک سفر منتخب فرمائیں گی۔"

"ہم خوش ہوئے کہ تم نے بات صاف کر دی۔" شہنشاہ بولا۔ "ہم بہت جلد تم دونوں کو مذہبی اور قانونی رشتہ میں منسلک کر دیں گے۔"

"شہنشاہ کے حکم سے سرتابی کا میں تصور بھی نہیں کر سکتا۔" چالاک مارکوئیس نے کہا "میں تو شہنشاہ سے یہ درخواست بھی کرنا چاہتا ہوں کہ شہنشاہ روم بذات خود اپنے لشکر کے ساتھ اس مذہبی جنگ میں اسی طرح حصہ لیں جس طرح دوسرے بادشاہ شریک ہو رہے ہیں۔"

"اچھا! کیا یورپ کا کوئی بادشاہ بھی کروسیڈ میں حصہ لینے کا ارادہ رکھتا ہے۔؟" شہنشاہ قسطنطنیہ نے دلچسپی سے پوچھا۔

"جی ہاں عالیجاہ!" مارکوئیس کونریڈ نے جواب دیا۔ "انگلستان کے شاہ رچرڈ۔ فرانس کے شاہ آگسٹس۔۔۔۔ اور جرمن ۔کے قیصر باربروصہ نے کروسیڈ (صلیبی جنگ) میں شرکت کی رضامندی ظاہر کر دی ہے۔ میری درخواست ہے کہ شہنشاہ بھی اس مقدس جنگ میں حصہ لے کر خداوند یسوع مسیح کی جائے پیدائش کو مسلمانوں سے پاک کریں۔"

"مارکوئیس کونریڈ۔ تم ہماری طرف سے کروسیڈ میں حصہ لینے تو جا رہے ہو، اب ہمارے جانے کی کیا ضرورت ہے؟" شہنشاہ بڑی خوبصورتی سے ٹال گیا۔

شہنشاہ قسطنطنیہ نے سفید جھوٹ بولا تھا۔ کچھ ہی دن پہلے شہنشاہ نے سلطان صلاح الدین ایوبی کو اپنے خاص غلام کے ذریعہ ایک خط بھیجا تھا جس میں شہنشاہ نے سلطان کے لئے نیک خواہشات کا اظہار کیا تھا اور ان سے دوستی کی زبردست خواہش کی تھی یہ وہ وقت تھا کہ سلطان صلاح الدین ایوبی کے ہاتھوں فلسطین کی تمام نصرانی طاقتیں شکست کھا چکی تھیں اور معرکہ حطین میں یروشلم (بیت المقدس) کا فیصلہ ہو گیا تھا۔

سلطان صلاح الدین نے شہنشاہ کے اس رابطے کو درخور اعتنانہ سمجھا اور شہنشاہ کو جواب تک نہ دیا تھا۔ شاہوں، شہنشاہوں، خصوصاً نصرانی بادشاہوں اور شہنشاہوں کی پرفریب خط و کتابت سے صلاح الدین واقف تھے۔ وہ اچھی طرح جانتا تھا۔ کہ نصرانی بادشاہ صرف اپنے مفاد میں اپنی مرضی سے جنگ کرتے ہیں اور جہاں اپنا مفاد نہیں دیکھتے

ھرے منہ پھیر لیتے ہیں۔

شہنشاہ نے مارکوئیس کو فلسطین جانے سے باز رکھنے بہت کوشش کی مگر مارکوئیس بلا کا ذہین اور شاطر تھا۔ ے قسطنطنیہ میں اپنا مستقبل روشن نہیں دکھائی دیتا تھا رکوئیس کونزیڈ کو باوجود تمام کمزوریوں کے ایک پر عزم ان کہا جاسکتا ہے۔ اسے فلسطین میں بہت کچھ دکھائی دے تھا۔ اس لئے وہ شہزادی اسحاقیہ کی صحبت سے دو ہی تتوں میں اکتا گیا اور وہ قسطنطنیہ سے نکل بھاگنے کی فکر نے لگا۔

شہزادی اسحاقیہ کو جس دن شبہ ہوا کہ مارکوئیس نزیڈ کے رویے میں پہلی سی گرم جوشی نہیں، اس نے ی دن شہنشاہ سے گفتگو کی اور دوسرے دن شہزادی اور رکوئیس کی بڑے شاندار طریقے سے شادی ہو گئی۔ رکوئیس کونزیڈ کو مجبوراً یہ شادی کرنا پڑی کیونکہ شہنشاہ نے اس کے بھاگنے کے تمام راستے بند کر دیئے تھے اور اس کے بحری بیڑے کی پوری ناکہ بندی کر دی گئی تھی۔

مارکوئیس کونزیڈ کی روانگی کے وقت شہنشاہ اسحاق رمانروائے سلطنت روم شرقی، بہ نفس نفیس ساحل سمندر پر وجود تھا۔ مارکوئیس کونزیڈ کو شہنشاہ نے گلے لگایا شہزادی حاقیہ روتے روتے بے دم ہو گئی۔ شاید اس کے دل کے سی کونے سے آواز آرہی تھی۔

"مار ُواپس نہیں آئے گا۔"

ذہین اور عیار مارکوئیس کونزیڈ سب سے خوشی وشی رخصت ہو کے اپنے جہاز پر سوار ہوا۔ وہ عرشے پر کھڑا س وقت تک اپنا رومال ہلاتا رہا جب تک اسے ساحل نظر آتا رہا یہ بھی اس کی مکاری تھی کیونکہ وہ جانتا تھا کہ ابھی وہ شہنشاہ کی حدود میں ہے۔ پھر جب اس کا بحری بیڑا درہ انیال کو عبور کر گیا تو اس نے اطمینان کا سانس لیا۔

مارکوئیس کونزیڈ نے ایک شادی اطالیہ میں کی اور سے دھوکا دے کر قسطنطنیہ بھاگ آیا اب وہ قسطنطنیہ کی شہزادی کو محبت کا فریب دے کر فلسطین جا رہا تھا۔ مارکوئیس اس وقت صور کے ساحل پر اترا جب تمام بڑے بڑے والیان ریاست صور کو بے سہارا چھوڑ گئے تھے۔

مارکوئیس واقعی صور کے بے سہاروں کا سہارا بن گیا۔

ہم ایک بار پھر عکہ کی طرف چلتے ہیں جسے نصرانیوں نے گھیر رکھا ہے۔ فلسطین، شام اور بیرون ملک سے بحری راستے سے نصرانیوں کو برابر کمک پہنچ رہی ہے۔ جرمنی کا فریڈرک ڈیوک آف سوبیا تقریباً ایک ہزار کی جمعیت کے ساتھ عکہ پہنچ گیا ہے۔ یہ کمک اگرچہ ناکافی ہے لیکن شہنشاہ جرمن بار بروسہ کے بیٹے کی موجودگی نے محاصرہ کرنے والے نصرانیوں کے حوصلے بڑھا دیئے ہیں۔

سلطان صلاح الدین کے ہراول دستے العیادیہ میں تعینات تھے جن کی مدد کو موصل کے سپاہی موجود تھے لیکن انہیں تل قیسان سے آگے بڑھ جانے کا حکم مل چکا ہے۔ نووارد جرمن فرمانروا فریڈرک نے کھلے میدان میں مسلمان ہراول دستوں سے دو دو ہاتھ کرنے کی کوشش کی لیکن ہراول دستوں نے انہیں آسانی سے مار بھگایا۔ اس کے بعد انہوں نے بجائے جنگ کے عکہ کا محاصرہ سخت کرنے میں اپنی تمام توانائیاں صرف کرنا شروع کر دیں۔

یورپ سے مزید کمک پہنچ گئی۔ ایک انگریزی جنگی بیڑا آ پہنچا۔ ستمبر کے مہینے میں بالڈون، آرچ بشپ آف کینٹربری، ہربرٹ والٹر، بشپ آف سیلزبری اور جسٹیسر رانلف دی گرینول، سپاہ، سامان اور روپیہ لے کر صور پہنچ گئے پھر اعلان ہوا کہ شاہان فرانس اور انگلستان ارض مقدس آ رہے ہیں۔

شکم سیر

ایک سردار جی پہلی بار دہلی گئے۔ وہاں بازار میں ایک پان کی دکان پر بڑے سلیقے اور نفاست سے سجائے گئے پان نظر آئے تو جا کر دس بارہ پان کھا ڈالے۔ اگلے روز پھر ادھر سے گزرے تو پنواڑی نے موٹی اسامی سمجھ کر انہیں آواز دی "سردار جی! کل سے آج زیادہ عمدہ پان ہیں۔ کرارے ہیں، مزہ آجائے گا۔"

سردار جی وہیں سے بولے "نہیں بھائیا! آج میں روٹی کھا کر چلا ہوں۔"

عکہ کے محاصرے کو دو سال گزر چکے تھے۔

یہ محاصرہ بھی عجیب قسم کا تھا۔ چار ساڑھے چار ہزار مسلمان عکہ کے قلعہ میں موجود تھے۔ پچھلے دو سال میں اُن پر کیا کیا قیامتیں نہ گزریں۔ ان مسلمانوں کو شام اور فلسطین کے مشترکہ نصرانی لشکروں نے گھیر رکھا تھا اور پھر ان گھیرنے والے نصرانیوں کے چاروں طرف سلطان صلاح الدین ایوبی اپنا لشکر لئے موجود تھا۔

یورپ کے تمام مؤرخین نے اپنا پورا زورِ قلم سلطان دمشق صلاح الدین ایوبی کو ایک نااہل جنرل ثابت کرنے پر صرف کیا ہے۔ اسٹینلے لین پول، ہیرلڈ لیم اور ایسبروز کو یہ غم کھائے جاتا ہے کہ سلطان نے صور پر پوری طاقت سے حملہ کر کے اُس کا خاتمہ کیوں نہیں کیا۔ اُن کی سمجھ میں یہ بات بھی نہیں آئی کہ جب صور کے حکمران مارکوئیس کونریڈ نے سابق شاہِ یروشلم سگائی کو صور میں داخل نہ ہونے دیا اور وہ خانماں برباد پورے شکست خوردہ نصرانی لشکر کے ساتھ عکہ کی طرف چلا تو سلطان نے اُسے عکہ پہنچنے سے پہلے ختم کیوں نہیں کر دیا۔

یہ دوسرے سال کے موسمِ خزاں کی دوسری بارش کا واقعہ ہے۔ اس بارش نے بھی دونوں لشکریوں کی زندگی اجیرن کر دی تھی۔ اس طوفان کے ہنگام میں مصر سے غلہ لے کے آنے والے جہازوں کی آمد نے لشکریوں میں دوسرا ہنگامہ کھڑا کر دیا۔ مسلمانوں اور عیسائیوں دونوں لشکروں میں غلہ بردار جہازوں پر قبضہ کے لئے ایک خون ریز جنگ چھڑ گئی۔ اُدھر طوفانی ہواؤں نے جہازوں کو دھکیل کر عکہ کے ساحل پر پہنچا دیا۔

شہر کی فصیل کئی جگہ سے شکستہ ہو کے گر گئی تھی۔ محصور مسلمان فصیل کی مرمت میں جان لگائے ہوئے تھے۔ عیسائی تیغ زن مسلمانوں پر برابر حملے کر رہے تھے مگر مسلمان پھر بھی مرمت اور تعمیر میں انہماک سے معروف تھے۔

یہ سچ ہے کہ تندرست گھوڑوں کو ذبح کر کے لشکری بڑی بے صبری سے کھا جاتے تھے۔ جب کہیں ایک گھوڑا ذبح ہوتا تو وہاں میلہ سا لگ جاتا۔ مذبوح گھوڑے کی قیمت زندہ گھوڑے سے زیادہ لگتی تھی۔ لشکریوں نے یہ تو عقلمندی کی تھی کہ سبزیوں کی کاشت شروع کر دی تھی ورنہ اور زیادہ مشکل ہو جاتی۔

ایسبروز لکھتا ہے کہ اس بارش سے ایک خطرناک وبا پھیل گئی۔ جب کئی دن تک مسلسل بارش ہوتی گئی تو پورا لشکر تر ابور ہو گیا تو ہر ایک کو کھانسی ہو گئی۔ سب کے گلے بیٹھ گئے۔ سر اور ہاتھ پاؤں سوج گئے۔ ایک دن میں ایک

ہزاروں آدمی مر گئے۔ ورم سے لوگوں کے دانت گر گئے۔

خدا ترس لوگ، خستہ حال لوگوں کی مدد کر رہے تھے۔ کاؤنٹ ہنری اور بشپ آف سالسبری نے بڑی فراخدلی سے لوگوں کی اعانت کی پھر طوفانی ہوا میں جہازوں پر آنے والا غلّہ مانسٹریٹ کے مارکوئیس کونریڈ کے ہاتھ لگ گیا۔ اس نے سامان رسد کو صور پہنچا دیا اور اپنے تصرف میں لے آیا اور دوسرے لشکریوں کو ایک دانہ نہ دیا۔ کسی کو نہیں معلوم تھا کہ اب کیا ہو گا۔ وہ ایک دوسرے سے آنکھیں چراتے تھے۔

قحط اور بدحالی کے باوجود محاصرین نے محاصرے میں کوئی کمی نہ واقع ہونے دی پھر انسی کریسنٹ کے دنوں میں غلّے کا ایک جہاز ساحل سے دور نمودار ہوا۔ لوگ خوشی سے پاگل ہوئے جاتے تھے۔ اطالوی تاجر جنہوں نے غلّہ مہنگا کر رکھا تھا ان کے چہرے اتر گئے۔ غلّہ کی قیمت میں ناقابل یقین کمی ہو گئی۔ لوگوں نے ان تاجروں کے نقصان پر خوب تالیاں بجائیں۔ دوسرے دن کئی اور جہاز غلّہ لے کر آ گئے۔

اپریل ۱۱۹۱ء میں چھ عظیم الشان جہاز لشکر لے کر عکّہ پہنچ گئے۔ ان جہازوں پر شاہ فرانس فلپ آگسٹس ثانی کے پرچم لہرا رہے تھے۔ ایک جہاز پر شاہ فرانس کا ذاتی نشان لہرا رہا تھا۔ شاہ فرانس کے ساتھ کئی دلیر اور تجربہ کار کاؤنٹ بھی آئے تھے۔ ان میں کاؤنٹ آف فلینڈرز بھی شامل تھا۔ شاہ فرانس بڑے طویل سفر کے بعد پہنچا تھا۔ مغربی یورپ کے تمام نصرانی نائٹ ایک ایک کر کے عکّہ کے ریتیلے ساحل پر اکٹھے ہوتے جا رہے تھے۔

جب جہاز ساحل پر لنگر انداز ہو گئے اور فوجیں ساحل پر اتر گئیں تو شاہ فرانس فلپ آگسٹس ثانی کا سفید باز محافظ کے ہاتھوں سے جھٹ کے اڑ گیا۔ باز نے چھاؤنی کے کئی چکر لگائے پھر عکّہ کی فصیل پر بیٹھ گیا۔ عکّہ کے محصور مسلمان یہ منظر دلچسپی سے دیکھ رہے تھے۔ باز فصیل پر بیٹھا تو مسلمانوں نے اسے پکڑ لیا۔ عیسائیوں نے اس واقعہ کو بدشگونی پر محمول کیا۔

شاہ فرانس نے اپنا خادم سلطان کے حضور میں بھیجا۔ خادم نے سلطان سے عرض کیا کہ شاہ فرانس کا باز عکّہ کی فصیل پر پکڑا گیا ہے۔ شاہ کو باز واپس کر دیا جائے وہ اس کی قیمت ادا کرنے پر تیار ہیں۔ مسلمانوں کا سلطان یہ بات سن کر مسکرایا اور اس نے شاہ کو جواب بھجوایا کہ باز یوں واپس نہیں ہو گا بلکہ طاقت سے حاصل کرنا ہو گا۔

چنانچہ شاہ فرانس نے اپنے لشکر کو بھی عکّہ کے مقابلے اور محاصرے میں لگا دیا۔ یہ لوگ پوری طاقت سے شکستہ قلعہ پر حملہ کرتے۔ ان کا زیادہ زور فصیل کی شکستہ دیواروں پر ہوتا لیکن مسلمان حملہ روکنے کے ساتھ ساتھ زور زور سے طبل جنگ بجاتے۔ طبل جنگ کی آواز جیسے ہی سلطان کے کانوں میں پہنچتی تو وہ فوراً اپنے سواروں کو عیسائیوں کے بیرونی حصہ پر حملے کا حکم دیتا اس طرح عیسائیوں کا زور عکّہ کی طرف کم ہو جاتا۔

"جون کے مہینے میں عیسائیوں کو ایک خوشخبری اور نصیب ہوئی۔ پچیس جہاز اور کئی جنگی بجرے ساحل سمندر پر نمودار ہوئے۔ عکّہ کا محاصرہ کرنے والے عیسائیوں کی خیمہ بستیوں میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ لوگوں نے کام کاج چھوڑ دیا۔ نائٹ، سردار اور سپاہی ناچتے کودتے ساحل کی طرف بھاگے۔ باجوں تاشوں سے فضا گونج اٹھی۔ ہر طرف مسرت کا ہنگامہ برپا ہو گیا۔ لوگوں نے سب سے آگے آنے والے جہاز کو خوش آمدید کہا۔ اس سرخ جہاز پر انگلستان کا جھنڈا لہرا رہا تھا۔

اس بات کا خیال رہے کہ عکّہ کے باہر عیسائیوں کی خیمہ بستی بن گئی۔ کہنے کو تو یہ خیمہ بستی تھی لیکن اس میں انسانی ضرورت کی ہر چیز موجود تھی۔ بڑے بڑے بازار، چوڑے چوڑے راستے، خیموں کے محلات۔ جن کے اندر داخل ہونے پر یوں محسوس ہوتا تھا جیسے سچ مچ کے محل میں چل پھر رہے ہوں۔ وہی قالینوں کا فرش۔ وہی چوکی پہرے کا انتظام۔ بادشاہ اپنے محل نما خیمے سے برآمد ہو کر دربار لگاتا۔ درباری اکٹھے ہوتے۔

بازاروں میں بھری پڑی دکانیں، غلّہ، سبزی،

گوشت۔ کیا چیز تھی جو وہاں نہ ملتی تھی۔ یہ بازار عیسائیوں کے خیمہ بستیوں میں بھی تھے اور مسلمانوں کی خیمہ بستیوں میں بھی ایسے ہی بازار لگتے تھے۔ دونوں جگہ کے بازار میں فرق دو چیزوں کا نمایاں ہوتا تھا۔ نصرانی بازاروں میں شراب کی بوتلیں اور خنزیر (سور) کا گوشت کھلے عام فروخت ہوتا جب کہ مسلمانوں کے بازار ان حرام اشیا سے پاک ہوتے تھے۔

ایک یورپی مورخ نے شاہِ انگلستان کی تعریف میں ایک مسلمان مورخ بہاءالدین کے مندرجہ ذیل جملے نقل کئے ہیں۔

"وہ بلا کا طاقتور تھا۔ نہایت دلیر اور اولوالعزم۔ اُس نے بڑے بڑے معرکے سر کئے تھے۔ جنگ میں اُس کی شجاعت مسلم تھی"۔

بہاءالدین کے یہ جملے سیاق و سباق سے الگ کر کے لکھے گئے ہیں۔ یہ ٹھیک ہے کہ رچرڈ نے انگلستان میں کئی جنگیں لڑی تھیں لیکن وہ جنگیں محدود قسم کی تھیں۔ اُس نے ایسی لڑائیوں میں شجاعت کا مظاہرہ کیا تھا لیکن رچرڈ تیسری صلیبی جنگ میں شروع سے آخر تک کوئی کارنامہ انجام نہیں دے سکا۔ رچرڈ کے متعلق یہی کہا جا سکتا ہے کہ جو گرجتے ہیں وہ برستے نہیں۔ رچرڈ کی بہت شہرت تھی اور اُس کے عکہ پہنچنے پر نصرانیوں نے خوب بغلیں بجائیں مگر رچرڈ مسلمانوں کے خلاف بہادری کا ایک کارنامہ بھی انجام نہیں دے سکا۔

رچرڈ یقیناً ایک بہادر جوان تھا مگر انتہائی خودسر۔ مغلوب الغضب۔ بڑی حد تک ظالم اور عیش و عشرت تو اُس کی گھٹی میں پڑا ہوا تھا۔ رچرڈ کو شیر دل کہا جاتا ہے مگر تاریخی حالات اور واقعات اس کی نفی کرتے ہیں۔ یورپی مورخ ہیرلڈ لیم نے رچرڈ کے جو کوائف پیش کئے ہیں اُن کا ذکر یہاں پر اس لئے ضروری ہے تاکہ انہیں تاریخی میزان میں تولا جائے۔

ہیرلڈ لیم، شاہِ انگلستان رچرڈ کے بارے میں لکھتا ہے۔

"رچرڈ چوبیس سال کا بھرپور جوان تھا۔ وہ شا رعب اور جلال کا پیکر تھا۔ اُسے اپنی قوت پر ناز تھا۔ وہ ک کمزوری کو برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ وہ طبیعت کا فیا تھا۔ رچرڈ کو بربط بجانے کا بھی شوق تھا۔ وہ ہر کھیل میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتا اور جنگ میں سرداری کے فرائض کرتا"۔

وہ انگلستان سے روانہ ہو کے سسلی (صقلیہ) پہنچا ایک سال تک وہاں مقیم رہا۔ صقلیہ میں وہ اپنی بہن حقوق کے لئے غاصب ٹینکرڈ کے خلاف نبرد آزما رہا۔ اُس جبراً ٹینکرڈ کے خزانہ پر قبضہ کر لیا پھر اُسے کئی بیش قیم تحائف بھی پیش کئے۔ آخر کار وہ صقلیہ سے روانہ ہوا۔ راستے میں اُس کے بیڑے کو طوفان نے گھیر لیا۔ اُس منتشر جہاز بمشکل جزیرہ قبرص پہنچے۔ وہاں بازنطینی حک کی بدسلوکی کا شکار ہو گئے۔ رچرڈ کو سخت غصہ آیا۔ وہ پایا پانی کو پار کر کے ساحل پر پہنچا اور جزیرے کو تاخت و تارا کر دیا۔ اُس نے بازنطینی شہزادے کو نقرئی زنجیر میں اسیر لیا اور اُس کی نوجوان بیٹی کو بطور یرغمال رکھ لیا۔

رچرڈ نے قبرص ہی میں وہاں کے بڑے گرجا میں اپنی منگیتر بیرنگریا آف نوارے سے بڑے تزک و احتش کے ساتھ شادی رچائی پھر اُس نے فلسطین کی راہ لی۔

صلیبی جنگوں کے دوسرے مورخ اسٹینلے لین پول نے شاہِ انگلستان رچرڈ کے انگلستان سے فلسطین تک۔۔۔ کو صرف چار سطروں میں لکھ کر رچرڈ کی راستے کی تمام کاریوں پر پردہ ڈال دیا ہے۔ لین پول کی لکھی ہوئی چا سطریں درج ذیل کی جاتی ہیں جو اس بات کا کھلا ثبوت ہیں کہ یورپی مورخوں نے اپنے جرنلوں اور بادشاہوں کی سوا تعریف کرنے کے اُن کے عیوب پر تبصرہ کرنے سے گر کیا ہے۔ وہ لکھتا ہے۔

"رچرڈ شاہِ انگلستان اور فلپ شاہ فرانس ارضِ مقدس پہنچنے والے تھے۔ وہ دونوں ۱۱۹۰ء کے موسم بہار میں روا ہوئے تھے لیکن اُن کی رفتار اس قدر سست تھی جیسے وہ تفر سیر و تفریح کے لئے نکلے ہوں۔ مسینا (سسلی کا ایک شہر) ک

سفر کرنے، جزیرہ قبرص کو فتح کرنے اور برنگیریا سے شادی رچانے میں شاہ رچرڈ کو کافی دیر لگی اور اس عرصہ میں اُس نے عکّہ کے لشکر کو قریب قریب تباہ کروا دیا۔ قبرص میں ماہ عسل گزار کر فاقہ زدہ کیمپ کو بچا لینا ایک ایسا کارنامہ تھا جس کی تاریخ میں مثال نہیں ملتی۔"

ملین پول کا یہ مختصر بیان تاریخی بددیانتی کی ایک مکروہ مثال ہے۔ رچرڈ نے شاہ قبرص کو گرفتار کر کے اُس کی کم سن بیٹی شہزادی سوسن کو جس طرح یرغمال بنایا اُس کا تذکرہ نہ کر کے مؤرخ نے تاریخی حقائق سے کھلی ہوئی چشم پوشی کی ہے۔

آیئے اب ہم رچرڈ کو تاریخ کی روشنی میں دیکھتے اور اُس کے کردار کو تیسری صلیبی جنگ کے حوالے سے مختصراً بیان کرتے ہیں۔

شاہ انگلستان رچرڈ اوّل جس کا دور ۱۱۸۹ء تا ۱۱۹۹ء رہا۔ جسے مغربی مؤرخین اور فسانہ طراز مطربوں (اسیروز جو شاہی گویا تھا) نے شیر دل کے لقب سے نوازا، تیسری صلیبی جنگ کا ہیرو بنایا اور غازی سلطان صلاح الدین ایوبی کا مدمقابل قرار دیا۔ اینجو خاندان کے پہلے شاہ انگلستان ہنری دوم (۱۱۵۴ء تا ۱۱۸۹ء) کا بیٹا تھا جس نے اپنے ظلم و جور اور تند خوئی سے کلیسا کے اقتدار کو سخت ٹھیس پہنچائی۔ جاگیرداری نظام پر کاری ضربیں لگائیں اور پھر شاہی اقتدار کو بحال کرنے کی کامیاب کوشش کی۔ ہنری دوم کی بیوی ایلینار (ایلینور) آف گائن ایک خود سر اور مغرور حسینہ اور شنشاہ لوئی آف فرانس کی مطلقہ تھی۔

رچرڈ اسی ایلینار کا بیٹا تھا۔ خود سر، لاابالی اور حلون مزاج۔ جس نے اپنی جوانی کے ایام فرانس کی غیر منظم جنگوں، جاگیرداروں کی جھڑپوں اور ذلیل لڑائیوں میں گزارے یا فرانس کے مطربوں سے بدمعہ گوئی کے مقابلوں میں شعر کہتے ہوئے بسر کئے۔ یہ بانکا سجیلا جوان، یورپ کے ایسے رومان پرور دور کی پیداوار تھا جس کی نوجوان نسل عشق و محبت کی دیوانی، دو بدو لڑائی اور شخصی جھگڑوں میں بے خطر کود پڑنے اور نام حاصل کرنے کی از خود جستجو کیا کرتے تھے۔ یہی اُن کی ہمت، جرأت، بہادری اور شجاعت کا رومان پرور معیار تھا۔ دوسرے الفاظ میں شجاعت اور بہادری کا اظہار کسی اعلیٰ مقصد کے لئے کم اور کسی حسینہ کو متاثر کرنے، اُسے اپنے دام میں لانے، کسی محبوبہ کے جذبات کو برانگیختہ کرنے یا ذاتی شہرت اور ناموری کے لئے زیادہ ہوتا تھا۔

یہ محض اتفاق تھا کہ صلیبی جنگوں کا آغاز اُس دور میں ہوا جو رچرڈ کی بھرپور جوانی کا تھا۔ رچرڈ کے سر میں ایامِ شہزادگی ہی سے صلیبی جنگوں میں حصہ لینے کا سودا سمایا ہوا تھا اور دل میں برنگیریا کی محبت کی دیوانگی تھی۔ ایسے حالات میں

"اے دل کہیں لے چل"

قسم کی امنگیں دل میں گدگدی پیدا کرتی ہیں۔

اُس زمانہ میں یعنی ۱۱۸۴ء میں شاہ انگلستان ہنری دوم اور اُس کے بیٹوں میں اختلاف پیدا ہوئے اور بیٹوں نے باپ کے خلاف بغاوت کر دی۔ یہ دراصل زخم خوردہ جاگیرداروں کا جوش انتقام اور ہنری کے خلاف شدید ردعمل تھا۔ اس بغاوت میں شاہِ انگلستان سے اُس کی بیوی ایلینار نے بھی بے وفائی کی۔ یہ ایلینار وہی ہے جو پہلے شاہ فرانس کی بیوی تھی اور جب شاہ فرانس نے اُسے طلاق دے دی تو اُس نے شاہِ انگلستان سے شادی کر لی تھی۔ یہی ایلینور (ایلینار) رچرڈ کی ماں تھی۔

شاہِ انگلستان کے خلاف یہ شورش اور بغاوت کامیاب ہوئی۔ جاگیرداروں نے رچرڈ کا ساتھ دیا کیونکہ وہ رچرڈ کو بادشاہ بنانا چاہتے تھے چنانچہ چار سال کی بغاوت کے بعد ہنری دوم کو معزول کر کے رچرڈ کو شاہِ انگلستان بنا دیا گیا مگر رچرڈ تو ہمیشہ کا خوش باش اور بے پروا انسان تھا۔ اُس نے بادشاہ ہونے کے بعد بھی حکومت کے سنجیدہ امور میں کوئی حصہ نہ لیا اور سلطنت سے ایک طرح بے تعلق سا رہا۔

رچرڈ کی حکومت پر نظر ڈالی جائے تو معلوم ہو گا وہ اپنے دس سالہ دورِ حکومت میں صرف دو مرتبہ انگلستان میں کچھ عرصہ مقیم رہا۔ ایک بار جب اُس نے حکومت سنبھالی اور

دوسری مرتبہ جب اُس کا دور ختم ہونے والا تھا۔ اُس کا یہ قیام بھی صرف اس ضرورت کے لئے تھا کہ وہ انگلستان میں رہ کر اپنے جا و بے جا کاموں کے لئے رقم اکٹھی کرے اور اپنی مہم پسندانہ طبیعت کو سکون دے۔

رچرڈ کو ۱۱۸۹ء میں بادشاہت ملی گویا دیوانگی کے تمام لوازمات اکٹھے ہو گئے۔ بس اُس نے سلطنت ماں (ایلینار) اور بھائی کے حوالے کی اور اگلے سال یعنی ۱۱۹۰ء میں تیسری صلیبی جنگ کے لئے روانہ ہوا۔ چھبیس سالہ شاہِ انگلستان اپنی بھکی اور بھٹکی ہوئی جوانی کے ساتھ جنگ کے لئے چلا مگر راستہ میں کئی جگہ ٹکرایا۔ پہلے اُس نے جزیرہ سسلی (صقلیہ) پر حملہ کیا اس لئے حاکم سسلی ٹینکرڈ نے اُس کی جوان بہن جین کے حقوق غصب کر لئے تھے۔

سسلی کا حاکم ٹینکرڈ بھی رچرڈ کی طرح اوباش اور بے پروا تھا۔ اُس نے رچرڈ کی بہن کے ساتھ اچھا سلوک نہیں کیا تھا اور وہ ناراض ہو کر میکے بیٹھ گئی تھی۔ رچرڈ اُسے اپنے ساتھ لایا تھا۔ یہ مسئلہ میاں بیوی اور سالے بہنوئی کا تھا۔ سالے بہنوئی کا رشتہ یوں بھی بہت نازک ہوتا ہے اور سالے کو بہن کے لئے جھکنا پڑتا ہے مگر رچرڈ کے ساتھ لشکر تھا اور اُسے اپنے شہنشاہ ہونے کا زعم تھا۔ اُس کا فرض تھا کہ اپنے بہنوئی حاکم سسلی ٹینکرڈ کے ساتھ نرمی سے پیش آتا اور صلح صفائی سے جین کو اُس کے حوالے کر دیتا لیکن اُس نے کیا یہ کہ پہلے اپنے بحری بیڑے کو سسلی کے ساحل سے لگا کر لشکر اُتروا دیا پھر ٹینکرڈ کو اپنے حضور طلب کیا۔

ٹینکرڈ اُس سے زیادہ خودسر اور بددماغ جوان تھا پھر اُسے شہنشاہِ انگلستان کے بہنوئی ہونے کا زعم بھی تھا۔ اپنے سالے رچرڈ کا یہ بلاوا اُسے ناگوار گزرا۔

"رچرڈ نے مجھے کس حیثیت سے بلایا ہے؟" اُس نے رچرڈ کے بھیجے ہوئے قاصد سے سختی سے سوال کیا۔

قاصد گھبرا گیا۔ وہ یہ تو جانتا تھا کہ رچرڈ، حاکم سسلی کا سالا ہے مگر وہ یہ بات خود تو نہیں کہہ سکتا تھا۔ قاصد سمجھ دار تھا۔ اُس نے رچرڈ کے اُن الفاظ کو بھی نہیں دہرایا جن الفاظ میں رچرڈ نے اپنے بہنوئی کو طلب کیا تھا۔ رچرڈ کا لہجہ اور الفاظ انتہائی ہتک آمیز تھے لیکن قاصد نے انتہائی نرم الفاظ میں ٹینکرڈ کو اطلاع دی تھی۔

"شاہِ انگلستان ٹینکرڈ حاکم سسلی سے ملاقات کے خواہش مند ہیں"۔

لیکن ٹینکرڈ اتنے نرم الفاظ بھی برداشت نہیں کر سکا اور اُس نے قاصد سے جرح شروع کر دی۔ قاصد نے پھر بھی بات سنبھالی۔ اُس نے پہلے جیسے نرم لہجے میں کہا۔

"حاکم سسلی آخر شاہِ انگلستان کے رشتہ دار ہیں۔ شاہِ انگلستان کے ساتھ شہزادی جین بھی تشریف لائی ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ شہنشاہ اُن کے بارے میں کچھ گفتگو کرنا چاہتے ہوں؟"

ٹینکرڈ بھڑک اُٹھا۔ "میرا جین سے کوئی تعلق نہیں۔ میں اُس کے بارے میں کوئی بات نہیں کرنا چاہتا"۔

قاصد نے دیکھا کہ بات تو پہلے ہی قدم پر ختم ہوئی جاتی ہے۔ اُس نے ٹینکرڈ کو سمجھایا۔

"حاکم سسلی سے میری درخواست ہے کہ وہ رسم و رواج اور شاہانہ طور طریقوں کو ضرور پیش نظر رکھیں۔ یہ ضرور ہے کہ روایت کے لحاظ سے آپ کا درجہ بلند ہے لیکن اس وقت شاہِ انگلستان کی فوجیں ساحل پر اُتر چکی ہیں اور اُس سے زیادہ لشکر ابھی جہازوں میں موجود ہے۔ میں اگرچہ انگلستان کا قاصد ہوں لیکن میری خواہش ہے کہ حاکم سسلی اس وقت اپنی ریاست اور اپنی حاکمیت کو داؤ پر نہ لگائیں"۔

ٹینکرڈ تھا تو بہت بددماغ، اُسے سسلی کی بھی پروا نہ تھی لیکن قاصد کی باتیں اور انداز نے اُسے بہت متاثر کیا۔

"معزز قاصد" ٹینکرڈ کا انداز اک دم بدل گیا۔ "میں آخر شاہِ انگلستان کا بہنوئی ہوں۔ اُس کا ملازم نہیں۔ سسلی ایک آزاد ملک ہے۔ یہ اور بات ہے کہ ہمارا انگلستان سے دوستی کا معاہدہ ہے لیکن رچرڈ کو یہاں آنے سے پہلے مجھے مطلع کرنا چاہیے تھا۔ مجھے معلوم ہوا ہے کہ وہ صلیبی جنگ کے لئے جا رہا ہے۔ میں اُس کے جذبہ کی قدر کرتا ہوں مگر اُسے یہ حق کس نے دیا کہ وہ حاکم سسلی کی اجازت کے بغیر سسلی

سرزمین پر قدم رکھا۔ کیا اُس کی یہ حرکت غاصبانہ اقدام کے تحت نہیں آتی؟"

"ضرور آتی ہے اے حاکم سسلی"۔ قاصد نے تائید کرتے ہوئے کہا۔

"یہ تو کھلا ہوا غاصبانہ قبضہ ہے لیکن مصلحت بھی ایک چیز ہوتی ہے۔ شاہِ انگلستان کے پاس اس وقت کثیر لشکر ہے۔ تقریباً ایک سال کا سامانِ رسد بھی جہازوں پر بار ہے۔ بے شمار سامانِ حرب بھی موجود ہے۔ انگلستان کا لشکر سسلی کے ایک ساحلی علاقہ پر قابض ہو چکا ہے۔ ان حالات میں آپ کو مصلحت سے کام لینا چاہیئے"۔

"تم ٹھیک کہہ رہے ہو قاصد"۔ ٹونکرڈ نے قاصد کی رائے تسلیم کر لی۔ "مگر اب بتاؤ مجھے کیا کرنا چاہیئے؟"

"اے حاکم سسلی، میں اس سلسلہ میں صرف یہ کہہ سکتا ہوں کہ آپ اس قیامت کو ٹالنے کی کوشش کیجیے"۔ قاصد نے مشورہ پیش کیا۔ "ایسا نہ ہو کہ فلسطین میں استعمال کے لئے جانے والا یہ لشکر اور اسلحہ، سسلی کو تاخت و تاراج اور خاکستر کرنے میں صرف ہو جائے۔ رہا آپ کے ذاتی معاملات کا مسئلہ اُسے تو آپ ہی بہتر طور پر نپٹا سکتے ہیں جہاں تک ہو سکے تلخی سے پرہیز فرمائیے گا"۔

"ٹھیک ہے۔ رچرڈ سے جا کے کہہ دو کہ میں اُس سے ملنے آ رہا ہوں"۔ حاکم سسلی ٹونکرڈ مصالحت کے لئے تیار ہو گیا۔

قاصد نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔ "اس طرح نہیں اے حاکم سسلی۔ اگر آپ فوراً ملاقات پر آمادہ ہو گئے تو شاہِ انگلستان آپ کو بہت ہی کمزور سمجھیں گے اور اپنی شرائط پر سسلی سے جانے پر آمادہ ہوں گے"۔

"پھر کیا کروں؟" ٹونکرڈ پریشان ہو گیا۔ "تم ہی نے تو کہا ہے کہ پالیسی سے کام لو اور اُسے سسلی سے بھگانے کی کوشش کروں؟"

"جی ہاں۔ میں بھی چاہتا ہوں"۔ قاصد نے جواب دیا "لیکن آپ اس وقت شاہِ انگلستان کو یہ پیغام بھجوائیں کہ وہ آپ کے جواب کا انتظار شام تک کریں اور یہ کہ آپ شام تک ہی ملاقات کرنے یا نہ کرنے کا فیصلہ کر سکتے ہیں۔ اس کے ساتھ آپ فوراً اپنی افواج کو تیاری کا حکم دے دیں؟"

"پھر کیا ہوگا؟" حاکم سسلی نے تعجب سے کہا۔

قاصد نے جواب دیا۔ "پھر کیا ہوگا، اس کا جواب آپ کو شام کو مل جائے گا"۔

ٹونکرڈ نے الجھتے ہوئے پوچھا۔ "مگر شام تک اور کیا کروں۔ اگر رچرڈ نے اپنے لشکر کو پورے ملک (سسلی) پر قبضہ کا حکم دے دیا تو؟"

"ایسا نہیں ہوگا میری سرکار! میں آپ کو یقین دلاتا ہوں"۔ قاصد نے زور دے کر کہا۔ "آپ کو میری بات کا یقین کرنا چاہیئے۔ شام ہوتے ہی آپ اپنے آدمی کے ذریعے شاہِ انگلستان کو اطلاع بھجوا دیں کہ آپ شاہ سے ملاقات کے لئے آ رہے ہیں"۔

حاکم سسلی ٹونکرڈ قاصد کی اس حکمتِ عملی سے بہت خوش ہوا۔ "اے عقلمند قاصد تم تو کمال کے آدمی ہو بلکہ بڑے کام کے آدمی ہو۔ کیا یہ نہیں ہو سکتا کہ تم شاہِ انگلستان کو چھوڑ کر میرے پاس آ جاؤ۔ میں تمہیں کوئی اچھی ملازمت دوں گا؟"

"اے شاہِ سسلی!" قاصد نے مستقل مزاجی سے جواب دیا۔ "مجھے انگلستان اور شاہِ انگلستان سے اُسی طرح محبت ہے جس طرح آپ کو سسلی سے ہے۔ میرے اور میری اولاد کی رگوں میں انگلستان کا نمک دوڑ رہا ہے۔ میں شاہ رچرڈ سے بے وفائی کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ آپ سے میں نے جو کچھ گفتگو کی ہے اُس کی بنیاد خالص قومی اور انسانی ہمدردی ہے۔ ظاہر ہے کہ اگر آپ نے شاہ کا مقابلہ کیا تو خوا مخواہ خون خرابہ ہوگا اور ہم نصرانیوں کا خون جو ہم یروشلم کی بازیابی میں بہانا چاہتے ہیں وہ آپس کی لڑائیوں میں بہے گا۔ دوسرے یہ کہ اگر آپ اور شہزادی جین کے درمیان اختلافات کسی صورت ختم ہو جائیں تو بات ہم سب کے حق میں ہو گی"۔

حاکم سسلی ٹونکرڈ نے قاصد کو رخصت کر دیا۔ وہ شاہِ انگلستان رچرڈ کے دربار میں پہنچا تو شاہ نے اُسے سوالیہ

نظروں سے دیکھا۔

"کیا جواب دیا اُس ذلیل کتے نے؟" شاہ کے لہجے سے چنگاریاں نکل رہی تھیں۔

"اے شاہِ اعلیٰ مقام!" قاصد نے سنبھل کے کہنا شروع کیا۔ "حاکمِ سسلی نے فرمایا ہے کہ انہیں آج شام تک وقت دیا جائے تاکہ وہ اپنے احباب سے مشورہ کر لیں"۔

"ہونہہ! معلوم ہوتا ہے ٹینکرڈ کا اب دماغ ٹھکانے آ رہا ہے"۔ شاہِ انگلستان نے نرم پڑتے ہوئے کہا۔ "اگر اُس نے ذرا الٹی سیدھی بات کی تو ہم سسلی کی اینٹ سے اینٹ بجا دیں گے۔ اُسے گستاخی کی ضرور سزا ملنی چاہیئے۔ کیوں جین تمہارا کیا خیال ہے؟"

"شاہ بھائی۔ آپ جو مناسب سمجھیں وہ کیجیے"۔ جین مختصر سا جواب دے کے خاموش ہو گئی۔

شاہِ انگلستان کی تند مزاجی اور سخت لہجے سے جین کے چہرے پر ایک رنگ آتا تھا اور ایک جاتا تھا۔ شام ہونے سے پہلے ہی ٹینکرڈ کا پیغام آ گیا۔ اُس نے کہلوایا تھا کہ وہ شہنشاہ سے ملاقات کے لئے حاضر ہو رہا ہے۔

شاہِ انگلستان نے سفر کی حالت میں ہوتے ہوئے ایک شاندار دربار سجایا۔ دراصل رچرڈ یہ ثابت کرنا چاہتا تھا کہ وہ خواہ انگلستان میں ہو خواہ اطالیہ میں اُس کی شان میں کوئی فرق نہیں آتا۔ ٹینکرڈ کو معلوم تھا کہ رچرڈ کینہ پرور انسان ہے اور اُس سے کوئی بات بعید نہیں۔ یہ بھی ہو سکتا تھا کہ شاہ اپنے آدمیوں کو لگا کر اُسے ہمیشہ کے لئے ہی راستے سے ہٹا دے۔

ٹینکرڈ سخت پہرے میں آیا اور گھوڑے کے بجائے اُس نے بند گھوڑا گاڑی استعمال کی۔ دربار کے سرے پر شاہ کے باڈی گارڈ نے ٹینکرڈ کا استقبال کیا۔ ٹینکرڈ نے دربار میں شاہِ انگلستان کو کورنش پیش کیا۔ شاہ نے ٹینکرڈ کو اپنے اُمرا کی قطار میں جگہ دی۔

حاکمِ سسلی ٹینکرڈ نے گفتگو شروع ہونے سے پہلے ہی بڑے وقار کے ساتھ کہا۔ "اے انگلستان کے عظیم شہنشاہ۔ میں بحرِ روم کے ایک چھوٹے سے جزیرے کا حکمراں ہوں۔ انگلستان اور سسلی کا کوئی مقابلہ نہیں۔ کہاں آفتاب ... کہاں ایک ذرۂ ناچیز۔ پھر بھی اگر شہنشاہ اپنے قیامِ سسلی کے دوران مجھے مہمان نوازی کا فرض عطا فرمائیں تو میرے لئے ایک ناقابلِ فراموش فخر ہو گا۔ میں کوشش کروں گا کہ شہنشاہ اور اُن کے تمام ہم سفروں کو کسی قسم کی تکلیف نہ ہونے پائے"۔

رچرڈ کا خیال تھا کہ ٹینکرڈ گستاخی سے پیش آئے گا لیکن اُس نے مہذب رویہ اختیار کیا تو اُس نے اپنا منصوبہ تبدیل کرنے کا ارادہ کیا۔ اُس نے یہ سوچا تھا کہ اگر ٹینکرڈ نے ذرا سی بھی بدتمیزی کا اظہار کیا تو وہ اُسے گرفتار کر کے ایک قیدی کی طرح اپنے ساتھ رکھے گا مگر اب اُسے اپنے ارادہ میں ترمیم کرنا پڑی۔ پھر بھی وہ پُرجلال لہجہ میں گویا ہوا۔

"ٹینکرڈ تم ہمیں اپنی مہمان نوازی سے اپنی غلطیوں اور کمزوریوں پر پردہ ڈالنا چاہتے ہو مگر یہ ممکن نہیں اس لئے کہ مہمان نوازی تو مہمانوں کی کی جاتی ہے۔ انگلستان کا لشکر تو تمہارا مہمان نہیں اُس نے ایک فاتح کی طرح صقلیہ (سسلی) پر قبضہ کیا ہے۔ پھر کیسے مہمان اور کہاں کی مہمان نوازی؟"

رچرڈ کا لہجہ اکھڑا ہوا تھا مگر ٹینکرڈ شاید اُس سے جان بچانا چاہتا تھا۔ اس لئے اُس نے رچرڈ کے سخت لہجے کو نظر انداز کر دیا۔

"شاہِ انگلستان نے درست فرمایا۔ لشکر یقیناً فاتح ہے اور اُس نے سسلی کے بیشتر علاقہ پر قبضہ بھی کر لیا ہے لیکن اس ناچیز کو تخت و تاجِ انگلستان سے ایک رشتے کا اعزاز بھی حاصل ہے۔ میں اُس اعزاز کے ناطے کم از کم شاہی خاندان کے افراد کو تو مہمان نوازی کی دعوت دے سکتا ہوں؟"

رچرڈ نے اپنی بہن جین کی طرف دیکھا جو بالکل بے تعلق سی بیٹھی تھی مگر جین نے کسی تاثر کا اظہار نہ کیا۔ رچرڈ نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

"ہم تمہاری دعوت پر غور کریں گے ٹینکرڈ۔ تم جانتے ہو کہ اس وقت ہم سفر میں ہیں اور ایک مقدس فرض کی ادائیگی کے لئے فلسطین کے لئے جا رہے ہیں۔ ہم چاہتے

ہیں تمہارا خزانہ بھی اس قرض کی ادائیگی میں خرچ ہو۔ تم واپس جاکر متعلقہ افسر کو اطلاع کر دو کہ ہمارا ایک فوجی دستہ آ رہا ہے وہ اپنی ضرورت کے لئے جتنی رقم چاہے حاصل کر سکتا ہے۔ اُس سے کسی قسم کا تعرض نہ کیا جائے"۔

ٹینکرڈ نے محسوس کیا کہ رچرڈ کی نظر صقلیہ کے خزانے پر ہے۔ وہ اگر رچرڈ کے فوجی دستے کو روکنا بھی چاہے تو نہیں روک سکتا۔ اُس نے سر جھکا کر جواب دیا۔

"میرا خزانہ شاہ اور شاہی خاندان کے افراد پر قربان ہے۔ فوجی دستہ میرے ساتھ ہی بھیجا جائے تاکہ حکم کی جلد تعمیل ہو سکے"۔

"ہمیں اتنی بھی جلدی نہیں ٹینکرڈ"۔ شاہ نے زہر خند کیا۔ "گھبراؤ نہیں۔ ہم ابھی کافی وقت صقلیہ میں گزاریں گے"۔

ٹینکرڈ دل میں بہت کڑھا مگر ادب سے بولا۔

"میرے لئے اور کوئی حکم ہے؟" رچرڈ نے پھر بہن کی طرف دیکھا لیکن شہزادی جین بدستور بُت بنی بیٹھی رہی۔

"ہم تمہیں پھر کسی وقت بلائیں گے ٹینکرڈ۔ اب تم جاسکتے ہو"

ٹینکرڈ جو شاہ رچرڈ کا بہنوئی تھا۔ منہ لٹکائے واپس آ گیا۔ اُس میں اور شہزادی میں شادی کے پہلے ہی دن اختلاف پیدا ہو گیا۔ شہزادی دلہن بن کے صقلیہ آئی تھی پھر جب وہ کچھ دن صقلیہ میں رہنے کے بعد لڑجھگڑ کے انگلستان واپس گئی تو پھر صقلیہ کا اُس نے رُخ بھی نہ کیا۔ اُس وقت انگلستان میں رچرڈ کا باپ برسرِ اقتدار تھا۔ اس لئے بھی جین نے ٹینکرڈ کی پروا نہ کی پھر اُن میں اختلاف اور جدائی کا عرصہ بڑھتا ہی گیا۔

شہزادی جین اور حاکم صقلیہ ٹینکرڈ کے درمیان قانونی طور پر طلاق ہوئی تھی لیکن اس طویل جدائی کے بعد دونوں نے یہی سمجھ لیا تھا جیسے اُن میں ہمیشہ کے لئے علیحدگی ہو گئی ہے۔ اگر شاہ انگلستان رچرڈ اچانک صقلیہ نہ پہنچ جاتا تو شاید ٹینکرڈ شہزادی جین کے بارے میں کبھی نہ سوچتا لیکن شاہ رچرڈ نے ستم یہ کیا کہ صقلیہ آتے ہی ساحل

صقلیہ کے مشرقی حصہ پر اپنے جہازوں کو فوجوں سے خالی کر دیا۔ اس طرح اس وقت انگلستان کی فوجوں کا شاہی محلات اور دفاتر کو چھوڑ کے باقی پورے جزیرے پر قبضہ تھا۔

صقلیہ (سسلی) یورپ کے ایک ملک اٹلی کا بحر روم میں ایک جزیرہ تھا۔ اس دور میں دور دراز کی تجارت کا دارومدار بحری راستوں پر تھا۔ صقلیہ بھی بحری راستے پر واقع ہونے کی وجہ سے ایک دولت مند آزاد ملک تھا۔ اس کا حکمراں ٹینکرڈ ایک سخت مزاج شخص تھا۔ اُس کی شادی بدقسمتی سے رچرڈ کی بہن سے ہوئی تھی جو اب بظاہر ختم ہو چکی تھی لیکن رچرڈ کو بہنوئی سے یہ شکایت تھی اس نے جین کے ساتھ ایک اچھے شوہر جیسے تعلقات نہیں رکھے اور اُس کے جذبات پامال کئے۔

رچرڈ کی یہ شکایت درست نہ تھی۔ اس لئے کہ شہزادی جین ایک خودسر اور مغرور لڑکی تھی۔ ماں باپ اور بھائیوں نے اُس کی ناز برداری کر کے اُس کا دماغ خراب کر دیا تھا۔ پس شادی ہونے پر اُس کی روش میں کوئی تبدیلی پیدا نہ ہوئی۔ ٹینکرڈ ایک آزاد ملک کا حکمراں تھا وہ بھلا شہزادی کے نخرے کیوں برداشت کرتا۔ اس طرح دونوں میں اختلاف بڑھا اور شہزادی جین صرف ایک بار سسرال جانے کے بعد میکے میں بیٹھ گئی۔

جین چونکہ شہزادی تھی۔ چرچ پر بھی اُس کا اثر تھا۔ اُس نے چاہا کہ ٹینکرڈ سے طلاق لے کر کسی اور جگہ شادی کر لے۔ پس انگلستان کے بڑے پادری (بشپ) نے شہزادی کو دوسری شادی کی اجازت دے دی۔ اس کے ساتھ ہی لارڈ پادری نے شہزادی کو اس بات کی بھی اجازت دے دی کہ اگر وہ دوسری شادی کرنے سے پہلے ٹینکرڈ کے پاس جانا چاہے تو بھی جاسکتی ہے اور اُس کے ساتھ بیوی میاں کی حیثیت سے رہ سکتی ہے۔

اس طرح شہزادی جین نے بظاہر طلاق حاصل کر لی تھی لیکن اس کی اطلاع ٹینکرڈ کے پاس صقلیہ نہیں بھیجی گئی تھی۔ ٹینکرڈ نے اسی وجہ سے دینی گفتگو کے دوران شاہ رچرڈ سے اپنی رشتہ داری کا حوالہ دیا تھا۔ انگلستان کے لیاپنگ

لشکر کے آجانے کی وجہ سے ٹونکرڈ بہت پریشان ہوگیا تھا اور اُس نے سوچ لیا تھا کہ اگر شہزادی جین اُس کے ساتھ رہنے پر آمادہ ہوگئی تو وہ فی الوقت اُسے قبول کر لے گا لیکن دربار میں جین کی خاموشی نے اُسے بہت ناامید کیا اور اُسے اپنا مستقبل تاریک ہوتا دکھائی دیا۔

شاہِ انگلستان رچرڈ نے محافظ دستے کو صقلیہ کا خزانہ اُٹھا لانے کو کہا تھا مگر جب صقلیہ والوں نے انگلستان کے فوجی دستے کو سرکاری دفاتر کی طرف جاتے ہوئے دیکھا تو وہ سمجھے کہ شاہِ انگلستان نے شاہی محلات اور دفاتر پر قبضہ کرنے کا حکم دے دیا ہے۔ لوگ بھاگ کے گھروں میں گھس گئے اور ہر طرف غل مچ گیا۔

"حملہ ہوگیا۔ انگریز فوج آگئی"۔

صقلیہ کی فوج اور سالار فوج کے کان میں یہ آواز پڑی تو پہلے وہ کچھ سوچتے رہے، پھر فوجی بیرکوں میں واپس چلے گئے۔ شاہی دستہ لوگوں سے پوچھتا پاچھتا خزانہ پر پہنچ گیا۔ محافظوں کو پہلے ہی معلوم ہوگیا تھا کہ انگلستان کے فوجی دستے شہر میں پھیل گئے ہیں اور اہم مقامات پر قبضہ کیا جارہا ہے اس لئے جب شاہی دستہ خزانہ پر پہنچا تو محافظوں نے خزانہ کی چابیاں اُن کے حوالے کردیں۔

شاہی دستے کی تو بن آئی۔ انہوں نے محافظوں کی مدد سے سونے چاندی کے تمام سکے تھیلوں میں بھروائے اور گاڑیاں منگوا کے تھیلے لدوا دیئے گئے۔ شاہی دستے نے خزانہ خالی کرنے کے بعد قریب کے محلات کا رُخ کیا۔ یہ تمام محلات صقلیہ کے وزیر خزانہ کے تھے جو ٹونکرڈ کا بہنوئی تھا۔ وزیر خزانہ ہی صقلیہ کی افواج کا سپہ سالار تھا۔ اس لئے اُس نے چار چار محلوں پر قبضہ جما رکھا تھا۔ اس وقت اپنے بیوی بچوں کو لے کر اطالیہ (اٹلی) فرار ہوچکا تھا۔

رچرڈ کی بہن جین نے ٹونکرڈ سے سمجھوتہ کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ صقلیہ کا خزانہ رچرڈ کے جہاز پر لادا جاچکا تھا۔ رچرڈ کو صلیبی جنگ کے لئے فلسطین پہنچنا تھا مگر وہ صقلیہ میں ٹھہرا ہوا تھا۔ اُس کا صقلیہ میں قیام کوئی معنی نہ رکھتا تھا سوائے اس کے کہ رات دن رقص و موسیقی کی محفلیں جمتیں۔ رات گئے یہ محفلیں برخاست ہوتیں تو عشرت کدے چمک اُٹھتے۔

شاہ رچرڈ جب انگلستان سے چلا تھا تو پہلے اُس نے انگلستان کا خزانہ بھرا چونکہ وہ ایک مذہبی جنگ کے لئے نکلا تھا اس لئے اس کے اعلان پر ہی رقم اکٹھی ہونا شروع ہوگئی پھر اُس نے پوری سلطنت میں تمام بڑی بڑی عمارتوں کو فروخت کر دیا۔ خود رچرڈ کے بیان کے مطابق کہ اُسے لندن کا کوئی خریدار نہیں ورنہ وہ اس شہر کو بھی فروخت کر دیتا۔ اس طرح اُس نے صلیبی جنگ کے نام پر ملک اور سلطنت کی تمام دولت سمیٹ لی تھی۔

صقلیہ کا سفر بھی اُسے بہت راس آیا۔ اس نے سوچا تھا کہ اپنی بہن کے حقوق کے بہانے وہ پلرمو (صقلیہ کا دارالسلطنت) کو تاخت و تاراج کر کے اُس میں آگ لگا دے گا لیکن اتنی آسانی سے اُسے صقلیہ کا پورا خزانہ مل گیا تو اُس کا لالچ اور بڑھ گیا اور اُس نے بے قصور شہریوں کو لوٹنا شروع کیا۔ مگر کہا گیا ہے کہ تنگ آمد بجنگ آمد۔ جب رچرڈ نے دیکھا کہ ٹونکرڈ لڑنے مرنے پر آمادہ نظر آرہا ہے تو اس نے فوراً پینترا بدلا اور قبل اس کے وہ اپنے باغیانہ خیالات کا اظہار کرے رچرڈ نے اُسے بات کرنے سے روک دیا۔

رچرڈ نے ناظم دربار کو اپنے پاس بلا کر اس سے سرگوشیوں سے کچھ کہا۔ ناظم باہر چلا گیا۔ اس دوران ٹونکرڈ کو پسینے پر پسینے آتے رہے۔ وہ سوچ رہا تھا کہ کہیں شاہ نے اُس کی گرفتاری کا حکم نہ دیا ہو یا پھر کہیں اُس کے قتل کے لئے جلاد نہ بلایا گیا ہو۔ بہرحال اُسے طرح طرح کے خیالات ستاتے رہے۔ اتنے میں ناظم واپس آیا اس کے پیچھے ایک غلام سر پر ایک خوان رکھے ہوئے داخل ہوا۔ وہ دونوں بادشاہ کی پشت پر آکر کھڑے ہوگئے۔

اس وقت بادشاہ نے ٹونکرڈ کی طرف دیکھا۔ "ٹونکرڈ آگے بڑھو"۔

ٹونکرڈ اُمرا کی صف سے دو قدم آگے بڑھ آیا مگر لرزاں و ترساں۔

"اور آگے آؤ ہمارے قریب"۔ شاہ رچرڈ کا لہجہ سپاٹ

تھا۔

اس نے بڑے متین لہجے میں کہا۔

"میرے درباریو۔ حاکم صقلیہ کو دیکھ رہے ہو۔ ٹینکرڈ ہمارا دوست، ہمارا وفادار ہے۔ ادھر کچھ دنوں سے ہمارے درمیان کچھ خاندانی اختلاف پیدا ہو گئے تھے لیکن لاٹھی کے مارنے سے پانی الگ تو نہیں ہو جاتا۔ ٹینکرڈ ہمارا ہے اور ہم ٹینکرڈ کے ہیں۔ تم نے دیکھا کہ ٹینکرڈ نے کس فراخدلی سے ہماری مہمان نوازی کی ہے۔ اُس نے سلطنت کے تمام ذرائع اور خزانہ تک ہمارے حوالے کر دیا ہے۔ ہم اس کی وفاداری اور خلوص کی قدر کرتے ہیں"۔

شاہ رچرڈ نے رک کر تمام دربار پر نظر ڈالی پھر بولا "ہمیں ٹینکرڈ کی وفاداری کا اعتراف کرنا چاہیئے اور تم جانتے ہو کہ شاہ انگلستان جب کسی سے خوش ہوتا ہے تو اُس کی دلداری کس طرح کرتا ہے"۔

شاہ نے اشارہ کیا اور غلام نے خوان، شاہ کے سامنے کر دیا۔ شاہ رچرڈ نے خوان سے ایک صنوبر کی لکڑی کی بنی چھوٹی سی صندوقچیہ اُٹھا کر اور اُس میں سے ایک موتی نکال کر اپنی ہتھیلی پر رکھا۔

"یہ کیا ہے ٹینکرڈ؟" شاہ نے سوال کیا۔

موتی نہایت قیمتی اور کبوتر کے انڈے کے برابر تھا۔ ٹینکرڈ نے آنکھیں جھپکا کے دیکھا کہ کہیں اُس نے غلط تو نہیں کہا لیکن اُسے وہ موتی ہی نظر آیا تھا۔ ایک بڑا موتی۔ ٹینکرڈ نے جواب دیا۔

"جی عالیجاہ۔ یہ موتی ہے ایک لاجواب اور بے مثال موتی"۔

"ٹھیک کہا تم نے"۔ شاہ رچرڈ جیسے خوش ہو گیا۔ "اچھا اپنا ہاتھ آگے بڑھاؤ"۔

ٹینکرڈ نے ڈرتے ڈرتے اپنا ہاتھ تو آگے کر دیا۔

شاہ رچرڈ نے پہلے ٹینکرڈ کو دیکھا پھر حاضرین دربار پر نظریں دوڑائیں اور مسکراتے ہوئے اُس بے مثال موتی کو ٹینکرڈ کی ہتھیلی پر منتقل کر دیا۔

"اب یہ تمہارا ہے ٹینکرڈ ہم نے تمہیں بخش دیا"۔

دربار میں تحسین و آفرین کا غلغلہ بلند ہوا۔

ٹینکرڈ نے دونوں گھٹنے زمین پر ٹیک کے پہلے موتی کو سر سے لگا کر بوسہ دیا پھر بولا۔ "اے شاہ انگلستان میرے پاس الفاظ نہیں کہ میں آپ کے اس اعزاز کا شکریہ ادا کر سکوں"۔

شاہ رچرڈ کی آنکھوں میں ایک خاص قسم کی چمک تھی۔

ٹینکرڈ دوبارہ شکریہ ادا کر کے پیچھے ہٹنے لگا تو شاہ نے اُسے روکا۔

"ابھی کدھر جا رہے ہو ٹینکرڈ؟"

ٹینکرڈ کے قدم جیسے زمین نے پکڑ لئے۔

شاہ رچرڈ اُس وقت تک صندوقچیہ سے ایک اور موتی برآمد کر چکا تھا۔ یہ موتی بھی پہلے کے مانند بڑا تھا اور اُس کا جوڑا معلوم ہوتا تھا۔

ٹینکرڈ دم سادھے اپنی جگہ کھڑا تھا۔

"آگے بڑھو ٹینکرڈ اور ہماری بخشش کی انتہا دیکھو۔"

شاہ رچرڈ مسکرا رہا تھا۔

ٹینکرڈ پھر سوالیوں کی طرح بڑھ کے شاہ انگلستان کے سامنے جھک گیا۔

شاہ نے دوسرا قیمتی موتی بھی ٹینکرڈ کی ہتھیلی پر رکھ دیا۔

"ہم تمہیں یہ دوسرا موتی اس لئے بخش رہے ہیں"۔ شاہ نے خود وضاحت شروع کر دی۔ "ہمارا دیا ہوا ایک موتی تمہارے پاس گھبرائے گا دوسرے موتی کے دینے کا مقصد یہ ہے کہ ہم اُس موتی کی تنہائی دور کریں۔ تنہائی کو ہم پسند نہیں کرتے۔ تم بھی تنہا نہ رہو اور اپنی تنہائی دور کر لو"۔

ٹینکرڈ میں دوسرا موتی لینے کے بعد حوصلہ پیدا ہو گیا تھا۔ وہ شہزادی جین سے مصالحت پر آمادہ ہو گیا تھا مگر شہزادی نے خود ہی اُس کی طرف التفات نہ کیا۔ اس لئے وہ بھی خاموش ہو گیا تھا۔ اس وقت شاہ نے لطیف الفاظ میں اُس کی تنہائی پر اعتراض کیا تھا۔ شہزادی جین دربار میں موجود نہ تھی اس لئے اُس نے دبے الفاظ میں جواب دیا۔

خالی جاتا تنہائی سے میں نے بھاگنے کی بہت کوشش کی مگر نہ بھاگ سکا"۔ ٹونکرڈ نے دزدیدہ نظروں سے شاہ کی طرف دیکھا کہ کہیں اُس کا مزاج برہم تو نہیں ہو رہا۔

"ٹھیک ہے۔ اب تمہیں اپنی تنہا زندگی سے سمجھوتہ کر لینا چاہیئے"۔ شاہ نے فوراً بات کا رُخ بدل دیا۔

شاہ انگلستان نے ٹونکرڈ کو صرف دو قیمتی موتی ہی نہیں دیئے ایک الماس کی گراں بہا انگشتری بھی عنایت کی۔

"ٹونکرڈ! تم یہ نہ سمجھنا کہ ہم نے یہ ہیرے جواہرات تمہارے خزانے سے نکال کے تمہیں دیئے ہیں۔ ہرگز نہیں۔ اس لئے کہ تمہارے خزانے میں نقد رقم تو موجود ہے لیکن کوئی نادر چیز نہیں۔ تم نوادر کی قدر کرنا نہیں جانتے۔ اس لئے تمہارا خزانہ نوادرات سے خالی ہے جو نادر چیزیں تمہارے پاس تھیں تم اُن کی قدر نہ کر سکے اور وہ ضائع ہو گئیں۔ اب ان چیزوں کو اپنے پاس ہماری یادگار سمجھ کر رکھنا"۔

غرض یہ کہ شاہ رچرڈ نے ٹینکرڈ کا تمام خزانہ لوٹنے اور صقلیہ کی پوری اقتصادیات برباد کرنے کے بعد اُسے ایک انگوٹھی اور دو قیمتی موتی بطور بخشش عطا کئے۔ رچرڈ معہ اپنے لشکر کے پورے ایک سال تک صقلیہ پر قبضہ جمائے بیٹھا رہا۔ اتنے بڑے لشکر کے روزانہ اخراجات، پھر ماہانہ، اگر ایک سال کے مکمل خرچ کا تخمینہ لگایا جائے تو یہی کہا جا سکتا ہے کہ رچرڈ جب صقلیہ سے چلا تو صقلیہ کی ریاست بالکل کھوکھلی ہو چکی تھی۔

شاہ رچرڈ صقلیہ سے رخصت ہوا تو ساحل پر موجود اہل صقلیہ شاہ انگلستان کے حق میں نعرے لگا رہے تھے۔ وہ اسی کو غنیمت سمجھ رہے تھے کہ رچرڈ نے صقلیہ کو قتل و خون سے محفوظ رکھا تھا۔

بہر حال ٹونکرڈ کے بختہ نظر سے شاہ انگلستان اور اُس کا لشکر صقلیہ والوں کی بڑی دعاؤں کے بعد فلسطین کی طرف روانہ ہوا اور جب چکیس جہازوں اور سینکڑوں بجروں کے ساتھ عظیم الشان بیڑا نظروں سے اوجھل ہوا تو ٹونکرڈ سیدھا بڑے گرجا میں گیا اور اس شہر کے تمام گرجوں کی گھنٹیاں بجوا کر اپنی خوشی کا اظہار کیا۔ اس خوشی میں ٹینکرڈ کے ساتھ صقلیہ کے عام باشندے اور اُمرا بھی شامل تھے کیونکہ انہیں راتوں کو اس خیال سے نیند نہ آتی تھی کہ کہیں انگلستانی لشکر ان کے گھروں اور محلات پر نہ چڑھ دوڑے۔

OOOOO

موسم گرما کے آخر تک صلیبیوں نے عکّہ پر اپنا دباؤ بڑھا دیا۔ انہوں نے قلعہ کے گرد اپنا دائرہ تنگ کرنا شروع کیا۔ اس سے جنگ میں شدت پیدا ہو گئی اور دونوں طرف سے منجنیقوں اور میدان جنگ میں تیار کئے گئے انجنوں سے سنگ باری ہونے لگی۔ منجنیقوں میں بھاری پتھر اور درختوں کے موٹے موٹے تنے چڑھا کر مخالف سمت پھینکے جاتے جو ان کی زد میں آ جاتا وہ چٹنی بن کے رہ جاتا۔

سلطانی لشکر اور عکّہ کے مسلمان محصورین کے درمیان سوائے نامہ بر کبوتروں کے اور کوئی ذریعہ پیغام رسانی نہ رہ گیا تھا۔ باریک کاغذ پر خط لکھا جاتا پھر اُسے چاندی کے انتہائی ہلکے خول میں داخل کر کے بند کر دیا جاتا اور یہ خول قاصد کبوتر کے پیر میں دھاگے کے ساتھ باندھ دیا جاتا۔ کبوتر کو قلعہ کی چھت سے اُڑایا جاتا۔ تربیت یافتہ قاصد کبوتر صلیبیوں کی صفوں پر سے اُڑتا سلطانی لشکر میں پہنچتا اور وہاں کبوتر کے پیر سے لٹکا ہوا خط حاصل کر لیا جاتا۔

خط میں عیسائیوں کے دن بھر کے حملوں کی تفصیل ہوتی۔ قلعہ والے اپنی مدافعت کا ذکر بھی کرتے۔ سلطان خط کے مطالعہ کے بعد محصورین کو استقامت کی تلقین کرتا اور انہیں جوانمردی سے مدافعت کا حکم دیتا۔ ایک دن نامہ بر کبوتر کے ذریعہ ہی سے سلطان کو اطلاع دی گئی کہ محصور مسلمانوں نے عیسائیوں کی دو میں سے ایک خطرناک منجنیق کو جلا کر راکھ کر دیا ہے۔ ان دو منجنیقوں نے قلعہ کے محصورین کو بہت تنگ کیا تھا۔

مسلمانوں نے اس منجنیق کو اس طرح تباہ کیا کہ انہوں نے فولاد کا ایک زبردست تیر بنایا پھر اسے آگ میں ڈال کے خوب گرم کیا جب یہ تیر سرخ ہو گیا تو اسے اپنی

منجنیق پر چڑھا کر دشمن کی منجنیق پر پھینکا۔ اس تیر نے
ہی پوری اور عیسائیوں کی منجنیق جل کر راکھ ہو گئی۔
سلطان صلاح الدین ایوبی اس مسرت انگیز اطلاع پر خدا کا شکر
ادا کیا۔

سمندر بھی شدید جنگ کی لپیٹ میں تھا۔ عیسائی
سوار قلعہ عکہ میں داخل ہونے کے لئے بیتاب ہو رہے
۔ وہ خود کو اس بات پر ملامت کرتے کہ دو سال کے طویل
محاصرے کے بعد بھی وہ ایک قلعہ تک فتح نہ کر سکے۔ قلعہ عکہ
کی مدافعتی فوج کی تعداد اگرچہ روز بروز کم ہوتی جا رہی تھی
ان مدافعت کم ہونے کے بجائے اور زیادہ مضبوط ہوتی جا
رہی تھی۔ بحری فوج طرح طرح کے حربوں سے قلعہ پر
قبضہ کرنے کی کوشش میں تھی۔

ان دنوں عیسائیوں نے ایک بڑے بجرے کے
مستولوں کے ساتھ چوڑے چوڑے تختے نصب کئے۔ ان
تختوں کے ساتھ معلق پل بندھے ہوئے تھے جنہیں مرضی
کے مطابق نیچا کیا جا سکتا تھا۔ عیسائیوں کا منصوبہ یہ تھا کہ
اس بجرے کو عکہ کی فصیل کے سامنے سمندر میں پہنچایا
جائے پھر معلق پلوں کو جو تختوں پر نصب تھے فصیل پر
لٹکایا جائے اس طرح فصیل پر جانے کا راستہ بن جائے گا اور
عیسائی لشکر ان پلوں کے ذریعہ قلعہ کی فصیل پر اتر جائے گا۔
اس بجرے کو قلعہ سے برسائی جانے والی آگ سے محفوظ رکھنے
کے لئے اس پر چھت ڈال دی گئی تھی۔

پس منصوبے کے مطابق عیسائیوں کے جتنے بھی
جنگی جہاز سمندر میں تھے ان سب کو قلعہ کے برج ذباب
کے گرد لا کر قلعہ پر شدید سنگ باری کی گئی۔ یہ
سنگ باری دراصل قلعہ والوں کو مصروف رکھنے اور ان کی توجہ
فصیل کی طرف سے ہٹانے کے لئے کی گئی تھی۔ اس سنگ
باری کا جواب قلعہ سے بھی دیا گیا اور منجنیقوں کا ایک
زبردست معرکہ شروع ہو گیا۔

پھر اس سخت سنگ باری کے دوران وہ بجرا جس پر
چھت پڑی ہوئی تھی اور جس کے مستولوں سے معلق پل
بندھے تھے وہ برج ذباب کے عین متصل لا کے کھڑا کیا گیا
پھر ملاحوں نے معلق پلوں کے سروں کو فصیل پر لٹکایا۔
اس طرح بجرے پر سے ایک پل بن گیا جس کے ذریعے فصیل
پر اترا جا سکتا تھا۔

قلعہ کی مدافعت کرنے والوں نے بجرے کو تو دیکھا
تھا لیکن انہیں یہ نہیں معلوم تھا کہ نصرانیوں نے فصیل پر
اترنے کے لئے ایک قیامت کی چال چلی ہے پھر جب
مستولوں سے بندھے ہوئے پل فصیل پر آ کے لگے اور ایک
راستہ بن گیا تو مسلمان نعرہ مار کر فصیل پر آ گئے۔ عیسائی
برابر پتھر برسا رہے تھے مگر مسلمان اس سے بے پروا ہو کر
فصیل کے اس حصے پر پہنچے جہاں معلق پل لٹکائے گئے تھے اور
فوراً ان لگے ہوئے پلوں پر "آتش یونانی" کی بارش کر دی۔

عیسائیوں کی یہ زبردست چال دیکھتے ہی دیکھتے خاک
میں مل گئی۔ آتش یونانی دراصل نفت کے تیل میں کچھ
اور کیمیائی مادے ڈال کر تیار کی جاتی تھی پھر انہیں ہانڈیوں
میں بھر کے منجنیق کے ذریعے آگے پھینکتے تھے۔ آتش
یونانی ایسی ظالم آگ تھی کہ یہ لوہے کو بھی پگھلا دیتی
تھی۔ مسلمانوں نے عیسائیوں کا یہ حملہ تو پسپا کر دیا لیکن ان
کے دو دبابے مسلمانوں کو بہت پریشان کر رہے تھے۔

یہ دبابے کیا تھے لوہے کے چلتے پھرتے قلعے تھے۔
سامنے کی طرف رسوں کی بنی ہوئی چٹائیاں لٹکائی گئی تھیں
تاکہ مسلمانوں کی منجنیقوں سے آنے والے پتھر ان رسوں
میں الجھ کے رہ جائیں۔ ان کے اوپری سروں کو فولادی
چادروں سے ڈھانپا گیا تھا۔ دبابے میں ایک سوراخ تھا جس
میں سے ہو کر ایک فولادی شہتیر باہر نکلا ہوا تھا۔ اس شہتیر کو
اندر کی طرف سے ہینڈل سے گھمایا جاتا۔ اس شہتیر سے فصیل کے
نچلے حصے کے پتھروں پر ضربیں لگائی جاتی تھیں۔

یہ دبابے لکڑی کے پہیوں پر چلتے تھے۔ انہیں آہستہ
آہستہ فصیل کے قریب لایا گیا۔ عکہ کے قلعہ میں سلطانی لشکر
کے دو عظیم سردار المشطوب اور قراقوش محصور فوجوں کی کمان
کر رہے تھے۔ انہیں قلعہ کی مدافعت کرتے ہوئے دو سال
گزر چکے تھے اور وہ ہر طرح کے گرم سرد سے گزر چکے تھے مگر
ان دو دبابوں نے انہیں پریشان کر دیا تھا۔ قراقوش نے

دبابوں کو جلانے کی ہر ممکن کوشش کی۔ دال کی ہانڈیاں، آتش یونانی، غرض تمام کوششیں انہیں جلانے یا تباہ کرنے کی بیکار ہو گئی تھیں۔

پھر المشلوب نے دبابے کی نوک جس پر آہنی چادر لپیٹی گئی تھی اُس نوک کو نشانہ بنانے کا حکم دیا۔ پس برقندازوں، سنگ باروں نے اُس کا نشانہ لیا اور آگ اور پتھر برسانا شروع کئے۔ شدید سنگ باری سے دبابے کا سرا تھوڑا سا ٹوٹ گیا۔ اُس کے ٹوٹتے ہی "آتش یونانی" کی ہانڈیاں اور گولے برسائے۔ اس طرح [illegible] ے کے سرے سے شعلے بھڑک اُٹھے اور [illegible] جل کر خاک ہو گیا۔

دوسرا دبابہ قلعہ کے بالکل مقابل کھڑا کیا گیا تھا۔ اس پر مسلمانوں نے اچانک حملہ کر دیا اور قلعہ سے نکل کر دبابے کو گھیر لیا پھر اُس کے اندر آگ لگا دی۔ اب دبابہ مسلمانوں کے قبضہ میں تھا۔ مسلمانوں نے دبابہ کو زنجیروں سے باندھا اور اُسے اُسی طرح گھسیٹ کر قلعہ میں لے گئے جس طرح "ٹرائے" کے میدان سے قلعہ والے لکڑی کا گھوڑا گھسیٹ کر لے گئے تھے۔ ٹرائے کے میدان سے لے جانے والے دیو قامت لکڑی کے گھوڑے میں دشمن کے سپاہی چھپے ہوئے تھے۔

قلعہ والے اپنی فتح کی یادگار کے طور پر گھوڑا قلعہ میں کھینچ کر لے گئے تھے پھر اندر پہنچ کر انہوں نے فتح کا جشن منانا شروع کیا اور شراب کے قدح کھل گئے۔ جب یہ لوگ شراب میں دُھت ہو گئے تو گھوڑے میں چھپے ہوئے دشمن سپاہیوں نے باہر نکل کر اُن مدہوشوں کا قتلِ عام کیا اور فتحیاب ہوئے۔

لیکن مسلمان اُن سے [illegible] ہوشیار تھے۔ انہوں نے دبابے کے اندر آگ لگا کر اُسے پھونک ڈالا تھا اور جتنے آدمی اُس کے اندر تھے وہ سب خاکستر ہو گئے تھے۔ یہ جلتا ہوا دبابہ کئی دن بعد ٹھنڈا ہوا تو مسلمان انجینئروں نے اس کے کل پرزوں کا معائنہ شروع کیا۔ کہتے ہیں کہ اس کی تیاری میں ہزاروں پونڈ فولاد استعمال ہوا تھا۔

دونوں دبابوں کی تباہی سے مسلمانوں کے حوصلے بلند ہو گئے۔ انہوں نے شعلہ انداز آلات سے لیس ہو کر عیسائیوں پر حملہ کر دیا۔ زرہ بکتر سے مسلح عیسائی نائٹ مسلمانوں کے حملہ کو روکنے کے لئے آگے بڑھے۔ مسلمانوں کے ہاتھوں میں لپکتے ہوئے شعلے تھے وہ انہوں نے نائٹوں پر کھینچ مارے۔ اُن کے کپڑوں میں آگ لگ گئی اور زرہ بکتر گرم ہو کر پگھلنے لگے۔ نائٹ تڑپ تڑپ کے زمین پر گرتے فوراً آگ کی شدت سے دم توڑ دیتے۔ اُس وقت مسلمانوں کے شعلہ انداز آلات دبابوں اور منجنیقوں کو نشانہ بنا رہے تھے۔

سلطان صلاح الدین کو ان لڑائیوں کی تفصیل قاصد کبوتروں کے ذریعہ سے پہنچا دی جاتی۔ اِدھر کچھ دنوں سے قاصد کبوتروں کے ذریعہ سے نامہ و پیام بند ہو گیا تھا۔ ہوا یہ کہ ایک قاصد کبوتر جب عیسائی چھاؤنیوں کے اُوپر سے گزر رہا تھا تو ایک تیر انداز نے کمان سنبھال کر اُس کا نشانہ لیا۔ تیر کبوتر کے پیوست ہو گیا اور وہ زمین پر گر پڑا۔ عیسائی لشکریوں نے کبوتر کو اُٹھایا تو اُس کے پیر سے چاندی کی نلی بندھی ہوئی تھی۔ نلی کے اندر سے کاغذ نکال کر پڑھا تو وہ سلطان صلاح الدین ایوبی کا خط اپنے سردار قراقوش کے نام تھا۔ قراقوش اور المشلوب قلعہ کے مدافعتی لشکر کے سردار تھے۔ عیسائی چوکنا ہو گئے۔ اس طرح قلعہ سے پیغام لانے والا ایک کبوتر بھی عیسائی تیر اندازوں کا نشانہ بنا پھر ایک زخمی کبوتر کسی طرح سلطان کے پاس پہنچ گیا جس سے سلطان کو علم ہو گیا کہ قاصد کبوتر دشمن کے تیر اندازوں کا نشانہ بن رہے ہیں۔ سلطان نے اس طرح کی خط و کتابت کو فوراً بند کر دیا۔

مگر یہ جنگ کا زمانہ تھا۔ قلعہ والوں کو سلطان کی خیر اور سلطان کو قلعہ کی روزانہ کی خبر ملنا ضروری تھی۔ سلطان نے اس کے لئے ماہر غوطہ خوروں اور تیراکوں کی خدمات حاصل کیں۔ ایک تیراک رات کے اندھیرے میں سلطانی فرودگاہ سے ساحل کی طرف بڑھا۔ اُسے عیسائیوں کے لشکر سے بھی گزرنا پڑتا مگر وہ چھپتا چھپاتا کسی نہ کسی طرح ساحل پر پہنچتا پھر اپنا لبادہ اتار کر کنارے پر چھپا دیتا اور سمندر میں تیرتا ہوا عکہ کی بندرگاہ پر اُس جگہ پہنچتا جہاں تک عیسائی

پہنچنے کی جرأت نہ کرتے تھے۔

یہ تیراک جلدی جلدی زبانی یا کاغذی احکامات شاہی، عکہ والوں کو منتقل کرتا اور اُسی طرح تیرتا ہوا واپس آ جاتا۔ پیغام رسانی کا یہ طریقہ بہت خطرناک تھا پھر اُس صورت میں کہ عیسائیوں کو یہ اطلاع ہو گئی تھی لب قلعہ اور شاہی خیمہ گاہ کے درمیان تیراکوں کے ذریعے رابطہ قائم ہے۔ انہوں نے جگہ جگہ تیرانداز لگا دیئے تھے جو پانی کے اندر یا کنارے پر کسی ہلکے سے شبہ پر بھی تیر چلا دیتے تھے۔ اس کا یہ نتیجہ بھی ہوا کہ خود عیسائیوں کے کئی لشکری اُن کے ہی تیراندازوں کا نشانہ بن گئے لیکن مسلمان تیراک بھی اکثر اُن کا نشانہ بنتے تھے۔

قاصد کبوتروں کی ناکامی کے بعد مسلمانوں کے پاس سوائے تیراکوں کا ذریعہ استعمال کرنے کے قلعہ سے کسی اور طرح رابطہ قائم ہی نہیں ہو سکتا تھا۔ اس سلسلے میں ایک شاہی تیراک کا حال بڑا دردناک مگر ایمان افروز ہے۔ وہ ہر تیسرے دن اپنے مشن پر تیرتا ہوا عکہ جاتا اور صبح ہونے سے پہلے عیسائیوں کی نظروں اور تیروں سے بچتا ہوا خیمہ گاہ میں واپس آ جاتا تھا مگر ایک رات وہ ایسا گیا کہ دو دن تک اُس کی واپسی نہ ہوئی۔ سلطان نے اُسے ساحلِ سمندر پر تلاش کرنے کا حکم دیا۔ چوتھے دن ساحل پر اُس کی لاش تیرتی ہوئی ملی۔

تیراک کی لاش سلطان کے سامنے پیش کی گئی۔ اُس کے جسم پر تیر یا کسی اور ہتھیار کا نشان نہ تھا۔ اس سے یہ اندازہ لگایا گیا کہ وہ کسی وجہ سے ڈوب گیا ہے مگر حیرت انگیز بات یہ تھی کہ جب وہ اُس کی ہمیانی (وہ چکنی تھیلی جس پر پانی کا اثر نہیں ہوتا اور اُس میں تیراک اہم چیزوں کو چھپائے رکھتا ہے) دیکھی گئی تو سلطان کا خط کچھ دیگر چیزیں اُس میں محفوظ تھیں۔ مرنے والے کے اس کارنامہ پر ہر ایک کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں۔ سلطان صلاح الدین کے قاضی اور مورخ کی زبان سے اک دم نکلا۔

"اس سے پہلے کبھی کسی انسان نے موت کے بعد اپنا فرض اس طرح انجام نہ دیا ہو گا۔"

صلاح الدین نے دریا کے بالائی حصہ میں اپنی بیرکیں تعمیر کی تھیں اور یہاں جیسرا بڑا بازار بن گیا تھا۔ اس بازار میں دھوبی، نائی، چمار جیسے ضروری کام کرنے والوں کی دکانوں کے علاوہ گھوڑے کے ساز تیار کرنے والی اور زین بنانے والوں کی کثرت سے دکانیں تھیں۔ ان دکانوں کو دھوپ اور بارش سے بچانے کے لئے ان پر ترپالوں کی عارضی چھتیں ڈال دی گئی تھیں۔ ضروریاتِ زندگی کی تقریباً ہر چیز اس بازار میں دستیاب تھی۔ گیہوں، تیل اور چاول کے بھرے اونٹ یہاں اُترتے اور خرید و فروخت کرتے تھے۔ تاجروں کے ساتھ ضرورت مند لوگ آ جاتے اور انہیں کسی نہ کسی کام میں لگا دیا جاتا۔ ایک مسافر کا بیان ہے کہ اُس نے اس بازار میں صرف کفش دوزوں (موچی) کی دو سو دکانیں گنیں۔ اس مقام پر فوج کا اتنا عرصہ قیام رہا کہ ایک ہزار عارضی دکانیں تیار ہو گئی تھیں۔

حبشیوں نے جگہ جگہ حمام بنا لئے تھے۔ وہ ایک گز زمین کھودتے تو پانی نکل آتا۔ انہوں نے پانی کے لئے حوض بنائے تھے اور اُن کے گرد کچی دیواریں کھینچ کر لکڑی اور کیچ سے چھتیں بنا دی تھیں۔ سفری حمام تھے اور ان میں ایک درہم دے کر غسل کیا جا سکتا تھا۔

یہ ایک نئے قسم کی جنگ تھی۔ دراصل یہ فوجوں کے صبر کا امتحان تھا جنہیں دشمن کے سامنے ہونے کے باوجود یہ نہ معلوم تھا کہ جنگ کب شروع ہو گی اس کا خاتمہ کب ہو گا۔ کبھی تو روز کوئی نہ کوئی جھڑپ ہو جاتی اور کبھی لشکری، ہفتوں ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہتے۔ یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ لشکروں پر جمود طاری ہو گیا تھا یا پھر وہ اپنی قسمت پر شاکر ہو کر بیٹھ گئے تھے۔ عکہ کا قلعہ نہ فتح ہوتا تھا اور نہ قلعہ والے قلعہ خالی کر کے باہر آنے کا نام لیتے تھے۔ سلطان کا قلعہ والوں سے براہِ راست رابطہ ختم ہو چکا تھا۔ کبھی کبھی قاصد کبوتر یا کسی تیراک کے ذریعہ خبروں کا تبادلہ ہو جاتا تھا۔

دونوں طرف سے جاسوسوں کی آمد و رفت کا سلسلہ جاری تھا۔ سلطان کی طرف سے خالی ہاتھ دہقان نصرانی لشکر میں بے دھڑک چلے جاتے تھے اور کبھی کبھی بڑی اہم

خبریں لے آتے تھے۔ یہی حال عیسائیوں کی طرف سے بھیجے ہوئے جاسوسوں کا تھا وہ بھی تاجروں کے ساتھ اپنے جاسوس بھیج دیتے جو سلطانی لشکر کی خبریں نصرانیوں میں پہنچاتے تھے۔ اگر سلطان کے قاضی اور ذاتی مؤرخ بہاءالدین کو یہ علم ہوتا تھا کہ فلاں فلاں دن سمندر کے راستے عیسائیوں کو اتنی کمک پہنچی تو عیسائیوں کو بھی یہ پتہ چل جاتا کہ شام سے تقی الدین کب واپس آیا اور اُس کے ساتھ کس قدر لشکر ہے۔

خزاں کا موسم گزر چکا تھا کہ جاسوسوں نے عیسائی سرداروں کو اطلاع دی کہ مسلمانوں نے اپنے سامانِ رسد کا ذخیرہ حیفہ کے قریب جبلِ کارمل کے سائے میں چھپا رکھا ہے۔ عیسائیوں کو سامانِ رسد کی شدید کمی تھی چنانچہ عیسائیوں کے تین سردار آرچ بشپ آف کنٹربری، کاؤنٹ ہنری اور مارکوئیس کونریڈ نے منصوبہ بنایا کہ حیفہ کے ذخیرہ کو لوٹا جائے۔ اس کے لئے انہوں نے اپنے اپنے لشکر سے چیدہ چیدہ سپاہیوں کا انتخاب کیا اور ایک رات حیفہ کی طرف روانہ ہوگئے۔

اِدھر سلطان نے اپنے مدافعتی منصوبہ میں عیسائیوں کے ہر بڑے سردار کی خیمہ گاہ پر اپنے دستے مقرر کر رکھے تھے کہ جس وقت بھی ان بڑے سرداروں کے فوجی دستے کسی طرف حرکت کریں تو فوراً ان کا تعاقب کیا جائے اور معقول جگہ روک کر حملہ کیا جائے۔ اس طرح جب آرچ بشپ، ہنری اور کونریڈ نے اپنے دستوں کے ساتھ حیفہ کا رُخ کیا تو سلطانی دستے بھی اُن کے دائیں بائیں لگ گئے۔

پھر جب یہ دونوں لشکر اپنی اپنی خیمہ گاہ سے کافی دور نکل آئے تو سلطانی دستوں نے اللہ اکبر کا نعرہ لگا کر عیسائیوں پر حملہ کر دیا۔ انہیں اس حملہ کی قطعی توقع نہ تھی اس لئے وہ بوکھلا گئے۔ عیسائیوں میں بہت سے نامی گرامی نائٹ اور ٹمپلر شامل تھے مگر اُن کو بُری طرح مار پڑی۔ حیفہ کا ذخیرہ لوٹنا تو ایک طرف رہا انہیں اپنی جانیں بچانا مشکل ہو گئیں۔ مسلمانوں نے انہیں گھیر کر اس قدر مارا کہ انہیں چھٹی کا دودھ یاد آگیا ہوگا۔ عیسائی دستوں کو حیفہ پہنچنے سے پہلے ہی گھیر لیا گیا تھا۔ دستوں کی یہ لڑائی ایک خوفناک جنگ میں تبدیل ہو گئی اور تین دن تک ایسا خونریز معرکہ پڑا کہ زمین کانپ کانپ گئی۔

پھر عیسائیوں نے پیٹھ دکھائی اور اپنا رُخ اپنی لشکر گاہ کی طرف کر لیا اور لڑتے بھڑتے، مار کھاتے اور قتل ہوتے ہوئے بڑی مشکل سے واپس ہوئے۔ اس خونریز جنگ میں جانی نقصان کا ذکر کہیں نہیں ملتا۔ آرچ بشپ کے نائب نے نصرانی کیمپ کا اس طرح اندوہناک نقشہ کھینچا ہے۔

وہ لکھتا ہے کہ مجھے افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ ہمارے کیمپ میں یوں معلوم ہوتا ہے جیسے خدا کا گزر ہی نہیں ہوتا۔ جنگ کے زمانہ میں عام لشکری اور سردار اپنی راتیں عبادت میں گزارتے ہیں مگر ہمارے سردار اپنی راتیں عیش و عشرت میں بسر کرتے ہیں۔ کم درجہ لشکریوں کی حالت بہت خراب ہے اُن کا کوئی پرسانِ حال نہیں۔ ہر شخص تن آسانی اور شہوانی خواہشات کا شکار ہے۔ اُمراء ایک دوسرے سے حسد کرتے ہیں۔

سلطان کی طاقت روز بروز بڑھتی جا رہی ہے اور ہمارے نائٹس بزدل ہوتے جا رہے ہیں۔ مسلمان اُن کا مذاق اُڑاتے ہیں اور انہیں دعوتِ مبارزت دیتے ہیں مگر ہمارے نائٹ خیموں میں دُم دبائے پڑے رہتے ہیں۔ یہ باتیں میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھی ہیں اگر میں نے سنی ہوتیں تو ان پر ہرگز اعتبار نہ کرتا۔ مجھے یہ بھی یقین نہیں آتا کہ یہ ہمارے نائٹس اور لشکری ہیں۔

سلطان کی اس دور اندیشی اور انتہائی کامیاب حکمتِ عملی کی کون داد دے سکتا ہے کہ انہوں نے چار ساڑھے چار ہزار کا اسلامی لشکر قلعہ عکّہ میں ٹھہرا کر عیسائیوں کی پوری طاقت کو اُس کے گرد اکٹھا کرا دیا۔ قلعہ والوں نے اندر سے مدافعتی اور سلطان نے باہر سے جارحانہ جنگ سے عیسائیوں کو مجبور کر کے ... دیا اور وہ لشکر جو یروشلم (بیت المقدس) کو آزاد کرانے کے لئے ایشیا اور یورپ کے تمام ملکوں سے آ رہا تھا وہ یروشلم کی طرف جانے کے بجائے قلعہ عکّہ کے محاصرہ میں لگ گیا تھا۔

سلطان کی اس حکمتِ عملی اور دور اندیشی کا کیا نتیجہ ہوا یہ تو آپ آئندہ صفحات میں پڑھیں گے یہاں پر اس قدر کہنا کافی ہو گا کہ جب نصرانی لشکر جس میں یورپ کے تمام ممالک کی فوجیں شامل ہو چکی تھیں انہیں یروشلم (بیت المقدس) پر یلغار کا موقع ملا تو اس قدر پژمردہ اور کمزور ہو چکا تھا کہ اس کی ہمت ہی نہ پڑی کہ وہ کم از کم یروشلم کا محاصرہ ہی کر لے حالانکہ وہ تو اسے آزاد کرانے آئے تھے۔

قلعہ عکہ کو اسی طرح محاصرے کی حالت میں چھوڑ کے ہم ایک بار پھر بحرِ روم کے جزیرہ صقلیہ چلتے ہیں جہاں سے انگلستان کا بادشاہ رچرڈ فلسطین کی طرف روانہ ہونے کے لئے پر تول رہا ہے۔

ooooo

ایک تاریخی حوالہ سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ شاہ رچرڈ کی والدہ ملکہ ایلینور ہونے والی بہو برنگریا آف نوارے کو خود اپنے ساتھ لے کر صقلیہ پہنچی تھی تاکہ شاہ رچرڈ کے فلسطین جانے سے پہلے وہ برنگیریا اور رچرڈ کی شادی کر دے۔ ملکہ ایلینور کے اس اقدام میں برنگریا آف نوارے کی یہ ضد بھی شامل تھی کہ وہ خود بھی صلیبی جنگ میں بحیثیت ملکہ انگلستان حصہ لینا چاہتی ہے۔

اس طرح ملکہ ایلینور صقلیہ پہنچی مگر اسے بتایا گیا کہ شاہ انگلستان رچرڈ صقلیہ کا ساحل دو روز پہلے ہی چھوڑ چکا ہے۔ ملکہ کو یہ بھی بتایا گیا کہ شاہ رچرڈ اپنے بحری بیڑے کے ساتھ مسینا سے جو صقلیہ کے شمال مشرق کی مشہور بندرگاہ ہے، فلسطین روانہ ہو چکا ہے۔ مزید یہ کہ شاہ فلسطین کے ساحل پر اُترنے سے پہلے جزیرہ قبرص میں کچھ روز قیام کر کے فلسطین کی جنگ کے حالات معلوم کرے گا پھر کسی معقول بندرگاہ پر اپنے بحری بیڑے کو ٹھہرائے گا۔

ملکہ ایلینور خود فلسطین نہیں جانا چاہتی تھی اس لئے اس نے صقلیہ کے ایک جنگی جہاز سے برنگریا کو سوار کرا کے قبرص روانہ کر دیا اور خود انگلستان واپس چلی گئی۔ شاہ رچرڈ کو انگلستان چھوڑے تقریباً ایک سال ہو رہا تھا مگر اس کے بحری بیڑے کی رفتار اس قدر سست تھی جیسے وہ صلیبی جنگ پر جانے کے بجائے سمندر کی سیر کو نکلا ہو۔

بہر حال شاہ انگلستان کا پچیس بڑے جہازوں اور بے شمار بجروں کا بحری بیڑہ قبرص کی طرف رواں دواں تھا کہ اچانک بحرِ روم میں طوفان آگیا۔ سمندر کے غصے سے خدا ہی محفوظ رکھے۔ اس کا مزاج بگڑتا ہے تو وہ بڑے بڑے جہازوں کو پتوں کی طرح الٹ دیتا ہے۔ وہ تو خیر ہوئی شاہ رچرڈ کا بحری بیڑہ جزیرہ قبرص کے قریب پہنچ چکا تھا۔ ملاحوں نے فوراً جہازوں کا رُخ کھاڑیوں کی طرف موڑ دیا۔ ان کھاڑیوں کو اونچی نیچی پہاڑیاں گھیرے ہوئے تھیں۔ جن بندرگاہوں کے سامنے سمندر میں پہاڑیاں ہوتی ہیں ان بندرگاہوں کو محفوظ سمجھا جاتا ہے کیونکہ طوفان کے زمانہ میں سمندر کی تیز ہواؤں اور لہروں کا زور یہ پہاڑیاں توڑ دیتی ہیں۔

قبرص کا جزیرہ اُن دنوں بازنطینی شہنشاہ روم کے ماتحت تھا۔ آپ کو یاد ہو گا کہ یورپ کی عظیم الشان "سلطنت روما" دو حصوں میں تقسیم ہو گئی تھی۔ جس میں ایک کا دارالسلطنت اطالیہ کا شہر روم تھا اور یہ سلطنت روما الکبریٰ کہلاتی تھی۔ عیسائیوں کا سب سے بڑا پیشوا جسے "پوپ" کہا جاتا ہے وہ روم ہی میں رہتا تھا۔ دوسری سلطنت روما مشرق میں تھی جس کا دارالسلطنت قسطنطنیہ (استنبول) تھا۔ اس سلطنت کے ماتحت مشرقی یورپ کے کئی ملک اور بحرِ روم کے بیشتر جزائر تھے۔

جب سے سلطان صلاح الدین نے بیت المقدس (یروشلم) کو فتح کیا تھا، یورپ کے تمام ممالک میں خواہ وہ مشرقی ہوں یا مغربی، ہر جگہ آگ سی لگی ہوئی تھی۔ یہ آگ یروشلم کے لارڈ پادری نے لگائی تھی۔ سلطان صلاح الدین ایوبی نے بیت المقدس پر قبضہ کے بعد لارڈ پادری کو جزیہ .... چھوڑ دیا تھا۔ اُس کو نہیں بلکہ کئی سنگتان شاہ یروشلم اور دوسرے بہت سے عیسائی شہزادوں، نائٹوں اور ہاسپٹلرز وغیرہ کو بھی جزیہ لے کر رہا کر دیا تھا ممکن ہے کہ بعض لوگ اسے سلطان صلاح الدین کی غلطی سمجھیں لیکن یہ سب کچھ سلطان نے خالص انسانی ہمدردی کے تحت کیا تھا۔ بیت المقدس پر سلطانی قبضہ سے پہلے حطین کے مقام پر

عیسائیوں اور مسلمانوں کا عظیم معرکہ ہوا تھا۔ یہ جنگ ہی دراصل بیت المقدس کی جنگ بن گئی کیونکہ حطین کے میدان میں عیسائیوں کے تقریباً تمام بڑے بڑے سردار اور حکمران یا تو کام آ گئے تھے یا پھر مسلمانوں کے ہاتھوں گرفتار ہو گئے تھے۔

پھر جب سلطان فاتحانہ بیت المقدس میں داخل ہوا تو اُس کے حضور وہ عیسائی خواتین پیش ہوئیں جن کے شوہر مارے جا چکے تھے یا گرفتار تھے۔ ان خواتین کا تعلق حکمران گھرانوں سے تھا اور یہ زار و قطار روتی ہوئی سلطان کے سامنے آئی تھیں۔ سلطان کو ان اُجڑی اور پریشان حال خواتین پر بڑا رحم آیا اور اُسے فوراً وہ حدیث یاد آ گئی جس کا مفہوم کچھ اس طرح تھا۔

"تم دنیا میں مخلوقِ خدا پر رحم کرو اللہ آسمان پر تم سے مہربانی سے پیش آئے گا"۔

سلطان نے حاجب کے ذریعہ دریافت کیا کہ یہ خواتین کون ہیں۔ حاجب نے خواتین سے دریافت کر کے عرض کیا۔

"عالیجاہ یہ وہ خواتین ہیں جن کے وارث جنگ میں مارے گئے ہیں یا گرفتار ہوئے ہیں"۔

سلطان نے پھر دریافت کیا کہ ان سے پوچھا جائے کہ یہ کیا چاہتی ہیں۔

حاجب پھر خواتین کے پاس گیا اور اُن کے سامنے سلطان کا سوال دہرایا۔ پھر اُن کا جواب لے کر سلطانِ عالی میں عرض کیا۔

"اے سلطانِ عالی مقام! خواتین درخواست کرتی ہیں کہ اگر اُن کے وارث لڑائی میں مارے جا چکے ہیں تو انہیں "قلعہ صور" میں بھیج دیا جائے اور اگر وہ گرفتار ہیں تو اُنہیں الطافِ خسروانہ کے تحت معاف فرمایا جائے اور اُن کی رہائی کا فرمان جاری ہو"۔ سلطان نے اُسی وقت فرمان جاری کیا۔

"جن خواتین کے وارث لڑائی میں مارے جا چکے ہیں اُنہیں اُن کی خواہش کے مطابق اُن کے عزیزوں کے پاس سرکاری اخراجات سے پہنچایا جائے نیز انہیں کم از کم چھ ماہ کے اخراجات کے لئے نقد رقم ادا کی جائے تاکہ وہ کوئی معقول ٹھکانہ بنا سکیں"۔

ایک دوسرے فرمان میں سلطان نے حکم دیا۔

"وہ تمام حکمران اور سردار جو جنگ حطین میں گرفتار ہوئے ہیں اُنہیں فی الفور رہا کر دیا جائے اور اُنہیں اُن کی مرضی کے مطابق اُس جگہ پہنچا دیا جائے جہاں وہ جانا چاہتے ہوں"۔

اللہ اللہ! یہ مسلمانوں کا سلطان تھا جس نے فاتح ہونے پر بے کس اور نادار خواتین پر رحم فرمایا۔ اُن کے وارثوں کو جن میں شاہِ یروشلم کے علاوہ عیسائیوں کے بڑے سردار اور حکمران شامل تھے بغیر کسی تفریق کے خواتین کی درخواست پر رہا کر دیا۔ اسی طرح یروشلم کی غیر مسلم آبادی کو جزیہ لے کر جانے کی اجازت دے دی۔ اس فاتح بیت المقدس کے مقابلہ پر ذرا اُن فاتحین بیت المقدس کا کردار ملاحظہ فرمائیے جنھوں نے ۱۰۹۸ء میں یعنی تقریباً ایک سو سال پہلے اسی یروشلم کو مسلمانوں کے ہاتھ سے چھینا تھا۔ ان فاتحین میں سے ایک صلیبی جنرل نے روم کے پوپ کو دشمنی فتح کے سلسلہ میں بڑے فخر کے ساتھ لکھا تھا۔

"ہم فاتحانہ یروشلم میں داخل ہوئے تو کافروں (مسلمانوں) کے خون سے یروشلم کی زمین نہ صرف سرخ تھی بلکہ وہاں خون کا ایک دریا بہہ رہا تھا اور ہمارے گھوڑے اس خون میں گھٹنوں گھٹنوں تک ڈوبے ہوئے تھے"۔

یہ اُس قتلِ عام کے متعلق ایک عیسائی کا خط ہے پھر ایک سو سال بعد جب سلطان صلاح الدین ایوبی یروشلم (بیت المقدس) میں فاتحانہ داخل ہوا تو ہر طرف اُس کا یہ اعلان گونج رہا تھا کہ خبردار اس ارضِ پاک پر انسانی خون کا ایک قطرہ بھی نہ گرنا چاہئے اگر کسی نے کسی کی نکسیر بھی پھوڑی تو اُس سے باز پرس ہو گی۔

بہرحال یہ تو اپنا اپنا ظرف ہے۔ عیسائیوں نے اسی بیت المقدس میں مسلمانوں کے خون کے دریا بہا دیئے تھے پھر جب مسلمانوں نے اس پر قبضہ کیا تو کسی عیسائی کی نکسیر تک نہ پھوٹ پائی۔ اب پھر اُسی بیت المقدس پر یہودیوں کا قبضہ ہوا تو اس طرح کہ پوری قوم فلسطین مہاجر ہو

کر ملکوں ملکوں خانماں برباد پھر رہی ہے اور جو فلسطین میں موجود ہیں اُن کا یہ حال ہے کہ کوئی ایسا دن نہیں جاتا جب کسی فلسطینی جوان یا بچے کا خون یہودی فوج نے نہ بہایا ہو۔

خیر اس وقت ذکر ہو رہا تھا بازنطینی سلطنت روما کا۔ قبرص کا جزیرہ اس سلطنت کے ماتحت تھا اور وہاں کا حکمران ایک بازنطینی شہزادہ تھا۔ ایک تو شہزادہ دوسرے حاکم قبرص۔ اسے کہتے ہیں کریلا اور نیم چڑھا۔ یہی حال قبرص کے حاکم کا تھا۔ وہ زمین پر قدم ہی نہیں رکھتا تھا۔ حاکم بددماغ ہو تو اُس کے عمال (افسر) اُس سے بھی زیادہ بددماغ اور مغرور ہو جاتے ہیں چنانچہ شاہ انگلستان کا بیڑا ہواؤں اور لہروں کے تھپیڑے کھاتا قبرص کے ساحل کے قریب پہنچا تو جزیرے والوں نے اپنے چند جنگی جہاز اور جنگی کشتیاں بھیج کر انگلستان کے بیڑے کو اپنے ساحل پر اُترنے سے روک دیا۔

انگلستانی بیڑے کے ہراول جہاز کا کپتان بھی اتنا ہی سرپھرا تھا جتنا قبرص کے جنگی جہازوں کا کپتان۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دونوں میں خوب تُو تُو میں میں ہوئی۔

جزیرے کے کپتان نے اپنے جہاز کے عرشے سے انگلستان کے ہراول جہاز کے کپتان سے کہا۔

"معلوم ہوتا ہے کہ تم نے کپتانی نئی نئی سنبھالی ہے اسی لئے کپتانی کے اصول اور قواعد سے ناواقف ہو"۔

انگلستانی کپتان نے بھی سختی سے جواب دیا۔

"میں تو بہت پرانا کپتان ہوں لیکن تم پر یہ ضرور شبہ ہوتا ہے کہ کسی کی سفارش نے تمہیں قبل از وقت کپتان بنوا دیا ہے ورنہ تمہیں یہ ضرور معلوم ہوتا کہ شاہوں اور شہنشاہوں کے جہازوں کا رنگ کیسا ہوتا ہے اور اُن پر کس طرح کا پرچم لہراتا ہے"۔

قبرصی کپتان گھبرا گیا۔ اُس نے غور سے دیکھا تو دور ایک سرخ رنگ کا جہاز کھڑا تھا۔ جہاز پر لہراتا جھنڈا صاف کہہ رہا تھا کہ یہ جہاز انگلستان کا ہے اور جہاز کا لال رنگ اس بات کی غمازی کر رہا تھا کہ یہ خاص جہاز انگلستان کے حکمران یعنی شاہ رچرڈ کا ہے۔ ان شناختوں کے باوجود قبرصی کپتان منہ کھا گیا اور سختی سے بولا۔

"اس سے بحث نہیں کہ یہ بحری بیڑا کس ملک کا ہے۔ سوال تو یہ ہے کہ دوسرے ملک سے آنے والے جہازوں کا یہ فرض ہے کہ وہ پہلے اپنی شناخت کرائیں اور ساحل پر اُترنے کی اجازت مانگیں کیونکہ آنے والا تو مہمان ہوتا ہے اور مہمان کا یہ فرض ہے کہ وہ اپنی شناخت کرائے"۔

اُس وقت تک شاہ رچرڈ اپنے جہاز کے عرشے پر آ گیا تھا۔ اُس کا جہاز بڑا تھا اور گہرے سمندر میں کھڑا تھا اس لئے وہ دونوں کپتانوں کی گفتگو تو نہ سن سکا مگر اُن کے ہاتھ کے اشاروں سے یہ اندازہ لگانے میں اُسے کوئی دقت محسوس نہیں ہوئی کہ دونوں کپتانوں میں تکرار ہو رہی ہے۔

اتنا سمجھتے ہی شاہ رچرڈ کا دماغ پھر گیا۔ اُس نے ایک چھوٹی کشتی سمندر میں اُتارنے کا حکم دیا اور کشتی کے جہاز سے لگتے ہی رسی کے ذریعہ رچرڈ بڑی تیزی سے کشتی میں اُتر گیا اور ملاح کو حکم دیا کہ کشتی اس جہاز کی طرف لے چلے جہاں دونوں کپتانوں میں تکرار ہو رہی تھی۔ ملاح نے کشتی کا رُخ اُسی طرف کر دیا۔

انگلستانی بحری بیڑے کے ملاحوں اور لشکریوں نے شاہ رچرڈ کو مخالف کے جہاز کی طرف جاتے دیکھا تو سیکڑوں کشتیاں شاہ رچرڈ کی تقلید میں سمندر میں اُتر گئیں۔ انگریز ملاح اور لشکری۔

"شاہ انگلستان زندہ باد"۔

"شہنشاہ انگلستان زندہ باد"۔

کے نعرے لگاتے سلطانی کشتی کی طرف بڑھے۔ اب تو یوں محسوس ہونے لگا جیسے قبرص پر انگلستانی بحری بیڑے نے حملہ کر دیا ہے۔ کئی سو جنگی کشتیاں جھنجھی چلاتی شاہ رچرڈ کی طرف بڑھ رہی تھیں۔ شاہ رچرڈ کا دل اور بڑھ گیا اور اُس نے ملاح کو کشتی کا رُخ ساحل کی طرف پھیرنے کا حکم دیا۔ رچرڈ کے پیچھے آنے والی کشتیوں کا رُخ بھی ساحل کی طرف ہو گیا۔

اُدھر قبرصی کپتان نے غصے میں آ کے انگریز کپتان

کو بُرا بھلا تو کہہ دیا تھا لیکن اب پچھتا رہا تھا۔ اُس نے شاہ رچرڈ کے جھنڈے سے پہچان لیا تھا کہ وہ سرخ جہاز نہ صرف یہ کہ انگلستان کے بحری بیڑے سے تعلق رکھتا ہے بلکہ وہ شاہ انگلستان کا ذاتی جہاز ہے مگر اب کرتا تو کیا کرتا۔ سوائے خوشامد کے اُسے کوئی اور بات سوجھی ہی نہیں۔

"برادر کپتان مجھے معاف کر دو۔ آپ کو پہچاننے میں مجھ سے سخت غلطی ہوئی"۔ قبرصی کپتان گڑگڑاتے ہوئے انگریز کپتان کے سامنے جھک گیا۔

انگریز کپتان اکڑ گیا۔ "میرے معاف کرنے نہ کرنے سے کچھ نہیں ہوتا۔ شہنشاہ خود تمہارا فیصلہ کریں گے"۔

اب انگلستان کی سینکڑوں جنگی کشتیاں قبرص کے ساحل کی طرف بڑھ رہی تھیں بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ قبرص کے گرد گھیرا ڈال رہی تھیں۔ قبرصی کپتان کے ہاتھ پیر پھول گئے۔ اُس نے بھی سمندر میں کشتیاں ٹھہرنے کا حکم دیا اور یہ بھی حکم دیا کہ شہنشاہ انگلستان کو سلامی دی جائے۔

اتنی دیر میں شاہ رچرڈ ساحل کے قریب پہنچ چکا تھا۔ اُسے ساحل پر اُترنے کی اتنی جلدی تھی اُس نے ساحل سے چند قدم پہلے ہی کشتی چھوڑ دی اور گھٹنوں گھٹنوں پانی میں چھپ چھپ کرتا ہوا کنارے کی طرف چلا۔ اُس کی کشتی والوں نے اپنے شاہ کو پانی میں دیکھا تو خود بھی کشتی چھوڑ کے پانی میں اُتر گئے اور شاہ کے دائیں بائیں چلنے لگے۔ شاہی ملاح اور کچھ لشکری پہلے ہی کنارے پر پہنچ چکے تھے۔ انہوں نے قبرصی ساحلی افسر کو ذرا دھمکا کر کچھ کوچ اور کرسیاں منگالی تھیں۔

شاہ رچرڈ بھیگا ہوا کنارے پہنچا تو ایک بحری کپتان نے اُسے سہارا دے کر اُوپر چڑھایا اور کرسی پر لا کے بٹھا دیا۔ شاہ رچرڈ سخت غصے میں تھا اور کسی سے بات نہیں کر رہا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے بحری بیڑے کے تمام لشکری ساحل پر اُتر گئے اور انہوں نے پوزیشن سنبھال لی۔

آخر شاہ رچرڈ نے پہلا حکم صادر کیا۔ "بندرگاہ کے تمام قبرصی افسروں کو حراست میں لے لیا جائے"۔

شاہ کی زبان سے الفاظ ادا ہوئے تھے کہ اُس کے فوجی جوان اور افسر ساحلی دفتر میں گھس گئے اور منٹوں میں آٹھ افسروں کو گرفتار کر کے لے آئے۔

شاہ رچرڈ نے دوسرا حکم جاری کیا۔ "اس قبرصی افسر کو پابہ زنجیر حاضر کیا جائے جس نے ہمارے کپتان سے گستاخی کی تھی"۔

وہ کپتان ساحل پر آ چکا تھا اور ایک طرف سر جھکائے کھڑا تھا۔ پہلے تو اُس نے سوچا کہ بھاگ کے نکل جائے مگر پھر اُس نے اپنا ارادہ بدل دیا اور خود ہی حاضر ہو گیا۔

"عالیجاہ! یہ گستاخی مجھ سے سرزد ہوئی تھی۔ میں اپنی غلطی تسلیم کرتا ہوں۔ مجھ سے انگلستان کے بحری بیڑے کو پہچاننے میں غلطی ہوئی۔ امید ہے کہ ظلِ الٰہی اس گستاخی کو درگزر فرمائیں گے"۔

"تم نے اپنی غلطی تسلیم کی ہے۔ ہم نے تمہیں معاف کیا"۔ اتنا کہہ کے شاہ نے منہ دوسری طرف گھما لیا جیسے یہ کوئی غیر اہم بات تھی۔

قبرصی کپتان کو فوراً چھوڑ دیا گیا۔

"جزیرے کا حکمران اب تک ہماری پیشوائی کو نہیں آیا"۔ رچرڈ نے ایک اور حکم جاری کیا "ایسے غافل حکمران کو گرفتار کر کے ہمارے حضور پیش کیا جائے"۔

انگریز بحری افسروں نے شاہ کے اس حکم کو سنا تو اُن کے چہروں سے پریشانی کا اظہار ہونے لگا۔ ایک غیر ملک میں انگلستان سے ہزاروں میل دور کسی حکمران کی گرفتاری کا حکم دینا کوئی عقلمندی کی بات نہیں معلوم ہوتی تھی۔

قبرص کے گرفتار افسر جو سامنے ہی کھڑے تھے اُن کے چہرے متغیر ہو گئے۔ ایک تو یہ اُن کی اور اُن کے حکمران کی سخت توہین تھی۔ دوسری بات یہ تھی کہ انہیں خطرہ پیدا ہوا کہ کہیں قبرص کا بازنطینی حکمران جو شہنشاہ قسطنطنیہ کا قریبی عزیز تھا، غیرت میں آ کے جنگ نہ شروع کر دے۔

مگر شاہ رچرڈ کا چہرہ بالکل سپاٹ تھا۔ اُس کے افسر حاکم قبرص کے محل کا پتہ لوگوں سے دریافت کرنے میں لگے تھے۔ اُسی وقت ایک قبرصی ملاح نے چیخ کے کہا۔

"شاہ قبرص تشریف لا رہے ہیں"۔

سب کی نظریں ملاح کی طرف اُٹھیں پھر اُس کی نظروں کے تعاقب میں شاہِ قبرص تک پہنچیں۔ شاہ قبرص ایک نوعمر عمر کا تنومند آدمی تھا۔ اُس کے چہرے پر ایک خاص قسم کا جلال تھا مگر اس وقت وہ گھبرایا ہوا دکھائی دیتا تھا۔ اُس کے دائیں بائیں چند قبرصی افسر تیز تیز قدموں سے چل رہے تھے۔

اُس وقت رچرڈ کے سر پر نہ تو تاج تھا اور نہ جسم پر شاہی لباس اس کے باوجود قبرص کے حکمران نے اُسے دور ہی سے پہچان لیا کہ یہی شاہ انگلستان ہے جو ایک بڑے لشکر کے ساتھ ساتھ قبرص کے جزیرے میں زبردستی گھس آیا ہے۔ قبرص میں نہ تو اتنی فوج تھی کہ وہ شاہ انگلستان کا مقابلہ کر سکتی اور نہ اُس کے پاس کوئی بڑا بحری بیڑا تھا جس کے زور پر وہ شاہ انگلستان کو قبرص کے قبضے سے روک سکتا۔

قبرص کے حکمران نے بہتر یہی سمجھا کہ جزیرے کو کشت و خون سے بچانے کے لئے اُسے مصالحانہ انداز اختیار کرنا چاہیئے۔ اُس نے شاہ رچرڈ کے سامنے پہنچ کے بڑے استقلال سے کہا۔

"قبرص کا حکمران، شاہِ انگلستان کو اپنے ملک میں خوش آمدید کہتا ہے"۔ شاہ رچرڈ نے اُسے سر سے پیر تک گھور کر دیکھا۔

"اچھا تو تم قبرص کے گورنر ہو؟" رچرڈ کا انداز تحقیر آمیز تھا۔

"جی ہاں شاہِ انگلستان۔ میں اس جزیرے کا حکمران ہوں اور بازنطینی شہنشاہ روم نے مجھے "شاہِ قبرص" کا خطاب بھی دیا ہے"۔ حاکم قبرص نے اپنا مختصر تعارف کرایا۔

"تم نے یہ کس طرح پہچانا کہ ہم سلطنت انگلشیہ کے تاجدار ہیں؟"

قبرص کے حکمران نے متانت سے جواب دیا۔ "اے شاہِ انگلستان! ایک بادشاہ دوسرے بادشاہ کو اپنی حسِ لطیف (چھٹی حس) سے پہچان لیا کرتا ہے"۔

"مگر تمہارے بدتمیز کپتان نے ہمیں کیوں نہیں پہچانا اور ہمارے ایک بحری افسر سے انتہائی گستاخ قسم کی گفتگو کی؟"

یہ رچرڈ کا محض اندازہ تھا ورنہ اُس کی اپنے کپتان سے اس سلسلے میں کوئی گفتگو نہ ہوئی تھی۔

قبرص کا حکمران کافی ذہین اور کچھ بذلہ سنج قسم کا انسان تھا۔ اُس نے مسکرا کے جواب دیا۔ "اے شاہِ انگلستان یہ افسر کسی ملک کا بادشاہ نہیں تھا کہ آپ کو شناخت کر سکتا مگر میں چونکہ قبرص کا بادشاہ ہوں اس لئے میں نے آپ کو فوراً پہچان لیا"۔

"بادشاہ!" شاہ رچرڈ نے منہ بنایا "اس چھوٹے سے جزیرے کا حاکم خود کو بادشاہ کہتا ہے؟"

"اے شاہِ انگلستان!" قبرص کا حکمران بڑے استقلال سے بولا۔ "میں واقعی اس جزیرے کا بادشاہ ہوں۔ مطلق العنان بادشاہ۔ خاندانی طور پر بھی میں ایک شہزادہ ہوں اور مجھے شہنشاہ قسطنطنیہ کے بھتیجے ہونے کا فخر حاصل ہے۔ اس بادشاہت پر میرا تیسرا حق اس لئے بھی ہے کہ شہنشاہ نے

ٹیکس فری

ملائشیا میں پہلی بیوی پر ٹیکس معاف ہے۔ ٹیکس دوسری بیوی سے ہوتا ہے۔ تیسری بیوی پر ٹیکس کی شرح بہت زیادہ ہے۔ وہاں کی حکومت کا خیال ہے کہ پہلی بیوی زندگی کی ضرورت ہے۔ باقی بیویاں عیش و عشرت ہیں۔ اگر کوئی رکھ سکتا ہے تو ٹیکس بھی دے سکتا ہے۔

ایک شخص اپنے ملازمین کو زیادہ سے زیادہ آسائشیں بہم پہنچانے پر خاصی رقم خرچ کر چکا تو اس نے ملازمین سے کہا: "میرا جی چاہتا ہے کہ جب میں ورکشاپ میں آیا کروں تو تمہیں نہایت خوشدلی کے ساتھ کام کرتے ہوئے دیکھا کروں۔ اگر تمہیں مزید کسی سہولت کی ضرورت محسوس ہو رہی ہو تو اس بکس میں جو میں نے گیٹ پر رکھوا دیا ہے اپنی تجاویز لکھ کر ڈال دینا۔"

ایک ہفتے بعد جب اس نے بکس کھولا تو اس میں بے شمار پرچیاں پڑی ہوئی تھیں اور ہر پرچی پر ایک ہی مضمون تحریر تھا۔ "مہربانی فرما کر آپ ورکشاپ میں ربڑ سول کے جوتے پہن کر تشریف نہ لایا کریں۔"

مجھے "شاہِ قبرص" کا خطاب خود عطا فرمایا ہے"۔

شاہ رچرڈ کو اُس کی یہ بات پسند نہ آئی۔ اُس نے کہا۔

"اے قبرص کے گورنر یاد رکھو کہ بادشاہ کسی ملک کا ہوتا ہے۔ قبرص جیسے جزیرے کا تو گورنر یا حاکم ہی ہو سکتا ہے"۔ شاہ رچرڈ نے اُس کی دوبارہ توہین کی مگر اُس کی رگوں میں بھی شاہی خون دوڑ رہا تھا۔ اسی لئے اُس نے بے خوفی سے جواب دیا۔

"اے انگلستان کے بادشاہ! قبرص ایک جزیرہ ہے اس لئے آپ کو یہاں کا بادشاہ نظر نہیں آتا لیکن جس ملک کے آپ بادشاہ ہیں وہ ملک بھی تو ایک جزیرہ ہی ہے یعنی جزائر برطانیہ جس کے ایک ملک یعنی انگلستان کے آپ بادشاہ ہیں"۔

قبرص کے حکمران کے برجستہ اور منہ توڑ جواب سے شاہ انگلستان کا چہرہ دھواں دھواں ہو گیا۔ حاکم قبرص نے صحیح کہا تھا۔ جزائر برطانیہ کے ایک حصہ کا نام انگلستان، دوسرے کا نام اسکاٹ لینڈ اور تیسرے کا ویلز وغیرہ ہیں مگر رچرڈ بجائے اس کے کہ شاہ قبرص کے اس برجستہ جواب کی داد دیتا، اُلٹا اُس پر تاؤ کھا گیا۔

شاہ نے اپنی کینہ پرور طبیعت کا مظاہرہ کیا۔ بولا۔

"قبرص کے بدزبان گورنر کو گرفتار کر لیا جائے"۔

قبرص کا حکمران اس اچانک حکم پر سن ہو گیا۔ اُس نے نرمی سے کہا۔ "اے شاہِ انگلستان میں نے آپ کو خوش آمدید کہا۔ آپ کو کورنش پیش کیا۔ آپ مرتبہ کا ذرا تو خیال فرمائیے۔ میں نے آپ سے جنگ نہیں کی۔ نہ میں آپ کا باغی ہوں پھر ایک بادشاہ دوسرے بادشاہ کی گرفتاری کا حکم کیوں دے رہا ہے۔ میں مشرقی روم کے شہنشاہ قسطنطنیہ کا بھتیجا ہوں۔ اُسے میری گرفتاری کی اطلاع ملے گی تو کتنا افسوس ہو گا؟"

شاہ رچرڈ نے قبرص کے حکمران کے اس مدلل اور مفصل جواب کا جواب الجواب اس طرح پیش کیا۔ اُس نے حکم دیا۔

"قبرص کے سابق حاکم کو پابہ زنجیر کیا جائے۔ اس لئے کہ یہ پاگل ہو گیا ہے اور پاگل کسی وقت بھی کسی کو کاٹ سکتا ہے"۔

قبرص کے حاکم کو بلاتاخیر زنجیریں پہنا دی گئیں اور اُسے جانوروں کی طرح ہانک کر ایک طرف کھڑا کر دیا گیا اور شاہ رچرڈ نے نئے نئے حکم دینا شروع کر دیئے۔

"تمام اہم مقامات پر پہرہ لگا دیا جائے"

ایک افسر نے سر جھکا کر سلام کیا اور ایک طرف روانہ ہو گیا۔

شاہ رچرڈ نے دوسرا حکم دیا۔

"فوج کو حکم دیا جاتا ہے کہ وہ قبرص کے تمام بحری اور بری فوجیوں کو غیر مسلح کر دیں اور پورے جزیرے میں اعلان کیا جائے کہ قبرص کے گورنر کو معزول کر دیا گیا ہے اس لئے تاحکم ثانی تمام انتظامی معاملات میں انگلستان کے ناظم سے رجوع کیا جائے جنہیں فوری طور پر مقرر کیا جا رہا ہے"۔

غرض یہ کہ شاہ رچرڈ اُس جگہ بیٹھا دو ڈھائی گھنٹے تک مختلف قسم کے احکامات صادر کرتا رہا۔ اس تمام وقت میں بیچارہ قبرص کا حکمران زنجیریں پہنے ایک طرف سر جھکائے کھڑا رہا۔ انگلستان کی بحری فوج نے پورے جزیرے پر قبضہ کر کے ہر جگہ اپنے پہریدار اور محافظ مقرر کر دیئے تھے۔ قبرص کے حکمران خاندان کے افراد سے تمام محلات خالی کرا لئے گئے تھے اور اُن میں شاہ رچرڈ کے عمال پہنچ چکے تھے۔

شام ہوتے ہی شاہ رچرڈ قبرص کے شاہی محل میں منتقل ہو گیا۔ قبرص کے حکمران کے اہل خانہ سے یہ محل زبردستی خالی کرایا گیا تھا۔ شاہ رچرڈ کے حکم کے مطابق قبرص کے حکمران کو اُسی طرح پابہ زنجیر رچرڈ کے اُس کمرے میں پہنچا دیا گیا تھا جہاں اُسے بیٹھنا تھا۔ شاہ رچرڈ نے حکم دیا تھا کہ قبرص کے حاکم کو رات دن ایسی جگہ رکھا جائے جہاں شاہ رچرڈ کی نظر پہنچ سکتی ہو۔ پتہ نہیں شاہ رچرڈ نے ایسا حکم کیوں دیا تھا۔ بظاہر یہ معلوم ہوتا تھا کہ اُس نے یہ قدم انتہائی احتیاط کے طور پر اُٹھایا تھا۔ شاید اُسے یہ خطرہ تھا کہ اگر قبرص کے حکمران کو قید خانہ میں رکھا گیا تو قبرصی اُسے قید خانہ توڑ کے نکال لے جائیں گے۔

جزیرہ قبرص کی تقدیر رات تک بالکل بدل چکی تھی۔ قبرصی پہریدار، محافظ، چھوٹے بڑے کارکن سب کے سب غائب ہوگئے تھے اور اُن کی جگہ انگریز لشکری ہر جگہ چلتے پھرتے اور ٹہلتے دکھائی دے رہے تھے۔

رات کا کھانا شاہ رچرڈ اپنی بہن جین اور چند بڑے سرداروں کے ساتھ کھا رہا تھا۔ یہ شاہی محل کا وہ حصہ تھا جس کی کھڑکیاں سمندر کی طرف کھلتی تھیں۔ صبح کے طوفان کی دھند ختم ہوچکی تھی۔ مطلع صاف تھا اور چاند پوری آب و تاب سے چمک رہا تھا۔ بحرروم کے ملکوں کی آب و ہوا یوں بھی خوشگوار ہوتی ہے لیکن طوفان کے بعد جب مطلع صاف ہوتا ہے تو بنات النعش گردوں (ستارے) کا حسن دیکھنے والا ہوتا ہے۔

کھانا نہایت خاموشی سے کھایا جا رہا تھا۔ شاید ہر شخص اپنی جگہ پریشان تھا سوائے شاہ رچرڈ کے۔ اُسے کسی قسم کی پریشانی نہ تھی۔ اُس کی لاابالی طبیعت اور بگڑی جوانی حوادثِ زمانہ سے ٹکراتی ہی رہتی تھی۔ مہم جوئی اُس کی طبیعت کا خاصہ تھی۔ شاہ رچرڈ نے قبرص کے حکمران کو پابند سلاسل کرتے وقت یہ بھی نہ سوچا کہ اُس حکمران کا چچا شہنشاہ قسطنطنیہ تھا جس کی مشرقی یورپ اور وسطی و مغربی ایشیا میں ایک ساکھ تھی۔ اگر شہنشاہ قسطنطنیہ اپنے بھتیجے اور قبرص کی بازیابی کے لئے میدان میں آجاتا تو رچرڈ کو کتنی مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا۔ اُس کا مقصد تو فلسطین پہنچ کر صلیبی جنگ میں حصہ لینا تھا مگر رچرڈ راستے ہی میں اٹکا ہوا تھا۔

شاہ رچرڈ نے تقریباً ایک سال صقلیہ میں گزارا تھا اور اب وہ قبرص پر اس انداز میں قبضہ جما رہا تھا جیسے وہ انگلستان کے بجائے قبرص ہی میں رہتا ہے۔ خیر یہ تو اُس کے سوچنے کا انداز تھا۔ اُس نے سوچا ہوگا کہ جس طرح اُس نے ایک سال صقلیہ میں گزارا ہے اسی طرح کچھ دن قبرص میں عیش و عشرت میں گزارے گا اور ہوسکتا ہے کہ اس دوران صلیبی جنگ کا کوئی فیصلہ ہوجائے۔ عیسائی صلیبی جنگ تو اُسی وقت ہار گئے تھے جب انہیں "حطین" کے میدان میں شکست ہوئی تھی اور اُن کے تمام بڑے بڑے نائٹس، ٹمپلرز اور ہاسپٹلرز یہاں تک کہ شاہ یروشلم بھی مسلمانوں کے ہاتھوں گرفتار ہوگئے تھے۔

جزیرہ قبرص کا شاہ رچرڈ اپنے مصاحبین کے ساتھ کھانے کی میز پر تھا۔ قبرص کا حکمران اُسی کمرے کے ایک کونے میں پابہ زنجیر کھڑا اپنی قسمت پر آنسو بہا رہا تھا کہ اچانک باہر سے شوروغل کی آوازیں آنے لگیں۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے کئی آدمی آگے پیچھے بھاگ رہے ہوں۔ چیخ پکار بھی ہوتی تھی۔

شاہ رچرڈ کا ہاتھ رک گیا۔ اُس کی تیوریوں پر بل پڑ گئے اور پھر غصہ سے لال بھبوکا ہوگیا۔ شاہ رچرڈ کی دونوں مٹھیاں بھینچ گئی تھیں اور شاید وہ کوئی سخت حکم دینے والا تھا کہ کھانے کے کمرے کا دروازہ ایک زوردار جھٹکے سے کھلا اور ایک خاتون یا دوشیزہ یا لڑکی کمرے میں محافظوں کو اپنے آگے سے ہٹاتی ہوئی داخل ہوئی۔

"تم میں رچرڈ کون ہے؟" لڑکی نے چیخ کے کہا۔ جوش و غصہ سے اُس کی آواز تھرتھرا رہی تھی۔ تمام حاضرین کی نظریں سمٹ کر شاہ رچرڈ کے چہرے پر جم گئیں۔

"تو تم ہو رچرڈ؟" اور لڑکی آہستہ قدم اٹھاتی رچرڈ کی طرف بڑھی۔ اُس کی نصف چہرہ سیاہ نقاب میں پوشیدہ تھا۔

"میرا باپ کہاں ہے رچرڈ؟" لڑکی شاہ رچرڈ کے بالکل قریب پہنچ کر چیخ پڑی اور اُس کے ساتھ ہی اُس نے چہرہ کا نصف نقاب نوچ کر پھینک دیا۔

پھر تو یوں محسوس ہوا جیسے کمرے میں سینکڑوں قندیلیں ایک ساتھ بھڑک اٹھیں ہوں۔ ماہتاب زمین پر اُتر آیا ہو یا آفتاب کچھ زیادہ ہی چمک پڑا ہو۔

ایک ریستوران کے باہر لگا ہوا نوٹس

"آگ لگ جانے کی صورت میں گھبرا کر بھاگنے کی کوشش نہ کریں۔ سکون سے کاؤنٹر پر آکر پہلے ہمارا بل ادا کریں اور پھر سرپٹ بھاگ کھڑے ہوں۔"

"تم میں سے رچرڈ کون ہے؟" نقاب پوش دوشیزہ نے چیخ کر کہا۔ اس کی آواز جوش و غضب سے تھرا رہی تھی۔

حاضرین کی نظریں سمٹ کر شاہ رچرڈ کے چہرے پر جم گئی تھیں۔ نقاب پوش دوشیزہ کی نظریں بھی دوسروں کی نظروں کا تعاقب کرتی ہوئی رچرڈ تک پہنچ چکی تھیں

"تو... تم ہو رچرڈ؟" نقاب پوش لڑکی آہستہ آہستہ قدم اُٹھاتی رچرڈ کے سامنے پہنچ گئی۔ اس کا نصف چہرہ لب تک نقاب میں چھپا ہوا تھا۔

"میرا باپ کہاں ہے رچرڈ...؟" لڑکی شیرنی کی طرح گرجی اور ساتھ ہی چہرے کا نقاب نوچ کر دور پھینکا۔

پھر تو یوں محسوس ہوا جیسے کمرے میں ایک ساتھ سیکڑوں قندیلیں بھڑک اُٹھی ہوں یا چاند اچانک زمین پر آگیا ہو یا پھر بقول شاعر۔

پھر اس کے بعد چراغوں میں
روشنی نہ رہی۔

شاہ رچرڈ کا چہرہ جو غصہ سے سرخ ہوگیا تھا اس کی رنگت پھیکی پڑ گئی یوں محسوس ہوتا تھا۔ جیسے اس کے چہرے پر ہوائیاں اُڑ رہی ہوں۔

لڑکی تھی کہ رچرڈ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے اُسے گھور رہی تھی باقی لوگ دم بخود تھے۔

"تیرا کیا نام ہے لڑکی؟" رچرڈ نے سنبھل کر پُر رعب لہجے میں کہا۔

"میں لڑکی نہیں شہزادی ہوں۔" لڑکی بپھر گئی۔

"میرا چچا شہنشاہ قسطنطنیہ اور باپ قبرص کا بادشاہ ہے۔"

"قبرص کا بادشاہ" رچرڈ نے اس کونے کی طرف دیکھا جہاں لڑکی کا باپ پا بجولاں کونے میں کھڑا تھا۔ لڑکی کی نظریں زنجیروں میں جکڑے باپ پر پڑیں تو وہ دانت پیس کر رچرڈ پر جھپٹی۔ "ظالم تُو نے میرے باپ اور اس ملک کے بادشاہ کا یہ حال کیا ہے؟"

وہ تو خیر ہوئی کہ رچرڈ کا حاجب درمیان میں آگیا ورنہ شاید لڑکی شاہ رچرڈ کا منہ اپنے ناخنوں سے نوچ ڈالتی۔

"سیدھی کھڑی رہ لڑکی ورنہ ہم کوئی سخت حکم بھی دے سکتے ہیں۔" رچرڈ نے لڑکی کو مرعوب کرنے کی کوشش کی۔

"مجھے یقین نہیں آتا کہ تم انگلستان کے بادشاہ رچرڈ ہو؟" لڑکی نے تحقیر آمیز لہجے میں کہا۔

"تیرے یقین نہ کرنے کی کیا وجہ ہے لڑکی...؟" شاہ رچرڈ نے پہلی بار قبرص کی شہزادی کو دلچسپی سے دیکھا۔

"اس لیے کہ اگر تم انگلستان کے بادشاہ ہوتے تو قبرص کے بادشاہ کو زنجیریں ہرگز نہ پہناتے..." لڑکی نے دلیری سے کہا۔

"یہ کوئی دلیل نہیں..." رچرڈ نے نفی میں سر ہلایا۔ "فاتح بادشاہ مفتوح بادشاہ کے ساتھ جو چاہے سلوک کر سکتا ہے۔"

"اے انگلستان کے بادشاہ..." لڑکی جرأت سے بولی۔ "ممکن ہے اُدھر کے ممالک میں یہی دستور ہو لیکن ہمارے بازنطینی شہنشاہ یا بادشاہ جب کوئی ملک فتح کرتے ہیں تو مفتوح بادشاہ کو یا تو قتل کر دیتے ہیں یا پھر آزاد کر دیتے ہیں ان کے ساتھ قیدیوں کا سلوک نہیں کیا جاتا۔"

"مگر ہم تمہارے بادشاہ کو زنجیروں سے آزاد نہیں کر سکتے۔" رچرڈ نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

"مگر میرے باپ کو پابہ زنجیر کیوں کیا گیا انہوں نے آپ کا کیا نقصان پہنچایا تھا۔" لڑکی نے جرح کا انداز اختیار کیا "ایک تو تم نے ایک آزاد ملک پر بغیر الٹی میٹم کے حملہ کیا خزانہ لوٹا آبادیاں تاراج کیں پھر ایک بے قصور بادشاہ کو زنجیروں میں جکڑ دیا۔۔"

"لڑکی تمہیں معلوم ہونا چاہئے کہ رچرڈ کے منہ سے نکلا ہوا ہر لفظ قانون کا درجہ رکھتا ہے اور ہم حکم دینے کے بعد واپس نہیں لیا کرتے۔" شاہ رچرڈ نے اُسے صاف جواب دے دیا۔

مگر شہزادی قبرص اپنی بات پر اڑ گئی تھی اس نے کمال جرأت کا مظاہرہ کیا اور بولی۔ "شاہ رچرڈ نے اچھا کیا کہ مجھے یہ بتایا کہ وہ حکم دے کر واپس نہیں لیا کرتے۔ اس سے ظاہر ہو گیا کہ شاہ رچرڈ کسی قانون کے پابند نہیں ہیں ورنہ بادشاہ تو صرف وہ ہوتا ہے جو حکم دینے پر قادر ہو اور اپنے دیے ہوئے حکم کو منسوخ کرنے کی بھی قدرت رکھتا ہو۔"

اس ترکی بہ ترکی جواب نے شاہ رچرڈ کو بد حواس کر دیا اس نے محسوس کیا کہ شہزادی قبرص سے بحث کر کے اس نے غلطی کی شہزادی جس قدر خوبصورت تھی اُس سے کہیں زیادہ عقلمند بھی تھی۔

شاہ رچرڈ کچھ دیر سوچنے کے بعد مضمحل آواز میں بولا۔

"ہم شاہ قبرص کو آزاد کرتے ہیں لیکن ان کے دونوں دستوں میں الگ الگ چاندی کے دو کڑے پہنائے جائیں اور یہ کڑے ہیرے جواہرات سے مرصع ہونا چاہئیں۔ شہزادی قبرص جس نے اب تک اپنا نام بتانے سے گریز کیا ہے وہ آج سے ہماری حفاظت میں رہے گی۔"

اب قبرص کی شہزادی پھر گویا ہوئی۔

"اے عالی مقام شاہ انگلستان۔" شہزادی بڑے ادب سے بولی۔ "مجھے افسوس ہے کہ میں شاہ رچرڈ سے گستاخی کی مرتکب ہوئی ہوں سب سے پہلے میں اس کے لئے معذرت خواہ ہوں۔ میں نے شاہ سے ایک گستاخی اور کی ہے۔ یہ گستاخی میں نے شاہ کے حکم کے باوجود اپنا نام بتانے سے گریز کر کے کی تھی۔ جب میں شاہ کے حضور آئی تھی تو جذبات سے مغلوب تھی اور مجھے اپنے باپ کی سلامتی کے علاوہ اور کوئی بات سجھائی نہ دیتی تھی۔۔۔"

"شہزادی۔" شاہ رچرڈ جو شہزادی کے سحر انگیز حسن میں پوری طرح گرفتار ہو چکا تھا اس نے شہزادی کو ٹوکا۔ "تمہیں مزید معذرت کی ضرورت نہیں۔ ہم نے تمہیں اور تمہارے باپ کو معاف کر دیا ہے۔"

"اے بادشاہ انگلشیہ" شہزادی نے شوخ نظروں سے شاہ کو دیکھا "آپ بادشاہ ہیں اور بقول آپ کے آپ نے قبرص پر قبضہ کیا ہے مگر ایک طرف آپ شاہ قبرص کو طوق و سلاسل میں جکڑنے کا حکم دیتے ہیں مگر فوراً شاہ قبرص کی معافی کا اعلان کیا جاتا ہے۔ کیا یہ معافی شاہ قبرص کی قید و بند کی پابندیوں سے کچھ کم ہے اگر میرا باپ شاہ قبرص غلامی کے چاندی کے کڑے پہن کر محل سے باہر نکلے گا تو کیا لوگ اس کا مذاق نہ اُڑائیں گے۔ اس پر قیدی کا آوازہ تو نہ کسیں گے؟"

شاہ رچرڈ، شہزادی کو دیکھتے ہی اُسے دل دے بیٹھا تھا اور اب اس کی ناراضگی مول لینے پر آمادہ نہ تھا اس لئے انتہائی نرم لہجے میں بولا۔ "تم اپنے باپ کے سلسلے میں اور کیا رعایت چاہتی ہو؟"

چالاک شہزادی نے شاید اس کا جواب پہلے ہی سوچ رکھا تھا فوراً بولی۔ "شاہ قبرص کو چاندی کی ایک جڑاؤ زنجیر گلے میں پہنائی جا سکتی ہے جس میں ایک چھوٹی صلیب

مقدس آدرزاں ہو۔"

شاہ رچرڈ شہزادی کو اب بہر صورت خوش رکھنا چاہتا تھا اس لئے اس نے شہزادی قبرص کی خواہش کو اپنے اعلان میں شامل کر دیا۔ شاہ نے نیا فرمان جاری کیا۔

"فرمان جاری کیا جاتا ہے کہ شاہ قبرص کے متعلق اس سے پہلے جتنے احکامات جاری ہوئے وہ سب منسوخ تصور کئے جائیں شاہ قبرص کی عزت، حرمت، تخت و تاج اور اقتدار اس فرمان کے ذریعہ بحال کیا جاتا ہے لیکن شاہ قبرص اپنے نام، احکام اور اقتدار کو اس وقت عمل میں لائیں گے جب انگلستان کا لشکر قبرص کو چھوڑ کر فلسطین روانہ ہوگا اسی طرح شاہ قبرص کے تمام محلات اور دفاتر بھی واگزار کئے جاتے ہیں۔ ان محلات اور دفاتر پر انگلستان کی فوجوں کا صرف عارضی قبضہ رہے گا۔"

شاہ انگلستان کا فرمان بڑا دلفریب نہیں بلکہ پُر فریب تھا فرمان کے خوبصورت الفاظ کے پیچھے کوئی خوش آئند بات نہ تھی۔ غیر ملکی فوجوں کے قبرص چھوڑنے کی کوئی تاریخ مقرر نہیں کی گئی تھی شہزادی قبرص کو رچرڈ اپنی حفاظت میں کیوں لے رہا تھا اس کی بھی کوئی وضاحت نہیں کی گئی تھی۔

مگر اب کون بول سکتا تھا شہزادی اپنی بے پناہ جرأت کے زور پر جس میں اس کے حسن کا سحر بھی شامل تھا صرف اس قابل ہوئی تھی کہ اپنے باپ کو باعزت بری کرا سکی تھی لیکن شاہ قبرص کے بری ہونے سے وہ خود شاہ رچرڈ کی قید میں چلی گئی تھی کیونکہ شہزادی کو اس کے اپنے محل سے رچرڈ کے برابر والے محل میں رہنے کا حکم ہوا تھا اور شہزادی کے لئے وہی لوازمات مہیا کئے گئے تھے جو ایک ملکہ کے شایان شان ہوتے ہیں اور لوگ اس غلط فہمی میں مبتلا ہوگئے تھے کہ شاہ رچرڈ بہت جلد شہزادی قبرص سے شادی رچائے گا۔

مگر یہ تمام اندازے اس وقت بالکل غلط ثابت ہوئے جب صقلیہ سے اس کے پاس اطلاع پہنچی کہ شہزادی برنگیریا آف نوارے بہت جلد اس کے پاس قبرص پہنچ رہی ہے۔

نوارے شمالی اسپین کی مسیحی ریاست تھی اس زمانے میں خلافت اندلس خود ہمارے اعمال کی وجہ سے ختم ہو چکی تھی اور اندلس (اسپین) میں طوائف الملوکی کا دور دورہ تھا نوارے قسطلان اور اراگون کی مسیحی ریاستیں بہت طاقتور ہو چکی تھیں۔

شہزادی برنگیریا کے قبرص آنے کی اطلاع نے شاہ رچرڈ اور اس کے سرداروں اور عمائدین کو ششدر کر دیا۔ رچرڈ کے سرداروں کا بھی یہی خیال تھا کہ جس طرح رچرڈ نے صقلیہ میں ایک سال تک عیاشیوں کا بازار گرم کر رکھا تھا اسی طرح وہ قبرص میں بھی سال چھ مہینے ضرور داد عیش دے گا لیکن برنگیریا کی آمد سے شاہ رچرڈ پر ضرور پابندی لگ گئی کیونکہ برنگیریا کو آخر ملکہ انگلستان ہونا تھا۔

شاہ رچرڈ نے برنگیریا کو روکنے کی قطعی کوشش نہ کی بلکہ وہ اس خبر سے مسرور ہوا۔ بلاشبہ قبرص کی شہزادی سوسن حسن و جمال میں شہزادی برنگیریا سے کہیں آگے تھی مگر رچرڈ کی نظر میں برنگیریا ہونے والی ملکہ انگلستان تھی اور سوسن کی حیثیت ایک داشتہ سے زیادہ نہ تھی اس نے اسی لئے فیصلہ کیا تھا کہ وہ شہزادی برنگیریا اور شہزادی قبرص یعنی سوسن کو اپنے اپنے مقام پر رکھے گا اور کوشش کرے گا کہ برنگیریا کو شہزادی سوسن کے بارے میں کچھ علم نہ ہو سکے۔

جہاں تک شہزادی سوسن کا تعلق ہے وہ شاہ رچرڈ کے مزاج سے بڑی حد تک واقف ہو چکی تھی اس کے کانوں تک بھی برنگیریا کی آمد کی خبر پہنچ چکی تھی اس سلسلہ میں اس نے اپنی کنیزوں سے معلومات حاصل کرنے کی کوشش بھی کی تھی لیکن سوسن کے ارد گرد جو کنیزیں خدمت پر مامور تھیں وہ سب کی سب انگریز عورتیں تھیں ایک تو وہ قبرصی یا یونانی زبان نہ جانتی تھیں دوسرے جو سوسن کی باتیں کچھ بھی سکتی تھیں وہ جان بوجھ کر انجان بن جاتی تھیں اور جب سوسن ان سے اس بارے میں بات کرنے کی کوشش کرتی وہ آئیں بائیں شائیں کر کے بات کو ٹال جاتیں۔

پھر ایک دن شاہ رچرڈ نے شہزادی قبرص کو بلا کر اچانک انکشاف کیا۔

"شہزادی سوسن ہماری منگیتر شہزادی برنگیریا آف نوارے قبرص آرہی ہیں ہم ان سے قبرص ہی میں شادی کریں گے اور یہیں ہنی مون منائیں گے۔"

شہزادی کے پیروں کے نیچے سے زمین نکل گئی۔ اس کے تمام سپنے اک جھناکے کے ساتھ ٹوٹ کر بکھر گئے اس نے شاہ رچرڈ سے بہت سی توقعات وابستہ کرلی تھیں شاہ رچرڈ اس وقت چونتیس سالہ جوان تھا اور اُسے خوبصورت کہا جاسکتا تھا مگر شہزادی سوسن کو جس ظالمانہ انداز میں شہزادی برنگیریا آف نوارے کے آنے کی اطلاع دی اس سے شہزادی سوسن کا دل ٹوٹ گیا۔

شاہ رچرڈ کچھ دیر سوسن کے جواب کا انتظار کرتا رہا لیکن سوسن بولتی کیا اس کے پاس کوئی جواب ہی نہ تھا شاہ رچرڈ اپنے فیصلوں میں آزاد تھا اس کا خیال تھا کہ شاید وہ کبھی رچرڈ کے دل و دماغ پر قابو پاسکے مگر اب تو یہ خیال بھی چکنا چور ہوگیا تھا۔

"تم نے ہمیں جواب نہیں دیا سوسن؟" شاہ رچرڈ کے لہجے میں تلخی آگئی تھی۔

سوسن نے ڈبڈبائی آنکھوں سے رچرڈ کو دیکھا۔ "شاہ نے مجھ سے کوئی سوال تو نہیں کیا تھا جس کا میں جواب دوں آپ کو مجھ تک ایک خبر پہنچانا تھی وہ پہنچ گئی۔"

"ہاں یہ بات تو ہے۔" شاہ رچرڈ نے نہ جانے کیا سمجھتے ہوئے کہا۔ "یہ اطلاع دینا ضروری تھی ممکن ہے اس سے تمہیں تکلیف پہنچی ہو لیکن تمہیں کسی قسم کی فکر نہ ہونا چاہئے۔"

"بالکل نہیں شاہ محترم۔" سوسن نے سنبھلتے ہوئے کہا۔ "یہ اطلاع تو میرے لئے نوید مسرت ہے۔"

"کیا مطلب ہے؟"

شاہ رچرڈ نے اسے گھور کر دیکھا اور اس کی تیوریوں پر بل پڑ گئے تھے۔

سوسن نے چہرے پر مصنوعی مسکراہٹ کو سجاتے ہوئے کہا۔ "شاہ کی شادی ہو رہی ہے کیا یہ میرے لئے نوید مسرت نہیں۔ مجھ سے زیادہ آپ کے اور کون قریب ہوگا اور مجھ سے زیادہ خوشی اور کسی کو کیسے ہوسکتی ہے؟"

"ٹھیک ہے ٹھیک ہے۔" شاہ خوش ہوگیا... "مجھے تم سے یہی امید تھی سوسن۔ تمہارا مقام یہی رہے گا اس میں کسی قسم کا فرق نہیں پڑے گا یہ بات تمہارے حق میں ہوگی کہ تم برنگیریا سے دور دور رہو۔ اسے تمہارے بارے میں کوئی اطلاع نہ ہوسکے گی تم بھی کوشش کرنا کہ اس کی نظروں میں نہ آؤ۔"

"میں آپ کے حکم کی ہمیشہ پابند رہوں گی..." سوسن نے افسردگی سے کہا پھر ذرا رک کر اچانک بولی۔ "کیا مجھے قبرص میں قیام کرنا ہوگا؟"

"ہرگز نہیں سوسن، تم ہمارے جسم کا ایک حصہ بن چکی ہو..." شاہ نے بڑے جوش سے کہا۔ "تمہیں برنگیریا کے برابر اختیار حاصل ہوں گے سوائے اس کے کہ تم دنیا کی نظروں میں ملکۂ انگلستان نہ بن سکو گی۔"

"شاہ بے فکر رہیں۔" سوسن نے یوں کہا جیسے اس نے حالات سے سمجھوتہ کرلیا ہو۔ "میں اپنی اوقات پر ہمیشہ نظر رکھوں گی۔"

"پھر تم یوں سمجھ لو کہ رچرڈ کی نظروں میں تم سے زیادہ کسی اور کا مقام نہیں ہوسکتا۔" شاہ رچرڈ نے زور دے کر کہا۔ "شہزادی برنگیریا انگلستان کی ملکہ ہوگی اور شہزادی سوسن شاہ انگلستان کے دل کی ملکہ بن کر رہے گی۔"

شہزادی سوسن کو حالات سے سمجھوتہ کرنا ہی پڑا اس کے سوا کوئی اور چارہ بھی تو نہ تھا۔ شاہ نے پہلے دن ہی کہہ دیا تھا کہ شہزادی قبرص ہماری حفاظت میں رہے گی اس کا صاف مطلب یہ تھا کہ اُسے یرغمال بنا کے رکھا جائے گا اور اس کی حیثیت ایک شاہی داشتہ سے زیادہ کبھی نہ بڑھ سکے گی۔

-----o-----

شہزادی برنگیریا آف نوارے کا بڑا شاندار استقبال کیا گیا۔ شاہ رچرڈ نے اپنے ایک اعلان کے ذریعہ ہر خاص و عام کو تاکید کی تھی شہزادی سوسن کے بارے میں شہزادی

برنگیریا کو کچھ نہ معلوم ہونا چاہئے اگر کسی نے غلطی سے بھی سوسن کے بارے میں شہزادی برنگیریا کے سامنے کسی قسم کا بھی ذکر کیا تو قابل گردن زدنی ٹھہرے گا اس لئے لوگوں نے سوسن اور شاہ رچرڈ کے تعلقات کو اپنے ذہن سے کھرچ کر پھینک دیا تھا۔

شہزادی سوسن سے کسی کو ملنے کی اجازت نہ تھی یہاں تک کہ اس کا باپ بھی اس سے ملاقات نہ کر سکتا تھا۔ شہزادی برنگیریا کے قبرص آنے سے شہزادی سوسن اپنی سہیلیوں میں بھی خود کو تنہا محسوس کرتی تھی۔ شاہ رچرڈ نے شہزادی سوسن کو انگلستان کی کنیزوں کے علاوہ چھ قبرص کی کنیزیں اور اتنی ہی سہیلیاں ساتھ رکھنے کی اجازت دی تھی لیکن شہزادی سوسن کی سہیلیاں اور کنیزیں شہزادی ہی کی طرح اس کے محل میں قید ہو گئی تھیں ان کے محل پر سخت پہرہ تھا پرندہ تک پر نہ مار سکتا تھا۔ شہزادی برنگیریا کو قبرص آئے دس دن ہو چکے تھے ان دنوں میں شاہ کے حضور صرف ایک بار طلبی ہوئی تھی وہ نصف شب گزرنے کے بعد جبکہ وہ اپنے محل میں محو خواب تھی کہ اس کی کنیز نے اسے نیند سے بیدار کر دیا۔

شہزادی سوسن ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی۔ آنکھیں ملتی ہوئی بولی۔ "خیریت تو ہے مجھے اس وقت کیوں جگایا گیا ہے؟"

"آپ کو شاہ انگلستان نے یاد فرمایا ہے شہزادی۔" کنیز نے وضاحت کی۔ "ایک شاہی غلام اور دو کنیزیں مہمان خانے میں انتظار کر رہے ہیں۔

شاہ رچرڈ کا حکم۔ سوسن کو تعمیل کرنا پڑی جلدی جلدی تیار ہوئی اور شاہی غلام اور کنیزوں کے ساتھ شاہ کے پاس پہنچ گئی واضح رہے کہ شہزادی سوسن نے اپنے محل سے رچرڈ کے محل تک کا فاصلہ ایک بند گاڑی میں طے کیا تھا۔

شاہی خوابگاہ کے باہر صرف ایک سنگین بردار محافظ پہرے پر تھا شہزادی دونوں کنیزوں کے جلو میں خوابگاہ میں داخل ہوئی تو شاہ کے پاس دو مسلح کنیزوں کے اور کوئی نہ تھا شاہ رچرڈ مسہری کی ٹیک لگائے خیالوں میں گم تھا سوسن کی آہٹ پر اس نے آنکھیں کھول دیں اور مسلح کنیزوں کو باہر جانے کا اشارہ کیا

خوابگاہ کی فضا مختلف خوشبوؤں سے بسی ہوئی تھی روشنی کم تھی صرف ایک دو شاخا قندیل روشن تھی۔ ماحول پراسرار نہیں بلکہ ہیجان انگیز تھا۔ سوسن نے مسہری کے قریب پہنچ کر شاہ کو تعظیم پیش کی شاہ نے اسے اپنے پائنتی بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

"تم سوچتی ہو گی کہ شاید ہم نے تمہیں بھلا دیا؟" شاہ کے چہرے پر ہلکا سا تبسم تھا۔ ہم تمہیں کبھی نہیں بھلائیں گے سوسن۔"

شاہ نے خود ہی سوال کیا پھر خود ہی اس کا جواب بھی دے دیا۔

شہزادی سوسن کی بھرپور جوانی تھی۔ نیند سے بھری آنکھوں میں سرخ ڈورے عجب بہار دکھا رہے تھے۔

وہ شب سوسن نے شاہ رچرڈ کے عشرت کدے میں گزاری اور صبح کو جب وہاں سے رخصت ہوئی تو بہت خوش تھی نہ معلوم شاہ رچرڈ نے اسے کون سے سبز باغ دکھائے تھے کہ وہ خوشی سے پھولے نہ سما رہی تھی اور اس کے قدم بہک رہے تھے۔

آئندہ اتوار کو سوسن کی تمام کنیزیں اس کے ارد گرد رہیں ہر کنیز باری باری سوسن کے پاس آتی اور اس کے چہرے کے تاثرات پڑھنے کی کوشش کرتی لیکن سوسن کا چہرہ دن بھر بالکل سپاٹ رہا اسے معلوم تھا کہ آج شاہ رچرڈ اور شہزادی برنگیریا آف نوارے کی شادی ہو رہی ہے وہ اپنے تصور میں دونوں کو نکاح نامے پر دستخط کرتے بھی دیکھ چکی تھی مگر اس نے اپنے چہرے سے کسی قسم کا تاثر ظاہر نہیں کیا پھر وہ کنیزوں کے سامنے سسکیاں بھر کے اپنی توہین نہ کرانا چاہتی تھی۔

دوسری صبح شہزادی سوسن کی آنکھ کچھ جلدی کھل گئی وہ یوں بھی تمام رات جاگتی اور کروٹیں بدلتی رہی تھی۔ کل دن بھر شاہ رچرڈ اور شہزادی برنگیریا آف نوارے کی شادی کے ہنگامے رہے رات بھر شراب و شباب کے جام لنڈھائے گئے تھے۔ یہ تمام لہو و لعب اگرچہ شہزادی سوسن کی آنکھوں کے سامنے نہ ہوا تھا اور اس کے کانوں نے شادی کے شادیانے سنے تھے مگر حساس شہزادی نے یہ پورے نظارے اپنی تصور کی آنکھوں سے دیکھ لئے تھے۔

صبح آنکھ کھلی تو اس نے اپنی قبرصی کنیز کو اپنی پائنتی باادب کھڑے دیکھا۔

شہزادی نے چہیتی کنیز مگیشا پر زور دیا کہ وہ جشن شادی کا مختصر احوال بتائے مگر وہ بیچ بیچ میں کہتی جاتی تھی کہ اے کاش برنگیریا کی جگہ ہماری شہزادی سوسن ہوتی۔ شہزادی سوسن کو اندازہ ہو گیا کہ شاہ رچرڈ نے دل بھر کے شاہ خرچی کی ہے اور ظاہر ہے کہ ان اخراجات کا قبرص کے خزانے ہی پر تو اثر پڑا ہو گا مگر رچرڈ کا اوباش دل ان باتوں کی پرواہ کب کرتا تھا۔

-------o-------

پورا ایک ماہ عسل گزارنے کے بعد شاہ رچرڈ کی سواری بادِ بہاری قبرص سے فلسطین کی طرف روانہ ہوئی لیکن رفتار اس قدر سست تھی جیسے محض سیر و تفریح کے لئے نکلا ہو صقلیہ کو مسخر کرنا، قبرص کی فتح اور برنگیریا سے شادی رچانے میں شاہ رچرڈ کو کافی وقت لگا۔

شاہ فرانس فلپ کی رفتار بھی سست تھی لیکن وہ شاہ انگلستان رچرڈ سے پہلے عکہ پہنچ گیا جو تیسری صلیبی جنگ کا مرکز تھا۔ نصرانیوں کے لئے وہ تائید غیبی بن کر آیا تھا۔ فلپ نے آتے ہی اپنی منجنیقوں، قافلہ شکن گرزوں اور دوسرے آلاتِ حرب سے حملہ کیا وہ دن میں قلعے کی دیوار ڈھانے اور رات میں خندقیں کھودنے، کھائیاں پاٹنے اور سیڑھیاں لگانے میں مشغول رہتے انہوں نے دیواروں کی طرح مٹی کا ایک پشتہ بنایا جس میں گول مینار بنائے اور چوبی تختوں اور پتھروں سے اسے بتدریج اونچا کرتے گئے۔ یہ پشتہ انہوں نے اپنے کیمپ کے پاس سے شروع کیا تھا پیچھے سے مٹی کھود کر آگے ڈالتے تھے۔

اس طرح وہ پشتہ بناتے بناتے اسے فصیل کے پاس لے آئے اس پر پتھروں کا اثر ہوتا تھا نہ آگ کا۔ شاہ فلپ بڑی تیزی سے محاصرہ سخت کر رہا تھا اور حملہ کرنے سے پہلے شاہ رچرڈ کا بڑی بے چینی سے انتظار کر رہا تھا۔

پہاڑیوں، وادیوں اور میدانوں میں ترکوں کی بے شمار فوج پڑی تھی جگہ جگہ ان کے رنگ برنگے خیمے نصب تھے۔ خود صلاح الدین ساحل سمندر اور بندرگاہ کی نگہبانی کر رہا تھا اور وقتاً فوقتاً عیسائیوں پر زبردست حملے کرتا رہتا تھا۔ شاہ رچرڈ بھی دشمن کی افواج کا جائزہ لے رہا تھا جب وہ بندرگاہ پر پہنچا تو شاہ فرانس فلپ نے تمام سرداروں کے ساتھ اس کا پرجوش استقبال کیا وہ سب بڑی بے چینی سے اس کا انتظار کرتے رہے تھے۔ شنبہ ۸ جون ۱۱۹۱ء کو رچرڈ عکہ پہنچا۔ اس کی آمد پر عیسائی پھولے نہ سماتے تھے۔

صلاح الدین نے تین دن پہلے العیاضیہ کی پہاڑی پر دوبارہ مورچے بنا لئے تھے۔ وہاں سے وہ دشمن کے مورچوں پر روزانہ حملے کرتا رہتا تھا۔ سلطان کی فوج پر سخت دباؤ پڑ رہا تھا

پھر بھی سلطان کے لشکری نصرانی مردہ گھوڑوں اور سپاہیوں کی لاشوں سے کھائیاں پاٹ دیتے تھے جو نصرانیوں کو ہی روزانہ صاف کرنا پڑتیں۔ حملہ آوروں کو پسپا کرنے اور ان کے سامان حرب کو برباد کرنے کے فرائض میں اس کام کا اور اضافہ ہوگیا۔ سلطان دراصل یہ چاہتا تھا کہ نصرانیوں کو اس طرف اُلجھائے رکھا جائے تاکہ منصور بن عکّہ پر ان کا دباؤ کچھ کم ہوجائے۔

اُدھر عکّہ کے قریب قلعہ شکن آلات تیار کئے اور ان کے ذریعے شہر پر حملہ کیا مسلمانوں نے جوابی حملہ کر کے فرنگیوں کے آلات یا تو جلا دئے یا پھر ان پر قبضہ کر لیا۔ فرنگی یہ صورت حال دیکھ کر پیچھے ہٹے اور انہوں نے مٹی کے ٹیلے قائم کئے اور ان آلات کے ذریعے ٹیلوں کی آڑ سے عکّہ پر حملہ کیا اس تدبیر سے انہیں کچھ کامیابی ہوئی اور منصور بن عکّہ کی حالت نازک ہوگئی۔

پھر جب مسلمان عکّہ کے محاصرے سے تنگ آگئے تو عکّہ کا سب سے بڑا سپہ سالار امیر سیف الدین علی بن احمد الہکاری المشطوب نیزے پر سفید جھنڈا باندھ کر قلعے سے نکلا۔ سفید جھنڈا امن کا نشان ہوتا ہے اس لئے امیر المشطوب کو عزت سے شاہ فرانس فلپ کے سامنے پیش کیا گیا۔

امیر المشطوب نے شاہ فرانس سے درخواست کی۔ "اگر اہل عکّہ کو امن کی ضمانت دی جائے تو عکّہ شاہ فرانس کے حوالے کر دیا جائے گا۔"

مغرور شاہ فرانس نے صاف انکار کر دیا۔ "حاکم قلعہ کی درخواست نا منظور کی جاتی ہے۔ عکّہ ہمارے ہاتھوں میں آ چکا ہے اب صلح ہماری شرطوں پر ہوگی۔"

امیر المشطوب بے نیل و مرام واپس آگیا عکّہ کے شہریوں کے حوصلے اور پست ہوگئے۔ عکّہ کے محاصرے کو تقریباً دو سال کا عرصہ ہو چکا تھا اور قلعے کے اندر مسلمان لشکر کی تعداد صرف چار ہزار تھی جو گھٹتے گھٹتے تین ہزار سے بھی کم رہ گئی تھی۔ اس سفارت کا اُلٹا نتیجہ نکلا اور مسلمانوں کے تین حلیف سردار ارسل الاسدی، ابن عزالدین جاولی اور سنقر برجانی اپنی فوج لے کر بھاگ گئے اس سے اہل عکّہ کو اور پریشانی ہوئی۔

عکّہ کے مسلمان ان بُرے حالات میں بھی مقابلہ پر ڈٹے رہے تو فرنگیوں نے خود ہی سلطان کے پاس سفارت بھیجی۔ جس نے سلطان سے درخواست کی کہ شہر فرنگیوں کے حوالہ کر دیا جائے تو اہل شہر کے ساتھ رعایت برتی جائے گی۔

سلطان نے بڑے حوصلے سے جواب دیا۔ "ہم عکّہ فرنگیوں کے حوالے کرنے پر تیار ہیں بشرطیکہ فرنگی شہر والوں کو پناہ دیں۔ ہم اس بات پر بھی تیار ہیں کہ فرنگی جس قدر شہریوں کو پناہ دیں گے ہم اتنی ہی تعداد میں فرنگیوں کے قیدیوں کو آزاد کر دیں گے۔ اس کے علاوہ نصرانیوں کی اس "صلیب عظیم" کو بھی فرنگیوں کو واپس کر دیا جائے گا جو ہمیں بیت المقدس پر قبضہ کے وقت حاصل ہوئی تھی۔"

فرنگی سفارت واپس گئی مگر اُدھر سے کوئی مزید جواب نہ آیا جس کا مطلب سوائے انکار کے اور کیا لیا جا سکتا تھا۔

دوسرے دن صبح نصرانیوں نے عکّہ پر شدید حملہ کیا۔ منصور بن کی مدافعت کی طاقت ختم ہو چکی تھی اس لئے امیر سیف الدین المشطوب کے حکم پر سفید جھنڈے بلند کر دیئے۔ حملہ اسی وقت رک گیا اور مندرجہ ذیل شرائط پر دو سال سے مقابلہ کرنے والا عکّہ نصرانیوں کے حوالے کر دیا گیا۔ شرائط صلح اس طرح تھیں۔

۱۔ حاکم شہر امیر المشطوب فرنگیوں کو دو لاکھ دینار تاوان دے گا۔

۲۔ پانچ سو نصرانی قیدی رہا کئے جائیں گے۔

۳۔ صلیب عظیم واپس کی جائے گی۔

۴۔ حاکم صور مارکوئیس کونرید کو چودہ ہزار دینار الگ ادا کئے جائیں گے۔

ان شرائط پر صلح ہو گئی۔ مال کی ادائیگی اور قیدیوں کی واپسی کے لئے دو ماہ کی مدت مقرر ہوئی۔ شہر فرنگیوں کے حوالے کر دیا گیا۔ لیکن شہر پر قبضہ کے بعد فرنگیوں نے شہریوں کے ساتھ غداری کی اور انہیں مال کی ادائیگی،

قیدیوں کی رہائی اور صلیب کی واپسی کے بدلے میں یرغمال بنالیا گیا۔

سلطان صلاح الدین نے ایک لاکھ دینار کی رقم اکٹھا کی اور ایک سردار فرنگیوں کے پاس بھیجا کہ سلطان فوری طور پر ایک لاکھ دینار دینے پر تیار ہے لیکن فرنگیوں کی فدائیہ جماعت اس بات کی ضمانت دے کہ فرنگی عہد شکنی اور وعدہ خلافی نہیں کریں گے لیکن فرنگیوں کے دل میں چور تھا وہ مسلمان یرغمالیوں کو کسی صورت چھوڑنے پر آمادہ نہ تھے بلکہ ان سے پچھلے دو سال میں قتل ہونے والے عیسائیوں کا بدلہ لینا چاہتے تھے۔

شاہ فرانس نے مسلم سردار کو جواب دیا۔ "جب تمہارا سلطان ہمیں ایک لاکھ دینار، قیدی اور صلیب بھیجے گا تو ہم جنہیں مناسب سمجھیں گے رہا کر دیں گے۔ باقی لوگوں کو اس وقت تک قید رکھیں گے جب تک باقی رقم نہیں مل جاتی۔"

اس سے فرنگیوں کی غداری ظاہر ہو گئی۔ وہ ایک لاکھ دینار حاصل کر کے صرف معمولی قیدیوں (یرغمالی) کو آزاد کر دیتے اور بڑے یرغمالیوں کے لئے بھاری فدیہ طلب کرتے۔

چنانچہ سلطان نے انہیں کوئی جواب نہ دیا۔

ماہ رجب کے آخر میں فرنگی شہر سے باہر جشن فتح منانے کے لئے نکلے تو مسلمانوں نے ان پر حملہ کر دیا۔ جب مسلمان ان کے محاذ تک پہنچے تو انہیں معلوم ہوا کہ وہ مسلمان جو فرنگیوں کے پاس قید تھے وہ دونوں صفوں کے درمیان قتل کر دیے گئے ہیں۔ فرنگیوں نے کمزور مسلمان کا صفایا کر دیا اور ان کے افسروں اور امراء کو فدیہ حاصل کرنے کے لئے اپنے پاس مقید رکھا۔ یہ دیکھ کر مسلمانوں کے ہوش اڑ گئے۔

رچرڈ نے سلطان کے تجویز رد کرتے ہوئے اس سے غیر مشروط ادائیگی کا مطالبہ کیا۔ اس طرح دن گزرتے گئے اور سلطان کی طرف سے کوئی جواب موصول نہ ہوا۔ کسی کو معلوم نہیں کہ سلطان کے ارادے کیا تھے البتہ یہ بات واضح تھی کہ اسے صلیبیوں کی نیت پر شبہ تھا اور وہ قیدیوں کی پہلی قسط کی واپسی کا منتظر تھا۔

لیکن رچرڈ کے رویے کے بارے میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہ رہی۔ اس نے عکہ میں اکابر امراء کی مجلس مشورت طلب کی اور نہایت خونی فیصلہ کیا چھبیس سو (۲۶۰۰) اسیران جنگ کو ہانک کر میدان میں لے جایا گیا جہاں کھمبوں سے رسیاں باندھ کر ان پر کمبل لٹکا دیے گئے تھے۔ یہ مقتل تھا۔ مسلمان قیدیوں کی مشکیں کس کے ان کے سر قلم کر دیے گئے اور باقی ماندہ مسلمانوں کو گشتی دستوں کے سامنے سولی پر لٹکا دیا گیا۔ انہوں نے یرغمال میں سے صرف چند امراء کی جان بخشی کی باقی سب کو تلوار کے گھاٹ اتار دیا۔

غیظ و غضب سے بپھرے ہوئے مسلمان گشتی رسالے نے عیسائیوں پُر جوش دھاوا بول دیا۔ ابھی خون شہیداں خشک بھی نہ ہوا تھا کہ اس میدان میں دوبارہ تلواریں ٹکرانے لگیں۔ آخر کار رسالہ پسپا ہو گیا اور اس نے سلطان کو اس حادثہ فاجعہ کی خبر دی۔

بلاشبہ سلطان کو اس بربریت کی توقع نہ تھی۔ مسلمانوں کے قتل کا اسے بہت صدمہ ہوا۔ اسی غیظ و غضب میں اس نے عیسائی اسیران جنگ سے نرمی کا برتاؤ نہیں کیا لیکن سلطان نے اس قتل عام کے جواب میں انتقامی طور پر ان عیسائی اسیروں سے جو اس کے قبضے میں تھے کوئی تعرض نہ کیا۔

ہیرالڈ لیم بڑی بے شرمی اور دیدہ دلیری سے لکھتا ہے کہ رچرڈ کے اس ظالمانہ فعل سے مسلمانوں کے جذبات سخت مشتعل ہو گئے لیکن یہ یاد رکھنا چاہیے کہ قرارداد معاہدہ کی رو سے رچرڈ من مانی کارروائی کرنے کا مجاز تھا۔ عیسائی محاصرے کے دوران لڑائی کے سخت دور سے گزرے تھے۔ انہوں نے بھاری نقصان اٹھائے تھے۔ وہ اپنے مقتولوں کو نہیں بھولے تھے۔ ان کے دلوں کے زخم ہرے تھے۔ وہ مسلمانوں کو گردن زدنی کافر سمجھتے تھے۔ لیکن عیسائیوں کے ان تند و تیز جذبات کے باوجود اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اس غیر ضروری کشت و خون سے رچرڈ کی ناموس اور عزت داغدار ہو گئی۔ سلطان صلاح الدین پر صد آفریں کہ اس عالی

حوصلہ انسان نے صرف علانیہ جنگ میں دشمن سے بدلہ لیا۔

صلیب و ہلال کا یہ معرکہ تقریباً دو سال رہا۔ یہ طویل مدت خود اس بات کی شہادت ہے کہ فنون جنگ میں مسلمانوں کی قابلیت نصرانیوں سے کچھ کم نہیں تھی۔ مسلمانوں کی ہمت اور مردانگی کی داد لین پول نے اس کے دور کے مؤرخین کے حوالے سے دی ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ مسلمان، عیسائیوں سے کہیں زیادہ دلیری اور بے جگری سے لڑے۔

مسلمان لشکر تعداد میں کم اور بیرونی امداد و اعانت سے محروم تھا۔ خلیفہ بغداد، سلجوقی امرا اور مراکش کے حکمراں سلطان صلاح الدین ایوبی کی بار بار کی کمک کی درخواست پر بھی کوئی مدد نہ کر سکے جبکہ صلیبی دنیا کے چیدہ چیدہ بادشاہ اپنے بڑے بڑے لشکر لے کر ساحل شام و فلسطین کی طرف آ رہے تھے۔ سلطان صرف اپنے مقبوضہ علاقے مصر سے کمک کا امیدوار تھا اور وہ بھی ناکافی۔

اس کے علاوہ اسلامی فوج میں صرف سلطان صلاح الدین کی بیمار اور نحیف و نزار ذات واحد تھی جو شہنشاہان انگلستان، فرانس اور جرمن کا مقابلہ تنہا کر رہی تھی۔ محصورین عکہ سلطان سے امداد کی درخواست کرتے ہیں۔ سلطان بڑے عزم سے دوسرے دن حملہ کا اعلان کرتا ہے مگر نقاہت اسے بستر سے اٹھنے بھی نہیں دیتی۔ آخر کار اپنے بھتیجے تقی الدین کو اپنی نیابت میں بھیجتا ہے اور لیٹے ہی لیٹے ہدایات دیتا رہتا ہے۔

سلطان نے قراقش کو قاہرہ سے بلوایا تھا۔ وہ اپنی پوری فوج کے ساتھ بڑے آرام اور تمکنت کے ساتھ قلعہ میں داخل ہو گیا اور کوئی بھی اس کا بال بیکا نہ کر سکا۔ صرف یہی نہیں بلکہ خود سلطان اور بہاء الدین اندر داخل ہو کر قلعہ کی فصیلوں پر گھوم کر ناکہ بندی کا جائزہ لیتے رہے اور کوئی کچھ نہ بگاڑ سکا۔ سلطان واپس ہوا اور اپنی فوج کی قیادت سنبھال لی۔

عکہ پر متعدد معرکے ہوئے اور پھر جب عیسائی مقتولین کی تعداد زیادہ ہو گئی تو سلطان نے بڑا دانشمندانہ کام کیا۔ لاشوں کو دریائے عکہ میں ڈلوایا گیا جس کا بہاؤ صلیبی پڑاؤ کی طرف تھا۔ یہ تمام لاشیں صلیبی پڑاؤ میں پہنچ گئیں۔

دو سال کی مسلسل سنگ باری سے فصیلیں اور برج شکستہ ہو چکے تھے مگر مسلمان اس وقت خود فصیلوں کی طرح سینہ سپر ہو گئے لیکن وہ جانتے تھے کہ اب دشمنوں کی زد میں پوری طرح آ چکے ہیں۔ امداد کا پہنچنا قطعی ناممکن۔ اس لئے انہوں نے باوقار شرائط پر عیسائیوں سے صلح کرنا قرین مصلحت سمجھا مگر عیسائیوں نے وعدہ خلافی کرتے ہوئے اہل عکہ کو یرغمال بنا لیا اور بعد میں ان یرغمالیوں کو شاہ رچرڈ جسے رچرڈ شیر دل کہا جاتا ہے۔ اس کے حکم سے ان بے گناہوں کا قتل عام کیا گیا۔ یہ تھا شاہ رچرڈ شیر دل کا کارنامہ۔

رچرڈ ۹ جون ۱۱۹۱ء کو عکہ پہنچا اور ۱۲ جولائی ۱۱۹۱ء کو مسلمانوں نے ایک باوقار صلح نامے کے تحت قلعہ ان کے حوالے کر دیا۔ آخر اس میں رچرڈ کا کیا حصہ تھا۔ قلعہ عکہ پر دو سال سے زیادہ عرصہ سے مسلسل یورشیں ہو رہی تھیں آخر قلعہ کی دیواریں اور برجیاں مٹی کا ڈھیر بن گئے اور مسلمانوں نے مجبوراً قلعہ حوالے کر دیا تو اسی لئے رچرڈ شیر دل کیسے ہو گیا۔ وہ تو شدید بخار میں مبتلا تھا۔ ادھر یہ کروٹیں بدل بدل کے بستر علالت پر سسکیں ڈال رہا تھا ادھر فوج فصیلوں سے شگاف ڈال چکی تھی۔ ہتھیار ڈالے جا چکے تھے پھر بھی عکہ کی فتح کا سہرا اس کے سر باندھ دیا گیا۔

اس غلط اعزاز پر اس نے جشن فتح منایا تو اس طرح دو ہزار چھ سو مسلمان اسیران جنگ کو جو یرغمال تھے، ان کے خون پر رچرڈ نے فتح کی بنیاد رکھی۔ اس سلسلے میں ایک بات اور یاد رکھنے کے قابل ہے وہ یہ کہ صلیبیوں کے تمام لشکریوں کی مجموعی تعداد اگر پانچ لاکھ بھی تسلیم کر لی جائے اگرچہ یہ تعداد دس لاکھ بتائی جاتی ہے تو بھی یہ بات ہر صلیبی اور ہر مسلمان لشکری جانتا ہے کہ صرف عکہ کے قلعہ پر قبضہ میں نصرانیوں کے لشکر کا نصف حصہ اپنی جانیں گنوا چکا تھا یعنی صلیبیوں نے ڈھائی لاکھ نصرانیوں کی قربانی دے کر ارض فلسطین کا صرف ایک ٹکڑا حاصل کیا تھا۔

شاہ رچرڈ یروشلم (بیت المقدس) پر چڑھائی کرنے کی

تیاریاں کر رہا تھا لیکن اسی دوران صلیبی کیمپوں میں ایک نیا جھگڑا کھڑا ہو گیا۔

اصل قصہ یہ تھا کہ نصرانیوں کو عکہ فتح ہونے پر یہ غلط فہمی ہو گئی تھی کہ اب سلطان صلاح الدین شکست کھا گیا ہے اور وہ صلیبیوں کا کہیں پر مقابلہ نہ کر سکے گا اور اگلے ہی حملہ میں یروشلم پر صلیبیوں کا قبضہ ہو جائے گا۔ اب سوال یہ تھا کہ یروشلم کا آئندہ بادشاہ کون ہو گا۔ یروشلم پر مسلمانوں کے قبضہ سے پہلے وہاں کا بادشاہ گائی لوسگنان تھا۔ گائی لوسگنان یروشلم کا موروثی بادشاہ نہ تھا بلکہ اس کی بیوی شہزادی سبل شاہی خاندان سے تھی اور اس کی شادی گائی لوسگنان سے ہوئی تھی اس لئے بادشاہت گائی کو حاصل ہوئی تھی۔

یہ وہی گائی لوسگنان شاہ یروشلم ہے جو حطین کی جنگ میں سلطانی لشکر کے ہاتھوں گرفتار ہوا تھا پھر نصرانی بیگمات نے سلطان صلاح الدین سے ملاقات کی اور اس سے اپنے شوہروں اور رشتہ داروں کی جان بخشی کرائی تھی۔ اس طرح گائی لوسگنان اور دوسرے شہزادے اور سرداروں کو رہائی ملی تھی اور رہائی ملتے ہی وہ دوبارہ سلطان کے مقابلہ پر کھڑے ہو گئے تھے۔

ان دنوں گائی لوسگنان کی بیوی شہزادی سبل، مارکوئیس کونریڈ کے علاقہ میں پناہ لئے ہوئی تھی۔ وہیں اس کا اچانک انتقال ہو گیا۔ اب سوال یہ اٹھا کہ یروشلم کی بادشاہت کی اصل وارث شہزادی سبل تھی اور اس کے توسط سے اس کا شوہر گائی شاہ یروشلم کہلاتا تھا۔ اس لئے سبل کے انتقال کے بعد اصولی طور سے گائی لوسگنان کی بادشاہت بھی ختم ہو گئی تھی۔ ان حالات میں یروشلم کا تخت خالی ہو گیا تھا اور اس کے لئے نئے بادشاہ کا انتخاب ہونا ضروری تھا۔

چنانچہ یروشلم کا مسئلہ حل کرنے کے لئے مجلس مشاورت طلب کی گئی۔ یہ مسئلہ نہایت اہم تھا کیونکہ اس سوال پر صلیبی امراء دو گروہوں میں تقسیم ہو گئے تھے۔ یروشلم کی سلطنت بہت محترم سمجھی جاتی تھی اس لئے شاہ یروشلم کو محض دنیاوی تاجدار کی حیثیت ہی نہ حاصل تھی بلکہ وہ سلطنت ربانی کے اختیارات کا بھی حامل تھا۔

مجلس مشاورت میں شاہ فرانس فلپ آرگسٹس بھی موجود تھا۔ وہ سیاہ لباس پہنے تھا۔ فلپ اگر صرف پچیس چھبیس سال کا جوان تھا لیکن اس کے چہرے پر قبل از وقت تفکر کی جھریاں نمودار ہو گئی تھیں، وہاں طویل الاعضا شاہ رچرڈ بھی تھا۔ وہ اس جھگڑے میں اپنی بات منوانے پر تلا ہوا تھا۔

اس کے پیچھے خاموش ارل آف لیسٹر، ہنری کاؤنٹ آف شمپین کھڑے تھے۔ ہنری، شاہ فرانس اور شاہ انگلستان دونوں کا بھانجا تھا لیکن اس کے باوجود وہ ایک مفلس شخص تھا۔

انگریز امراء کے ساتھ ٹمپلر سردار سفید چغے پہنے بیٹھے تھے اس کے علاوہ لوسگنان خاندان کے تینوں بھائی موجود تھے۔

گائی لوسگنان کی پوزیشن یوں کمزور تھی کہ اس کی بیوی شہزادی سبل کا اچانک انتقال ہو گیا تھا اور سبل کی دوسری بہن شہزادی ازابیل جو سبل کی جگہ یروشلم کے تخت و تاج کی وارث ہو سکتی تھی اس نے نواب ہمفرے سے شادی رچائی تھی۔ ان حالات میں مارکوئیس کونریڈ کو پہلے نواب ہمفرے کو راستے سے ہٹانا تھا اس کے بعد گائی لوسگنان سے نمٹنا تھا۔

------o------

مارکوئیس کونریڈ ان دونوں مشکلات کے باوجود یروشلم کے متوقع تخت و تاج سے دستبردار ہونے پر آمادہ نہ تھا اور اس نے واقعی ایک صورت پیدا کر دی جس سے اس کے لئے یروشلم کے تاج کا حصول آسان نظر آنے لگا۔ اس نے سوچا کہ اگر وہ کسی طرح شہزادی ازابیل پر قابو حاصل کر لے تو اس کے لئے یروشلم کا تاج کچھ زیادہ دور نہ رہ جائے گا۔ چنانچہ اس نے شہزادی ازابیل کی طرف قدم بڑھائے۔

ادھر ازابیل اور نواب ہمفرے میں محبت کی شادی ہوئی تھی۔ یہ شادی قلعہ کرک میں اس وقت ہوئی تھی جب سلطان صلاح الدین کی فوجیں قلعہ کو گھیرے ہوئی تھیں اور قلعہ پر سنگ باری ہو رہی تھی مگر جب سلطان سے

درخواست کی گئی کہ وہ نواب ہمفرے اور شہزادی ازابیل کی شادی میں تعاون کرے اور شادی کے دن قلعہ پر سنگ باری اور حملہ نہ کرائے تو سلطان نے یہ درخواست منظور فرمائی اور لشکر کو حکم دیا کہ قلعہ کے اس حصہ پر حملہ نہ کیا جائے جہاں شادی کی رسم کی ادائیگی ہونے والی تھی۔ اس سلسلہ میں دونوں طرف سے شادی کے تحائف کا تبادلہ بھی ہوا تھا۔ یہ شادی اس طرح کرک کی تاریخ کا ایک باب بن گئی تھی۔

ظاہر ہے کہ نواب ہمفرے آف تورون اور شہزادی ازابیل میں کس قدر پیار ہوگا کہ انہوں نے جنگ کے مہیب بادلوں کے دوران شادی کی رسم ادا کی تھی۔ اس چالاک مارکوئیس کونزیڈ کی شاطرانہ چالوں کی بھی داد دینا پڑتی ہے جس نے ان دو محبت بھرے دلوں میں کچھ اس طرح نفاق کا بیج بویا کہ وہ ایک دوسرے سے الگ ہونے پر مجبور ہوگئے۔

مارکوئیس نے اپنی ایک اطالوی کٹنی کے ذریعہ ایسا جال پھیلایا کہ ازابیل بس اس جال میں پھنس کے رہ گئی۔ اسی اطالوی کٹنی، ڈائن یا چالاک عورت کا نام لورینا تھا۔ یہ بڑھیا آسمان میں تھگلی لگاتی تھی اور محبت بھرے دلوں میں زہر گھول کے انہیں پھاڑ دیتی تھی۔ اسے یہ معلوم تھا کہ ازابیل اور نواب ہمفرے آف تورون میں بہت پیار ہے اور یہ شادی بھی پیار ہی کی وجہ سے ہوئی تھی۔

ایک دن لورینا سیدھی نواب ہمفرے کے محل پہنچ گئی۔ اطالوی کٹنی لورنیا نے شہزادی ازابیل کی بلائیں لینے کے بعد ایک سرد آہ بھری اور دو موٹے موٹے آنسو آنکھوں سے ٹپکا دیے۔

"خالہ جی آپ نے شاید اپنا نام لورینا بتایا ہے اور آپ کا تعلق اطالیہ (اٹلی) سے ہے؟"

"جی شہزادی عالیہ آپ نے درست فرمایا۔" لورینا خالہ نے زبردستی پلو سے خشک آنسو پونچھے۔ "میری پیدائش تو دراصل جنت ارضی یروشلم کی ہے مگر جب سے اس پر کافروں نے قبضہ کیا ہے۔ رات دن خون کے آنسو روتی ہوں۔"

"مگر اس وقت آپ کو رونا کیوں آیا۔" شہزادی ازابیل نے الجھتے ہوئے پوچھا۔ "آپ کو رونے دھونے کی ضرورت نہیں۔ جس کام کے لئے آپ تشریف لائی ہیں وہ بیان فرمائیے۔ میں اسے پورا کروں گی؟"

"شہزادی عالیہ۔ میری فکر نہ کیجئے۔" مکار لورنیا نے کہا۔ "میں آپ کے پاس کسی ضرورت سے نہیں آئی۔ مجھے اطالوی شہزادے کونزیڈ مانسٹریٹ اپنے ساتھ ہی اطالیہ سے لائے تھے۔ انہی کے پاس رہتی ہوں شہزادے بہادر میرا بڑا خیال کرتے ہیں۔"

مارکوئیس کونزیڈ کے نام پر ازابیل کے کان کھڑے ہوئے۔ "یہ مارکوئیس کونزیڈ وہی تو نہیں جو صور کے حاکم ہیں؟"

"ہاں شہزادی وہی شہزادے کونزیڈ" لورنیا نے جواب دیا۔

"ہوں۔" کہہ کے شہزادی چند لمحے خاموش رہی پھر بولی۔ "اچھا خالہ لورنیا۔ اب تو بتائیے کہ آپ مجھے دیکھ کر رونے کیوں لگی تھیں؟"

"شہزادی عالیہ۔ یہ میرے دل کی بات ہے اسے کوئی دل ہی والا سمجھ سکتا ہے۔" لورنیا نے اور زیادہ مکاری دکھائی۔ "میں تمہیں بتاؤں تو شاید تم ناراض ہو جاؤ؟"

"نہیں ------ نہیں خالہ لورنیا میں ناراض کیوں ہوں گی۔ آپ اتنی تو اچھی ہیں۔" شہزادی ازابیل نے خالہ کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔

تم منہ کھلوا رہی ہو تو سنو شہزادی ازابیل اس لئے پیدا نہیں ہوئی ہے کہ وہ ایک کونے میں بیٹھ کے اپنی زندگی گزار دے۔ تم شہزادی نہیں ملکہ یروشلم ازابیل ہو۔ تمہاری بہن سبئیل ملکہ یروشلم تھی۔ اس کے بعد یروشلم کے تخت و تاج پر تمہارا حق ہے۔" لورنیا جلدی جلدی بات ختم کر کے کھڑی ہوگئی۔

لورنیا کی بات نے ازابیل کے دل میں ایک نئی جوت جگائی تھی۔ اس نے لورنیا کا ہاتھ دوبارہ پکڑ لیا۔ "خالہ لورنیا، جب بات تم نے منہ سے نکال ہی دی ہے تو پھر اسے پوری کرنے میں میری مدد کرو۔"

"ے وہ شہزادی۔" لورنیا اک دم مسکرا دی۔ "یہ کیا
ت ہوئی اپنے شوہر سے کہو کہ وہ تمہیں یروشلم کے تخت و
ج کا وارث ثابت کریں۔"

"ن سے یہ نہ ہو سکے گا خالہ۔" شہزادی انگلیاں چٹخاتی
وئی بولی۔ "وہ تو محبت کرنے والے بھولے بھالے نواب
یں۔ گائی لوسگنان کا مقابلہ وہ نہیں کر سکتے۔ پھر عکہ فتح
رنے والے دو دو بادشاہ موجود ہیں۔ یروشلم فتح کرنے کے
بعد وہ میرے شوہر کے بجائے گائی کو تخت و تاج دیں گے۔"

خالہ لورنیا نے جھٹکے سے ہاتھ چھڑایا اور دو قدم چل کے
ر کی۔ "شہزادی برا نہ ماننا۔ اگر تمہارے شوہر نواب ہمفرے
گائی لوسگنان اور شاہ فرانس اور شاہ انگلستان کے مقابلے پر
نہیں کھڑے ہو سکتے تو ان سے کہہ دو کہ وہ تمہارے راستے
سے ہٹ جائیں اور ایسے آدمی کو آگے آنے دیں جو بادشاہوں
کا پنجہ مروڑ کر تمہیں یروشلم کے تخت و تاج کا مالک بنا سکتا
ہے۔"

خالہ لورنیا دو قدم آگے بڑھ کر پھر رک گئیں۔

شہزادی ازابیل کو یوں محسوس ہوا جیسے یروشلم کا تخت
و تاج خود بخود اس کی طرف بڑھتا چلا آ رہا ہے۔ اس نے
پُر امید نظروں سے خالہ لورنیا کو دیکھا اور مردہ آواز میں بولی۔
"خالہ لورنیا ایسا کون شخص ہو سکتا ہے اور وہ میرے لئے اتنی
زبردست قربانی کیوں دینے لگا؟"

"بھولی شہزادی۔" لورنیا نے بڑے استقلال سے کہا۔
"اتنا بڑا خطرہ وہ تمہارے لئے نہیں بلکہ اپنی محبت کے لئے
مول لے گا۔"

"کیا؟" ازابیل ایک بار پھر چونکی۔ "کونسی محبت کے
لئے مول لے گا۔ کیا کہنا چاہتی ہو خالہ!"

"میں نے ٹھیک کہا شہزادی۔" خالہ لورنیا نے بھی
مضبوط لہجے میں کہا۔ "اسے تم سے محبت ہے اور وہ تمہاری
محبت میں حد سے گزر جانا چاہتا ہے۔ میں تمہیں تاریکی
میں نہیں رکھنا چاہتی۔ وہ شخص ہے اطالوی شہزادہ کونریڈ
آف مانسٹریٹ جو شاہ فرانس اور شاہ انگلستان کی آنکھوں
میں آنکھیں ڈال کر بات کرتا ہے۔ اس کی خواہش ہے کہ وہ
تمہارے سر پر ملکہ یروشلم کا تاج دیکھے لیکن یہ سب کچھ اس
وقت ممکن ہے جب تم اس کی محبت کا جواب محبت سے
دو۔"

یہ کہتی ہوئی خالہ لورنیا وہاں سے رفو چکر ہو گئی مگر
شہزادی ازابیل کو ایک عجب طرح کے مخمصے میں ڈال گئی۔
کہتے ہیں اقتدار کی جھلک جو ایک بار دیکھ لے پھر اسے سوائے
اقتدار کے اور کوئی دکھائی نہیں دیتا اور جسے اقتدار کی ہوا لگ
جائے پھر اسے کے قدم زمین پر نہیں پڑتے۔ خالہ لورنیا کی
بات ازابیل کو کچھ اس طرح لگی تھی کہ وہ گھنٹوں بولائی
بولائی کمروں میں گھومتی رہی اور جیسے نواب ہمفرے آف
ٹورون محل میں آیا وہ اس کے سر پر سوار ہو گئی۔

"میری بات غور سے سنو نواب ہمفرے۔" ازابیل
نے سخت لہجے میں کہا۔ "بات ذرا سنگین ہے غور سے سنو
میری بات؟" ازابیل کے لہجے کی سختی کم ہو گئی تھی مگر ختم
نہ ہوئی تھی۔

"ہاں ہاں کہو پیاری ازابیل۔" نواب نے خوشامد
شروع کر دی۔

"اچھا بس خوشامد بند۔" ازابیل کے لہجے میں اب تک
تلخی گھلی تھی۔ "میں جو پوچھوں اس کا صحیح صحیح جواب
دو۔"

"پوچھو نا پیاری ازابیل؟" نواب ڈر گیا۔

"اچھا یہ بتاؤ گائی لوسگنان کو یروشلم کی بادشاہت کیوں
ملی تھی؟" ازابیل نے سوال کیا۔

نواب ہمفرے نے فوراً جواب دیا۔ "اس لئے کہ تخت
و تاج کی وارث ملکہ سبل تھی اور گائی لوسگنان اس کا شوہر
تھا اس لئے وہ یروشلم کا بادشاہ کہلاتا تھا۔"

"اب ملکہ سبل تو مر چکی ہے۔ یروشلم کے تخت و
تاج کا مالک کون ہو گا۔" ازابیل کے اس سوال پر نواب گھبرا
گیا۔

"تم کہنا کیا چاہتی ہو ازابیل میں تمہارا مطلب نہیں
سمجھا؟" نواب نے عاجزی سے کہا۔

"میری بات تم ابھی سمجھ رہے ہو مگر تم بزدل ہو۔

تم میں ہمت اور جرأت نہیں ہے؟" ازابیل بگڑ گئی۔ "گائی صرف اس وجہ سے یروشلم کا بادشاہ تھا کہ تخت و تاج کی مالک ملکہ سبل تھی۔ ملکہ سبل کے مرنے کے بعد تخت و تاج کی وارث اور حقدار میں ہوں اور میرا شوہر نواب ہمفرے آف تورون یروشلم کا بادشاہ ہو گا۔"

نواب ہمفرے کا پورا بدن لرز اٹھا۔ وہ ہاتھ جوڑ کے گڑگڑایا۔ "چپ ہو جاؤ ازابیل تمہیں خداوند یسوع مسیح کا واسطہ۔ لوسگنان ابھی زندہ ہے اس نے تمہاری بات سن لی تو مجھے اور تمہیں دونوں کو سولی چڑھا دے گا۔ اس کی طاقت کا اندازہ ہے تمہیں۔ تیسری صلیبی جنگ لڑنے والا وہی شخص ہے۔"

"چپ ہو جاؤ بزدل ہمفرے۔" ازابیل چیخ پڑی۔ "تم مجھے میرا حق بھی نہیں دلا سکتے۔ لعنت ہے تم پر۔"

ازابیل بڑبڑاتی اندر جانے لگی تو ہمفرے نے اسے روک کے کہا۔ "ازابیل تم جو چاہو کہہ سکتی ہو مگر یروشلم کے تخت و تاج کا نام نہ لینا ورنہ ہمیں جینا دوبھر ہو جائے گا۔"

دوسرے تیسرے دن اطالیہ کی کنٹسی خالہ لورنیا پھر ازابیل کے محل میں داخل ہو رہی تھی۔

ازابیل، خالہ لورنیا کو دیکھتے ہی دوڑ کے اس سے لپٹ گئی۔ کنٹسی نے ازابیل کے سر پر محبت سے ہاتھ پھیرا۔

"خالہ لورنیا۔" ازابیل نے روہانسی آواز میں کہا۔ "نواب ہمفرے تو نرا نواب نکلا۔ بزدل کہیں کا۔ کہتا ہے کہ یروشلم کے تخت و تاج کا نام نہ لینا ورنہ قتل کر دی جاؤ گی۔"

"اور پھر بھی اسے تمہاری محبت کا دعویٰ ہے؟" خالہ لورنیا نے چبھتا ہوا سوال کیا۔

"صرف خالی خولی کی محبت۔ مجھے تو اس سے نفرت ہونے لگی ہے۔" ازابیل کے دل کی بات منہ پر آ گئی۔

کنٹسی لورنیا نے اسے گھور کے دیکھا۔ "کیا شہزادی یہ بات تم دل سے کہہ رہی ہو؟"

"ہاں خالہ۔ جو مجھے میرا حق نہ دلا سکے۔ وہ مجھ سے محبت کیا کرے گا؟" ازابیل غمگین ہونے لگی تھی۔

"پھر کروں کسی محبت کرنے والے سے ملاپ؟" لورنیا نے فوراً بات ڈال دی۔ "ابھی میں آ رہی تھی تو شہزادہ کونریڈ مجھے ملے تھے وہ اب تک تم سے امید لگائے بیٹھے ہیں۔"

شہزادی ازابیل نے کوئی جواب نہ دیا۔ کنٹسی لورنیا سمجھ گئی کہ خاموشی نیم رضا۔

"شہزادی اب مجھے واپس جانے دو۔" لورنیا نے پلٹتے ہوئے کہا۔ "میں یہی جواب لینے آئی تھی۔ شہزادہ میرا انتظار کر رہا ہو گا۔"

ازابیل نے اب بھی اسے کوئی جواب نہ دیا مگر کچھ اس انداز سے لورنیا کو دیکھا جس میں ہزاروں امنگیں اور آرزوئیں بھری تھیں۔ اس طرح لورنیا کی معرفت پہلے ازابیل اور کونریڈ میں کچھ دن سلام و پیام ہوئے پھر دو ایک طویل ملاقاتیں۔ ازابیل پکے آم کی طرح ٹوٹ کے کونریڈ کی گود میں آ گئی۔

مارکوئیس کونریڈ صور کا نجات دہندہ تھا اور تیسری صلیبی جنگ میں اس نے بھرپور حصہ لیا تھا۔ سب ہی اس کی عزت کرتے تھے۔ صور والے تو اس پر جان نچھاور کرتے تھے۔ کونریڈ نے صور کے اسقف اعظم (لارڈ پادری) کو بلا کر اشاروں کنایوں میں اپنا مطلب بیان کیا۔ اسقف اعظم نے تعاون کا وعدہ کر لیا۔

پھر ایک دن صلیب کے بزرگان دین کی طرف سے ایک فتویٰ جاری کر دیا۔

مارکوئیس نے بزرگان صلیب سے حسب مرضی فتویٰ حاصل کر لیا۔ اس سے پہلے اس میں اور شہزادی ازابیل میں کافی طویل صلاح مشورے ہوئے تھے اور عہد و پیمان کئے گئے تھے۔ فتویٰ سامنے آتے ہی شہزادی ازابیل نے کلیسا کو طلاق کی درخواست دیدی اور نواب ہمفرے سے ہمیشہ کے لئے علیحدہ ہو گئی۔ اس کا اگلا قدم مارکوئیس کونریڈ سے شادی کرنا تھا۔

مارکوئیس کونریڈ صور کا بادشاہ اور عکہ کا ایک اہم رکن تھا بعض لوگ تو اسے فاتح عکہ بھی کہتے تھے۔ بہر حال وہ ایک باوقار شخصیت تھا۔

کونزیڈ کو ازابیل سے قطعی محبت نہ تھی وہ تو ازابیل کے ذریعہ یروشلم کے تخت و تاج تک پہنچنے کا ایک آسان راستہ ڈھونڈ رہا تھا۔ اس کے جواب میں ازابیل بھی اس سے کوئی رغبت نہ رکھتی تھی سوائے اس کے کہ وہ کونزیڈ جیسے مضبوط انسان کے ذریعہ یروشلم کا تخت و تاج حاصل کر لے اور پھر شہزادے کونزیڈ کو اپنی طرف سے یروشلم کے تخت و تاج کا اعزاز بخشے۔ ان دونوں کا نصب العین اور منزل ایک ہی تھی اس لئے ان کی شادی ہو گئی اور عکہ کیتھیڈرل میں ازابیل اور کونزیڈ کی شادی کا اعلان بد قسمتی سے اس دن ہوا جس دن یروشلم کا اسقف اعظم ہر کلیس پطرس اپنے دینی ساتھیوں کے ہمراہ یورپ سے واپس آیا اور ایک اسپینی جہاز سے عکہ کے بندرگاہ پر اترا۔

یہ پہلے ہی بیان کیا جا چکا ہے کہ یروشلم کا اسقف پطرس، یروشلم پر سلطان صلاح الدین ایوبی کے قبضہ کے وقت گرفتار ہوا تھا اور فدیہ دے کر آزادی حاصل کی تھی پھر چند پادریوں کے ساتھ یورپ روانہ ہوا تھا اور وہاں پہنچ کر اس نے مسلمانوں کے خلاف ہر ملک میں زہر اگلا تھا اور عیسائیوں کو یروشلم واپس لینے کے لئے ابھارا تھا۔ اسی پادری کے پروپگنڈہ کی وجہ سے شاہ انگلستان اور شاہ فرانس ارض فلسطین آئے تھے۔

اسقف ہر کلیس پطرس اور مارکوئیس کونزیڈ کی ملاقات اطالیہ میں ہوئی تھی۔ پطرس کی ایک جوان بیٹی بھی اس کے ساتھ تھی جو فرانس کے شاہی کلیسا میں پراسرار طور پر غائب ہو گئی تھی۔ ان دنوں مارکوئیس کونزیڈ بھی جولیا کے تعاقب میں فرانس پہنچا تھا۔ اسقف کو شبہ تھا کہ جولیا کے اغوا میں کونزیڈ کا ہاتھ ہے۔ اس لئے وہ کونزیڈ کے سخت خلاف تھا۔

اسقف پطرس کو عکہ کی بندرگاہ پر اترتے ہوئے معلوم ہو گیا کہ شاطر مارکوئیس کونزیڈ نے شہزادی ازابیل سے شادی رچالی ہے۔ اس نے فوراً ہی ازابیل اور کونزیڈ کی شادی کے خلاف فتویٰ دیدیا جس سے عکہ کے کلیسائی طقوں میں اضطراب کی لہر دوڑ گئی لیکن مارکوئیس کونزیڈ نے

اسقف پطرس کے فتوے کی کوئی پروانہ کی اور اس کے اشارہ پر صور کے آرچ بشپ نے نئے کیتھیڈرل میں ازابیل اور مارکوئس کونزیڈ کی شادی کا اعلان کر دیا۔ اس وقت صور کے نئے کیتھیڈرل میں شادی کے موقعہ پر شاہ فلپ آگسٹس اور کونزیڈ کے سردار دوست اور نواب موجود تھے۔

اس تمام جھگڑے کا سب سے دلچسپ پہلو یہ ہے کہ یروشلم (بیت المقدس) کی پوری ریاست سلطان صلاح الدین ایوبی کے قبضے اور مضبوط ہاتھوں میں تھی مگر عقل کے اندھے صلیبی بادشاہ اور لشکری یہ سمجھ بیٹھے تھے کہ عکہ کی طرح یروشلم پر بھی ان کا قبضہ ہو جائے گا اور اسی خیال کے تحت اس وقت یروشلم کے متوقع بادشاہ کا انتخاب ہو رہا تھا۔

---o---

اس اجلاس میں سب ہی موجود تھے یورپ سے آنے والے بادشاہ، شہزادے ڈیوک، ارل، کاؤنٹ، سردار اور پ

سالار، دنیائے صلیب کے بڑے بڑے ہاسپٹلرز اور ٹسافتقہ اور المحارقہ کے پرجوش سردار جن کی بات کلیسا والے بے چون و چرا مانتے تھے۔

بالآخر اس مقدمہ کا فیصلہ ہو گیا۔ ملکہ ازابیل کا مطالبہ جائز تھا۔ کیونکہ بالڈون خاندان کی وہی وارث تخت و تاج ہیں۔ انہوں نے کہا۔

"ہمیں بے حد خوشی ہو گی اگر مارکوئیس کونریڈ آف مانسٹریٹ کو یروشلم کا بادشاہ تسلیم کر لیا جائے کہ وہ صور کے ہزاروں عیسائی باشندوں کے نجات دہندہ ہیں۔ انہوں نے تیسری صلیبی جنگ کے لئے سلطان صلاح الدین ایوبی کے خلاف سب سے پہلے پرچم بلند کیا تھا۔ شہزادہ کونریڈ صلیبی مملکت کے جائز حقدار ہیں۔"

مزید تائید شاہ فرانس نے کر دی۔

"ہم مارکوئیس کونریڈ کے حق میں بلند ہونے والی آواز کی پوری پوری تائید کرتے ہیں۔ کونریڈ کو شاہ یروشلم بننا مبارک ہو۔"

مارکوئیس کونریڈ اور ازابیل بھی مجلس میں موجود تھے۔ ان کی آنکھیں خوشی سے چمک اٹھیں، ازابیل کو اس وقت چالاک بڑھیا اور رینا بہت یاد آئی۔

اسی وقت گائی لوسگنان کا بھائی جافری تلوار لہراتا ہوا کھڑا ہوا اور اس نے مارکوئیس کونریڈ کو ڈوئل کی دعوت دی مگر شاہ فرانس نے اسے سختی سے ڈانٹ دیا۔

"یہ وقت ڈوئل کا نہیں۔ ابھی یروشلم کی جنگ باقی ہے۔ جافری کو اس جنگ کے لئے اپنی تلوار کو سنبھال کے رکھنا چاہیے۔"

جافری کو پکڑ کے بٹھا دیا گیا۔

اب حلقہ ٹسافتقہ سے یروشلم کا بوڑھا اسقف ہرکلیس پطرس اپنی دراز آستین لہراتا ہوا کھڑا ہوا۔ اس نے براہ راست شاہ فرانس کو مخاطب کیا۔

"جناب آگسٹس! یروشلم کی دینی اور دنیاوی سلطنت ایسی نہیں جسے لیٹروں کے حوالے کر دیا جائے۔"

"محترم اسقف۔" شاہ فرانس غصے سے کھڑا ہو گیا۔

"آپ کو یہ نہ بھولنا چاہیے کہ آپ فلپ آگسٹس شاہ فرانس سے مخاطب ہیں۔"

"اے مقدس جنگ کے صلیبی بادشاہ۔" اسقف نے گفتگو کا انداز بدل دیا۔ "میں نے عکہ کے ساحل پر قدم رکھتے ہی کونریڈ اور ازابیل کی شادی کو ناجائز اور نامبارک قرار دیا تھا لیکن اس کے باوجود آپ نے صور کے نئے کوتعمدزل سے اس شادی کا اعلان اپنے سامنے کرایا۔ اس طرح آپ نے یروشلم کے اسقف ہرکلیس پطرس ہی نہیں بلکہ پاپائے روم کی بھی نافرمانی کی ہے کیونکہ میں اس صلیبی جنگ کا محرک ہوں اور میں نے پورے یورپ کا سفر پاپائے روم کے نمائندہ کی حیثیت سے کیا ہے؟"

شاہ فرانس گھبرا گیا۔ اس نے کہا۔

"اے یروشلم کے اسقف محترم۔ آپ نے یہ تو نہیں فرمایا کہ آخر ازابیل اور مارکوئیس کونریڈ کی شادی کیوں نامبارک اور ناجائز ہے؟"

اسقف ہرکلیس پطرس نے کراری آواز میں اعلان کیا۔

"اس لئے کہ کونریڈ نے دو شادیاں پہلے کی ہیں اور یہ اس کی تیسری شادی ہے جبکہ اس کی ایک بیوی اب تک اطالیہ میں دوسری بیوی قسطنطنیہ میں بیٹھی اس کا انتظار کر رہی ہے کونریڈ تو ایک بیوی کی موجودگی ہی میں دوسری نہیں رکھ سکتا اور اس نے تو دھاندلی کی حد کر دی۔ اس نے تو دو کی موجودگی میں تیسری شادی رچا ڈالی۔"

حاضرین سناٹے میں آ گئے۔ مارکوئیس کونریڈ کا رنگ فق ہو گیا۔ ازابیل کی نظروں سے یروشلم کا تخت و تاج دور ہوتا محسوس ہوا۔

مگر مارکوئیس کونریڈ کو پھر بھی یروشلم کے تخت و تاج میں کسی نہ کسی طور پر شریک کر لیا گیا۔





گوشت ختم، چکن ختم، جبکہ میری ڈیوٹی ختم ہونے میں پانچ منٹ باقی ہیں۔

یروشلم، مسلمانوں عیسائیوں اور یہودیوں کے لئے یکساں طور پر متبرک اور قابلِ احترام تھا۔ مسلمان اُسے قبلہ اول کہتے تھے۔ اس لئے کہ خانۂ کعبہ کی طرف نماز پڑھنے سے پہلے مسلمان بیت المقدس (یروشلم) کی طرف منہ کر کے نماز ادا کرتے تھے۔ یہی بیت المقدس، اسلام کے عظیم ترین رہنما، نبی و رسول اور سرکارِ دوعالم احمدِ مجتبےٰ، محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے سفرِ معراج کی پہلی منزل تھا۔ اسی بیت المقدس سے حضورِ پاک عالمِ بالا کی طرف محوِ پرواز ہوئے تھے۔

عیسائیوں کے لئے بیت المقدس یوں قابلِ تعظیم ہے کہ عیسائیت کے علمبردار حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا بیت المقدس مولد ہے۔ وہ اسی جگہ پیدا ہوئے اور اسی مقام پر انہیں اس دنیا سے اُٹھا لیا گیا۔

یہودیوں کی وہ عبادت گاہ جسے ہیکلِ سلیمانی سمجھا جاتا ہے۔ اگرچہ اب اس کا کوئی نشان باقی نہیں ہے لیکن کسی زمانے میں وہ اس بیت المقدس میں موجود تھی۔

ان تاریخی حقائق سے معلوم ہوتا ہے کہ دنیا بھر کے مسلمان۔ عیسائی اور یہودی اپنے اپنے مقدس مقامات، روایات اور زیارات کی وجہ سے اس مقام کو محبوب رکھتے ہیں اور اسے حاصل کرنے کی کوشش میں سرگرداں رہتے ہیں۔

جنگ اور امن کے زمانے میں نصرانیوں اور مسلمانوں کا کردار رہتا تھا اور رہتا رہا ہے اس کا مکمل اور مفصل حال تاریخ میں درج ہے۔ سنہ ۱۰۹۸ء میں جب نصرانیوں نے مسلمانوں سے بیت المقدس حاصل کیا تھا تو اس پاک زمین پر گھوڑوں کے گھٹنوں گھٹنوں تک انسانی خون موجود تھا۔ ایک صلیبی نے بیت المقدس سے یورپ میں ایک پادری کو لکھا تھا۔

خداوندِ یسوع مسیح نے یروشلم پر ہمارا قبضہ کرا دیا۔ ہم نے کافروں (مسلمانوں) کا اس قدر خون بہایا کہ یروشلم کے احاطے کے اندر تک ہمارے گھوڑے ان کے خون میں گھٹنوں گھٹنوں تک ڈوبے ہوئے ہیں۔

یہ تھا ان نصرانی صلیبیوں کا کردار جنہوں نے ۱۰۹۸ء میں دوسری صلیبی جنگ میں مسلمانوں سے بیت المقدس واپس لیا تھا۔ پر جب اس کے نوے سال کے بعد مسلمانوں نے صلاح الدین کی سرکردگی میں ۱۱۸۷ء میں عیسائیوں سے دوبارہ بیت المقدس واپس لیا تو مسلمانوں کا سرخیل سپہ سالار اور مجاہدِ اعظم سلطان صلاح الدین نے بیت المقدس میں داخل ہونے سے پہلے اپنے سرداروں اور لشکریوں کو حکم دیا۔

خبردار! پاک بیت المقدس کی پاک زمین پر دشمن کی نکسیر بھی نہ پھوٹنے پائے۔ اس سرزمین پر سرکارِ دوعالم محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے قدم مبارک پڑے ہیں۔ اسے انسانی خون سے ناپاک نہیں ہونا چاہیے۔

اور مسلمانوں کی تلواریں جیسے کند ہو گئی تھیں۔

یہ قوموں کا اپنا اپنا ظرف ہے۔ نصرانی ہمیشہ کامیابی کے نشے میں وحشی درندے بن جاتے ہیں۔ ہمارے سامنے سقوطِ عکہ کی مثال موجود ہے۔

عکہ پر نصرانیوں کا قبضہ ہو گیا تھا اور اب وہ اس خوش فہمی میں مبتلا ہو گئے تھے کہ وہ بہت جلد یروشلم (بیت المقدس پر بھی قبضہ کر لیں گے۔ بیت المقدس پر مسلمانوں کے قبضے سے پہلے عیسائیوں کے بالڈون خاندان کی حکمرانی تھی۔ بالڈون خاندان کی ملکہ سبیل اصل وارث تھی اور اس کی طرف سے اس کا شوہر گائی لوسگناں یروشلم کا بادشاہ تھا۔

اب یہ سوال تھا کہ یروشلم کی متوقع سلطنت کا حقدار کون ہو گا۔

"سابق شاہ گائی لوسگناں یا ازابیل کا نیا شوہر مارکوئیس کونریڈ آف مانسریٹ۔"

تخت و تاج کے دونوں متوقع حقدار اپنی اپنی جگہ پر بہت اہم تھے گائی کی اہمیت اس لئے تھی کہ تیسری صلیبی جنگ کا اسی نے آغاز کیا تھا اور وہ اب تک میدان جنگ میں سینہ سپر رہا تھا۔

اس کے مقابلے پر مارکوئس آف مانسریٹ یوں اہمیت کا حامل تھا کہ قطع نظر اس کے کہ اس نے صلیبیوں کا نہ صرف بھرپور ساتھ دیا تھا بلکہ اس جنگ میں اپنے ہاتھ پیروں سے شریک رہا تھا۔

شاہ فلپ آگسٹس نے مارکوئیس کونریڈ کو یروشلم کا بادشاہ تسلیم کر لیا اور اسے مبارک باد بھی دیدی لیکن شاہ انگلستان رچرڈ نے اس کی سخت مخالفت کی اور شاہ فرانس کو مخاطب کر کے کہا۔

"شاہ فرانس کو معلوم ہونا چاہیے کہ ہم فلسطین میں مالِ غنیمت بانٹنے اور بادشاہتیں تقسیم کرنے نہیں آئے ہیں بلکہ ہم اس لئے آئے ہیں کہ یروشلم کی مذہبی سلطنت کو مسلمانوں سے چھین کر گائی لوسگناں کو اس کا بادشاہ بنائیں۔"

شاہ فرانس نے رچرڈ کو ترکی بہ ترکی جواب دیا۔ اس نے پُر جوش لہجے میں کہا۔

"آج شاہ انگلستان کو اپنا فرض یاد آرہا ہے مگر انہیں یہ فرض اس وقت کیوں نہیں یاد آیا جب وہ قبرص کو تاخت و تاراج کر کے وہاں قبضہ جما کر بیٹھ گئے تھے۔

شاہ فرانس فلپ آگسٹس کو ایک طرح کا چیلنج تھا۔ وہ برداشت نہ کر سکا اور جواب دیا۔

"شاہ انگلستان ارضِ فلسطین کی تمام جنگوں اور کامیابیوں کو اپنے حصے میں ڈال کر فلسطین اور یروشلم میں بزور شمشیر اپنی مرضی کی حکومت بنانا چاہتے ہیں۔ وہ یہ بھول جاتے ہیں کہ یہاں کے معاملات میں دوسروں کا حصہ اور حق ہے۔"

"ہم نے کسی کا حق نہیں مارا۔" رچرڈ اپنی لانبی آستینیں لہراتا ہوا بولا۔ "مسلمان جنگی قیدیوں کو ہم نے نصف نصف کی نسبت سے تقسیم کیا۔ تمام مالِ غنیمت، اسلحہ اور سامان رسد میں یہی نسبت رہی۔ ہم پر کسی کا حق مارنے کا الزام کیسے لگایا جا سکتا ہے؟"

شاہ فلپس آگسٹس جواب کے لئے کھڑا ہوا تو اس کے پیر کپکپا رہے تھے اس نے غصے سے لرزتی آواز میں کہا۔

"شاہ انگلستان نے ہمارا حق مارا ہے اگر وہ انصاف پسند ہوتے تو قبرص کے آدھے علاقے پر میرا حق تسلیم کرتے۔ میں بھی انہی کی طرح اپنا ملک چھوڑ کر اس مقدس جنگ کے لئے آیا ہوں۔"

شاہ فرانس کا یہ حملہ بڑا زبردست تھا۔ قبرص واقعی مالِ غنیمت میں تھا اور اس پر قبضہ تیسری صلیبی جنگ کے سلسلے میں ہوا تھا۔ یہ ٹھیک ہے کہ قبرص کو انگلستان کی بحریہ نے فتح کیا تھا لیکن اس پر دوسرے صلیبیوں کا بھی حق تھا۔

مگر اس مشکل سوال کو شاہ رچرڈ نے چٹکیوں میں حل کر دیا۔ رچرڈ نے تیسری صلیبی جنگ میں پہلی اور آخری بار اپنی ذہانت کا ثبوت دیا تھا۔

رچرڈ نے گرجدار آواز میں کہا۔ "شیر اگرچہ جنگل کا بادشاہ ہوتا ہے لیکن وہ اپنے مارے ہوئے شکار سے دوسروں کو بھی حصہ دیتا ہے۔ ہم اعلان کرتے ہیں جزیرہ قبرص کا نصف حصہ تاج فرانس میں شامل کیا جائے۔ شاہ فرانس جزیرہ کو شمالاً جنوباً یا شرقاً غرباً جس طرح چاہیں تقسیم کر کے اپنے حصے پر قبضہ کر سکتے ہیں۔"

رچرڈ کے اس جواب نے شاہ فرانس اور اس کے ہمدردوں کا منہ پھیر دیا۔

اور آخر مجلس مشاورت نے یروشلم کی متوقع بادشاہت کا فیصلہ کر دیا۔ طے یہ ہوا کہ

(۱) آگائی لوسگناں تاحیات یروشلم کی متوقع سلطنت کا بادشاہ رہے گا۔

(۲) آگائی لوسگناں کے بعد یروشلم کا بادشاہ مارکوئیس کونریڈ یا اس کا بیٹا ہوگا۔

(۳) اگر کونریڈ گائی لوسگناں سے پہلے انتقال کر جائے تو پھر شاہ انگلستان کو اختیار ہوگا کہ وہ جسے چاہے سلطنت یروشلم کا فیصلہ کرے بشرطیکہ کہ شاہ انگلستان اس وقت مشرقِ وسطیٰ میں موجود ہو۔

اس فیصلے سے سب کے آنسو پونچھ گئے مگر شاہ فرانس کا اس پر شدید ردِ عمل ہوا۔ مجلس مشاورت کے اختتام پر شاہ فرانس فلپ آگسٹس نے اپنے فیصلے کا اعلان کیا۔ ایک تو رچرڈ کے سخت اور توہین آمیز رویے سے وہ سخت دل برداشتہ تھا دوم فرانس میں ڈیوک آف فلینڈرز کی موت واقع ہوئی تھی اور شاہ فرانس کے اقتدار کے لئے راستہ صاف ہو گیا تھا۔ وہ جلد از جلد فرانس واپس جانا چاہتا تھا۔ چنانچہ اس نے بیماری کا بہانہ کیا کچھ تو وہ واقعی بیمار تھا۔ اور کچھ اس نے بیماروں جیسی صورت بنالی اور فرانس جانے کا اعلان کر دیا۔

شاہ فرانس ان دنوں قلعہ صور میں مارکوئیس کونریڈ کا مہمان تھا اور وہیں آرام کر رہا تھا۔ فرانسیسی لشکر نے اس فیصلے کا بہت برا منایا۔ چند سرداروں نے فلپ آگسٹس سے ملاقات کر کے اسے جنگ کے اختتام تک فلسطین میں رہنے کی درخواست کی تھی لیکن فلپ نے اپنا ارادہ تبدیل نہیں کیا۔ شاہ فرانس کی عجلت کا یہ عالم تھا کہ اس نے اپنے پیچھے اور کھلے دشمن رچرڈ شاہ انگلستان سے دو تیز رفتار جہاز مانگے جو اسے جلد از جلد فرانس پہنچا سکیں شاہ فرانس نے فلپ آگسٹس کو جہاز مہیا کر دیئے وہ خود بھی چاہتا تھا کہ فلپ میدان سے ہٹ جائے تاکہ اسے صلیبی جنگ کا قائد تسلیم کر لیا جائے۔ رچرڈ کو فلپ آگسٹس کے جانے سے یہ فائدہ تو ہوا مگر اسے یہ خطرہ بھی تھا کہ کہیں فلپ آگسٹس فرانس پہنچ کر انگلستان پر حملہ نہ کر دے یا اس کے حلیفوں کو نقصان پہنچانے کی کوشش نہ کرے۔ اس خطرے کے پیش نظر رچرڈ نے فلپ سے از سرِ نو حلف اٹھوایا کہ وہ نہ تو انگلستان سے جنگ چھیڑے گا اور نہ انگلستان کے حلیفوں سے چھیڑ خانی کرے گا۔

فلپ آگسٹس نے یہ حلف اٹھا لیا مگر مشہور مقولے کے مطابق کہ جنگ اور محبت میں ہر بات جائز ہے۔ ابھی دو سال بھی نہ گزرے تھے کہ فلپ نے حلف نامے کی دھجیاں بکھیر دیں اور انگلستان سے جنگ چھیڑ دی۔ دراصل انگلستان اور فرانس کی سلطنتیں ایک ہی خاندان کے افراد کے پاس تھیں اور ان دونوں میں اتفاق پیدا کرنے کے لئے شاہی اور عوامی سطح پر انگلستان اور فرانس والے آپس میں بے دھڑک شادیاں کرتے رہتے تھے۔

------OOO------

مسلمانوں میں سقوطِ عکہ سے بڑا ہیجان پیدا ہوا تھا۔ اس کے بعد صلیبیوں کے قائد شاہ انگلستان نے تین ہزار مسلمان یرغمالیوں کو قتل کرا دیا تو اس ہیجان میں اور بھی اضافہ ہو گیا۔ پھر دونوں طرف سے جنگی تیاریوں میں اضافہ ہو گیا۔ شاہ فرانس فلپ آگسٹس واپس جا چکا تھا۔ شاہ فرانس کی وجہ سے مار کوئیس کونریڈ بے سہارا تھا۔ اس کے جانے کے بعد مار کوئیس کونریڈ نے عکہ میں ٹھہرنا مناسب نہیں سمجھا اور اپنے بہترین دستوں کے ساتھ صور واپس چلا گیا۔

اب فرنگیوں نے جن کا قائد رچرڈ ہو گیا تھا انہوں نے عکہ سے قدم نکالے اور عسقلان فتح کرنے کے لئے جنوب کی طرف روانہ ہوئے۔ ان کا انداز یہ تھا کہ بری فوج ساحل کے ساتھ حرکت کر رہی تھی۔ اور بحری فوج سمندر میں ان کے متوازی چل رہی تھی اور دونوں کے متوازی پہاڑیوں کی آڑ میں سلطان صلاح الدین اپنے لشکر کے ساتھ چل رہا تھا۔

سلطان نے عکہ سے عسقلان تک پورے راستے پر جگہ جگہ اپنے چھاپہ مار دستے مقرر کر دیئے تھے کہ فرنگی لشکر اس کے سامنے سے گزرے تو وہ دن اور رات میں ان پر حملہ کر کے انہیں پریشان کرتے اور نقصان پہنچاتے رہیں۔ ان دستوں پہ

سلطان افضل، سیف الدین ابو زکوش اور عزالدین خردیک وغیرہ کو سردار مقرر کیا تھا۔ پس جب رچرڈ لشکر لے کر روانہ ہوا تو ان چھاپہ مار دستوں نے انہیں تنگ کرنا شروع کر دیا۔ یہ دستے اچانک حملہ کرکے یا تو فرنگی لشکریوں کو قتل کر دیتے یا گرفتار کر لیتے تھے۔

شاہ رچرڈ اپنی فرنگی فوج کے ساتھ اٹھتا بڑھتا آخر یافا پہنچ گیا۔ فرنگیوں نے اس جگہ قیام کیا۔ رچرڈ کی باقی فوج بھی عکہ سے آ گئی۔ سلطان کی فوجیں بھی ان کے سامنے پڑاؤ ڈالے ہوئے تھیں۔ یافا میں کچھ دن قیام کے بعد فرنگی فوجیں قیساریہ کی طرف روانہ ہوئیں۔ مسلمان فوجیں بھی ان کے تعاقب میں روانہ ہوئیں جو فرنگی ان کے ہاتھ آ جاتا اُسے قتل کر دیتے۔ قیساریہ پہنچ کر دونوں فوجوں میں ایک جھڑپ ہوئی۔ فرنگیوں نے مقابلہ کیا مگر ان کا نقصان زیادہ ہوا۔ مسلمانوں نے رات کو شب خون مارا اور فرنگیوں کا زبردست نقصان ہوا۔

دوسرے دن فرنگی ارسوف پہنچے۔ راستہ بہت تنگ تھا۔ مسلمان ان سے پہلے ارسوف پہنچ چکے تھے۔ فرنگیوں کے پہنچتے ہی مسلمانوں نے ان پر زبردست حملہ کیا اور انہیں سمندر کی طرف دھکیل دیا مگر فرنگیوں نے پلٹ کر حملہ کیا۔ سمندر میں چلنے والے جہازوں سے بھی بہت سے فوجی ان کے ساتھ ہو گئے۔ چنانچہ ان کے جوابی حملے نے مسلمانوں کو قلب کی طرف پسپا کر دیا۔ قلب میں خود سلطان موجود تھا۔ اس نے پسپا ہوتی فوج کو کمک دے کر فرنگیوں کے حملے کو روک دیا۔

فرنگی وہاں سے یافا واپس آ گئے۔ یافا خالی تھا۔ انہوں نے اس پر قبضہ کر لیا۔ دوسری طرف سلطان صلاح الدین اپنے لشکر کے ساتھ رملہ پہنچا۔ وہاں اس نے فوجی سامانِ جنگ اکٹھا کیا اور فرنگیوں پر ایک بھرپور حملے کا ارادہ کیا۔ اس سلسلے میں سلطان نے ایک مجلسِ مشاورت منعقد کی۔

سلطان نے اپنا خیال ظاہر کیا۔

"میرا خیال ہے کہ ہمیں عسقلان پہنچ کر مورچہ قائم کرنا چاہیے اور وہاں فرنگیوں سے مقابلہ کریں۔"

سلطان کے ایک سردار نے کہا۔ "اگر یہ سلطان کا حکم ہے تو ہم اس پر عمل کرنے کے لیے تیار ہیں۔"

سلطان نے جواب دیا۔ "اگر ہمیں حکم دینا ہوتا تو ہم مجلسِ مشاورت کیوں منعقد کرتے۔ ہم نے صرف اپنا خیال ظاہر کیا ہے۔"

اسی سردار نے جواب دیا۔ "سلطان عالی مقام۔ عسقلان کا محلِ وقوع۔ عکہ سے کچھ زیادہ مختلف نہیں۔ ہو سکتا ہے کہ ہم عسقلان پہنچ کر عکہ کی طرح گھیرے میں آ جائیں۔"

ایک دوسرے سردار نے کہا۔ "سلطانِ معظم۔ عکہ اور عسقلان میں بہت فرق ہے۔ عکہ میں ہمارے فوجیوں کی تعداد چار ساڑھے چار ہزار سے زیادہ تھی۔ اور فرنگیوں کی تعداد بڑھتے بڑھتے تین لاکھ سے بھی زیادہ ہو گئی تھی۔ عسقلان میں ہم گھیرے میں نہیں آسکیں گے۔ ہمارے ساتھ ایک بڑا لشکر ہے اور ہم ایک طویل عرصہ تک جنگ کر سکتے ہیں۔"

پہلے سردار نے جواب دیا۔ "ایسی طویل جنگ سے کیا فائدہ کہ بعد میں ہم محصور ہو جائیں۔ فرنگیوں کے ساتھ ان کا بحری بیڑا ہے۔ شکست کی صورت میں وہ اپنے بحری بیڑے میں محفوظ ہو کے بیٹھ سکتے ہیں۔ خدا نہ کرے، کہ اگر ہم شکست کھا گئے اور انہوں نے عسقلان پر قبضہ کر لیا تو انہیں ہمارا بے انتہا سامان جنگ مل جائے گا اور ان کی طاقت میں اضافہ ہو جائے گا۔"

سلطان بڑی توجہ سے ان کی باتیں سن رہا تھا۔ آخر میں اس نے کہا۔

"عسقلان میں خطرہ موجود ہے۔ ہم عسقلان کو عکہ بننے نہیں دیں گے بلکہ ہم عسقلان کو زمین کے برابر کر دیں گے۔"

سلطان نے یہ بات بڑے جوش سے کہی تھی۔ کسی سردار کی سمجھ میں نہ آیا کہ سلطان کے کیا ارادے ہیں۔ انہوں نے پہلے ایک دوسرے کا منہ دیکھا۔ پھر ان میں سے ایک نے دھیمی آواز میں کہا۔ "سلطان جو حکم بھی دیں گے ہم اس پر عمل کریں گے لیکن ہم یہ نہیں سمجھ سکے کہ سلطان عسقلان کا کیا حشر کرنا چاہتے ہیں۔"

"میرے بہادر سردارو!" سلطان صلاح الدین نے

بڑے جوش سے کہا۔

"میدان جنگ میں اگرچہ سپاہی لڑتا ہے مگر کامیابی کی صورت میں اس کے سردار کا نام بلند ہوتا ہے۔ اس لئے ہر لشکر میں سردار کو اہمیت دی جاتی ہے اور اس کی رائے پر توجہ سے غور کیا جاتا ہے۔ میں نے یہ محسوس کیا ہے کہ اس وقت عکہ کی طرح عسقلان بھی ہمارے لئے مشکلات پیدا کر سکتا ہے۔ اس قسم کی باتیں آپ لوگوں کی طرف سے بھی کہی گئی ہیں اس صورت میں ہم عکہ کا محاصرہ دہرانا نہیں چاہتے لیکن ہم یہ بھی نہیں دیکھ سکتے کہ ہمارے ہوتے ہوئے عسقلان پر فرنگیوں کا قبضہ ہو جائے اور وہ بیت المقدس کے محاصرے کے لئے وہاں اپنا فوجی اڈہ قائم کریں۔ اس لئے ہم نے فیصلہ کیا ہے کہ ہم عسقلان کی شکل اس طرح بگاڑ دیں گے کہ اگر فرنگی لشکر وہاں پہنچے تو اسے کھانے کے لئے دانہ پینے کے لئے پانی نہ مل سکے یہی نہیں بلکہ وہ آسمان کی چھت کے نیچے اپنے خیمے نصب کر سکیں۔"

سلطان صلاح الدین میں یہ خوبی تھی کہ وہ اپنے منصوبوں کو آخری وقت تک پوشیدہ رکھتا تھا لیکن جب کسی منصوبے میں فوج کا بھرپور تعاون چاہتا تھا تو اسے بے دھڑک بیان کر دیتا مگر اس بیان میں وہ اس قدر پُرجوش ہوتا کہ پوری فوج اس کی ہمنوا ہو جاتی۔

چنانچہ سرداروں نے اسکے منصوبے کی تائید کر دی۔

ایک سردار نے کہا۔

"اگر سلطان یہ مناسب سمجھتے ہیں کہ عسقلان کسی وقت مشکلات پیدا کر سکتا ہے تو پھر اس کی قربانی دے دیجئے۔ سلطان ہم سے زیادہ عقلمند ہیں۔ ہم اس منصوبے کی پوری تائید کرتے ہیں۔"

سلطان نے اپنے بیٹے افضل کو مخاطب کیا۔

"ہم چاہتے ہیں کہ اس کام کی ذمہ داری الملک الافضل کو سونپ دیں۔ کیا خیال ہے تمہارا افضل؟"

شہزادہ افضل گھبرا گیا عسقلان جیسے اہم اور بڑے شہر کو نیست و نابود کر دینا بڑے دل گردے کا کام تھا۔ افضل نے ادب سے جواب دیا۔

"سلطان بابا کا حکم سر آنکھوں پر لیکن میں اپنے آپ میں اتنی طاقت نہیں پاتا کہ عسقلان پہنچ کر اس کی بربادی کا حکم دوں اور تباہی و بربادی کو اپنی آنکھوں سے دیکھ سکوں۔"

سلطان کی آنکھوں میں ایک مسکل سی چمک پیدا ہوئی۔

"نادان افضل۔ یاد رکھ کہ یہ دنیا فانی ہے اور اس دنیا کی ہر چیز فانی ہے۔ ہم جس کام کے لئے نکلے ہیں اس میں تو اپنی سر کی بھی قربانی دینا پڑتی ہے۔ پھر عسقلان کا شہر کیا چیز ہے۔ شہر انسانوں کے آرام کے لئے کھڑے کئے جاتے ہیں پھر جب یہ شہر انسانوں کا راستہ روکنے لگیں تو انہیں راستے سے ہٹانے کے لئے ان کا سر نیچا کرنا پڑتا ہے۔ اب کسی اور سردار کو اس کام پر مامور نہیں کروں گا اس لئے کہ وہ بھی اسی انداز میں سوچ سکتا ہے جس کا تم نے اظہار کیا۔ لشکر کی سپہ سالاری میں ملک العادل کے سپرد کرتا ہوں اور میں خود عسقلان جا کر اس کام کو انجام دوں گا۔"

عسقلان کی بربادی بڑی دردناک تھی۔ جنگ میں ایسے لمحات بھی آتے ہیں جب لوگوں کو اپنے گھر بار خود اپنے ہاتھوں سے تباہ کرنا پڑتے ہیں۔ سلطان اپنے دستوں کے ساتھ ۱۸ شعبان کو عسقلان پہنچا۔ سلطانی لشکر کو دیکھ کر مسلمانوں کو بڑا اطمینان ہوا۔ عکہ کی تباہی اور قتلِ عام کا حال وہ پہلے ہی سن چکے تھے۔ انہیں عکہ کے سقوط کا غم تھا لیکن اس شہر و قلعے نے ڈھائی سال تک صرف چار ہزار فوجیوں کی مدد سے جس بے جگری سے لاکھوں صلیبیوں اور ان کی قلعے نما منجنیقوں، تیر اندازوں اور قند اندازوں کا مقابلہ کیا تھا۔ وہ تاریخ اسلام کا سنہرا باب بن چکا تھا۔

عسقلان بحر روم کے کنارے ایک تجارتی شہر، ایک کارآمد بندرگاہ اور ایک مضبوط قلعہ تھا۔ خدا نخواستہ اگر عسقلان پر فرنگیوں کا قبضہ ہو جاتا تو اس مضبوط قلعے سے فرنگیوں کے تین چار لاکھ کے لشکر کو باہر نکالنا ناممکن ہو جاتا۔ سلطان اس قلعہ پر اور حیفہ اور یافا کے قلعوں پر قبضہ تو کر سکتے تھے مگر ان پر اپنا قبضہ برقرار نہیں رکھ سکتے تھے۔ اس لئے کہ مسلمانوں کی

بری طاقت ختم ہو چکی تھی۔ جب دشمن کے بری جہاز ساحل کے ساتھ ساتھ رینگتے ہوئے نصرانی لشکر کی حفاظت کر رہے تھے۔

اسی مجبوری نے سلطان کو عسقلان کو برباد کرنے پر آمادہ کیا تھا۔ سلطان کے حفاظتی دستوں پر مشتمل لشکر عسقلان کے باہر خیمہ زن ہوا۔ بندرگاہ کے سلطانی محافظ دستوں کے سردار سلطان کے ارغوانی خیمے کے پاس پہنچ گئے۔ معززین شہر بھی سلامی کے لئے حاضر ہوئے تھے۔ سلطان اپنے خیمے میں سرداروں کے ساتھ گفتگو میں مصروف تھا۔ مسئلہ درپیش یہ تھا کہ بلی کے گلے میں گھنٹی کون ڈالے۔ باہر جمع ہونے والے شہریوں سے کون کہے کہ ہم جو تمہارے گھروں کے محافظ اور رکھوالے ہیں آج اپنے ہی ہاتھوں سے ان گھروں کو آگ دکھانے آئے ہیں۔ سلطان صلاح الدین ایوبی ایک دم خیمے سے باہر آیا۔ حاضرین نے سر کو ذرا خم کر کے سلطان کو سلام پیش کیا۔ سلطان نے بغیر کسی تمہید کے مجمع سے سوال کیا۔

"اے خوبصورت شہر عسقلان کے دلیر باشندو۔ تمہارا سلطان جو آج تک تمہاری حفاظت کر رہا تھا آج تم سے ایک سوال کرنے آیا ہے اور تمہیں اس کا جواب دینا ہوگا۔"

سلطان نے رک کر مجمع پر ایک نظر دوڑائی۔ پھر بولا۔

"شہر تعمیر ہوتے ہیں تاکہ عوام میں خوشحالی ہو۔ بندرگاہ بنائی جاتی ہیں۔ تاکہ بیرونی تجارت سے فائدہ اٹھایا جائے۔ اس طرح مکانات اور قلعے بنائے جاتے ہیں تاکہ تم اس میں رات کو آرام کرو اور جنگ کے موقع پر محفوظ رہو۔"

مسلسل جنگ، دوڑ دھوپ، مختلف آب و ہوا رہائش اور نا مساعد حالات میں اڑتالیس اڑتالیس گھنٹے تک مسلسل گھوڑے کی پیٹھ پر سفر اور آتے ہوئے بڑھاپے نے سلطان کے اعصاب مضمحل کر دیئے تھے ان کا جگر خراب ہو چکا تھا اور موسمی بخار کے حملے ہوا کرتے تھے۔ شاہی طبیب مجبور ہو کر انہیں آرام کا مشورہ دیتے۔ سلطان خاموشی سے مشورے سنتے مگر اس کے بعد ہی کوئی ایسا سفر درپیش ہوجاتا کہ سلطان کو بخار کی حالت میں گھوڑے کی پیٹھ پر سوار ہو کر سفر کرنا پڑتا۔

سلطان رک رک کر بول رہا تھا۔ عسقلان والے اب تک سلطان کے ارادے سے واقف نہ تھے۔ سلطان خاموش ہوا تو قاضی شہر نے باادب عرض کیا۔

"سلطان عالی مقام۔ اہلِ عسقلان آپ کو اپنے درمیان دیکھ کر کس قدر مسرور ہیں اس کا بیان الفاظ میں تو نہیں کیا جاسکتا۔"

"بزرگ محترم۔" سلطان نے کہا۔ "ہمیں نہیں معلوم کہ آپ کون ہیں۔ کاش اہلِ عسقلان جس طرح ہمارے آنے سے مسرور ہوئے ہیں۔ اسی طرح ہمارے عسقلان سے واپس جانے پر بھی مسرور رہیں۔"

پھر سلطان نے کچھ عجیب نظروں سے خیمے کے سامنے جمع ہونے والے لوگوں کو دیکھا۔

قاضی شہر نے جواب میں عرض کیا۔

"اے بادشاہوں کے بادشاہ اور سلطانوں کے سلطان۔ یہ خادم آپ کے شہر عسقلان کا قاضی ہے اور آپ کو رات دن دعائیں دیتا ہے یقین کیجئے کہ اہلِ شہر کو آپ سے اتنی ہی عقیدت ہے جس کا ذکر میں نے کیا ہے۔ ہم سب جانتے ہیں اس جنگ کے دوران بھی اہلِ عسقلان اطمینان کی نیند سوتے ہیں اس لئے ہمارا بادشاہ اور سلطان راتوں کو جاگتا ہے۔ ہمارے لئے جنگ کرتا ہے۔ دوڑ دھوپ کرتا ہے اور ہمارے بیوی بچے پیر پھیلا کر سوتے ہیں۔"

"اے قاضی شہر۔ اچھا ہوا کہ تم میرے سامنے حاضر ہو۔" سلطان نے جیسے چونک کر کہا۔ "اے قاضی شہر تم انصاف کی مسند پر بیٹھتے ہو۔ ہم تمہارے سامنے ایک استغاثہ پیش کرتے ہیں اور ہمیں امید ہے کہ تم اس کا فوراً انصاف کرو گے؟"

"عالی مقام سلطان۔" قاضی نے سنبھل کر کہا۔ "بلاشبہ خداوند تعالیٰ نے آپ کے توسط سے مجھے انصاف کی مسند پر بیٹھنے کا اعزاز عطا کیا ہے اور میں پورے خلوص اور ایمانداری سے نبھا رہا ہوں۔ سلطان محترم استغاثہ پیش فرمائیں میں فوری انصاف کروں گا۔ اس لئے کہ انصاف میں ذرا سی تاخیر بھی ظالم کو فائدہ اور مظلوم کو نقصان پہنچاتی ہے۔"

قاضیٔ شہر خاموش ہوا اور انتظار کرنے لگا کہ سلطان استغاثہ پیش کریں تو وہ انصاف کے تقاضے پورے کرے لیکن سلطان گہری سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔ اُسے وہ وقت یاد آیا جب اس نے اپنے بیٹے اور دوسرے سرداروں کو عسقلان کو برباد کرنے کا حکم دیا تھا اور وہ یہ فیصلہ سن کر گھبرا گئے۔ ان میں سے کسی میں ہمت نہیں نہ تھی کہ عسقلان جیسے خوبصورت اور بارونق شہر، بندرگاہ اور قلعہ کو برباد کرنے کی حامی بھریں۔

قاضیٔ شہر سلطان کے استغاثہ کا منتظر ہے۔" آخر قاضی نے اس بڑھتے ہوئے سکوت کو توڑا۔

آخر سلطان کو بولنا پڑا۔

"اے قاضیٔ شہر۔ میرا استغاثہ یہ ہے کہ میرے لڑکے کے دائیں ہاتھ میں پھوڑا نکلا اور اس کے پورے ہاتھ میں زہر پھیل گیا۔ جراح نے مجھ سے درخواست کی کہ اگر بچے کی زندگی بچانا ہے تو زہر زدہ ہاتھ کاٹ کر جسم سے الگ کرنے کا حکم دیا جائے ورنہ یہ زہر باقی جسم کو بھی زہر آلودہ کردے گا۔

میں نے جراح کو بچے کا ہاتھ کاٹنے کا حکم دے دیا۔ جراح نے ہاتھ کاٹ دیا اور بچے کی جان بچ گئی۔ اب بچے کی ماں الزام لگا رہی ہے کہ ہم نے اس کے بچے پر ظلم کیا ہے۔ قاضیٔ محترم۔ فرمایئے آپ کا انصاف اس سلسلہ میں کیا کہتا ہے؟"

قاضیٔ شہر نے چند لمحے سوچنے کے بعد اپنا فیصلہ دے دیا۔

"اے سلطان عالی مقام۔ اللہ عالم الغیب ہے اور وہ نیتوں کا حال جانتا ہے لیکن ایک قاضی اور ایک منصف ایسے معاملات میں صرف اس حدیث کو پیش نظر رکھتا ہے جس کے معنی ہیں۔

اعمال کا دارومدار نیتوں پر ہے۔

"انما الاعمال بالنیات"

زیرِ استغاثہ میں آپ نے بچے کا ہاتھ کاٹنے کا حکم دیا۔ یہ حکم بظاہر بڑا ظالمانہ ہے مگر اس حکم کے وقت آپ کے پیش نظر اور آپ کی نیت یہ تھی کہ اس ظالمانہ حکم سے بچے کی جان بچ سکتی ہے۔ اس لئے آپ پر جرم ثابت نہیں کیونکہ آپ کی نیت نیک تھی۔"

مجمع میں سے کئی آوازیں قاضی کی تائید میں اُٹھیں مگر سلطان مطمئن نظر نہ آتا تھا۔ اس نے قاضی کو پھر مخاطب کیا۔

"قاضیٔ محترم۔ جہاں تک حدیث مبارک کا تعلق ہے وہ اپنی جگہ مستند ہے لیکن تم نے نیت کا جو اندازہ لگایا ہے وہ غلط بھی ہو سکتا ہے یا پھر ظالم نیت کی غلط تعبیر کر کے جرم سے بچ بھی سکتا ہے۔"

"سلطانِ معظم۔" قاضی نے مضبوط لہجے میں کہا۔

"نسیان بشر کی فطرت میں داخل ہے کیونکہ انسان صرف انسان ہے وہ فرشتہ نہیں ہو سکتا۔"

"درست فرمایا قاضیٔ شہر نے۔" سلطان نے قاضی کی تائید کی۔ "کیا قاضیٔ محترم حیاتِ رسول مقبول (صلی اللہ علیہ وسلم) سے اس کی سند پیش کر سکیں گے؟"

"ضرور۔ ضرور۔۔۔" قاضی چیخ پڑا۔ "سلطانِ عالی مقام میں اپنے خدا سے دعا کر رہا تھا کہ اے باری تعالیٰ تو میری نیت کو جانتا ہے اس لئے ایسے اسباب پیدا کر کہ میں سلطان اور اہلِ عسقلان کے سامنے سرخرو ہوں۔ ٹھیک اسی وقت مجھے حیاتِ رسولؐ کا وہ واقعہ یاد آگیا جو اس حدیث کی پوری تشریح کرتا ہے۔ وہ واقعہ اس طرح بیان کیا گیا ہے کہ ایک بار سرکارِ دوعالم مسجدِ نبوی میں صحابہ کرام کے ساتھ تشریف فرما تھے کہ ایک شخص مسجد میں آیا۔ وہ پسینے میں شرابور تھا۔ اس نے حضورؐ کو بتایا کہ رسولِ خدا آپ پر میرے ماں باپ قربان۔ میں اس وقت فلاں فلاں کنویں کے پاس سے گزر رہا تھا، اس کنویں پر قافلے والے اپنے گھوڑوں کو پانی پلانے آتے ہیں۔ میں نے دیکھا کہ کچھ مسافر اپنے گھوڑوں کی لگامیں پکڑے دھوپ میں کھڑے ہیں۔ میرے دل میں فوراً خیال آیا کہ اگر کنویں کے پاس گھوڑے باندھنے کے لئے کچھ کھونٹے گاڑ دئیے جائیں تو کم از کم ان کے سوار اپنے گھوڑے باندھ کر کسی سائے میں جا کر بیٹھ سکتے ہیں۔ اس خیال کے تحت میں گھر سے دو کھونٹے لایا اور میں نے کنویں کے قریب گاڑ دیے۔

حضورِ مقبولؐ نے اس کے اس فعل کو پسند فرمایا اور یہ بھی کہا کہ اس نے نیکی کا کام کیا ہے جس کا اسے اجر (ثواب) ملے گا۔

دوسرے روز ایک اور شخص مسجدِ نبوی میں داخل ہوا۔ اس نے عرض کیا:۔۔۔ اے رسولِ خدا، آپ پر میرے ماں باپ قربان۔ میں اس وقت فلاں فلاں کنوئیں کے پاس سے گزر رہا تھا۔ وہاں قافلے والے اپنے گھوڑوں کو پانی پلانے آتے ہیں۔ میں نے دیکھا کہ کنوئیں کے قریب دو کھونٹے گڑے ہوئے ہیں ان کا آدھا حصہ اندر اور آدھا باہر ہے۔ مجھے خطرہ پیدا ہوا کہ اجنبی مسافر ان کھونٹوں سے ٹکرا کر زخمی ہو سکتے ہیں پس میں نے دونوں کھونٹوں کو اکھاڑ کر دور پھینک دیا۔

"حضورؐ نے اس شخص کے اس فعل کو پسند فرمایا اور یہ بھی فرمایا کہ اس نے نیکی کا کام کیا ہے اللہ اسے اس کا اجر (ثواب) دے گا۔"

حضورؐ کے سامنے بیٹھے ہوئے صحابہ کرامؓ تقریباً وہی تھے جنہوں نے کل اس شخص کی باتیں سنی تھیں جس نے کنوئیں کے پاس کھونٹے گاڑے تھے۔ حضورؐ نے آج کھونٹے اکھاڑ پھینکنے والے شخص کو جو جواب دیا اس سے صحابہ کرامؓ بہت حیران ہوئے

اس شخص کے جانے کے بعد ایک صحابی نے حضورؐ سے عرض کیا کہ اے سرکارِ دو عالمؐ میری جان آپ پر قربان۔ کل ایک شخص کنوئیں کے پاس کھونٹے گاڑ آیا تھا تو آپؐ نے اس کے کام کو نیکی کہتے ہوئے اسے ثواب کی نوید دی تھی اور آج یہ شخص ان کھونٹوں کا اکھاڑ کر آیا ہے تو آپؐ نے اس کے کام کو بھی پسند فرمایا اور اسے بھی ثواب کا مژدہ سنایا۔

حضورؐ نے جواب میں فرمایا کہ تم لوگ اپنے دل میں کسی وسوسے کو جگہ نہ دو کیونکہ دونوں نے اپنی اپنی نیت کے مطابق کام کیے ہیں۔ پہلے کی نیت یہ تھی کہ اس کے کھونٹے گاڑنے سے مسافروں کو اپنے گھوڑے باندھنے میں آسانی ہوگی یہ نیت نیک تھی اس لئے وہ ثواب کا حق دار ہوا۔ دوسرے نے کھونٹوں کو اس نیت سے اکھاڑ پھینکا کہ مسافر ٹھوکر کھا کر زخمی نہ ہوں۔ اس کی نیت بھی نیک تھی۔ اس لئے وہ بھی ثواب کا حق دار ہوا۔"

"سبحان اللہ قاضی صاحب۔" سلطان نے قاضی کے تفصیلی بیان کی تعریف فرمائی۔ "آپ نے ہماری ایک بڑی مشکل آسان کر دی۔ اب میں آپ کی موجودگی میں اہالیانِ عسقلان سے ایک زبردست قربانی کا طلب گار ہوں۔ یہ قربانی بالکل اسی طرح کی ہے جس کی مثال میں نے پہلے دی تھی۔ یعنی ایک بیٹے کا ہاتھ زہر آلود ہو گیا ہے۔ اگر اسے جسم سے الگ نہ کیا گیا تو زہر تمام جسم میں پھیل جائے گا اور مریض کی زندگی کی تمام امیدیں ختم ہو جائیں گی۔

آپ لوگ مجھے اپنا امیر اور سلطان کہتے ہیں۔ آپ کو یہ یقین رکھنا چاہئے کہ میں فرنگیوں سے جنگ میں جو قدم بھی اٹھاؤں گا اس کا مقصد مسلمانوں کا مفاد ہوگا۔ آپ جانتے ہیں کہ پورا دول یورپ ارضِ فلسطین پر اُمڈ آیا ہے اور چاہتا ہے کہ ہم اپنے قدیم کعبہ (بیت المقدس) سے جسے ہم نے حال ہی میں نصرانیوں سے واپس لیا ہے اس سے دستبردار ہو جائیں لیکن ربِ کعبہ کی قسم صلاح الدین اپنی زندگی میں یہ نہیں ہونے دے گا۔ ہم بیت المقدس کی حفاظت کے لئے جنگ کر رہے ہیں۔ مسلمان اپنی جانیں نچھاور کر رہے ہیں۔ خون بہا رہے ہیں۔ طرح طرح کی قربانیاں دے رہے ہیں۔"

"اور اے اہالیانِ عسقلان۔ اب یہ مقدس جنگ تم سے قربانی طلب کر رہی ہے۔ تمہیں بیت المقدس کی حفاظت کی خاطر قربانی دینا ہے۔ تم ہمیں یہاں دیکھ کر خوش ہوئے ہوگے کہ خطرے کے وقت عسقلان کو بچانے کے لئے پہنچ گئے لیکن عسقلان کے شہریو اور فوجیو ہم تمہاری حفاظت کو ضرور آئے ہیں اس لئے کہ تمہاری حفاظت ہمارا فرض ہے لیکن تمہاری حفاظت سے زیادہ ہماری ایک ذمہ داری اور بھی ہے اور وہ ذمہ داری ہے بیت المقدس کی حفاظت۔ وہ بیت المقدس جو معراجِ نبویؐ کا پہلا زینہ تھا اور وہی بیت المقدس جہاں خلیفۂ دوم حضرت عمر فاروقؓ تشریف لائے تھے اور وہ بیت المقدس جہاں حضرت عیسیٰؑ۔ حضرت موسیٰؑ، حضرت یعقوب و سلیمان کے علاوہ اور بہت سے پیغمبروں کے مزار

ہیں۔"

"تب میں تمہیں بتاتا ہوں کہ تمہیں بیت المقدس کے لئے کس طرح قربانی دینا ہے۔ اس وقت صلیبیوں کا ریلا جافا تک آگیا ہے۔ یہ صلیبی لشکر ایشیا کے عیسائیوں کا نہیں بلکہ دول یورپ کے تمام ترقی یافتہ ممالک کے لشکر اس میں شامل ہیں۔ شاہ رچرڈ انگلستان سے آیا ہے۔ تو شاہ فلپ آگسٹس فرانس چھوڑ کر اس جنگ میں حصہ لینے آگیا ہے۔ یہ ریلا اور یہ صلیبی لشکر دو تین دن میں عسقلان پہنچ جائے گا۔ ہم نے عکہ سے جافا تک ان پر برابر حملے جاری رکھے ہیں۔ ہم عسقلان کو بچا سکتے ہیں لیکن عسقلان کی حفاظت کرنے کی صورت میں ہمیں بیت المقدس کا دفاع کمزور کرنا پڑے گا۔ ہمیں بیت المقدس اور دوسرے اہم مقامات سے فوجیں ہٹا کر عسقلان کی حفاظت کے لئے فوجیں لانا ہوں گی۔"

"ان حالات میں ہم بیت المقدس کا دفاع کمزور کر کے عسقلان کو بچا بھی نہیں سکتے اور عسقلان کو بے یار و مددگار چھوڑ بھی نہیں سکتے کہ صلیبی ریلا یہاں پہنچ کر عسقلان کی اینٹ سے اینٹ بجا دے اور اہلِ عسقلان کا قتلِ عام کیا جائے۔ اس لئے ہم نے فیصلہ کیا ہے کہ آپ خود اپنے ہاتھ سے لگائے ہوئے اس خوبصورت پودے کو جڑ سے اکھاڑ کر پھونک دو۔ نہ رہے بانس نہ بجے بانسری۔"

"اے اہلِ عسقلان یہ قربانی تو آپ کو دینا ہوگی کیونکہ عسقلان اب اس زہریلے پھوڑے کی مانند ہو گیا ہے جسے جسم سے اس لئے کاٹا گیا تھا کہ باقی جسم زندہ اور محفوظ رہ سکے۔ اے قاضی شہر آپ اعلان کرا دیجیے کہ تمام لوگ بغیر رنگ و نسل عسقلان کو فوراً چھوڑ دیں۔ وہ جتنا سامان ساتھ لے جا سکتے ہوں لے جائیں ان کے لئے بہترین پناہ گاہ مصر ہے یا پھر بیت المقدس۔ ہم دونوں مقامات پر یہ پیغام بھیج رہے ہیں کہ عسقلان کے مہاجروں کو وہی تمام مراعات دی جائیں جو مکہ سے مدینے جانے والے مہاجروں کو دی گئی تھیں۔"

"اے بہادر قوم کے بہادر شہریو۔ جاؤ اپنا سامان سمیٹو کیونکہ صبح کی پہلی کرن کے ساتھ عسقلان کو بنیادوں سے اس طرح اکھاڑ پھینکا جائے گا جیسے یہ شہر کبھی آباد ہی نہ تھا۔"

حاضرین اور سامعین پر اس قدر سناٹا طاری تھا جیسے وہاں ایک متنفس بھی موجود نہ ہو۔ صرف ہلکی ہلکی سسکیوں کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔

سلطان صلاح الدین خاموش ہوا تو قاضی شہر نے نمناک آنکھوں سے کہا۔ "خدا کی قسم عسقلان کا ایک پتھر اکھاڑنے کے بجائے میری ساری اولاد مر جاتی لیکن اب کیا کریں۔ یہ امر مجبوری ہے۔"

وہاں جمع ہو جانے والی خواتین کی سسکیاں پہلے ہلکی چیخوں پھر نالہ و فریاد کی صورت اختیار کر گئیں لیکن انہوں نے کسی سے فریاد نہ کی اور روتی ہوئی اپنے گھروں کو واپس ہو گئیں۔

صبح کو سلطان کے لشکریوں کے ساتھ شہر کے مزدور اور وہ جوان جو سلطانی لشکر میں ملازمت کے لئے آئے تھے سب کے سب عسقلان کے دیدہ زیب شہر سے اس طرح چمٹ گئے جیسے شہد کی مکھیاں چھتے سے چمٹتی ہیں۔ سلطان صلاح الدین باوجود شدید بخار کے گھوڑے پر سوار صبح سے شام تک عسقلان کو زمین کے برابر ہوتے دیکھتا رہا اور ضروری ہدایات بھی دیتا رہا۔

سلطان نے شہر کو کئی حصوں میں بانٹ دیا تھا۔ اس کے علاوہ فصیل کو ایک الگ حصہ قرار دے کر سب سے پہلے اسی کی بیخ کنی کی گئی۔ اہلِ عسقلان صبح ہونے سے پہلے اپنا ضروری سامان لے کر شہر سے نکل گئے تھے ان میں زیادہ کا رخ مصر کی جانب تھا اور کچھ لوگ بیت المقدس کی طرف جا رہے تھے۔

اس سلسلے میں بہاؤالدین رقمطراز ہے۔

سلطان نے یہ ناگوار فریضہ اپنے لشکر کے سپرد کیا اور ان کی مدد کے لئے مزدوروں کی ایک کثیر جمعیت بھی مہیا کی۔

جب مزدور شہر میں داخل ہوئے تو گویا ہر گھر میں صفِ ماتم بچھ گئی۔ یہ شہر نہایت خوش منظر تھا۔ اس کی فصیل مضبوط تھی اور مکانات نہایت خوبصورت تھے۔ لوگوں نے اپنا وہ سامان جو وہ ساتھ نہیں لے جا سکتے تھے اونے پونے بیچ دیا۔ اس دن ایک درہم کی دس دس مرغیاں

فروخت ہوئیں۔ اہلِ عسقلان اپنے اہل و عیال کو لے کر کیمپ میں آ گئے اور گھر کی باقی ماندہ چیزیں وہیں فروخت کر دیں۔ فوج تھکان سے خستہ تھی سپاہیوں نے وہ رات خیموں میں بسر کی۔ اُف خدایا یہ کتنی مصیبت کا دن تھا۔

صبح ہوتے ہی سلطان نے فصیل کے انہدام کا کام شروع کرا دیا۔ سلطان نے شہر میں موجود غلے کے ذخیروں کو مزدوروں میں تقسیم کر دیا۔ مزدوروں نے ایک سرے سے لے کر دوسرے سرے تک مکانوں کو آگ لگا دی، برجوں میں لکڑیاں بھر کر انہیں نذرِ آتش کر دیا گیا۔

سلطان کی طبیعت دو روز تک اتنی ناساز رہی کہ نہ وہ سواری کر سکتا تھا اور نہ کچھ کھا پی سکتا تھا۔ سلطان نے اپنا خیمہ فصیل کے قریب منتقل کرا لیا تھا۔ اس نے شتربانوں اور گدھے ہانکنے والوں کو بھی کام پر لگا دیا تھا۔ اس عجلت کی وجہ ظاہر تھی کہ اگر دشمن کو اس کا علم ہو جاتا تو وہ اس سے فائدہ اُٹھاتا اور کام میں رخنہ اندازی ہوتی۔

عسقلان کی بربادی کی خبر صلیبیوں کو جافا میں پہنچی تو وہ ہنس دیے۔ رچرڈ نے جافا میں اپنی پہلی کانفرنس میں اعلان کیا۔

"معزز حاضرین! ترک عسقلان برباد کر رہے ہیں۔ انہیں ہمارے خلاف نبرد آزما ہونے کی جرأت نہیں۔ اب ہمیں فوراً اس شہر کو بچانا چاہیے۔"

لیکن جافا سے باہر کوئی نہیں نکلا۔ زیتون کے درختوں پر صلیبیوں کے جھنڈے لہراتے۔ شمال کی خنک ہوا چلتی رہی اور نہر کے شاداب کناروں پر صلیبیوں کے گھوڑے چرتے رہے۔ صلیبی لشکری انجیر، انگور اور بادام کھاتے رہے اور جافا کے محلوں میں آرام کرتے رہے یا پھر ٹولیوں کی صورت میں کشتیوں میں بیٹھ کر عکہ پہنچ گئے۔ ڈھائی سالہ بربادی کے بعد صلیبیوں نے اس پر قبضہ کرتے ہی اُسے عشرت کدوں میں تبدیل کر دیا تھا۔ قرب و جوار ہی نہیں بلکہ یورپ تک سے وہاں خوبصورت عورتیں جمع ہو گئی تھیں۔ یہ عورتیں ان عشرت گاہوں میں صلیبی سپاہیوں کی مفت میں دلداری کرتی تھیں۔ ان کے خیال میں یہ کارِ ثواب تھا۔

جافا میں مقیم صلیبی اس بات پر بحث کرتے تھے کہ انہیں اب کیا کرنا چاہیے۔ آخر یہ طے پایا کہ جافا کی دیواروں کی پہلے مرمت کرنا چاہیے۔

مغربی افسانہ طرازوں نے ارسوف کی جھڑپ کو ایک معرکۂ عظیم قرار دیا ہے۔ حالانکہ مورخین اُسے جنگ کا نام بھی نہیں دیتے اور اس کا ذکر ایک جھڑپ کی طرح کرتے ہیں۔ دراصل انہیں رچرڈ کو شیر دل رچرڈ بنانا تھا۔ اس کے لئے انہوں نے ارسوف کی ایک عام جھڑپ کو ایک خوفناک جنگ بنایا۔ اور اس کی تفصیل بیان کرنے میں کتنے ہی صفحات کالے کر ڈالے۔ مغرب والوں نے اس جھڑپ کو اس لئے منتخب کیا کہ اس میں رچرڈ کو خود اپنے دفاع کے لئے تلوار اُٹھانا پڑی تھی۔

بس رچرڈ کا ہاتھ میں تلوار پکڑنا تھا کہ وہ تیسری صلیبی جنگ کا ہیرو اور "شیر دل رچرڈ" بن گیا۔ آیئے پہلے اس جھڑپ اور بقول مغربی افسانہ طراز معرکۂ عظیم کا حال ہیرالڈ لیم کی زبان سے سنتے ہیں۔ اگرچہ ہم اسکی پوری تفصیل تو بیان نہیں کر سکتے اس لئے کہ اس کے لئے پندرہ بیس صفحات درکار ہوں گے۔ چنانچہ اسے اختصار سے کام لیتے ہوئے پیش کرتے ہیں۔

ارسوف قیصریہ اور عسقلان کے درمیان ایک آبادی تھی۔ جس کا ذکر تاریخوں میں محض مسلمانوں اور عیسائیوں کی اس جھڑپ کی وجہ سے ہوا۔

ہیرالڈ لیم اس جنگ کا حال اس طرح بیان کرتا ہے۔

فوج بڑھتی گئی۔ ساحل سنسان تھا۔ کہیں بھیڑیں بھی چرتی نہ دکھائی دیتی تھیں۔ قیصریہ شہر خالی اور ویران تھا۔ ہمارا بیڑا قیصریہ پہنچا اور عکہ سے سامان رسد اور باقی لوگوں کو لے آیا۔

ایک اور تذکرہ نویس نے لکھا ہے کہ ہماری فوج جنگلوں کے دریا کے کنارے خیمہ زن ہوئی۔ ہمارے آقا اور یسوع مسیح اکثر یہاں اپنے حواریوں کے پاس آیا کرتے تھے۔ اب ترکوں نے شہر پناہ کے کئی حصے اور برج منہدم کر دئیے تھے۔

قیصریہ سے فوج ساحل کے اندرونی جانب ہٹ گئی
کیونکہ پہاڑیوں کا پُر خطر سلسلہ ساحل سے دور چلا گیا تھا۔
سرداروں نے شاداب زمین، چشموں اور کنووں سے گزرتی
ہوئی راہ اختیار کی۔

عیسائی فوجیں قیصریہ سے روانہ ہوئیں تو اس کے
عقب میں مسلمان رسالہ نمودار ہوا۔ عیسائی فوج کا ساقہ ان کے
حملوں اور تیروں کی بوچھاڑ سے سخت پریشان تھا۔ رچرڈ نے یا
اس کے مشیروں نے ایسی ترتیب کی کہ پُر جوش دشمن کے
حملے کارگر نہ ہوئے۔

سمندر سے قریب اور مسلمانوں کی دسترس سے دور
تیسرا لشکر تھا۔ اس میں گاڑیاں، سامانِ رسد، مال و اسباب
بردمیں اور مریض شامل تھے۔ یہ لشکر مزے سے رواں دواں
تھا۔ بہر کیف تیسرے لشکر کے دستے مقررہ وقت کے بعد
باری باری پہلے لشکر کے پیادوں سے تبدیل کر دیے جاتے
تھے تاکہ انہیں آرام مل سکے۔

پہلے دن لڑائی دوپہر تک جاری رہی اور چلچلاتی دھوپ
میں فرنجیوں کا جوش ٹھنڈا پڑ گیا۔ عیسائی فوج ریتیلے ٹیلے عبور
کر کے ایک تنگ گھاٹی میں جا پہنچی۔ مسلمانوں نے بڑی ہو
شیاری سے یہاں کمین گاہیں بنائی ہوئی تھیں۔ انہوں نے
عیسائی ہراول دستوں کو گھیر لینے کے لئے کئی پھندے لگائے
تھے اور انہیں نگاہوں سے چھپا دیا تھا لیکن ٹمپلر مسلمانوں کی
چال کو بھانپ گئے۔ انہوں نے اپنی پیش قدمی روک دی اور
دریا کے کنارے خیمہ زن ہو گئے۔ وہاں کا پانی اچھا تھا۔
عیسائیوں نے اس دریا کا نام "دریائے مردار" رکھا۔

دوسرے دن ہماری فوج ایک لق ودق میدان سے گز
ری۔ ساقہ پر ٹمپلر متعین تھے۔ وہ ترکوں کے پیہم حملوں سے
سخت پریشان ہوئے۔ سارا دن ترکوں کا طوفان جاری رہا اور وہ
شفق پھوٹنے کے بعد خیموں کو لوٹے۔ تیسرے دن ہماری
فوج نے تکیں دریا سے کوچ کیا اور صف بستہ ہو کر بڑھی۔
اس دن یہ افواہ گرم تھی کہ جنگل میں ترک گھات لگا کر بیٹھے ہیں
اور موقع پا کر ہمارے ارد گرد جھاڑیوں کو آگ لگا دیں گے لیکن
ہماری فوج نے بڑے نظم و ضبط کے ساتھ مفروضہ کمین
گاہوں سے نکل کے کھلے میدان میں آ گئے۔ وہاں جاسوس خبر
لائے کہ آگے ترکوں کی بے شمار فوج راستہ روکے پڑی
ہے۔

صلاح الدین اور ملک العادل نے یہ میدان جنگ کے
لئے منتخب کیا تھا اور دو دن تک سلطانی رسالے عیسائی سواروں
کو پیادوں کے حفاظتی حلقے سے نکالنے کی کوشش کرتے رہے
لیکن بے سود۔ عیسائی سوار کھلے میدان میں لڑنے کے لئے
آمادہ نہ ہوئے۔ مسلمان فوج سواروں پر مشتمل تھی۔
اور اُسے رسالہ پر کم از کم پانچ گنا عددی فوقیت حاصل تھی (اس
سفید جھوٹ کو کیا کہا جائے۔ رچرڈ کے ساتھ تقریباً تین لاکھ کا
لشکر تھا۔ فسانہ طراز کے خیال کے مطابق پھر سلطان کی فوج
پندرہ لاکھ ہونا چاہیے) مسلمان فوج کا مقصد صلیبی سواروں کے
حفاظتی حلقے میں انتشار پیدا کرنا تھا۔ اس مقصد کے لئے انہوں
نے صلیبی فوج کو پیادوں کے حفاظتی حلقے سے نکلنے کی بار بار
ترغیب دی لیکن عیسائی فوج اپنی جائے پناہ چھوڑنے پر تیار نہ
ہوئی۔ اگر وہ اپنی جگہ چھوڑ دیتے تو ترک انہیں میدانی علاقے میں
ذروں کی طرح بکھیر دیتے۔

رچرڈ اس خطرے سے آگاہ تھا۔ اس لئے اس نے
تاکید کی تھی کہ خواہ کتنا ہی اشتعال کیوں نہ دلایا جائے وہ ہرگز
صف بندی نہ چھوڑیں اور انہیں حملے کے اعلان کا منتظر رہنا
چاہیے۔

اس دن فوج گنجان دستوں کے جم غفیر کی صورت میں
آہستہ آہستہ آگے بڑھی جیسے کوئی عفریت تیروں اور بھالوں
کی چبھن سے بے پروا ہو کر آہستہ آہستہ زمین پر رینگ رہا ہو۔
ٹمپلر مقدمۃ الجیش میں تھے۔ ان کے پیچھے برٹینی کا لشکر اور
انجو کے نائٹ تھے۔

ان کے پیچھے گائی لوسگنان کی سرکردگی میں اہل پوشو
کے دستے مارچ کر رہے تھے۔ ان کے پیچھے برطانوی اور نارمن
سردار شاہی نشان لئے رواں تھے۔ ساری فوج کے عقب میں
سیاہ پوش ہاسپٹلر تھے۔ جو ترکوں کی پیہم یلغار کا شکار
ہوئے۔ شاہ رچرڈ اور ڈیوک آف برگنڈی صفوں کے درمیان
میں سے گھوڑے دوڑاتے گزرے اور انہوں نے لشکر کو حوصلہ

دیا۔

ڈی ونسوف نامی تذکرہ نگار کا بیان ہے کہ ہماری فوج کے عقب میں ایک شدید گرج سنائی دی۔ گویا دشمن گرزوں سے ضرب لگا رہا ہو۔ دشمن ہمارے عقبی دستوں سے یوں اُلجھ گیا کہ وہ اپنے تیر کمان نہ استعمال کر سکے۔ دست بدست لڑائی شروع ہو گئی۔ جب ترکوں کی تلواروں کی ضرب ان کی زرہوں پر پڑتی تو یوں گونج اُٹھتی جیسے لوہے کے ہتھوڑے سے کوٹا جا رہا ہو۔ وہ گرمی سے بے حال ہو رہے تھے۔ انہیں دم لینے کی بھی فرصت نہ تھی۔ ہاسپٹلر کی آخری صفیں ترکوں کے حملے کی تاب نہ لا سکیں اور بُری طرح کچلی گئیں۔ وہ نہایت حوصلے اور استقلال سے ڈٹے رہے۔ اور بھاری نقصان اُٹھانے کے باوجود انہوں نے اپنی مقررہ پیش قدمی جاری رکھی۔

ترک فریہ نعرے لگاتے ہوئے انہیں للکارتے۔

"ہم خوددار ہیں اور کوئی ضرب ہم پر کامیاب نہیں ہو سکتی۔"

پھر تقریباً بیس ہزار ترک ہمارے سپاہیوں پر ٹوٹ پڑے۔ اس خوفناک حملے سے گھبرا کر گارنیر ڈی نیپلز جو ہاسپٹلرز کا ایک سردار تھا بے اختیار چلا اُٹھا۔

"المدد سینٹ جارج المدد۔ کیا تمہیں گوارا ہے کہ ہم یونہی روندے جائیں۔"

یہ دیکھ کر ہاسپٹلروں کا قائد بھاگتا ہوا شاہ رچرڈ کے پاس پہنچا اور عرض کیا۔

"بادشاہ سلامت۔ دشمن نے ہمارا قافیہ تنگ کر دیا ہے۔ مجھے ڈر ہے کہ کہیں ہم منہ موڑ کر ازلی بدبختی کا شکار نہ ہو جائیں۔ بے شمار گھوڑے دشمن کے تیروں کا شکار ہو چکے ہیں۔ آخر ہم ہی اکیلے کیوں دشمن کا حملہ روکیں؟"

"اچھے نائٹ یہ حملہ آپ ہی کو روکنا پڑے گا۔ کوئی شخص بھی ہر جگہ موجود نہیں ہو سکتا۔" رچرڈ نے اُسے جواب دیا۔

جب ہاسپٹلر خاموشی سے واپس ہوا تو کوئی شہزادہ اور کاؤنٹ ایسا نہ تھا جس کا چہرہ ندامت اور شرمندگی سے سرخ نہ ہو گیا ہو۔

وہ آپس میں باتیں کرنے لگے۔

"کیوں نہ گھوڑے دوڑا کر دشمن پر حملہ کیا جائے؟"

یہ سنتے ہی دو جوشیلے نائٹ آگے بڑھے۔ وہ مزید تاخیر برداشت نہ کر سکے۔ ان کی عجلت پسندی سے دوبارہ ابتری پھیل گئی۔ وہ گھوڑے اُڑاتے ہوئے ترکوں کی صفوں پر جھپٹے اور دونوں نے اپنے اپنے مدِ مقابل کو چھید دیا۔ ان میں سے ایک ہاسپٹلروں کا مارشل تھا۔ اور دوسرا بالڈون ڈکیرو تھا۔

جب عیسائیوں نے ان دو منچلے سرداروں کو یوں بہادری سے دشمن پر جھپٹتے دیکھا اور "سینٹ جارج مدد" کا نعرہ سنا تو انہوں نے بھی باگیں اُٹھائیں اور نہایت جوش و خروش سے دھاوا بول دیا۔ اب ہاسپٹلروں کے بھی حوصلے بڑھے ورنہ دن بھر کی یورش سے ان کی صفوں میں اتنی بیبرنگ گئی تھی کہ وہ پریشان تھے۔ تب انہوں نے بھی پیش قدمی کی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ فوج کا پچھلا حصہ آگے اور اگلا حصہ پیچھے ہو گیا یعنی ہاسپٹلرز جو عقب میں تھے اب وہ مقدمۃ الجیش بن گئے تھے۔

جب شاہ رچرڈ نے اپنی فوج کی تیز حرکت دیکھی تو وہ بھی ہاسپٹلرز کے درمیان سے اپنا گھوڑا دوڑاتا ہوا ترک پیادوں پر جا پڑا۔ رچرڈ اور اس کے سرداروں کی تابڑتوڑ ضربوں سے ترک پیادے گھبرا گئے۔ اور ان کے لئے راستہ کھلا چھوڑ کر دائیں بائیں بھاگنے لگے۔ زمین لاشوں سے پٹ گئی۔ دوست دشمن بلا تمیز روندے جا رہے تھے۔ سواروں کے بغیر گھوڑے غول در غول بھاگے جا رہے تھے۔

اُف لڑائی ان لوگوں کے تصور سے جو خانقاہوں میں مراقبے میں غرق رہتے ہیں کس قدر مختلف اور بھیانک ہوتی ہے۔

اس معرکے میں ہمارے بادشاہ نے اپنی غیر معمولی شجاعت سے دشمن کی صفوں میں شگاف کر کے اپنے لئے ایک کشادہ راہ بنالی۔ اس فضول تعریف کو کیا نام دیا جائے۔ معلوم ہوتا ہے کہ ترکوں کی صفیں نہیں بھیڑ بکریاں تھیں۔ چنانچہ دشمن کے سپاہی مرعوب ہو کر رچرڈ کے راستے سے ہٹ گئے۔

ترکوں کا قائد امیر تقی الدین تھا۔ جو سلطان کا عزیز تھا۔ سات سو منتخب بہادر تقی الدین کے ہمرکاب تھے۔ یہ

دستے صلاح الدین کے ذاتی لشکر کا حصہ تھے۔ ہر دستہ زرد علم بلند کئے ہوئے بڑھا۔ وہ مردانگی کے خوفناک پیکر تھے۔

جب انہوں نے اپنے تازی گھوڑوں کو سرپٹ دوڑاتے ہوئے حملہ کیا تو ہمارے سردار عزم و استقلال کے باوجود ان کی بے پناہ یورش کی تاب نہ لا سکے۔ اب لڑائی بہت خونریز اور خوفناک ہو گئی۔ دشمن ہمیں کچلنے کی بے پناہ کوشش کر رہا تھا۔ اور ہم دشمن کو پیچھے دھکیلنے میں ایڑی چوٹی کا زور لگا رہے تھے۔

یہ دیکھ کر بادشاہ اپنے قبرصی کمیت (گھوڑے) پر سوار ہوا اور دشمن پر جھپٹا۔ اس نے مخالفوں کو منتشر کر دیا اور اس کی شمشیر کی ضرب سے کئی خود پاش پاش ہو گئے۔ اس کے سامنے دشمن نہ ٹھہر سکا۔ اس طرح ہماری فوج کو چھٹکارا ملا۔

پھر ہم نے ارسوف کا رخ کیا اور شہر پناہ کے باہر خیمے نصب کیے گئے۔ ابھی ہم خیمے نصب کرنے میں مصروف تھے کہ ناگہاں دشمن کی ایک کثیر جمعیت نے ہمارے عقبی دستوں پر دوبارہ ہلہ بول دیا۔ رچرڈ صرف پندرہ سواروں کو لے کر دوڑا اور ترکوں کے مقابلے میں ڈٹ گیا۔ انہوں نے زور کا نعرہ لگایا۔

"یا مزار المسیح۔ المدد۔ الغیاث۔"

جب ہمارے سپاہیوں نے یہ نعرہ سنا تو وہ بھی تیزی سے بادشاہ کی طرف بھاگے۔ انہوں نے ترکوں پر حملہ کر کے انہیں پسپا کر دیا۔

ہماری فوج دن بھر کی تکان سے چُور تھی۔ اس رات وہ آرام سے سوئے۔ لُوٹ کے طلب گار چپکے سے میدانِ کارزار کو چلے گئے۔ واپس آ کر انہوں نے بتایا کہ ہم نے بتیس ترک سرداروں کی لاشیں خود گنی ہیں۔ ترک بھی اپنے سرداروں کی لاشوں کی تلاش میں سرگرداں رہے۔

اس طرح صلاح الدین کی صلیبیوں کو کھلے میدان میں شکست دینے کی کوشش ناکام ہوئی۔ رچرڈ کے حکم کے خلاف دو نائٹوں نے اچانک حملہ کیا اور دو سپاہی رسالے نے ان کی متابعت کی تو مسلمان گھبرا گئے اور مسلمان لشکر کو بھاری نقصان اٹھا کر پہاڑوں کی سمت پسپا ہونا پڑا۔ اس حملے میں مسلمانوں کو پہلی مرتبہ رچرڈ شیر دل کی غیر معمولی شجاعت سے سابقہ پڑا تھا۔

تقی الدین اور ترک امیروں کے جوابی حملوں سے صلیبی لشکر بہ عجلت تمام ارسوف کے باغات اور مورچوں میں پناہ لینے پر مجبور ہونا پڑا۔ دوسرے دن صلاح الدین بہ نفسِ نفیس میدان جنگ میں آیا لیکن صلیبیوں کو مقابلے میں آنے کی جرأت نہ ہوئی۔

یہ بیان تھا ہیرلڈ لیم کا۔ ارسوف کی جھڑپ کے متعلق جسے پہلے اس نے معرکۂ عظیم قرار دیا۔ پھر ارسوف میں مسلمانوں کی شکست کا اعلان کیا اور آخر میں خود ہی لکھتا ہے۔

ارسوف کی چپقلش کو باقاعدہ لڑائی نہیں کہا جا سکتا اگرچہ سلف کے چند مؤرخوں نے اسے فیصلہ کن لڑائی قرار دیا ہے۔

پھر رچرڈ نے جافا میں اپنی پہلی کانفرنس میں اعلان کیا۔

"معزز سردارو! ترک عسقلان برباد کر رہے ہیں۔ انہیں ہمارے خلاف نبرد آزما ہونے کی جرأت نہیں۔ ہمیں فوراً اس شہر کو بچانا چاہیئے۔"

مگر رچرڈ کے اعلان پر کسی نے کان نہ دھرے۔ نہروں کے شاداب کناروں پر گھوڑے مزے سے چرتے رہے اور صلیبی بڑے شوق سے پکے ہوئے انگور اور تازہ انجیر و بادام کھاتے رہے۔ بہت سے کشتیوں کے ذریعے عکہ کی عشرت گاہوں میں پہنچ گئے۔ جہاں یورپ سے حسین عورتیں ان کا دل بہلانے اور دادِ عیش دینے آئی تھیں۔

شاہ رچرڈ نے قبرص میں بڑی دھوم دھام سے شہزادی برنگیریا سے شادی کی تھی۔ مگر جب شاہ قبرص سے عکہ آیا تو پتا نہیں، میاں بیوی میں کیا پیچ پڑ گیا کہ رچرڈ برنگیریا سے کھنچا کھنچا رہنے لگا۔ شاہ بازنطینی شہزادی سوسن کو عکہ اپنے ساتھ ہی لایا تھا۔ سوسن کو اپنے مرتبے کا احساس ہو گیا تھا۔ اُسے رچرڈ اور برنگیریا کی شادی کے دن ہی معلوم ہو گیا تھا کہ اب اس کی حیثیت ایک داشتہ سے زیادہ نہیں ہے پھر بھی وہ تن بہ تقدیر رچرڈ سے چمٹی رہی اور کوئی حرفِ شکایت زبان

بے زبانی۔

ہو سکتا ہے کہ سوسن کی یہ بے زبانی ہی اس کی سفارش بن گئی ہو۔ بہر حال یہ حقیقت ہے کہ عکہ کے محاصرے کے دوران جب شاہ رچرڈ بظاہر بیمار ہوا تھا۔ وہ اکثر شہزادی سوسن کو اپنے خیمے میں بلایا کرتا تھا۔ سوسن اسی لشکر میں جس میں برگمیریا بھی رکھی گئی تھی لیکن رچرڈ نے تمام پہریداروں کو تاکید کی تھی کہ سوسن اور برگمیریا جو ملکہ انگلستان ہو چکی تھی، کو ایک دوسرے کی خبر نہ ہونی چاہیئے۔

مگر یہ کیسے ممکن تھا کہ ایک ہی پڑاؤ میں جب شہزادی سوسن کو طلب کیا جاتا اور وہ پردوں کی طویل غلام گردشیں طے کر کے شاہ رچرڈ کے عالیشان خیمے میں پہنچتی تو اسے کوئی نہ دیکھ پاتا۔ محافظ، لونڈی۔ غلام ہر دوسرے تیسرے دن یہ تماشا دیکھتے لیکن اپنی آنکھیں بند اور زبان پر تالے لگا لیتے تھے۔

شاہی محلات (یہ محلات خیموں، پھول داریاں اور قناتوں کے تھے۔ کیونکہ رچرڈ کی لشکر گاہ عکہ کے باہر میدان میں تھی) میں سازشیں اور ریشہ دوانیاں تو ہوا ہی کرتی ہیں۔ مگر میدانِ جنگ کے یہ محلات بھی اس بدعت سے پاک نہ تھے۔ ملکہ اور شہزادیوں کی اپنی اپنی خاص کنیزیں ہوتیں۔ جو جاسوسی کے فرائض بھی انجام دیتی تھیں۔ ظاہر ہے کہ ایسی کنیزوں کی اپنی مالکنوں کی نظروں میں اسی وقت تک قدر رہتی ہے جب تک وہ مالکن کو روز کوئی نہ کوئی نئی خبر پہنچاتی رہیں۔ اس طرح ان کنیزوں کو اپنی کارکردگی برقرار رکھنے کے لئے سچ سے زیادہ جھوٹ کا سہارا لینا پڑتا تھا۔ اور یہی جھوٹ سازشوں کو جنم دیتا تھا۔ شاہ رچرڈ کے ساتھ اس کی بہن جین اور بیوی برگمیریا تھیں۔ مگر ان دو کے علاوہ ایک تیسری اہم شخصیت شہزادی سوسن کی تھی۔ جو باوجود داشتہ ہونے کے شاہ رچرڈ کے ذہن پر چھائی ہوئی تھی۔ شاہ نے اگرچہ ان دو پارٹیوں کو الگ الگ رکھا تھا اور اس کا خیال تھا کہ شہزادی سوسن اور ملکہ برگمیریا ایک دوسرے کے حالات اور واقعات سے قطعی ناواقف ہیں۔ حالانکہ ہر رات جب سارا عالم سوتا تو برگمیریا اور سوسن کی منہ چڑھی کنیزیں اپنی اپنی مالکن کے خاص کمرے میں (خیال رہے کہ یہ کمرے بھی خیموں کے اندر قناتوں سے بنائے جاتے تھے) داخل ہوتیں اور دن بھر کی تمام جھوٹی سچی داستان سنا کر انعام حاصل کرتیں۔

خود شاہ رچرڈ بھی جاسوسی کے اس عیب سے خالی نہ تھا۔ اس کی بھی کچھ خاص کنیزیں تھیں جنہیں اس نے ملکہ برگمیریا اور شہزادی سوسن کی خدمت پر اس لئے مامور کیا تھا کہ وہ دن بھر کا دیکھا سنا بادشاہ کو سنایا کریں۔ اس کی تفصیل کچھ اس طرح سے ہے کہ شاہ رچرڈ کی جو کنیز ملکہ برگمیریا کی خدمت پر مامور تھی وہ برگمیریا کی جاسوسی شاہ رچرڈ سے کرتی۔ اور شاہ رچرڈ کی ایک ایک بات نمک مرچ لگا کر برگمیریا کو سناتی تھی۔ اس طرح وہ دونوں کی نظروں میں معتمد اور معتبر تھی۔ یہی کام شہزادی سوسن کے پاس خدمت کے لئے بھیجی جانے والی کنیزیں کرتی تھیں۔ شہزادی سوسن جس قدر حسین اور جاذبِ نظر تھی اتنا ہی زیادہ عقلمند بھی تھی۔ اور اس کی اس عقلمندی ہی نے اسے شاہ رچرڈ کے ساتھ سمجھوتہ کرنے پر آمادہ کیا تھا۔ ورنہ عام عورت تو کسی بادشاہ کی داشتہ بننے پر فخر کر سکتی ہے مگر شہزادی کا رتبہ بھی تقریباً بادشاہ کے برابر ہوتا ہے۔ وہ یہ کیسے برداشت کر سکتی ہے کہ اسے داشتہ بنا کر رکھا جائے جبکہ اس کی شادی کسی شہزادے یا شاہ سے ہو سکتی ہو۔

ایک صبح شاہ رچرڈ کے محل میں صبح سے بھگدڑ مچی ہوئی تھی۔ کنیزیں اور غلام ادھر ادھر بھاگ دوڑ رہے تھے مگر ان کی زبانیں سر بمہر تھیں۔ ان کی گفتگو اشاروں اور کنایوں میں ہوتی تھی۔ انہی اشاروں اور کنایوں سے ان سب کو یہ معلوم ہو گیا کہ آج مزاجِ شاہ برہم ہے اور جب شاہ کا مزاج برہم ہو جائے تو پھر کوئی چیز ٹھکانے پر نہیں رہتی۔ شاہ کا مزاج برہم کرنے والا کوئی بھی ہو مگر اس کا سارا غصہ کنیزوں اور غلاموں پر اترتا ہے۔ اس وقت بھی کچھ ایسی ہی بات تھی۔

شاہ رچرڈ صبح بیدار ہوا تو الجھا الجھا سا تھا۔ ادھر ادھر سے جھانکتی ہوئی کنیزوں نے خود اندازہ کر لیا کہ آج دو چار غلاموں اور کنیزوں کا پتا کٹ جائے گا اور کوئی پتا نہیں کہ ایک دو غلام کنیزوں کو سولی پر چڑھا دیا جائے۔

شاہ نے تکیے سے سر اٹھا کر ادھر ادھر دیکھا پھر شیر کی

طرح دہاڑا۔ "کنیز کہاں ہے؟"

شاہ رچرڈ کی دہاڑ خوابگاہ کے باہر تک پہنچی تو دروازے سے لگی کنیز کانپتی ہوئی اندر داخل ہوئی اور آداب بجا لائی

"ہم نے تمہیں حکم دیا تھا۔ تم کیوں بھولیں!" شاہ رچرڈ تکیے کے سہارے بیٹھ چکا تھا۔

کنیز کو پسینہ آ گیا۔ اس کا پورا بدن لرزنے لگا۔ اس کی سمجھ میں نہ آ رہا تھا کہ کیا جواب دے۔ شاہ نے اُسے کوئی بھی حکم نہ دیا تھا۔ وہ ابھی ابھی تو آئی ہے اور رات کی کنیز کو رخصت کر کے اس نے بڑی احتیاط سے ڈیوٹی سنبھالی تھی۔ شاہ کی یہ پہلی آواز تھی۔ پھر اس نے حکم کس وقت دیا۔

"عالی جاہ۔" کنیز نے لرزتے ہوئے کہا۔ "کنیز ابھی ابھی آپ کی خدمت میں حاضر ہوئی ہے۔" کنیز اس لئے زیادہ وضاحت نہ کر سکی کہ وہ متلون مزاج شاہ سے واقف تھی۔ اس سے بحث کرنا موت کو دعوت دینا تھا۔

"تم سے پہلے کون کنیز تھی؟" رچرڈ کا لہجہ اسی طرح کھردرا تھا۔

"شالی تھی عالی جاہ۔" کنیز نے جلدی سے جواب دے کر جان چھڑائی۔

"اُسے پیش کرو۔"

رچرڈ نے حکم دے کر پھر تکیے پر سر رکھ دیا۔

کنیز فوراً باہر نکل گئی۔

اس کنیز نے رات والی کنیز کے پاس پہنچ کر اُسے بتایا۔

"یہ تو میں تمہاری آمد ہی سے سمجھ گئی تھی کہ کوئی بات ضرور ہو گی۔" رات کی کنیز تمام رات شاہ کی حضوری میں پیش ہونے کے بعد ابھی لیٹی ہی تھی کہ دن والی کنیز نے اُسے یہ کہہ کے ہلا دیا کہ بادشاہ غصے میں ہے۔

"تمہاری فوری طلبی ہوئی ہے۔" بلانے والی کنیز نے اُسے مزید بتایا۔

"وہ تو میں چلوں گی مگر یہ تو بتاؤ کہ ہوا کیا تاکہ میں اس کا کوئی توڑ پہلے ہی سے سوچ لوں۔" کنیز بستر چھوڑتے ہوئے بولی۔

"تم کپڑے پہننا شروع کرو۔" آنے والی نے کہا۔ "میں تمہیں بتا رہی ہوں ذرا جلدی کرو۔ کہیں دوسرا ہرکارہ نہ آ جائے تمہیں بلانے۔"

کنیز جلدی جلدی کپڑے بدلنے لگی۔

آنے والی نے اُسے تفصیل سے آگاہ کیا۔

رات والی کنیز کپڑے تبدیل کر کے کھڑی تھی اور گھبرائی ہوئی تھی۔ اس نے پوری رات کے شاہ رچرڈ کے دیئے ہوئے احکامات کو ایک ترتیب میں رکھا۔ مگر اس نے تو ان تمام احکامات کی تعمیل کی تھی۔ کوئی حکم بھی ایسا نہ تھا جسے وہ ٹال گئی ہو۔

تمام راستے دونوں خاموش چلتی رہیں۔ وہ اپنے خیالوں میں گم تھیں۔ خوابگاہ پر پہنچ کر دن والی کنیز دروازے کے ساتھ لگ کر کھڑی ہو گئی اور رات والی کو اندر جانے کا اشارہ کیا۔

کنیز اندر داخل ہوئی، بادشاہ دروازے کی طرف پشت کر کے لیٹا تھا۔

"کنیز تسلیمات پیش کرتی ہے عالی جاہ!" کنیز نے دھیمی آواز میں کہا۔

شاہ رچرڈ نے پلٹ کر دیکھا۔ کنیز کا جھکا ہوا سر زمین کو چھو رہا تھا۔

"تم نے ہماری حکم عدولی کی ہے۔ کیا سزا دی جائے تمہیں کنیز؟" شاہ کے لہجے میں شاہانہ طنطنہ تو نہ تھا مگر گرج موجود تھی۔

"عالی جاہ کنیز کا سارا خاندان انگلستان کے شاہی خاندان کی خدمات بجا لانے میں ہمیشہ پیش پیش رہا۔ کنیز کی کوئی خطا ہو یا نہ ہو میں ہر سزا بھگتنے پر تیار ہوں۔" کنیز نے کچھ ایسی شائستگی سے کہا کہ بادشاہ اس کا منہ دیکھتا رہ گیا۔

"دیکھو۔" شاہ اور نرم ہو گیا۔ "ہم بغیر قصور کے کسی کو سزا نہیں دیا کرتے۔ ہم نے تمہیں حکم دیا تھا کہ شہزادی سوسن سے کہا جائے کہ صبح دم جب ہم بیدار ہوں تو وہ ہماری خوابگاہ میں موجود ہو۔ شہزادی سوسن یہاں نہیں آئی۔ اس سے ہم نے یہ نتیجہ نکالا کہ تم ہمارا پیغام پہنچانا بھول گئیں۔"

عالی جاہ نے درست فرمایا۔" کنیز نے جیسے اقبالِ جرم کر لیا۔ "کنیز کی سماعت نے غلطی کی۔ میں رات شہزادی سوسن کے حضور گئی تھی مگر میں نے غلطی سے انہیں یہ پیغام دیا کہ عالی جاہ کی طبیعت آج کچھ مکدر ہے اس لئے انہیں حضور عالی میں حاضر ہونے کی ضرورت نہیں۔"

"ہاں۔ ہاں ہم نے تمہیں یہ پیغام دیا تھا۔ مگر۔۔ شاہ رچرڈ کہتے کہتے کچھ سوچنے لگا۔

"عالی جاہ یہ پیغام تو میں نے شہزادی کے گوشِ گزار کر دیا تھا۔" کنیز نے بہت سنبھل کر کہا۔

"مگر ہم نے یہ دوسرا پیغام کس کے ذریعے بھیجا۔" بادشاہ اُلجھتے ہوئے بولا۔

"عالی جاہ۔ حضور عالی میں کل رات کوئی دوسری کنیز حاضر نہیں ہوئی تھی۔" کنیز کی بن آئی تھی۔ الزام اس پر سے ہٹ گیا تھا۔

"ہو سکتا ہے کہ دوسرے دروازے سے کوئی غلام آیا ہو اور ہم نے اس کے ہاتھ پیغام بھیج دیا ہو۔" شاہ رچرڈ نے اپنا خیال ظاہر کیا۔

"جی عالی جاہ۔" کنیز بولی۔ "ایسا ضرور ہو سکتا ہے لیکن یہ اس وقت ممکن ہے کہ جب عالی جاہ نے دوسرے دروازے کے غلام کو یہ اجازت خاص دی ہو کہ وہ کسی خاص آدمی کو اس دروازے سے داخل ہونے کی اجازت دیتے ہیں۔ پھر بھی عالی جاہ اگر کوئی دوسرے دروازے سے خوابگاہ میں داخل ہوتا تو مجھے ضرور خبر ہو جاتی۔ اس لئے کہ میں دروازے کے ساتھ کھڑی ہوتی ہوں۔ اور میری نظر ہر وقت خوابگاہ کے اندرونی حصے کا جائزہ لیتی رہتی ہے کیونکہ یہ میرے فرائض میں داخل ہے۔"

"ہوں۔۔" بادشاہ نے ہنکاری بھری۔ "ہو سکتا ہے کہ یہ ہمارا مبہم کا کوئی منتشر خواب ہو۔ بہر حال اب تم جاؤ اور شہزادی سوسن کو اپنے ساتھ لے کر آؤ۔"

کنیز سلام کر کے باہر نکلی۔ وہ مسکرا رہی تھی۔ پہرے کی کنیز نے پوچھا۔ "کیسی گزری؟ تم تو بہت خوش نظر آ رہی

باہر آنے والی کنیز نے آہستہ سے گر بل کر کہا۔ "شاید اسی لئے کہا جاتا ہے کہ بادشاہ کی اگاڑی اور گھوڑے کی پچھاڑی سے بچ کر رہنا چاہئے۔ حضور نے خواب میں کسی کو حکم دیا تھا کہ سوسن صبح کو خوابگاہ میں موجود ہو اور الزام مجھ پر لگ رہا تھا۔"

پہرے والی کنیز نے ٹھنڈی سانس لے کر منہ بنایا۔ "یہی تو عیب ہوتا ہے بادشاہوں میں۔ خوش ہوں تو گالی دینے پر انعام دیے جاتے ہیں اور مزاج برہم ہو تو بے خطا ہونے پر بھی سولی پر چڑھوا دیتے ہیں۔"

اور شہزادی سوسن کے پاس پیغام لے جانے والی ہنستی ہوئی آگے بڑھ گئی۔

کنیز نے شہزادی سوسن کے محل میں پہنچ کر شاہ رچرڈ کا پیغام پہنچایا۔ یہ شاہی کنیز بڑی حسن پرست تھی۔ دو تین بار پہلے بھی شہزادی سوسن کے پاس شاہ کا پیغام لے کر آ چکی تھی۔ مگر اس کا طریقہ یہ رہا تھا کہ وہ بات تو منہ سے کرتی

"جب انسان شیر کو مارنے کی نیت سے جنگل کو جاتا ہے تو اسے شکار کھیلنا کہتے ہیں لیکن جب شیر انسان کو مارنے کے لئے حملہ کرتا ہے تو اسے درندگی کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ جرم اور انصاف میں صرف اتنا ہی فرق ہے۔" ......(برنارڈ شا)

"جو شخص ایک روپیہ چرائے وہ چور ہے جو ایک لاکھ چرائے وہ فن کار ہے۔" ......(برنارڈ شا)

کان گوشی

ایک شخص ٹرین میں کھڑکی کے ساتھ والی نشست پر بیٹھا تھا۔ ایک معمر خاتون بھی خالی نشست پر آ کر بیٹھ گئیں۔ تھوڑی دیر بعد وہ تیزی سے مڑیں اور برابر میں بیٹھے ہوئے شخص سے بولیں "میں بڑی دیر سے سن رہی ہوں کہ تم مجھے مخاطب کرنے کی کوشش کر رہے ہو حالانکہ تمہیں پتا نہیں کہ میں دونوں کانوں سے بہری ہوں۔"

تھی مگر اس کی آنکھیں شہزادی کے چہرے پر ٹھہر کر رہ جاتیں۔

شہزادی سوسن کپڑے تبدیل کرتے ہوئے بڑبڑائی۔

"یہ بادشاہ بھی اُلٹے دماغ کے ہوتے ہیں۔ رات کو فرمان جاری ہوا کہ آنے کی ضرورت نہیں اور اس وقت جبکہ اصل سونے کا وقت تو سویرا ہی ہوتا ہے تو بلاوا آ گیا۔ فوراً آ جاؤ۔ معلوم ہوتا ہے کہ اگر میں وہاں نہ پہنچوں گی تو شاہ بے چارے بستر ہی سے نہ اٹھیں گے۔"

"شہزادی نے بالکل ٹھیک کہا۔" کھورا جو شہزادی کو مسکرا مسکرا کر دیکھ رہی تھی اس نے شہزادی کے چہرے سے نظریں ہٹائے بغیر کہا۔ "شاہ بہادر رات بھر آپ کو خواب میں دیکھتے رہے ہیں اور صبح بیدار ہوتے ہی پہلا سوال یہ تھا کہ شہزادی سوسن کیوں نہیں آئی۔"

شہزادی سوسن تیار ہو کر کھورا کے برابر آ کر کھڑی ہو گئی۔ "کھورا تم ایسی باتیں مجھ سے نہ کہا کرو۔ جتنے چھپے ایک بار بلاوا آتا ہے۔ اس میں بھی ایک دو ناغے ہو جاتے ہیں اور میں بے چاری آنکھوں میں رات کاٹتی ہوں۔"

"ہائے شہزادی۔ آپ کی تنہائی اور بے کسی دیکھ کر کلیجہ منہ کو آتا ہے۔" کھورا نے بڑے پیار بھرے لہجے میں کہا۔ ایک بار پھر اس کی نظریں سوسن کے چہرے کا طواف کرنے لگیں۔ "آپ کا یہ گورا چہرہ اور یہ جوانی اس لئے تو نہیں کہ یوں گھٹ گھٹ کر رہے۔ میرا بس نہیں چلتا ورنہ برگمیریا کے محل میں جا کر اس کا منہ نوچ لوں۔"

شہزادی سوسن نے ہلکا سا قہقہہ لگایا اور حسن جیسے اور نکھر گیا۔ "کیوں بے چاری کے پیچھے پڑی ہو۔ کیا بگاڑا ہے اس نے تمہارا؟"

"بگاڑا یہ ہے کہ پوری شاہی مسند سنبھال کر بیٹھ گئی۔ آپ کو ذرا سی جگہ نہیں دیتی۔" کھورا بڑبڑائی۔ "بھلا کوئی صورت شکل بھی تو ہو۔ دبلی پتلی۔ لمبی تڑنگی۔ بھلا یہ صورتیں کہیں ملکہ انگلستان بننے کے قابل ہیں؟"

"جلو مت کھورا۔" سوسن ٹھنڈی سانس لے کر بولی۔ "ہم اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔ قبرص کے بڑے گرجے میں شاہ نے اس سے شادی رچائی تھی۔ اُف کیسا وقت تھا وہ۔ مجھے معلوم ہو گیا تھا کہ شاہ آج برگمیریا سے شادی کر رہے ہیں۔ مگر میں منہ سے نہیں بول سکتی تھی۔ میری قبرصی کنیز نے مجھے تاکید کی تھی کہ اگر میں نے کسی قسم کا واویلا کیا یا اودھم مچایا تو بابا حضور کی جان کی خیر نہ ہوگی۔ شاہ نے اپنے حلقے میں اعلان کر دیا تھا کہ اگر شہزادی نے اس کی شادی کی تقریب میں کوئی فتنہ کھڑا کیا تو وہ بابا حضور کو قتل کرا دیں گے۔"

کھورا کی آنکھوں میں بھی آنسو آ گئے۔ وہ تھی تو شاہ کی جاسوس مگر نہ معلوم کیوں شہزادی سوسن کے معصوم حسن پر ریجھ گئی تھی۔ شہزادی کا ہاتھ چوم کر بولی۔ "مت گھبرائیے شہزادی۔ آپ کے گھر بھی چاندنی آئے گی۔ ہمیشہ یہ اندھیرا تو نہیں رہے گا۔ بادشاہوں کے چھچھورے پن سے کون واقف نہیں۔ آج برگمیریا شاہ کے سر پر بیٹھی ہے تو کل نظر سے گر بھی سکتی ہے۔ دل سے اتر بھی سکتی ہے۔"

"جس دن ایسا ہوا میں تیرا منہ جواہرات سے بھر دوں گی۔" شہزادی نے بڑی مسرت سے کہا۔

پھر وہ دونوں کنیزوں اور غلاموں کی نظروں سے بچتی ہوئی ایک طویل اور ویران راہداری سے گزر کر شاہی محل پہنچ گئیں۔ کپڑے کی قناتوں سے بنائی جانے والی یہ راہداری بڑی پُراسرار تھی۔ شاہ اور سوسن کے محل نما خیموں کے درمیان یہ راہداری خاص طور پر شاہ نے بنوائی تھی۔ اور رات کے پچھلے پہر شاہ اپنی محبوبہ شہزادی سوسن کے ساتھ اسی راہداری میں گشت کرتا رہتا تھا۔

شہزادی سوسن اور کھورا شاہی خوابگاہ پر پہنچے تو پہریدار کنیز نے انہیں اندر جانے سے روکا کھورا نے کنیز کو بتایا۔ "شاہ نے مجھے شہزادی سوسن کو بلانے بھیجا تھا۔"

"تو مجھے بھی معلوم ہے کھورا۔" پہریدار کنیز مسکرائی۔ "مگر اب خوابگاہ کے اندر کی کیفیت بالکل تبدیل ہو گئی ہے۔ شاہ کے پاس اس وقت شاہ کی دو عزیز ترین ہستیاں موجود ہیں۔ ان کی موجودگی میں شہزادی سوسن کو میں کس طرح اندر جانے کی اجازت دے سکتی ہوں۔"

شہزادی سوسن نے ٹھنڈی سانسوں کے درمیان میں

کہا۔ "میں نے اپنا دل پتھر کر لیا ہے اب اس پر کسی بات کا اثر نہ ہوگا۔ تم بے تکلف نام بتاؤ۔"

کنیز سر جھکا کر اور آنکھیں چرا کر بولی۔ "اندر ملکہ انگلستان برگیمبریا آف نوائے اور شہزادی جین تشریف فرما ہیں۔"

"بہر حال ہم واپس تو نہیں جا سکتے۔" شہزادی سوسن نے نرم لہجے میں کہا۔ "ہمیں شاہ نے بلوایا ہے۔ انہیں ہماری آمد کی اطلاع ضرور ہونی چاہیے۔"

کنیز ہچکچائی تو کلورا نے کہا۔ "تم جانا نہیں چاہتیں تو مجھے اندر جانے دو۔ شاہ نے میرے ذریعے شہزادی سوسن کو بلوایا ہے۔ میں اندر جاؤں گی تو انہیں کوئی اعتراض نہ ہوگا۔"

"جب اندر جانا ہے تو پھر خود ہی جاتی ہوں۔" کنیز نے شہزادی کی طرف دیکھ کر کہا۔ "مگر میں صرف آپ کی ذمہ داری پر جا سکتی ہوں۔"

"ٹھیک ہے۔" شہزادی نے سر ہلایا۔ "میں شاہ سے کہوں گی کہ آپ نے مجھے بلوایا تھا۔ میں بغیر شاہ کو اطلاع دیے کیسے واپس جا سکتی ہوں۔"

شاہی کنیز خوابگاہ میں داخل ہوئی پھر چند ہی لمحوں بعد مسکراتی ہوئی آئی۔ "تشریف لے جائیں شہزادی سوسن۔ شاہ آپ کا بے چینی سے انتظار کر رہے ہیں۔"

شہزادی سوسن آگے اور کلورا پیچھے دونوں خوابگاہ میں داخل ہوئیں۔

اندر کا ماحول کچھ گمبھیر سا تھا۔ ملکہ برگیمبریا آف نوائے کا چہرہ دھواں دھواں تھا۔ اور شہزادی جین سر جھکائے بیٹھی تھی۔ واضح رہے کہ برگیمبریا اور شہزادی سوسن دونوں ایک دوسرے کے لئے اجنبی تھے۔ وہ ایک دوسرے کے بارے میں سب کچھ جانتی تھیں مگر ایک دوسرے سے ملنے کا اب تک اتفاق نہ ہوا تھا۔

شہزادی سوسن نے شاہ کو تعظیم پیش کی تو اس نے ہنس کر کہا۔

"ادھر آؤ سوسن۔ تم نے بہت انتظار کرایا۔"

سامنے ملکہ برگیمبریا اور شہزادی جین (رچرڈ کی بہن) بیٹھی تھیں۔ شاہ کا اشارہ پا کر سوسن، شاہ کے پاس پہنچی تو شاہ نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اپنی دائیں جانب بٹھا لیا۔

"جین تم تو سوسن کو جانتی ہو نا۔" شاہ کا موڈ بڑا خوشگوار معلوم ہو رہا تھا۔

"جی ہاں جانتی ہوں اور مل بھی چکی ہوں۔" شہزادی جین نے جواب دیا۔

"سوسن۔" شاہ نے ایک دم شہزادی سوسن سے سوال کیا تو وہ چونک پڑی۔ دراصل اس کی نظریں ملکہ برگیمبریا پر لگی ہوئی تھیں۔ اور وہ اس کے چہرے میں وہ چیز تلاش کر رہی تھی جس نے شاہ رچرڈ کا دل ایسا موہ لیا تھا کہ وہ اسے اپنی ملکہ بنانے پر مجبور ہو گیا تھا۔

"جی عالی جاہ۔" شہزادی سوسن نے جواب دیا۔

"تم ہماری ملکہ برگیمبریا کے بارے میں کس حد تک واقفیت رکھتی ہو؟" شاہ نے سوال کیا۔

"عالی جاہ مجھے صرف یہ معلوم ہے کہ آپ نے قبرص کے بڑے کلیسا میں شادی کی ہے۔ کس سے شادی کی اور کیوں کی اس کا مجھے کوئی علم نہیں۔" شہزادی نے دل جلے انداز میں جواب دیا۔ "خیر یہ تو اور زیادہ اچھی بات ہے۔" شاہ رچرڈ بولا۔ "اب آج سے تم پر ایک ذمہ داری ڈالی جا رہی ہے جسے تم ہر صورت نبھاؤ گی۔ ذمہ داری یہ ہے کہ آج سے ہم اپنی ملکہ برگیمبریا اور شہزادی جین کو تمہاری حفاظت میں دیتے ہیں۔ تم دونوں کی ایک طرح سے ان کی اتالیق (استاد) ہو گی اور ان کو اچھائی اور برائی میں تمیز کرنا سکھاؤ گی۔"

"لیکن عالی جاہ۔" شہزادی سوسن نے احتجاج کے لئے منہ کھولا تھا کہ شاہ نے بات کاٹ دی۔

"خاموش سوسن۔" شاہ نے تنبیہ کے انداز میں کہا۔ "تم ملکہ کی اتالیق ضرور ہو گی مگر یہ خیال رکھنا کہ برگیمبریا ملکہ انگلستان ہے اور یہ مرتبہ کسی اور کو نہیں مل سکتا۔"

انگلستان، فرانس، اطالیہ، جرمن، قبرص یعنی تقریباً پورے وسطی یورپ اور ملک شام کے نصرانی فرمانرواؤں کے متحدہ لشکر سلطان صلاح الدین ایوبی سے قبلۂ اول بیت المقدس کی بازیابی کے لئے نبرد آزما ہوئے جن کی تعداد چھ لاکھ سے زیادہ تھی لیکن تین سال تک مسلسل لڑائیوں اور جنگوں کے بعد صلیبیوں کو تین لاکھ عیسائیوں کی قربانی دینے پر بھی بیت المقدس کی ایک اینٹ بھی نہ حاصل ہو سکی۔ اور وہ بے نیل و مرام منہ پیٹتے اپنے اپنے گھروں کو واپس ہو گئے۔

الحمد للہ کہ ۴۹ قسطوں یعنی چار سال ایک ماہ کے عرصہ میں صلاح الدین کا سلسلہ اختتام کو پہنچا۔

الماس (ایم۔اے)

شہزادی سوسن نے شاہ رچرڈ کو سلام کیا۔ وہ سلام کرتے وقت سہرے کی حد تک جھک گئی تھی۔

"ہمارے پاس آؤ سوسن؟" شاہ نے فرمایا۔

قبرص کی شہزادی سوسن اس کے پاس پہنچی تو شاہ نے اس کا ہاتھ پکڑ کے اپنی دائیں جانب بٹھالیا۔ رچرڈ کے شاندار خیمے میں قالینوں کا فرش تھا۔ سامنے کی طرف شاہ رچرڈ کی مسند تھی۔ شاہ کے سامنے اس کی ملکہ برنگیریا اور بہن شہزادی جین بیٹھی تھی۔

"جین۔ تم سوسن کو جانتی؟" شاہ نے بہن کو مخاطب کیا۔

جین نے جواب دیا۔ "جی ہاں جانتی ہوں اور مل بھی چکی ہوں۔"

"سوسن!" شاہ رچرڈ نے سوسن کو چونکا دیا۔ وہ دراصل ملکۂ انگلستان برنگیریا کے سراپا کا جائزہ لے رہی تھی۔ شاید سوسن، ملکہ میں وہ خوبی تلاش کر رہی تھی جسے دیکھ کر رچرڈ نے اسے ملکہ کے لئے انتخاب کیا تھا۔

"جی عالیجاہ۔ میں گوش بر آواز ہوں۔" اس کی آواز میں گھنگروؤں کی کھنک تھی۔

"تم ہماری ملکہ برنگیریا کے بارے میں کس حد تک واقفیت رکھتی ہو؟" شاہ نے سوسن کو امتحان میں ڈال دیا۔

"صرف اس حد تک عالیجاہ کہ آپ نے قبرص کے بڑے کلیسا میں ان سے شادی کی تھی۔ مگر یہ نہ معلوم کر سکی کہ یہ شادی آخر کیوں ہوئی تھی؟" سوسن نے دل جلے انداز میں جواب دیا یا یوں کہئے کہ کلیجے کے پھپھولے پھوڑے۔

"تمہیں یہ جاننے کی نہ پہلے ضرورت تھی اور نہ اب ہے۔" یہ کہتے ہوئے شاہ نے برنگیریا کی طرف دیکھا جس کا چہرہ سوسن کے طنزیہ انداز پر غصہ سے سرخ ہو گیا تھا۔

ملکہ برنگیریا نے شاہ کی نظر اپنی طرف دیکھی تو فوراً اٹھ کے کھڑی ہو گئی۔

"عالیجاہ۔ میری طبیعت خراب ہو رہی ہے۔ مجھے آرام کی اجازت دی جائے۔" دراصل ملکہ انگلستان، سوسن کے ساتھ بیٹھنا اپنی توہین سمجھ رہی تھی۔

"بیٹھ جاؤ برنگیریا۔" شاہ کے لہجے میں تلخی آگئی۔ "جس سوسن کے سامنے سے تم بھاگنا چاہتی ہو وہ اب چوبیس گھنٹے تمہارے سامنے رہے گی۔"

"جی عالیجاہ.....!" برنگیریا کے ہاتھ پاؤں ٹھنڈے ہونے لگے۔ "میں سمجھ نہیں سکی؟"

"ہم سمجھاتے ہیں تمہیں۔" شاہ کا لہجہ سپاٹ ہو گیا۔ "ہم نے فیصلہ کیا ہے کہ آج سے تم یعنی شہزادی قبرص سوسن اور شہزادی انگلستان جین ہماری اور انگلستان کی ملکہ برنگیریا کی محافظ اور اتالیق ہو گی۔"

ملکہ برنگیریا کی آدھی جان تو پہلے نکل گئی تھی اب یہ سن کر تو اس پر غشی سی طاری ہونے لگی۔ مگر اس نے فوراً خود کو سنبھالا اور احتجاج سے منہ کھولا۔

"عالیجاہ....."

شاہ نے اسے فوراً اشارے سے روک دیا۔ "تم کچھ نہیں بولو گی برنگیریا۔"

برنگیریا کے سینے کے اندر لپکتے ہوئے شعلے سینے ہی میں دب کے رہ گئے۔ اس نے گردن جھکالی۔

"ہاں سوسن تم سن لو اور گرہ میں باندھ لو۔" شاہ نے پلٹ کر سوسن سے کہا۔ "تم ملکہ انگلستان برنگیریا کی محافظ اور اتالیق ضرور ہو گی مگر تمہیں ہر وقت یہ خیال رکھنا ہو گا کہ صرف برنگیریا ہی ملکۂ انگلستان ہے اور رہے گی۔ یہ مرتبہ

کسی دوسرے کو نہیں مل سکتا۔"

اس دفعہ شہزادی قبرص سوسن کا منہ لٹک گیا۔

شاہ انگلستان کی آواز پھر اُبھری۔ "ایک بات اور ہماری نظروں میں تمہارا جو مقام ہے اس سے نیچے تمہیں کوئی نہیں لاسکتا۔"

اس کے بعد ہی شاہ رچرڈ نے تخلیہ کا اعلان کیا اور تینوں چمکتے دمکتے ستارے سر جھکائے شاہی خیمے سے باہر چلے گئے۔

یہ وہ زمانہ تھا کہ فرنگیوں کے دماغ سے قلعہ عکہ کی فتح کا خمار اتر چکا تھا۔ عکہ کا قلعہ کن حالات میں فرنگیوں کے حوالہ کیا گیا اس کی تفصیل پہلے گزر چکی ہے۔ ایک محتاط اندازے کے مطابق عکہ کا محاصرہ تقریباً دو سال تک جاری رہا پھر جب قلعہ میں گھرے ہوئے ساڑھے چار ہزار مسلمانوں کے پاس کھانے پینے کا سامان اور اسلحہ ختم ہو گیا۔ بُرجیاں گر گئیں۔ مورچے زمین بوس ہو گئے اور باہر سے انہیں کسی امداد کی توقع نہ رہ گئی اس وقت قلعہ والوں نے ایک معاہدہ کے تحت قلعہ کو فرنگیوں کے حوالے کیا اور خود بھی ان کے یرغمالی ہو گئے

شاہ انگلستان نے عکہ کے یرغمالیوں کی جان کی حفاظت کی ضمانت دی تھی لیکن اس نے تمام جنگی، اخلاقی اور انسانی قوانین منہ چڑاتے ہوئے اٹھائیس سو (۲۸۰۰) یرغمالیوں کو میدان جنگ میں تہہ تیغ کر کے اس ایک قلعہ عکہ کو حاصل کرنے کے دوران دو لاکھ فرنگیوں کی جو قربانی دی تھی اس کا انتقام لیا۔

شاہ انگلستان کی اس ذلیل حرکت نے سلطانی لشکر میں اس قدر سراسیمگی اور دیوانگی پھیلائی کہ مسلمان لشکری فرنگیوں پر اس شدت سے حملہ آور ہوئے کہ زمین و آسمان کانپ اٹھے۔ اٹھائیس سو مسلمانوں کی شہادت کے جواب میں مسلمانوں نے تقریباً پانچ ہزار فرنگیوں کو ایک ہی دن میں ٹھکانے لگا دیا لیکن عکہ کے مسلمان شہداء کا غم ان کے دلوں سے پھر بھی نہ مٹ سکا۔

جافا پہنچتے پہنچتے فرنگیوں کا کافی نقصان ہو گیا تھا۔ سلطان نے یہ بھی کیا تھا کہ تمام ساحلی قلعوں کو تڑوا کے زمین کے برابر کر دیا تھا تاکہ فرنگیوں کو کسی جگہ نہ تو پناہ ملے اور نہ سامان کا ذخیرہ۔ اس وجہ سے فرنگی لشکر اور زیادہ پریشان اور بددل ہو گیا تھا۔

جافا پہنچنے پر شاہ انگلستان کو معلوم ہوا کہ سلطان نے عسقلان کے خوبصورت، بارونق اور عظیم قلعہ کو بھی توڑنے کا حکم دے دیا ہے۔ شاہ نے فوراً سرداروں کی کانفرنس بلائی۔ یہ شاہ رچرڈ کی پہلی کانفرنس تھی۔ اس نے سرداروں کو مخاطب کیا۔

"اے خداوند یسوع مسیح کے جانفروش سردارو۔ ترک (مسلمان) عسقلان کو برباد کر رہے ہیں۔ ہمیں فوراً اس شہر کو بچانا چاہیئے۔"

مگر سرداروں کے کان پر جُوں تک نہ رینگی۔ وہ بادام اور انجیر کھاتے رہے۔ ان کے گھوڑے سایہ دار درختوں کے نیچے چرتے رہے اور وہ آپس میں بحث کرتے رہے۔

"اب ہمیں کیا کرنا چاہیئے۔"

آخر میں سرداروں نے طے کیا کہ پہلے جافا کی فصیل کی مرمت کرنا چاہیئے جسے سلطانی لشکر توڑ پھوڑ گیا تھا۔ رچرڈ اپنے سرداروں کی رائے نہ بدل سکا۔ عکہ سے جافا تک کے خطرناک اور تھکا دینے والے سفر نے اسے چڑچڑا کر دیا تھا۔ اس کے سردار اور لشکری جنگ سے جی چرانے لگے تھے۔ بعض لشکری تو کشتیوں پر سوار ہو کر عکہ کے عشرت کدوں میں واپس چلے گئے تھے۔

رچرڈ کو پہلی مرتبہ احساس ہوا کہ اس نے عکہ کو تو دو سال کی سخت جنگ کے بعد حاصل کر لیا مگر اب مسلمانوں سے کوئی اور قلعہ حاصل کرنا ناممکن ہے۔ اس لئے بیت المقدس کا خیال چھوڑ کے مسلمانوں سے صلح کر لی جائے۔ یہ اس کی بے دلی کا پہلا مظاہرہ تھا۔ آخر رچرڈ نے سلطان صلاح الدین کے دیوپیکر بھائی اور سلطانی لشکر کے سپہ سالار ملک العادل کے پاس اپنا قاصد بھیجا۔

ملک العادل سلطان کا بھائی بھی تھا اور مشیر بھی۔ اسے سلطان کی طرف سے لامحدود اختیارات حاصل تھے۔ اس نے شاہ رچرڈ کی دعوت قبول کر لی اور شاہ رچرڈ کے قاصد کے ساتھ ایک شاندار سوار رسالے کے ساتھ رچرڈ کے پاس گیا تھا۔

ایک فرنگی مؤرخ لکھتا ہے کہ ملک العادل نہایت محتاط اور خلیق تھا۔

شاہ رچرڈ نے اپنے بیرن ناٹنوں کے ساتھ ملک العادل کا استقبال کیا۔ ملک العادل نے مسکرا کر شاہ کی طرف ہاتھ بڑھایا اور مصافحہ کیا۔ شاہ، ملک العادل کو اپنے شاندار خیمے میں لے گیا جہاں دنیا کی ہر چیز موجود تھی۔ دونوں میں گفتگو شروع ہوئی۔ نوجوان ہمفرے آف ٹورون نے مترجم کے فرائض انجام دیے۔

شاہ رچرڈ نے پر رعب آواز بناتے ہوئے کہا۔ "اس جنگ کو بہت مدت گزر چکی ہے۔ دونوں طرف کے ہزاروں بہادر جانوں کا نذرانہ پیش کر چکے ہیں۔ ہم تو شام کے ساحل کے عیسائیوں کی مدد کو آئے تھے۔ آپ ان سے مصالحت کر لیجیے تاکہ دونوں طرف کی فوجیں اپنے اپنے ملکوں کو چلی جائیں؟"

ملک العادل حسنِ کلام کا ماہر تھا۔ اس نے بے پروائی سے پوچھا۔ "عیسائی کن شرائط پر صلح چاہتے ہیں؟"

رچرڈ کو اس سوال کی امید نہ تھی۔ اسے جواب دینا ہی پڑا۔ "یروشلم ہمارے حوالے کر دیا جائے اور مسلمان فوجیں اردن کے اس پار چلی جائیں۔"

ملک العادل اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور بڑی تمکنت سے بولا۔ "اے شاہ انگلستان یہ دونوں باتیں ناممکن ہیں۔"

اور وہ اپنے رسالے کے ساتھ خیمے سے نکل گیا۔

شیراز کے شیخ سعدی نے اپنے ایک شعر میں فرمایا ہے کہ ایک مرتبہ دمشق میں اتنا زبردست قحط پڑا کہ لوگ عشق کرنا بھی بھول گئے۔ خدا قحط کی تباہ کاریوں سے ہر ملک اور ہر شہر کو محفوظ رکھے۔ شیخ سعدی نے اپنا تجربہ بیان کیا ہے اور یہ یقیناً صحیح ہو گا لیکن اپنا مشاہدہ، تجربہ اور مطالعہ کہتا ہے کہ خواہ لوگ قحط سالی کے دوران عشق کرنا بھول جاتے ہوں لیکن میدان جنگ میں جبکہ موت ہر طرف منڈلاتی رہتی ہے لوگ عشق کرنے سے نہیں چوکتے اور حسن و عشق کی ستم رانیاں اور کار فرمائیاں اس ماحول میں بھی جاری اور ساری رہتی ہیں۔

اس تیسری صلیبی جنگ میں ایک فرنگی مؤرخ کے بقول اب تک عیسائی مقتولین کی تعداد دو لاکھ سے زیادہ ہو چکی تھی لیکن عشق و محبت کے نظارے وہاں پر بھی دکھائی دیتے ہیں۔ یہ سلطان صلاح الدین ایوبی کی آخری قسط ہے اس لئے اس داستان عشق کی تفصیل کا موقع نہیں لیکن مختصر طور پر اس کا تذکرہ اس لئے ضروری ہے کہ یہ عشق تاریخ یورپ اور تاریخ اسلام کے صفحات میں نمایاں طور پر درج کیا گیا ہے۔

اس کا آغاز اس طرح ہوا کہ جس وقت ملک العادل، شاہ رچرڈ کے پاس سے شرائطِ صلح رد کر کے مع اپنے دستے کے شاہی خیمے سے باہر آیا تو اس کے چہرے پر کچھ ناگوار قسم کے تاثرات تھے یا یوں کہنا چاہیئے کہ اس کا موڈ کچھ بگڑا ہوا تھا۔ مگر جب وہ گھوڑے پر سوار ہو کر اپنی خیمہ گاہ کی طرف چلا تو اسے ایک طرف سے دس پندرہ سوار تیزی سے آتے ہوئے دکھائی دیے۔

ملک العادل نے گھوڑے کی راسیں فوراً کھینچ لیں۔ اس کے لئے مشہور تھا کہ وہ خطرات کی تلاش میں رہتا ہے۔ سواروں کو دور پر آتا دیکھ کر اس کی حمیت نے یہ گوارہ نہ کیا کہ وہ آنے والوں کی تحقیق کئے بغیر اپنے راستہ پر چلتا رہے۔ چنانچہ وہ گھوڑا روک کے کھڑا ہو گیا اور آنے والوں کو دلچسپی سے دیکھنے لگا۔ اس کے ساتھیوں نے بھی اپنے گھوڑے روک لئے۔

یہ بھی ایک عجیب اتفاق تھا کہ ٹھیک اسی وقت جب ملک العادل نے اپنے گھوڑے کی راسیں کھینچیں تو دور سے آنے والے بھی اپنے گھوڑے روک کر جہاں تک پہنچے تھے وہیں پر رک گئے ان آنے والوں میں چار خواتین یا پری پیکر لڑکیاں تھیں اور دس عدد ان کے محافظ سوار تھے۔ ان لڑکیوں میں ایک لڑکی شاہ انگلستان رچرڈ کی بہن شہزادی جین تھی جس کی شادی حاکم صقلیہ (سسلی) سے ہوئی تھی لیکن میاں بیوی کے ذہنوں میں کوئی مطابقت نہ ہونے کی وجہ سے ان میں ہمیشہ کے لئے علیحدگی ہو چکی تھی۔

باقی تین لڑکیاں شہزادی کی کنیزیں تھیں جنہیں شہزادی نے اپنی سہیلیوں کا درجہ عطا کر رکھا تھا۔ ادھر ملک العادل اور ادھر شہزادی جین اپنے اپنے ساتھیوں سے دوسرے کے بارے میں قیاس آرائیاں کر رہے تھے۔

شہزادی کی ایک سہیلی نے زور دے کر کہا۔ "میں یقین سے کہتی ہوں اور شرط لگاتی ہوں کہ ان میں آگے والا سوار سلطان صلاح الدین کا بھائی ملک العادل ہے۔"

"تمہارے یقین کی کوئی وجہ تو ہوگی؟" شہزادی جین نے دلچسپی سے پوچھا۔

"وجہ یہ ہے کہ میں لڑائی کے دوران اپنے لشکریوں کو یہ کہتے ہوئے سنا ہے کہ یہ بھاری بھرکم سوار جو سلطانی فوج کی سالاری کر رہا ہے سلطان کا بھائی ملک العادل ہے۔"

"یہ صرف دیکھنے میں بھاری بھرکم ہے یا فنون جنگ سے بھی واقفیت رکھتا ہے؟" یہ سوال شہزادی نے اس طرح دھیمی آواز سے کیا تھا جیسے وہ سرگوشی کر رہی ہو یا خود سے ہم کلام ہو۔

"شہزادی عالیہ۔ میں نے اسے جنگ کرتے دیکھا ہے۔ یہ واقعی شیر ہے شیر۔" سہیلی نے جواب دیا۔ "پورے مسلمان لشکر میں سلطان کے بعد دو بہادروں کے نام ہمارے مَردوں میں مشہور ہیں۔ ایک ملک العادل اور دوسرا تقی الدین۔ ان دونوں پر سلطان کو بہت اعتماد ہے۔"

ملک العادل اور اس کے ساتھیوں میں بھی کچھ اسی گفتگو ہو رہی تھی۔

ملک العادل نے اپنے ساتھیوں سے کہا۔ "ہمیں رکتے دیکھ کر یہ آنے والے کیوں رک گئے۔ آخر یہ کون ہو سکتے ہیں؟"

"محترم سپہ سالار اعلیٰ۔" ایک سوار نے جواب دیا۔ "ان آنے والوں میں ایک شہزادی جین ہے اور تین اس کی کنیزیں۔ باقی محافظ سوار ہیں۔"

شہزادی جین کے نام پر ملک العادل کے کان کھڑے ہو گئے تھے۔ اس نے پوچھا۔ "یہ شہزادی جین کون ہے؟"

سوار نے جواب دیا۔ "محترم سپہ سالار۔ شہزادی، شاہ انگلستان رچرڈ کی بہن ہے اور وہ شاہ کے ساتھ انگلستان سے آئی ہے۔ بڑی نڈر شہزادی ہے۔ اکثر اپنے پڑاؤ سے تنہا سوار ہو کر نکل آتی ہے۔"

"اچھا۔ اس کا مطلب ہے کہ فرنگی لشکر میں ایک دیکھنے والی چیز بھی ہے۔" اور ملک العادل خود بخود مسکرا دیا۔

"چلیئے حضور۔ قریب سے دیکھتے ہیں۔" سوار نے کہا۔

"میں نے بہت تعریف سنی ہے شہزادی جین کی۔"

"نہیں۔ لڑکیوں سے ملنے جانا ہماری توہین ہے۔"

ملک العادل اک دم اکڑ گئے۔

"سپہ سالار۔ اگر لڑکی خود ملنے کی خواہش کرے تو؟"

سوار نے الٹا ملک العادل سے سوال کر دیا۔

"تمہیں یہ کیسے معلوم ہوا کہ یہ ان کی خواہش ہے" وہ ملک العادل نے تیز نظروں سے اسے دیکھا۔

"یہ میں اس سے معلوم کئے لیتا ہوں۔ آپ مجھے جانے کی تو اجازت دیجیئے۔" سوار نے باگ پر ہاتھ جما کر کہا۔

ملک العادل نے ایک لمحے کے توقف کے بعد کہا۔

"تم کیا کہو گے ان سے؟"

سوار نے جواب دیا۔ "میں ان سے پوچھوں گا کہ وہ سپہ سالار لشکر اسلام ملک العادل کو دیکھ کر رک کیوں گئیں؟"

"ٹھیک ہے تم جا سکتے ہو۔" ملک العادل نے اسے اجازت دے دی۔

ملک العادل گرانڈیل اور بہت وجیہہ شخصیت کا مالک تھا۔ وہ شادی شدہ تھا اور اس کا ایک بیٹا جوانی کی منزل میں قدم رکھ رہا تھا۔ لڑکیاں خواہ وہ مسلم ہوں یا غیر مسلم، ملک العادل کو دیکھ کر ٹھٹک جایا کرتی تھیں اور ان کی خواہش ہوتی تھی کہ وہ اس دیوقامت انسان سے گفتگو کریں۔

سوار گھوڑا بڑھا کر اس جگہ پہنچا جہاں شہزادی اپنی سہیلیوں کے ساتھ کھڑی تھی۔ اس نے ادب سے شہزادی جین کو سلام کیا پھر اس طرح گویا ہوا۔ "میں سپہ سالار لشکر اسلام اور سلطان صلاح الدین کے برادر محترم الملک العادل کا ایک ادنیٰ محافظ ہوں۔ کیا شہزادی عالیہ ہمارے سپہ سالار سے گفتگو کرنا پسند فرمائیں گی؟"

"کیا سپہ سالار ہم سے گفتگو پر آمادہ ہیں؟" شہزادی نے یہی سوال محافظ سوار سے کر دیا۔

"بشرطیکہ شہزادی عالیہ اس کی خواہش فرمائیں۔" محافظ سوار نے بڑی ذہانت سے جواب دیا۔

شہزادی سوار کے جواب پر گھبرا گئی۔ اس کی دل سے

یہ خواہش تھی کہ وہ شہزادہ ملک العادل سے ملاقات کر کے یہ معلوم کرنے کی کوشش کرے کہ ملک العادل میں وہ کون سی خوبیاں ہیں جن کی بنا پر اسے مسلمانوں کے لشکر کا سپہ سالار بنایا گیا ہے۔

یہ تو تھی اس کے دل کی بات مگر اب سوال یہ تھا کہ وہ اپنی اس خواہش کو ایک غیر مرد جو اس کی دشمن فوج کا ایک فرد تھا اس کے سامنے اسے کس طرح بیان کرے۔ آخر اس نے ایک سہیلی کا سہارا لیا اور اس سے سرگوشیوں میں اپنا مدعا بیان کیا۔ سہیلی نے سہیلی کی طرف سے جواب کو ذہن میں ترتیب دیا پھر کہا۔

"اے مسلم سپہ سالار کے عقلمند قاصد۔ شہزادے ملک العادل ہماری شہزادی سے گفتگو کے لئے تشریف لا سکتے ہیں۔"

قاصد واقعی عقلمند اور ذہین تھا اس نے جواب میں کہا۔ "اے انگلستان کی شہزادی کی خوبصورت سہیلی۔ مجھے افسوس ہے کہ میرے سوال کا یہ جواب نہیں ہے یا پھر تم نے شہزادی کے جواب کو صحیح طور پر نہیں بیان کیا؟"

"تم بہت جھکی معلوم ہوتے ہو قاصد۔" سہیلی چڑ کر بولی۔ "شہزادی نے تمہارے سپہ سالار کو گفتگو کی اجازت تو دے دی ہے۔ تم اور کیا چاہتے ہو؟"

"اے شہزادی کی تنک مزاج سہیلی۔ میرا نام شریف اور شرافت کا جواب چاہتا ہوں۔ تمہارے جواب سے شہزادی کی کسی خواہش کا اظہار نہیں ہوتا بلکہ یوں معلوم ہوتا ہے جیسے شہزادی کسی کو حکم دے رہی ہیں۔"

"اے شریف اور شرافت کے پتلے۔" سہیلی نے دونوں ہاتھوں کے درمیان راہیں پکڑ کر جیسے ہاتھ جوڑے۔ "نا بابا۔۔۔ میں تم سے باتوں میں نہیں جیت سکتی۔ اب میں صاف الفاظ میں کہہ رہی ہوں کہ یہ شہزادی عالیہ کی خواہش ہے، آرزو ہے اور تمنا ہے۔ اب تو تم خوش ہو گئے؟"

"ہاں خوش تو ہوں گا۔" شریف نے مسکرا کر کہا۔ "مگر جب شہزادی عالیہ کی خوبصورت اور تنک مزاج سہیلی مجھے اپنا نام بتائے گی؟"

"اچھا شریف زادے اب جان چھوڑ دو۔" سہیلی نے جواب دیا۔ "میرا نام ہی سننا چاہتے ہو تو سنو۔ تمہارا نام شریف ہے اور میرا نام شریر ہے۔ (NAUGHTY)

"واہ واہ۔ کیا پیارا نام ہے۔" شریف ہنس پڑا اور گھوڑا گھما کر ملک العادل کی طرف چلا گیا۔

یہ شہزادے ملک العادل اور شہزادی جین کی پہلی ملاقات تھی۔ حالانکہ شہزادی کی سہیلیوں اور شہزادے کے محافظوں نے ان دونوں کو تنہائی میں گفتگو کا موقع فراہم کیا اور وہ سب تھوڑی دور ہٹ کے کھڑے ہو گئے تھے پھر بھی شہزادی اور شہزادے میں حجاب مانع رہا اور انہوں نے صرف رسمی سی دو چار باتیں کیں لیکن اگر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ محبت کی زبان، الفاظ کی محتاج نہیں ہوتی تو پھر یہ یقین سے کہا جا سکتا ہے اس ملاقات کے دوران زیادہ وقت شہزادے اور شہزادی کی نظروں کے ملاپ یا تصادم میں گزرا اور انہوں نے نگاہوں ہی نگاہوں میں وہ سب کچھ کہہ ڈالا اور اس کا جواب بھی پا لیا جو وہ زبان سے نہ کہہ سکتے تھے۔

پھر جب شہزادہ اور شہزادی اپنی گفتگو ختم کر چکے۔ شہزادہ محافظوں کی طرف لوٹ گیا اور شہزادی اپنی سہیلیوں میں آ گئی۔

اس ملاقات کے بعد شہزادی جین اور سپہ سالار لشکر اسلام شہزادے ملک العادل میں کئی ملاقاتیں ہوئیں۔ شہزادی جین کی سہیلی نائی (شریر) بڑی بیباکی سے ملک العادل کے خیمے تک شہزادی کا پیغام لے جاتی۔ اسی طرح ملک العادل کا محافظ شریف فرنگی لشکر گاہ کے قریب ایک مقام تک جاتا جہاں یا تو نائی موجود ہوتی یا اس کی متبادل اور کوئی کنیز۔ شریف ملک العادل کا پیغام پہنچا کر واپس آ جاتا۔ پھر طے شدہ منصوبے کے تحت جین اور ملک العادل میں ملاقاتیں ہوتی تھیں۔

اتنی بڑی بات بھلا لشکریوں سے کیسے چھپ سکتی تھی۔ لشکری خواہ فرنگی ہوں خواہ مسلمان۔ انہیں تو کوئی مشغلہ چاہیئے۔

چنانچہ شاہ رچرڈ جین اور ملک العادل کی ملاقاتوں سے واقف ہی نہیں بلکہ جین کی ہمت افزائی بھی کر رہا تھا۔

ادھر یہ خبریں سلطان صلاح الدین ایوبی کے کانوں تک بھی پہنچ رہی تھیں اور انہوں نے بھی خاموشی اختیار کر رکھی تھی۔ سلطان کو ملک العادل پر پورا اعتماد تھا۔ ملک العادل شادی شدہ اور سنجیدہ سپاہی تھا۔ اس نے سوچا کہ اگر شہزادی سب کچھ جانتے ہوئے بھی ملک العادل سے شادی کی خواہش مند ہے تو وہ خواہ مخواہ دخل کیوں دے۔ پھر ابھی تک شاہ رچرڈ کی طرف سے اس کے پاس کوئی پیغام بھی نہیں تھا۔

شہزادی جین اور ملک العادل کی ملاقاتیں اکثر ہونے لگیں کبھی شہزادی کا بلاوا آجاتا تو کبھی ملک العادل اس سے ملنے کی خواہش کرتے۔

کچھ عرصے بعد رچرڈ نے ایک بار پھر ملک العادل کو دعوت کا پیغام بھیجا کیونکہ ملک العادل اس کی نظروں میں ایک پُروقار اور حسن اخلاق کا پیکر تھا۔ ملک العادل نے رچرڈ کو مثبت جواب دیا اور دن اور وقت مقررہ پر اپنے رسالے کے ساتھ رچرڈ کے خیمہ دربار میں پہنچ گیا۔ اس دوران نائی اور شریف کے توسط سے شہزادی جین اور ملک العادل میں کئی خفیہ ملاقاتیں ہو چکی تھیں اور خفیہ ملاقاتوں میں بات کہاں سے کہاں تک پہنچ چکی تھی۔ شہزادی جین نے ملک العادل کے سامنے اپنا دل نکال کے رکھ دیا تھا اور ملک العادل نے اسے جواب دیا تھا کہ اگر سلطان نے یہ رشتہ منظور کر لیا تو وہ انکار نہیں کرے گا بلکہ کامیابی کی کوشش بھی کرے گا۔

شاہ رچرڈ کو ان خفیہ ملاقاتوں کی نہ صرف فوراً اطلاع مل جاتی تھی بلکہ آخری دنوں میں شہزادی جین نے خود ہی اپنی ملاقاتوں کی تفصیل سے شاہ بھائی کو آگاہ کرنا شروع کر دیا تھا اور اس دفعہ ملک العادل کو جو دعوت دی گئی تھی وہ جین ہی کی کوششوں کا نتیجہ تھا۔ شہزادی جین نے شاہ رچرڈ کو یقین دلایا تھا اگر سلطان کو اس کی اور ملک العادل کی شادی کی تجویز پیش کی گئی تو ملک العادل اس رشتہ کی حمایت کرے گا۔

شاہ رچرڈ نے ملک العادل سے بڑی بے تکلفی سے کہا۔ "اب مسلم سپہ سالار ملک العادل میرے ذہن میں اس طویل جنگ و جدل کو ختم کرنے کی ایک تدبیر موجود ہے اگر تم پسند کرو تو ہم اس کی تفصیل سے تمہیں آگاہ کریں؟"

ملک العادل نے فوراً جواب دیا۔ "شاہ انگلستان جانتے ہیں کہ میں فیصلہ کرنے میں قطعی دیر نہیں کرتا۔ آپ تجویز پیش کیجیئے میں فوراً اس پر اپنی رائے ظاہر کروں گا۔"

شاہ رچرڈ نے بھی بڑی بے تکلفی سے کہا۔ "ہمارے ذہن میں اس جنگ کو ختم کرنے کی بہترین ترکیب یہ ہے کہ میری پیاری بہن شہزادی جین اور تمہاری شادی کر دی جائے اور شادی کے بعد مسلمانوں کی طرف سے سلطان صلاح الدین اور صلیبیوں کی طرف سے شاہ انگلستان یعنی ہم اپنے اپنے مفتوحہ علاقے نئے شادی شدہ جوڑے کو پیش کر دیں۔ اس طرح یروشلم پر فریقین کا پُرامن تسلط ہو جائے گا۔ زائرین آزادانہ مقامات کی زیارت کر سکیں گے اور صلیبِ الصلبوت عیسائیوں کو مل جائے گی۔"

شاہ رچرڈ نے بظاہر یہ تجویز بڑے خلوص سے پیش کی لیکن یہ مکاری سے پُر تھی اور مسلمانوں کو فریب دینے کی زبردست سازش تھی۔ دوسری طرف شاہ رچرڈ اب صلیبی جنگ سے عاجز آگیا تھا۔ تجویز پیش کرنے کے بعد رچرڈ نے ملک العادل کی طرف اس کا ردعمل معلوم کرنے کے لئے دیکھا۔ ملک العادل ایک کھرا سپاہی تھا اس نے فوراً جواب دیا۔ "اگر سلطان نے اس رشتے کے بارے میں مجھ سے دریافت کیا تو میں اس تجویز سے انکار نہیں کروں گا لیکن اس کا فیصلہ صرف سلطان محترم کریں گے۔"

شاہ رچرڈ کو ملک العادل کے جواب پر بڑا تعجب ہوا۔ اس کا خیال تھا کہ شہزادہ ملک العادل مسلمان فوجوں کا سپہ سالار ہے اور شاہی خاندان کا فرد ہونے کی وجہ سے وہ بڑی حد تک آزاد خیال اور خودمختار ہو گا مگر ملک العادل کے جواب سے شاہ رچرڈ یہ سوچنے پر مجبور ہو گیا کہ سلطان صلاح الدین نہ صرف جنگی اور ملکی معاملات میں مطلق العنان ہے بلکہ اس کے امیروں کی ذاتی زندگی بھی سلطان کے تابع ہوتی ہے۔ جب سپہ سالار کو سلطان کی ذات اور اس کے وقار کا اتنا خیال تھا تو پھر عام سرداروں اور لشکریوں کا کیا حال ہو گا۔

یورپین مؤرخین اور شاہ رچرڈ کے قصیدہ خوانوں نے سلطان پر الزام لگایا ہے کہ مسلمان لشکر پر سلطان کی گرفت

مضبوط نہیں تھی اور وہ اکثر حکم عدولی کر جاتا تھا۔ اس کا جواب ایک تو یہ ہے کہ فرنگی لشکر پر شاہ رچرڈ کی کتنی گرفت تھی اس کا حال تو ابھی تحریر کیا گیا ہے کہ جب شاہ رچرڈ نے اپنی سرداروں کی پہلی کانفرنس میں کہا۔

"سلطان عسقلان کو برباد کر رہا ہے۔ ہمیں فوراً اسے بچانے کے لئے روانہ ہونا چاہیئے۔"

اس کے جواب میں شاہ رچرڈ کے سرداروں نے جس سرد مہری کا اظہار کیا اس کا حال قارئین ملاحظہ کر چکے ہیں۔ شاہ رچرڈ کو مجبور ہو کر کہنا پڑا۔

"اچھا تو پھر یافا کی فصیلوں کو درست کیا جائے۔"

شاہ فرانس آگسٹس فلپ، رچرڈ سے ناراض ہو کر واپس فرانس چلا گیا تھا۔ مارکوئیس کونریڈ نے رچرڈ کے رویہ سے بددل ہو کر صلیبی جنگ سے منہ موڑ لیا تھا۔

ان حالات میں فرنگی مؤرخوں کو سلطان صلاح الدین پر الزام لگاتے ہوئے ذرا بھی شرم نہیں آتی کہ وہ اس سلطان پر الزام لگانے سے باز نہیں آتے جس نے مصر میں بلبیس کے میدان میں پہلی بار تلوار بے نیام کی تو آج تک وہ تلوار اس کے ہاتھ میں بے نیام ہی ہے۔ تقریباً آٹھ دس سال تک تو اس نے عراق اور شام کے ان خود سر امیروں، سرداروں اور مسلمان شاہوں کو ایک جھنڈے تلے جمع کرنے کے لئے جنگ کی پھر جب دمشق کی مسلمان سلطنت مضبوط ہوئی تو اس نے جہاد کا آغاز اور قبلۂ اول بیت المقدس کی بازیابی کی کوشش شروع کی۔ اس لئے اسے پہلے شام کی تمام عیسائی حکومتوں سے ٹکرانا پڑا اور آخر اللہ تعالیٰ کی کرم نوازی سے سلطان صلاح الدین نے بیت المقدس فتح کر لیا۔

اس کے ساتھ ہی تیسری صلیبی جنگ شروع ہو گئی اور پورا دول یورپ، فلسطین پر چڑھ دوڑا۔ یورپ کی سلطنتوں میں مسلمانوں کے خلاف فلسطین اور یروشلم کے بھگوڑے پادریوں نے اس قدر زہر اگلا اور مسلمانوں کے ظلم و ستم کے اتنے فرضی قصے بیان کئے کہ وہاں کے مرد کمر کس کے صلیبی جنگ میں شرکت اور یروشلم (بیت المقدس) کی بازیابی کے لئے فلسطین پہنچنا شروع ہو گئے۔ شاہ انگلستان، شاہ فرانس، شاہ جرمنی، پورے یورپ کے نائٹس، ٹمپلرز، ہاسپٹلرز، ایڈریاٹک کے ملک ناروے، فن لینڈ، یوگوسلاویکیہ، پرشیا، صقلیہ غرضیکہ یورپ کا کوئی ایسا ملک نہ تھا جس نے اپنا لشکر تیسری صلیبی جنگ میں شرکت کے لئے نہ بھیجا ہو۔

اب بیس سال کا تھکا ماندہ سلطان پورے یورپ کے سامنے سینہ سپر تھا۔ یورپ والے تازہ دم تھے اور سلطانی لشکر دس سال سے مسلسل جنگ کر رہا تھا۔ سلطان صلاح الدین نے جس دن سے قاہرہ (مصر) چھوڑا تھا اسے وہاں جانے کا موقعہ نہ مل سکا۔ دس برس سے سلطان اپنے دارالسلطنت دمشق سے نکلا ہوا تھا اور اسے ایک دن کا بھی آرام نہ مل رہا تھا طبیب اسے روکتے مگر سلطان علی الصباح گھوڑے کی پشت پر نظر آتا۔ ایسے سلطان، ایسے مجاہد اور غازی پر کس کا منہ ہے کہ الزام لگائے۔ اس کا کردار بے داغ تھا۔

ایک ایسے ہی سلطان کے متعلق شاہ رچرڈ یہ سوچ سکتا تھا کہ صلاح الدین کی حکومت صرف مسلم عوام پر نہیں بلکہ وہ تو عوام اور خواص کے دلوں پر بھی حکومت کرتا تھا۔ ملک العادل نے شاہ رچرڈ کو صحیح جواب دیا تھا کہ "فیصلہ سلطان ہی کر سکتے ہیں۔" اور پھر سلطان نے جین اور ملک العادل کی شادی کی تجویز کا فیصلہ کر دیا مگر وہ فیصلہ انتہائی غیر متوقع اور بڑا ہی عجیب تھا۔

ملک العادل نے رچرڈ کی ضیافت سے واپس آنے کے بعد سلطان صلاح الدین سے عرض کیا۔ "عالیجاہ۔ شاہ رچرڈ نے آج کی ضیافت میں ایک ایسی تجویز پیش کی میں اسے سن کر حیران رہ گیا۔"

اس وقت سلطان کے پاس ان کا وزیر، مشیر اور مؤرخ بہاؤالدین بھی موجود تھا۔ سلطان نے ملک العادل سے کوئی سوال نہیں کیا بلکہ سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔

ملک العادل کو حوصلہ ہوا اور اس نے عرض کیا۔ "عالیجاہ۔ شاہ رچرڈ نے دعوت کے بعد کہا کہ اس طویل جنگ کو اب ختم ہو جانا چاہیئے اور پھر خود ہی اس نے جنگ کے خاتمہ کی یہ تجویز پیش کی کہ اس کی بہن شہزادی جین کی شادی

آپ کے اس غلام ملک العادل سے کر دی جائے۔"

سلطان اور بہاؤالدین نے چونک کے ملک العادل کو دیکھا۔ سلطان اور دوسرے لوگوں کو یہ تو معلوم تھا کہ شہزادی جین، ملک العادل کو ملاقات کے لئے اکثر اپنی ایک سہیلی کے ذریعہ بلوایا کرتی ہے اور ملک العادل ملاقات کو جاتا ہے مگر کسی نے بھی اس معاملہ کو کبھی سنجیدگی سے نہیں سوچا تھا۔ ظاہر ہے کہ اس اچانک انکشاف پر انہیں متعجب ہونا ہی تھا۔

ملک العادل خاموش ہوا تو دوسرے ہی لمحے سلطان کی پر رعب آواز ابھری "رچرڈ نے کیا شرائط رکھی ہیں؟"

ملک العادل گھبرایا مگر فوراً سنبھل کے بولا۔ "عالی جاہ شاہ رچرڈ نے کسی شرط کا نام تو نہیں لیا تھا۔ ہاں یہ ضرور کہا تھا کہ اس شادی کے بعد مسلمانوں کی طرف سے سلطان صلاح الدین اور فرنگیوں کی طرف سے وہ یعنی شاہ انگلستان اپنے اپنے مفتوحہ علاقے نئے شادی شدہ جوڑے کو پیش کر دیں۔ اس طرح یروشلم پر فریقین کا پرامن تسلط ہو جائے گا۔ زائرین آزادانہ مقامات مقدس کی زیارت کر سکیں گے اور صلیب الصلبوت عیسائیوں کو واپس مل جائے گی۔"

سلطان کے چہرے پر ہلکی سی کرختگی گئی۔ انہوں نے فرمایا۔ "ملک العادل کیا تمہیں اس تجویز میں کوئی شرط پوشیدہ نظر نہیں آتی؟"

اب ملک العادل کے بوکھلانے کی باری تھی۔ اس نے اسی بوکھلاہٹ میں کہا۔ "عالیجاہ۔ میں نے اس تجویز پر کچھ غور نہیں کیا اس لئے کہ تجویز کے فیصلہ کا حق سلطان صلاح الدین ایوبی اور صرف سلطان صلاح الدین ایوبی کے پاس ہے۔"

سلطان کے چہرے کی شکنیں درست ہو گئیں۔ "تم جا سکتے ہو ملک العادل۔" اور سلطان نے ملک العادل کو رخصت کر دیا۔ ملک العادل نے دل ہی دل میں خدا کا شکر ادا کیا۔ وہ واقعی سلطان کے سوال پر بہت زیادہ گھبرا گیا تھا۔

ملک العادل کے جانے کے بعد سلطان اس طرح خاموش ہوا جیسے وہ اپنے ذہن میں کسی فیصلے پر پہنچ جانا چاہتا ہو۔ بہاؤالدین وہاں موجود تھا لیکن اس نے صلاح الدین کے خیالوں میں حل ہونے کی کوشش نہیں کی۔ اسے معلوم تھا کہ سلطان صلاح الدین ہر اہم فیصلے کے وقت گہری سوچ میں ڈوب جاتے ہیں اور وہ اس وقت تک کسی کی بات کا جواب نہیں دیتے جب تک کسی نتیجہ پر پہنچ نہ جائیں اور جب وہ کسی اچھے یا بُرے نتیجے پر پہنچ جاتے تھے تو ان کے چہرے کے تاثرات بھی تبدیل ہو جاتے تھے۔

بہاؤالدین دیر تک سلطان کے چہرے پر نظریں جمائے بیٹھا رہا پھر اچانک سلطان نے بہاؤالدین کی طرف دیکھا۔ بہاؤالدین نے اطمینان کا سانس لیا کیونکہ سلطان کا چہرہ اپنی اصلی حالت پر آگیا تھا۔

"اگر غلام غلطی نہیں کرتا تو سلطان معظم کسی فیصلے پر پہنچ چکے ہیں؟" بہاؤالدین نے بڑے ادب سے کہا۔

سلطان نے جذبات سے عاری لہجے میں جواب دیا۔ "تم ہمارے مزاج داں ہو بہاؤالدین۔ تم نے درست اندازہ لیا۔"

"کیا غلام کو ایک سوال کرنے کی اجازت مرحمت فرمائی جائے گی؟" بہاؤالدین نے حوصلہ کر کے کہا۔

"ایک نہیں دو سوال کر سکتے ہو بہاؤالدین۔" سلطان کا لہجہ بالکل سپاٹ تھا۔

سوال کرنے کے لئے بہاؤالدین کو محتاط ہونا پڑا۔ اس کے سوال سے سلطان متنفض بھی ہو سکتا تھا۔ چند لمحوں بعد اس نے نظریں نیچی کر کے سوال کیا۔ "کیا سلطان عالی مقام، شاہ انگلستان کی تجویز منظور فرمائیں گے؟"

"ضرور۔" سلطان نے صرف ایک لفظ میں فوراً جواب دیا۔

بہاؤالدین اپنی جگہ پر اُچھل پڑا۔ وہ کچھ ہی نہ سکا کہ سلطان کا اس لفظ "ضرور" کا کیا مطلب ہے۔ بہاؤالدین سلطان کا منہ چڑھا تھا۔ اس نے پھر جرأت کی۔ "غلام، عالیجاہ کی زبان سے ادا ہونے والے اس لفظ "ضرور" کا مطلب بالکل نہیں سمجھ سکا اس لئے کہ غلام کی عقل اب بوڑھی ہو چکی ہے؟"

"بہاؤالدین۔" سلطان نے پورے اطمینان سے کہا۔ "لفظ "ضرور" اپنے اصلی معنی میں استعمال ہوا ہے۔ ہم نے تمہارے سوال کا جواب اثبات میں دیا ہے۔"

"جی عالیجاہ۔" بہاؤالدین کا پورا منہ حیرت سے کھل گیا

اور اس کی نظریں سلطان کے چہرے پر اٹک کے رہ گئیں۔

"بہاؤالدین۔ تم ہماری بات اب بھی نہیں کہہ سکے۔" سلطان نے ٹھہرے لہجے میں کہا۔ "اب ایک بار تم اپنے سوال کو پھر دہرا لو اور ہمارے جواب کو غور سے سنو۔"

بہاؤالدین کی نظریں اک بار پھر سلطان کے چہرے پر جم گئیں۔ اس نے محسوس کیا سلطان کے چہرے پر برافروختگی اور غصہ کے کوئی آثار نہیں ہیں۔ اس لیے اس نے بڑے واضح طریقے سے اپنا سوال دہرایا۔ "میں عالیجاہ کی زبان سے اس تجویز کا جواب سننا چاہتا ہوں جو شاہ انگلستان نے اپنی بہن شہزادی جین اور ہمارے سپہ سالار شہزادہ ملک العادل کی شادی کے سلسلے میں پیش کی ہے۔ کیا عالیجاہ اس تجویز کو منظور فرمائیں گے؟"

"بہاؤالدین۔ ہم پہلے بھی کہہ چکے ہیں کہ جین اور ملک العادل کی شادی کی تجویز ہم منظور کر لیں گے۔" سلطان نے ایک ایک لفظ پر زور دے کے جواب دیا۔ "اب اس سلسلے میں ہم سے کوئی سوال نہ کیا جائے۔"

بہاؤالدین نے خاموشی سے سر جھکا لیا۔ اس سلسلے میں کیا بہاؤالدین نے اس دن پھر کسی اور سلسلہ میں بھی بات نہیں کی مگر جب وہ سلطان سے اجازت لے کر جانے کے لئے تیار ہوا تو سلطان نے اسے سمجھایا۔

"بہاؤالدین۔ تمہیں اس بات پر سخت تعجب ہوا کہ ہم نے شہزادی جین اور شہزادے ملک العادل کی شادی پر رضامندی کا اظہار کیا۔ ہم تمہارے اس تعجب سے خوش ہوئے اس لئے کہ اس شادی کے بارے میں جو مسلمان بھی سنے گا اسے یا تو تعجب ہوگا یا پھر افسوس کرے گا لیکن ہماری ایک بات اور یاد رکھنا وہ یہ کہ ہم نے شادی کی اجازت دے دی ہے مگر یہ شادی نہیں ہوگی۔ اب تم جا سکتے ہو بہاؤالدین۔"

بہاؤالدین کو سلطان کے پہلے جواب پر بھی تعجب ہوا تھا اور اب ان کے یہ کہنے پر کہ ان کے قبول کرنے پر بھی یہ شادی نہیں ہو سکے گی۔ اس نے بہاؤالدین کو اور زیادہ متعجب کیا۔ کیونکہ سلطان کی رضامندی کے بعد نہ تو ملک العادل اس سے انکار کر سکتا تھا اور نہ سلطان کا کوئی لشکری

اس سلسلے میں زبان کھولنے کا مجاز تھا۔ سلطان کے لشکریوں اور سرداروں کا یہ اعتقاد تھا کہ سلطان صلاح الدین جو کہتے ہیں اس میں کوئی مصلحت ضرور ہوتی ہے۔ [illegible] سلطان کے اس شادی پر رضامند ہونے میں بھی کوئی مصلحت ضرور ہوگی۔

بہاؤالدین کے دل میں جیسے پنکھے لگے ہوئے تھے۔ وہ سلطان کے پاس سے اٹھ کر سیدھا شہزادہ ملک العادل کے پاس پہنچا۔ ملک العادل نے اسے خوش آمدید کہا۔ بہاؤالدین سلطان کا منہ چڑھا وزیر، مشیر اور مؤرخ بھی تھا۔ مگر اس وقت بہاؤالدین کو خوش آمدید کہنے کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ جب ملک العادل نے شاہ رچرڈ کی تجویز سلطان کے سامنے پیش کی تھی تو وہاں بہاؤالدین بھی موجود تھا۔ ملک العادل کے دل میں کھلبلی یا گدگدی سی پیدا ہو رہی تھی کہ خدا معلوم سلطان نے شادی کی تجویز کا کیا فیصلہ کیا۔ اسے یقین تھا کہ سلطان نے جو بھی فیصلہ کیا ہوگا اس کا علم بہاؤالدین کو ضرور ہوگا اور یہ بھی ممکن ہے کہ بہاؤالدین خود ہی سلطان کے فیصلے سے اسے آگاہ کرنے آیا ہو۔

بہاؤالدین نے بیٹھتے ہوئے ملک العادل سے کہا۔ "سپہ سالار بہادر۔ میں آپ سے کچھ پوچھنے آیا ہوں۔ کیا آپ بتانا پسند فرمائیں گے؟"

ملک العادل بڑی خوشدلی سے بولا۔ "محترم! آپ میرے بزرگ ہیں۔ سلطان کے مزاج میں آپ کو کس قدر دخل ہے۔ اس کا بھی مجھے علم ہے۔ میں آپ سے کوئی بات چھپانے کی کوشش نہیں کروں گا بشرطیکہ وہ کوئی فوجی راز نہ ہو۔"

"اطمینان رکھیئے سپہ سالار۔" بہاؤالدین نے بزرگانہ انداز میں کہا۔ "میں آپ سے کوئی ایسی بات دریافت نہ کروں گا جس کا تعلق فوجی معاملات سے ہو۔ ہاں اس کا تعلق آپ کے دل سے ضرور ہو سکتا ہے۔"

"شکریہ۔ وزیر محترم۔" ملک العادل نے جواب دیا۔ "اب میں آپ کے ہر سوال کا جواب دینے پر آمادہ ہوں۔"

"چونکہ گفتگو کچھ ذاتی سی ہو رہی ہے اس لئے میں آپ کو سپہ سالار کے بجائے شہزادے بہادر سے مخاطب کروں گا۔ اس سے آپ کے وقار میں تو کوئی فرق نہیں آئے گا۔"

بہاؤالدین نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

"ہرگز نہیں بزرگ محترم۔" ملک العادل بھی مسکرایا۔ "بلکہ مجھے اس تخاطب سے خوشی ہوگی۔ اس لئے کہ میں دن بھر سپہ سالار۔ سپہ سالار۔ سنتے سنتے تنگ آجاتا ہوں اور مجھے محسوس ہوتا ہے جیسے میں اپنی عمر سے زیادہ بوڑھا ہو گیا ہوں۔"

"اچھا خیر چھوڑیئے ان باتوں کو۔" بہاؤالدین نے موضوع بدلا۔ "میں آپ کی توجہ اس تجویز کی طرف مبذول کراتا ہوں جو شاہ انگلستان نے آپ کے ذریعہ سلطان معظم تک پہنچائی ہے۔"

"فرمایئے۔ اس بارے میں آپ کیا پوچھنا چاہتے ہیں۔" ملک العادل کا خیال درست نکلا۔

"کیا اس تجویز میں شہزادے بہادر کا بھی کوئی دخل ہے؟" بہاؤالدین نے ایک چبھتا اور الجھا ہوا سوال کیا۔

شہزادہ ملک العادل چکرا گیا۔ "میں آپ کا سوال سمجھ نہیں سکا بزرگ محترم کیا آپ وضاحت فرمائیں گے؟" شہزادہ بہت سنبھل کے بول رہا تھا۔

"بہت مناسب سوال ہے آپ کا۔" بہاؤالدین نے جواب دیا۔ "میں دراصل یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ اس تجویز میں آپ کا کس حد تک دخل ہے۔ شاید میں اب بھی پوری طرح واضح نہیں کر سکا۔ اگر میں یہ کہوں کہ شاہ انگلستان نے یہ تجویز پیش کرنے سے پہلے اس سلسلے میں آپ کی رائے مانگی تھی یا خود آپ نے شاہ انگلستان کو اس بات پر آمادہ کیا تھا کہ وہ اس طرح کی تجویز سلطان معظم کے پاس بھجوائیں؟"

"میرے بزرگ۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ رچرڈ نے مجھ سے اس سلسلہ میں کبھی کوئی بات نہیں کی اور نہ میں نے اس سے اس قسم کی درخواست کی تھی۔" ملک العادل نے بڑی صاف گوئی سے کہا۔ "ہاں میرے کان اس سلسلہ میں گنہگار ہیں کہ میں نے یہ بات کسی اور ذریعہ سے سنی تھی کہ شاہ رچرڈ کے ذہن میں کوئی ایسی تجویز ہے۔"

بہاؤالدین نے شہزادے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔ "اور آپ تک یہ بات پہنچانے والا ذریعہ شاہ رچرڈ کی بہن شہزادی جین ہے؟"

"درست فرمایا آپ نے۔" اور شہزادے نے شرما کر سر جھکا لیا۔

بہاؤالدین نے فوراً ہی ایک اور سوال کیا۔ "شہزادے بہادر۔ آپ کا کیا خیال ہے۔ سلطان معظم اس تجویز کا کیا جواب دیں گے؟"

"یہ سوال تو میں آپ سے پوچھنے والا تھا۔" ملک العادل نے جواب دیا۔ "میں تجویز پیش کر کے چلا آیا تھا۔ میرا خیال تھا کہ سلطان نے آپ سے اپنا ردعمل ضرور بیان کیا ہوگا؟"

"ہاں شہزادے۔" بہاؤالدین فکر مند لہجے میں بولے۔ "سلطان معظم نے تجویز پر غور بھی فرمایا اور فیصلہ بھی کر دیا۔"

"یعنی سلطان نے رچرڈ کی تجویز نامنظور کر دی؟" ملک العادل نے دھڑکتے دل سے پوچھا۔

"یہی تو حیرت انگیز بات ہے شہزادے۔" بہاؤالدین نے خشک منہ سے کہا۔ "سلطان معظم نے تجویز نامنظور نہیں کی بلکہ بڑی فراخ دلی سے اس تجویز کو منظور فرمایا ہے۔"

"کیا سچ؟" ملک العادل کا دل کھل اٹھا۔ "آپ میری دلداری کے لئے تو نہیں کہہ رہے ہیں؟"

"نہیں شہزادے۔ سلطان معظم کی بات میں جھوٹ کی آمیزش کا میں تصور بھی نہیں کر سکتا۔" بہاؤالدین کا لہجہ تھکا تھکا تھا۔ "دراصل یہ بات خود مجھے پسند نہیں آئی۔ اس لئے میں نے سلطان سے سوالیہ انداز میں دریافت کیا کہ وہ اس تجویز کو منظور کر لیں گے اور سلطان نے برجستہ فرمایا کہ وہ اس تجویز کو منظور کرتے ہیں۔ سلطان نے اپنے اس فرمان کی تین بار تصدیق کر کے اسے ناقابل تنسیخ بنا دیا۔"

■

شادی کی تجویز شہزادہ ملک العادل لے کے آیا تھا۔ اس لئے سلطان نے شہزادے کو طلب کر کے اسے یہ پیغام دیا۔

"شاہ انگلستان رچرڈ کو ہماری طرف سے پیغام دیا جائے کہ ہم نے شہزادی جین اور شہزادہ ملک العادل برادر زادہ صلاح الدین ایوبی کی شادی کی تجویز پسند کی اور منظور

فرمائی ہے۔ اس نسبت کا اعلان کر دیا جائے۔"

شہزادے ملک العادل کو کیا کہنا تھا۔ وہ پیغام سن کر ذرا دیر کھڑا رہا کہ شاید کچھ اور ارشاد فرمائیں لیکن اُدھر خاموشی تھی۔ شہزادے نے اجازت طلب کی۔ "عالیجاہ۔ کیا مجھے اجازت ہے اور کیا یہ پیغام اس وقت پہنچانا ہے؟"

"اجازت ہے۔ پیغام جب چاہے پہنچا سکتے ہو۔" سلطان کا چہرہ بالکل بے تاثر تھا۔

ملک العادل نے سلام کیا اور خیمے سے نکل آیا۔ خیال رہے کہ رچرڈ نے تجویز چار دن پہلے بھیجی تھی اور سلطان صلاح الدین نے اس کی منظوری آج دی تھی۔ ان چار دنوں کے دوران نہ شہزادی جین نے نائی (اٹریما کے ذریعہ ملک العادل کو کوئی پیغام بھیجا اور نہ ملک العادل نے شہزادی کو کوئی اطلاع دی۔ ملک العادل، سلطان کے فیصلے کا انتظار کر رہا تھا اور شہزادی کو بھی اس فیصلے کا انتظار تھا وہ جانتی تھی کہ سلطان جیسے ہی فیصلہ کریں گے ملک العادل اپنے قاصد شریف کے ذریعہ اسے فوراً مطلع کر دیں گے۔

پیغام پہنچانے کا حکم ملک العادل کو دیا گیا تھا لیکن شہزادہ بغیر اطلاع رچرڈ کے پاس جا کر اپنی بے صبری کا مظاہرہ نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اس لئے ملک العادل نے شریف کو بلا کے حکم دیا۔ "تم فوراً شاہ رچرڈ کے خیمہ پر جاؤ اور ان سے کہو کہ ملک العادل ان سے ملاقات کا خواہش مند ہے۔"

شریف کو معلوم تھا کہ ملک العادل شادی کی تجویز لائے ہیں مگر اسے ابھی یہ نہ معلوم ہوا تھا کہ سلطان نے تجویز کے بارے میں کیا فیصلہ کیا۔ اس لئے وہ ملک العادل کا حکم سننے کے بعد بھی اپنی جگہ پر کھڑا رہا۔

"شریف" شہزادہ ملک العادل چڑ گیا۔ "تمہیں کچھ حکم دیا گیا ہے تم خاموش کیوں کھڑے ہو؟"

شریف نے ملک العادل کے لہجے کی تلخی محسوس کی مگر شہزادے کا راز دار تھا اس لئے سوال کر بیٹھا۔ "شہزادے بہادر۔ آپ نے شاہ رچرڈ کے لئے پیغام دیا ہے لیکن میں شہزادی عالیہ سے کیا کہوں گا۔ وہ مجھے اس طرح تو نہ آنے دیں گی؟"

"کہہ دینا کہ ہم خود آ کے بات کریں گے۔" ملک العادل نے اسے ٹال دیا۔

شہزادہ ملک العادل چاہتا تھا کہ سلطان کی رضامندی کی اطلاع وہ شہزادی کو اپنی زبان سے دے۔ اس لئے اس نے شریف کو ٹال دیا تھا۔ شہزادے کو شریف پر غصہ اس وجہ سے آیا تھا کہ رچرڈ کے پاس جانے میں دیر کر رہا تھا جبکہ ملک العادل، شاہ انگلستان سے فوراً ملاقات کرنا چاہتا تھا۔

شریف کا رخ جب شہزادی جین کے خیمے کی طرف ہوتا تو کوئی پہریدار اسے نہ روکتا کہ یہ شہزادی کا حکم تھا مگر اس وقت شریف سیدھا شاہی خیمہ کی طرف جا رہا تھا۔ شاہی خیمہ پر چوبیس گھنٹے پہرہ رہتا تھا۔ شاہی محافظوں نے شریف کو ٹوکا پھر جب شریف نے بتایا کہ وہ سپہ سالار افواج اسلام کا ضروری پیغام لے کر شاہ رچرڈ کے پاس جا رہا ہے تو پانچ سوار شریف کے ساتھ ہو لئے۔ خیمے سے کچھ دور پہلے سوار گھوڑوں سے اترے اور ان میں سے ایک شاہی خیمے میں گیا۔ چند لمحوں بعد سوار واپس آیا اور اس نے شریف کو بتایا کہ شاہ

خدا کے لئے

جہاز بحر اوقیانوس پر پرواز کر رہا تھا کہ مسافروں نے پائلٹ کا اعلان سنا "میں جہاز کا کپتان آپ سے مخاطب ہوں۔ یہ معاملہ ایمرجنسی کا ہے۔ ہمارے جہاز کے دو انجن فیل ہو گئے ہیں۔ تاہم ہمیں امید ہے کہ ہم کسی طرح منزل مقصود پر بحفاظت اتر جائیں گے۔ اس دوران آپ حضرات سے گزارش ہے کہ سگریٹیں بجھا دیں اور سیفٹی بیلٹ باندھ لیں۔ شکریہ۔"

ایک مسافر جو ایک پادری کے پڑوس میں بیٹھا تھا، چیخ کر اپنے پڑوسی سے بولا "پادری صاحب، یہ وقت اس طرح بیٹھنے کا نہیں ہے۔ آپ ایک مذہبی رہنما ہیں، خدا کے لئے کچھ کریں۔"

پادری نے اٹھ کر گرجے کے لئے چندہ جمع کرنا شروع کر دیا۔

انگلستان اور... کے منتظر ہیں۔

شریف نے شاہ کے سامنے پہنچ کے سر کو ذرا خم کر کے سلام کیا۔

"تمہارا نام شاید شریف ہے؟" شاہ نے دریافت کیا۔

"جی شاہِ معظم۔ مجھے شریف کہتے ہیں۔" شریف نے ادب سے جواب دیا۔

"کہو۔ ہمارے خوددار اور خوش مزاج دوست نے کیا پیغام بھیجا ہے؟" شاہ نے اس سے پوچھا۔ اس وقت شاہ کے پاس کوئی اور نہ تھا۔ شاہ رچرڈ کچھ لکھ رہا تھا۔ اس نے قلم الگ رکھ دیا اور شریف کی طرف متوجہ ہو گیا۔

"شاہِ معظم۔ شہزادے ملک العادل سپہ سالار افواج اسلام آپ سے فوراً ملاقات کے خواہش مند ہیں؟" شریف نے پیغام سنایا۔

"ارے۔ اس میں اجازت کی کیا ضرورت تھی۔" شاہ رچرڈ نے شگفتہ دلی سے کہا۔

"شہزادے ملک العادل ہمارے دوست ہیں وہ ہر وقت تشریف لا سکتے ہیں۔"

شاہ رچرڈ خود بھی ملک العادل سے ملاقات کے لیے بے چین تھا۔ اس نے چاہا کہ ملک العادل کے قاصد سے دریافت کرے کہ اس کے سلطان نے شادی کی تجویز کا کیا فیصلہ کیا۔ لیکن پھر اس نے یہ بات اپنے وقار کے خلاف تصور کی کہ وہ ایک قاصد سے اپنی بہن کی شادی کے بارے میں گفتگو کرے۔ قاصد چلا گیا لیکن اس کے آجانے سے شاہ رچرڈ کی بے چینیوں میں اضافہ ہو گیا۔

شاہ رچرڈ اگرچہ ایک جذباتی اور ناتجربہ کار بادشاہ تھا لیکن وہ اس قدر بھولا بھی نہ تھا کہ جنگ کے حالات اور اپنے لشکر کے رویے سے یہ اندازہ نہ لگا سکتا کہ یروشلم کی بازیابی کی جنگ ختم ہو چکی ہے اور اگر اپنی عزت بچانا چاہتا ہے تو کسی طرح سلطان صلاح الدین سے کوئی باعزت سمجھوتہ کر لے۔ اس کے لشکر نے جب سے عسقلان کی طرف کوچ کرنے سے انکار کیا تھا، اس کا دل اسی وقت سے ٹوٹ گیا تھا۔ اس نے جس جوش اور جذبہ سے صلیبی لشکریوں کی باگ ڈور سنبھالی تھی، اس کا وہ جوش اور جذبہ سرد پڑ گیا تھا اور اب وہ چوبیس گھنٹے اپنا وقار بچانے کی فکر میں رہنے لگا تھا۔

پھر جب شہزادی جین کا مسئلہ اس کے سامنے آیا تو اسے امید کی ایک کرن نظر آئی۔ ایک طرف تو اس نے شہزادی جین کی حوصلہ افزائی کی کہ شہزادی ملک العادل سے زیادہ سے زیادہ قریب ہو سکے اور دوسری طرف اس نے یہ سوچنا شروع کیا کہ شہزادہ ملک العادل جو اسلامی لشکر کا سپہ سالار، سلطان کا بھائی اور دستِ راست ہے اس کے ذریعے وہ سلطان سے کس طرح مراعات حاصل کی جا سکتی ہیں جبکہ اسے یہ معلوم ہو گیا تھا کہ سلطان صلاح الدین اپنے بھائی کا بہت لحاظ کرتا ہے اور اس کی کوئی بات نہیں ٹالتا۔

پھر ہفتوں اور مہینوں کے غور و خوض کے بعد وہ یہ منصوبہ بنانے میں کامیاب ہوا تھا کہ اگر شہزادی جین اور ملک العادل کی شادی ہو جائے تو اس کے لشکریوں کے لئے یروشلم کی زیارت کو جانے کا راستہ کھل جائے گا۔ اس کی اس شرط پر کوئی وزن نہ تھا کہ اس شادی سے یروشلم پر دونوں فریقوں کا پر امن قبضہ ہو جائے گا۔ اس لئے کہ فرنگی لشکر کو تو یروشلم (بیت المقدس) میں داخل ہونے کا سوال ہی نہیں اٹھتا تھا۔ سلطان نے بیت المقدس کو ایک ایسے قلعہ میں تبدیل کر دیا تھا جس سے کوئی لشکر سر تو ٹکرا سکتا تھا مگر اس کے اندر داخل نہیں ہو سکتا تھا۔ رچرڈ کے لئے یہی بات باعث طمانیت تھی اس شادی سے یروشلم کی زیارت کرنے والوں کے کم از کم آنسو تو پونچھ جائیں گے۔ اس لئے وہ اس تجویز کی کامیابی کے لئے اس قدر بے چین تھا۔

شاہ رچرڈ اسی اوھیڑ بن میں اٹھ کر ٹہل رہا تھا کہ ایک اچانک اس کے خیمے کے ایک بغلی دروازے سے شہزادی قبرص سوسن داخل ہوئی۔ اسے دیکھتے ہی رچرڈ کا پارہ چڑھ گیا اور دوسری طرف شہزادی سوسن کا رنگ زرد پڑ گیا۔

"سوسن!" رچرڈ تقریباً چیخ پڑا۔ "تمہیں بغیر اجازت ہمارے پاس آنے کی جرأت کیسے ہوئی؟"

سوسن کا پورا بدن کانپ رہا تھا۔ اس نے زکمراتے لہجے میں کہا۔ "حضور۔ گستاخی معاف کی جائے دراصل مجھے

ایک ایسی خوشخبری ملی تھی جسے میں عالیجاہ کو سنانے کے لئے اس قدر بے چین ہوئی کہ آداب شاہی کا بھی لحاظ نہ رکھا۔"

"خوش خبری۔" رچرڈ رک کے کھڑا ہو گیا۔ "کیسی خوشخبری۔ تم نے جھوٹ بولنے کی کوشش کی تو ہم تمہیں سخت سزا دیں گے؟"

"عالیجاہ۔ مجھے معتبر ذریعے سے معلوم ہوا ہے کہ مسلمانوں کے سلطان نے شہزادی اور شہزادے ملک العادل کی شادی منظور کر لی ہے۔" سوسن نے لرزتے ہوئے کہا۔

"کیا سچ؟" شاہ رچرڈ دو قدم سوسن کی طرف بڑھ آیا۔

"جی عالیجاہ۔ میں شاہ کے حضور جھوٹ نہیں بول سکتی۔" سوسن میں ذرا حوصلہ پیدا ہوا۔

شاہ رچرڈ نے کچھ کہنے کے لئے منہ کھولا تھا کہ خیمہ کا بیرونی پردہ اٹھا اور غلام نے داخل ہو کر کہا۔

"مسلمان سپہ سالار ملاقات کے آرزو مند ہیں۔" رچرڈ کا چہرہ بحال ہو گیا۔ اس سوسن کو جانے کا اشارہ کیا اور غلام سے مخاطب ہوا۔ "شہزادے ملک العادل کو عزت و احترام سے اندر لاؤ....."

غلام باہر گیا پھر ملک العادل کو لے کے اندر آیا۔ شہزادے نے شاہ کی تعظیم کی۔

"ملک العادل۔" شاہ نے اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔ "تمہارے آنے سے ہماری طبیعت خوش ہو جاتی ہے۔"

رچرڈ نے ملک العادل کا ہاتھ پکڑا اور اسے ساتھ لے کر اپنی مسند پر بیٹھ گیا۔

"باہر کا موسم کیسا ہے شہزادے؟" اور رچرڈ نے شہزادے کی چہرے پر نظریں جما دیں۔

"بہت خوشگوار موسم ہے شاہ معظم۔" ملک العادل نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"میں خوشگوار موسم کی اطلاع دینے ہی آیا ہوں۔"

"سمجھا۔" اور شاہ رچرڈ بھی مسکرا دیا۔

"سلطان معظم نے شاہ کی تجویز کو شرف قبولیت بخشا ہے اور اظہار مسرت فرمایا ہے۔" شہزادے ملک العادل نے بڑی مسرت سے کہا۔

شاہ رچرڈ نے اطمینان کا سانس لیا مگر اسے ظاہر نہیں ہونے دیا۔ "یہ بہت اچھا ہوا۔ مخلوق خدا جنگ کی آگ سے بچ جائے گی۔"

"درست فرمایا شاہ نے۔" شہزادہ ملک العادل خود بھی خوشی سے کھلا جا رہا تھا۔ "شاہ کا اب اگلا قدم کیا ہو گا؟"

"ہم آج ہی سرداروں کی میٹنگ طلب کریں گے اور ایک دو روز میں اپنے قاصد کے ذریعے سلطان کو آئندہ انتظامات کے بارے میں مطلع کر دیں گے۔" شاہ رچرڈ نے پُر مسرت لہجے میں مگر ٹھہر ٹھہر کر جواب دیا۔

"اچھا مجھے اجازت دی جائے۔" ملک العادل نے اٹھتے ہوئے کہا۔

"اتنی جلدی شہزادے؟" شاہ نے حیرت کا اظہار کیا۔

"جی ہاں۔ مجھے بھی بہت سے انتظامات کرنا ہیں۔"

شہزادہ ملک العادل کو جلدی اس لئے تھی کہ شہزادی جین اس کی منتظر تھی اور اس نے کہلوایا تھا کہ اس سے ملے بغیر شہزادہ واپس نہ جائے۔

ملک العادل نے شاہ کے پاس سے واپسی پر شہزادی جین سے ملاقات کی جو اپنی قریبہ (نائی) سیلی کے ساتھ اس خاص جگہ پر کھڑی تھی جہاں وہ دونوں ملا کرتے تھے۔ شہزادی کا چہرہ خوشی سے دمک رہا تھا۔ ملک العادل کو اس کے چہرے ہی سے اندازہ ہو گیا کہ شہزادی کو اس کی خبر ہو چکی ہے۔

"مبارک ہو شہزادی۔ سلطان نے تجویز منظور فرمالی۔" شہزادے نے پھر بھی اسے اپنی طرف سے مبارک باد دینا مناسب سمجھا۔

"شہزادے بہادر کو بھی مبارک ہو۔" جین نے کسی تعجب کا اظہار نہیں کیا۔ "مجھے جب سے معلوم ہوا ہے اس وقت سے میرے قدم زمین پر نہیں پڑ رہے ہیں۔"

شہزادہ ملک العادل اس سے بہت کچھ کہنا اور سننا چاہتا تھا لیکن اسی وقت نائی نے شہزادی سے کوئی بات سرگوشیوں میں کہی۔ شہزادی نے گردن گھما کر ادھر ادھر

دیکھا پھر بولی۔

"شہزادے۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ بات پورے لشکر میں پھیل گئی ہے اور فوجی سردار، شاہ بھائی کو مبارک باد دینے جا رہے ہیں۔ اس وقت ہمارا یہاں کھڑا رہنا مناسب نہیں۔ میں آپ کو جلد ہی بلوائوں گی۔ اس وقت تک بات اور بھی واضح ہو جائے گی۔ اچھا رخصت۔"

اور شہزادی نائی کا ہاتھ پکڑ کر ایک طرف تیز تیز قدموں سے چلنے لگی۔ شہزادے کے دل کی باتیں دل ہی میں رہ گئیں۔ اس نے چاہا کہ شہزادی کو یہ بتا دے کہ فوج کے سرداروں کو شاہ نے مشورے کے لیے طلب کیا ہے لیکن شہزادی کچھ پریشان سی ہو گئی تھی اس لیے اس نے شہزادی کو روکنے کی کوشش نہیں کی۔

تنگ آئے فوجی سرداروں کو جب شاہ انگلستان رچرڈ نے سلطان کے ساتھ طے پانے والے صلح نامہ کے بارے میں تفصیل سے بتایا تو وہ بے انتہا خوش ہوئے۔ ایک سردار نے آنکھوں میں آنسو بھر کے کہا۔

"یہ سب کچھ خداوند یسوع مسیح اور کنواری مریم کی مہربانیوں سے ہوا ہے۔ وہ ہمیں یروشلم کی زیارت سے محروم نہیں رکھنا چاہتے تھے۔"

دوسرے سردار نے تائید کرتے ہوئے کہا۔ "مجھے ایک جاسوس نے بتایا ہے کہ یروشلم کو صلاح الدین نے ایک آہنی قلعہ میں تبدیل کر دیا ہے۔ اسے فتح کرنا کیسا ہمارا لشکر اس کی فصیل تک بھی نہیں پہنچ سکتا۔"

شاہ رچرڈ کو اگرچہ ان کی باتیں اچھی لگ رہی تھیں کیونکہ اسے بھی یروشلم کی مدافعتی تیاریوں کے بارے میں جاسوسوں نے عجیب عجیب باتیں بتائی تھیں لیکن اس نے اس کانفرنس کو طول نہیں دیا اور یہ کہہ کے رخصت کر دیا کہ اس خبر کو لشکریوں میں مشتہر کر دیا جائے۔

صلیبی سردار شاہ انگلستان کے پاس سے خوشی خوشی اٹھے مگر جب وہ اپنے اپنے یونٹ میں پہنچے تو انہیں معلوم ہوا کہ لشکریوں کو یہ خبر پہلے ہی مل چکی ہے اور وہ اس پر ملا جلا ردعمل کر رہے ہیں۔ شاہ انگلستان کے فوجی دستے تو اس معاہدہ کی شرائط پر رضامند ہیں مگر فرانسیسی فوجیں جو فرانس کے شاہ آگسٹس فلپ کے جانے کے بعد شاہ انگلستان کی زیر کمان دے دی گئی تھیں وہ اس معاہدہ کی شدید مخالفت کر رہی ہیں۔

سب سے زیادہ مخالفت چرچ کے پادریوں کی طرف سے ہو رہی ہے۔ ان پادریوں کا پیشوا یروشلم کا وہی لارڈ پادری ہے جس نے مارکوئیس کونریڈ اور شہزادی ازابیلا کی شادی میں روڑے اٹکائے تھے۔ وہ خیمہ گاہ میں ہزاروں لشکریوں کے درمیان کھڑا چیخ چیخ کر کہہ رہا تھا۔

"شاہ انگلستان نے انگلستان کی عزت اور آبرو کا سودا کیا ہے۔ انہوں نے شہزادی جین کو مسلمانوں کے ہاتھ بیچ ڈالا ہے۔ یورپ کے لشکر یروشلم کی مقدس زمین کو مسلمانوں سے بازیاب کرانے آئے تھے مگر شاہ انگلستان نے اپنی خاندانی عزت اور حرمت کا سودا کر کے صلیب مقدس کے شیدائیوں کو یروشلم کی زیارت کو سر جھکا کے فقیروں کی طرح جانے کا حق حاصل کیا ہے۔ غیرت مند صلیبی اس بے عزت صلح نامہ کو نہیں تسلیم کریں گے۔ ہم یروشلم پر قبضہ کریں گے یا اس پر قربان ہو جائیں گے۔"

فرنگی خیمہ گاہ اور لشکریوں میں ایک ہُلڑ مچ گیا تھا۔

وہ سردار جو شاہ انگلستان سے خوشخبری سن کر آئے تھے وہ اپنے اپنے خیموں میں جا چکے تھے۔ انہیں بپھرے ہوئے لشکریوں کے سامنے جاتے ہوئے ڈر معلوم ہوتا تھا۔ لشکریوں میں پھوٹ پڑ گئی تھی۔ ان میں دو گروہ بن گئے تھے۔ ایک معاہدہ کے حق میں تھا اور دوسرا معاہدے کی شدید مخالفت کر رہا تھا۔

قلعہ عکہ اور صور کی طرف قاصد دوڑا دیئے گئے تھے۔ شاہ انگلستان کے خیمہ پر سخت پہرہ لگ گیا تھا۔ دراصل اس زمانہ میں یورپ کے تمام ممالک میں دو طاقتیں حکومت کرتی تھیں۔ ایک تو ملک کے بادشاہ کی طاقت اور دوسری کلیسا کی طاقت یعنی پادریوں اور مذہبی لوگوں کی طاقت۔ یہ طاقت بادشاہ وقت کی طاقت سے کسی طرح کم نہ ہوتی تھی اور یہ طاقتیں ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کے لئے اکثر شمشیر بکف

ہو جاتی تھیں جس طرح اس وقت ہو رہا تھا۔

یہ ہنگامہ اس قدر بڑھا کہ بیچارے شاہ انگلستان کو اپنی پوزیشن اور عزت بچانا مشکل ہو گیا۔ آخر شاہ رچرڈ کو یروشلم کے سابق اسقف پطرس کو گفتگو کے لئے بلانا پڑا۔ اسقف چار دوسرے پادریوں کے ساتھ شاہ سے ملنے آیا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے تقریباً ایک ہزار سواروں کے ایک مسلح اور مضبوط دستے کو شاہ رچرڈ کے خیمے کے گرد دور دور پر مقرر کیا اور انہیں حکم دیا کہ اگر شاہ رچرڈ اسے گرفتار کریں تو یہ سوار حملہ کر کے اسے گرفتار کرنے والوں کے ہاتھوں سے چھڑا لیں۔

اسقف شاہ کے خیمے میں داخل ہوا تو شاہ اس کے استقبال کے لئے کھڑا ہو گیا اور اسقف کا ہاتھ چوم کے اسے اپنے ساتھ مسند پر بٹھا لیا۔

شاہ رچرڈ نے گفتگو کا آغاز کیا۔ "اے مقدس یروشلم کے مقدس اسقف اعظم۔ ہم نے مسلمان سلطان کے پاس ایک تجویز بھیجی تھی۔ اس کی نمایاں شرط یہ تھی کہ صلیب المصلوب ہمیں واپس کر دی جائے۔ اس کے علاوہ مقدس یروشلم پر دونوں قوموں کا پرامن قبضہ ہو اور خدائے یسوع مسیح کو ماننے والے تمام عیسائی یروشلم کی بلا روک ٹوک زیارت کے لئے جایا کریں۔ اس لئے ہم نے کسی لشکری، کسی سردار یا کسی محافظ کلیسا کی کوئی قربانی نہیں دی بلکہ اپنی سگی بہن شہزادی جین کو قربانی کے لئے پیش کیا تھا۔ اگر کلیسا کے اقتدار کے مالک ہمارے اس قدم کو غلط سمجھتے ہیں اور پسند نہیں کرتے تو ہم اس سے انکار کر دیں گے کیونکہ اس طرح کا کوئی معاہدہ ابھی تک ضبط تحریر میں نہیں آیا۔"

شاہ کے خاموش ہوتے ہی یروشلم کے اسقف نے بھرے دربار میں نہایت تلخ لہجے میں جواب دیا۔ "شہزادی جین ہماری بہن اور خداوند یسوع مسیح اور کنواری مریم کے پیروکاروں کے سر کا تاج اور افتخار ہے۔ اسے ہم مسلمانوں کے سپہ سالار کے حوالے کر کے عیسائیوں اور عیسائیت کی گردن نہیں جھکا سکتے۔ یروشلم کی زیارت کے لئے ہم شہزادی جین کا سودا کرنے پر ہرگز تیار نہیں۔ ہم شاہ سے درخواست کرتے ہیں کہ وہ اس تجویز کو فوراً ختم کر دیں اور یروشلم کو بزور شمشیر مسلمانوں کے ناپاک وجود (نعوذ باللہ) سے پاک کریں۔"

شاہ رچرڈ نے ہنگامہ کو فرو کرنے کے لئے تجویز ختم کرنے کا فیصلہ پہلے ہی کر لیا تھا۔ اس نے واضح الفاظ میں اعلان کیا۔

"ہم یعنی رچرڈ شاہ انگلستان خلوص دل سے اعلان کرتے ہیں کہ ہم اسقف اعظم کے ساتھ ہیں اور ہم اپنی تجویز واپس لینے اور ختم کرنے کا اعلان کرتے ہیں۔"

اسقف کے پاس اب کہنے کو کیا رہ گیا تھا۔ شاہ رچرڈ کے آدمیوں نے فوراً شاہ رچرڈ زندہ باد کے نعرے لگانا شروع کر دیئے۔

آخر یروشلم کے اسقف کو کہنا پڑا۔ "ہم شاہ انگلستان کے شکر گزار ہیں اور انہیں یقین دلاتے ہیں تمام لشکر بلا تفریق قومیت ان کے حکم کے تحت یروشلم کے لئے اپنی جانیں قربان کر دے گا۔"

اس سے اگلے دن سلطان صلاح الدین کے خیمہ پر شاہ انگلستان رچرڈ کا قاصد پہنچا اور اس نے شاہ رچرڈ کا زبانی پیغام پہنچایا۔

"سلطان عالی مقام۔" قاصد نے ٹھہر ٹھہر کر کہا۔ "ہمارے شاہ انگلستان رچرڈ نے آپ کی خدمت میں یہ پیغام بھیجا ہے کہ شاہ کی بہن شہزادی جین کسی مسلمان سے شادی کرنے پر آمادہ نہیں...."

سلطان کے چہرے پہ ہلکی سی مسکراہٹ آ گئی۔ "پیغام ہمیں مل گیا۔ تم جا سکتے ہو قاصد....." سلطان نے رچرڈ کے قاصد کو رخصت کر دیا۔

بہاؤالدین اس وقت سلطان کے پاس موجود تھا اور پھٹی پھٹی آنکھوں سے کبھی سلطان کو اور کبھی رچرڈ کے قاصد کو دیکھ رہا تھا۔

سلطان نے فرمایا۔ "تمہیں کس بات کی حیرت ہے بہاؤالدین۔ کیا ہم نے اسی دن تم سے نہیں کہہ دیا تھا کہ یہ بیل منڈھے نہیں چڑھے گی؟"

"مگر کیوں عالی جاہ۔ رچرڈ نے کیوں انکار کیا؟" بہاؤالدین کی سمجھ میں کچھ نہ آ رہا تھا۔ اس کے خیال میں فرنگیوں کی یہ بہت بڑی خوش نصیبی تھی کہ شکست کھانے کے بعد بھی وہ ایک باعزت معاہدہ کر رہے تھے۔

سلطان صلاح الدین نے بہاؤالدین کو سمجھایا۔

"بہاؤالدین نصرانی حکومتوں کی یہ بدقسمتی ہے کہ وہ ملک پر دو طاقتیں بیک وقت حاکم ہوتی ہیں۔ ایک بادشاہ وقت کی طاقت اور دوسری نصرانی کلیسا کی طاقت جسے پادری اور لارڈ پادری سنبھالے ہوئے ہیں۔ شاہ رچرڈ بہن کی شادی کر کے ہم سے صرف یہ رعایت حاصل کرنا چاہتا تھا کہ یورپ سے آنے والوں کو یروشلم کی زیارت حاصل ہو جائے۔ اگر یہ شادی ہو جاتی تو شاہ رچرڈ یقیناً اپنے لشکریوں کی تمام ہمدردیاں حاصل کر لیتا۔"

"مگر سلطان معظم اس طرح ہمیں بیت المقدس کو شہزادی جین کی منہ دکھائی میں کیا نہ دینا پڑتا؟" بہاؤالدین نے گھبرا کے اپنا خدشہ ظاہر کیا۔

"شہزادی کو کچھ نہ ملتا بہاؤالدین۔" سلطان نے جواب دیا۔ "شہزادی جین بھائی سے رخصت ہو کے یہاں تک پہنچنے سے پہلے ہی کلمۂ حق پڑھ کے مسلمان ہو چکی ہوتی اور عکہ کے قلعہ کے علاوہ وہ تمام قلعے جنہیں ہم نے مسمار کرا دیا ہے اپنے ساتھ جہیز میں لے کے آتی۔"

اب تو بہاؤالدین کی عقل ٹھکانے آگئی۔ "سبحان اللہ۔ عالیجاہ کس قدر دور رس نظروں کے مالک ہیں۔ ایک بات اور سمجھا دیجیے عالیجاہ؟" بہاؤالدین نے درخواست کی۔

"اور کیا پوچھنا ہے؟" سلطان نے کہا۔

"مگر کلیسا نے اس شادی کی کیوں مخالفت کی؟" بہاؤالدین نے دوسرا سوال اٹھایا۔

"اس لئے کہ نہ تو یروشلم پر نصرانی حکومت قائم ہوتی اور نہ یروشلم کا لارڈ پادری اپنے عہدے پر فائز ہو پاتا پھر وہ اس شکست کی بدنامی میں کیوں شامل ہوتا۔" سلطان نے بہاؤالدین کو قائل کر دیا۔

دوسرے دن سے پھر جھڑپیں شروع ہو گئیں لشکری جو یہ سن کر خوش ہو گئے تھے کہ شہزادی جین اور شہزادے ملک العادل کی شادی کے بعد عیسائی بے دھڑک یروشلم کی زیارت گاہوں میں داخل ہو سکیں گے۔ ان کی امیدیں خاک میں مل گئیں۔ شاہ رچرڈ کو اپنی گردن بچانے کی فکر پڑ گئی تھی۔ اس نے نصرانیوں کو یروشلم کی زیارت کرنے کے لئے اپنے طور پر ایک بڑا کامیاب منصوبہ بنایا تھا لیکن کلیسا نے اس کی ایک نہ چلنے دی۔

سلطانی دستوں کے حملے تیز ہو گئے۔ وہ دن میں بھی حملہ آور ہوتے اور رات کے اندھیرے میں بھی شب خون مارتے۔ ایک بار تو وہ شاہ رچرڈ کے خیمے تک پہنچ گئے تھے اور بڑی مشکل سے اس کی جان بچی تھی۔ ایک اور موقعہ پر فرنگیوں اور سلطانی حملہ آور دستوں میں جھڑپ ہو رہی تھی کہ رچرڈ کو جوش آیا تو گھوڑے پر سوار ہو کر ان کی جنگ میں کود پڑا۔

سلطانی حملہ آوروں میں سے کسی نے رچرڈ کو پہچان لیا۔ اس نے فوراً آواز لگائی۔

"یہ شاہ انگلستان ہے جانے نہ پائے۔"

یہ آواز سنتے ہی سلطانی سواروں نے رچرڈ کو گھیر لیا مگر ٹھیک اس وقت ایک فرنگی سوار نے سلطانی حملہ آوروں کو للکارا۔ "ادھر آؤ۔ شاہ انگلستان میں ہوں۔ میرا مقابلہ کرو۔"

یہ آواز ایک فرنگی نائٹ ولیم آف پیرو کی تھی جس نے شاہ کے لئے اپنی قربانی پیش کی اور حملہ آوروں کو خود کو شاہ انگلستان ظاہر کر کے اپنی طرف متوجہ کر لیا۔ اس کی آواز سن کر سلطانی سوار اصلی رچرڈ کو چھوڑ کر نقلی رچرڈ کے گرد ہو گئے۔ انہیں یقین ہو گیا کہ یہی شاہ رچرڈ ہے کیونکہ وہ نائٹ تھا اور بڑی تیزی سے تلوار چلا رہا تھا۔

سلطانی سواروں نے ولیم آف پیرو کو گھیر لیا تھا اور اسے آسانی سے قتل کر سکتے تھے لیکن شاہ انگلستان کو قتل کرنے کی انہیں اجازت نہ تھی اس لئے انہوں نے کمندیں پھینک کر ولیم آف پیرو کو گرفتار کر لیا اور اسے سلطانی خیمہ گاہ میں لے گئے۔ اس طرح ولیم کی کوشش سے شاہ رچرڈ گرفتاری سے بچ گیا۔

اب عام طور سے شاہ رچرڈ کے بجائے سرداروں اور امیروں کا حکم چلتا تھا۔ انہوں نے حکم صادر کیا۔ "ساری فوج عسقلان کو جائے اور اس کی فصیلیں تعمیر کرے۔"

جب یہ خبر فوج میں مشہور ہوئی تو ان میں مایوسی

پھیل گئی۔ اصل بات یہ تھی کہ فرنگی لشکر بیت المقدس کا محاصرہ کرنے سے قاصر تھی۔ سلطان صلاح الدین کی منظم فوجوں کی موجودگی نے فرنگیوں حوصلے پست کر دیئے تھے۔ فرانسیسی امیر محاصرے پر زور دیتے تھے لیکن فرنگی سرداروں اور امیروں نے بیت المقدس سے مایوس ہو کر محاصرے کا خیال چھوڑ دیا تھا اور کوئی منصوبہ تیار نہ کیا تھا۔ انہوں نے فوجی چھاؤنی کو پہاڑوں میں منتقل کر کے سپاہیوں کو صرف خوش کیا تھا تاکہ وہ دور ہی سے بیت المقدس کی ایک جھلک دیکھ سکیں لیکن اس سے ان میں اور زیادہ مایوسی پھیل گئی۔

سرداروں اور امیروں کے حکم کے تحت فرنگی لشکر عسقلان کی طرف چلا۔ مایوس اور بددل فرنگی اپنے گھوڑوں کو مار کے ان پر اپنا غصہ اتارتے تھے۔ اس طرح لشتم پشتم وہ شام تک رملہ پہنچ گئے۔ رملہ میں بھی فرنگی فوج موجود تھی مگر مایوس اور بددل۔ بے شمار فرانسیسی ڈیوک آف برگنڈی کے ساتھ چلے گئے۔ شاہ رچرڈ اپنے بھتیجے کاؤنٹ ہنری آف شیمپن کے ساتھ ایلیمن کو چلا گیا۔ دوسرے دن بعد دوپہر فرنگی لشکر عسقلان پہنچا۔ سلطان صلاح الدین نے عسقلان کو زمین کے برابر کرا دیا تھا۔ فصیلوں کے پتھر سمندر میں پھنکوا دیئے گئے تھے۔ پورا شہر برباد پڑا تھا۔

ادھر سلطان صلاح الدین کو جاسوسوں نے اطلاع پہنچائی۔ "عالیجاہ۔ فرنگی لشکر مورچے چھوڑ کے سمندر کی طرف پسپا ہو گیا ہے۔"

سلطان نے سر کی جنبش سے اپنی خوشنودی کا اظہار کیا۔ پھر سلطان کی طرف سے اعلان ہوا "شاہی لشکر کو مئی تک کے لئے رخصت دی جاتی ہے۔"

اس کے لشکر میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ شاہی لشکر مسلسل چار سال سے شام میں جنگ کر رہا تھا۔ سلطان کے اس اعلان نے ان کا دل جیت لیا۔

فرنگی لشکر بددل تھا۔ شاہ رچرڈ کو سٹرفورڈ کے پادری کی زبانی انگلستان سے بری خبریں موصول ہوئی تھیں۔ پادری ولیم، بشپ آف ایلی کا خط لایا تھا جس میں تحریر تھا کہ شاہ رچرڈ کے بھائی لارڈ جان نے شاہی چانسلر کو برطرف کر کے خزانہ پر قبضہ کر لیا ہے۔

ان بری خبروں کے ساتھ ساتھ اہل جینوا اور اہل پیزا آپس میں الجھ پڑے۔ عکہ کے بازاروں میں انہوں نے خانہ جنگی شروع کر دی۔ شاہ رچرڈ فوری طور پر تصفیہ کے لئے عکہ پہنچا۔ اس نے مخالف فریقوں کے سرغنوں کو طلب کر لیا۔ مگر ان کے بیانات نے شاہ رچرڈ کو اس شکست کا احساس دلا دیا۔ وہ ان کی قیادت کرنے میں ناکام رہا تھا۔

فریقین نے اگرچہ دست بستہ عرض کیا مگر یہ شاہ رچرڈ سے کھلی ہوئی بغاوت تھی اور اس کی صریحاً توہین کی جا رہی تھی۔

انہوں نے واضح الفاظ میں کہا۔ "ہم لوگ جنگ کے التوا اور یروشلم کے نامزد شاہ گائی کی نالائقی سے بیزار ہیں۔ ہماری قیادت صرف مارکوئیس کونریڈ آف مانسٹریٹ کر سکتا ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ کونریڈ شاہ یروشلم کی حیثیت سے فوجوں کی رہنمائی کرے۔"

انہوں نے شاہ رچرڈ کو دودھ کی مکھی کی طرح درمیان سے نکال پھینکا تھا۔ شاہ رچرڈ نے اپنی شکست تسلیم کر لی اور ان کا مطالبہ مان لیا۔ کونریڈ کو پیغام بھیجا گیا کہ وہ عکہ پہنچ جائیں اور شاہ یروشلم کی تاجپوشی کے بعد صلیبی فوجوں کی کمان سنبھالے۔ شاید شاہ رچرڈ کے انگلستان کی فوجوں کے علاوہ باقی تمام صلیبی لشکری خلاف ہو گئے تھے۔ انہوں نے اس فیصلہ پر خوشی کا اظہار کیا۔

لیکن حالات نے ایک اور پلٹا کھایا۔ مارکوئیس کونریڈ اپنے مرکز صور سے تاجپوشی کے لئے عکہ روانہ ہونے سے پہلے ہی قتل کر دیا گیا۔ اسے شیخ الجبل کے فدائیوں نے قتل کیا تھا۔ قاتل گرفتار ہوئے اور انہوں نے بیان کیا کہ انہیں کونریڈ کے قتل پر شاہ رچرڈ نے مامور کیا تھا۔

رچرڈ پر یہ الزام تو لگ گیا مگر یہ ثابت نہ کیا جا سکا۔ رچرڈ نے سرداروں اور امیروں کو جمع کر کے کہا۔ "کونریڈ کے قتل کے بعد ہنری کاؤنٹ آف شیمپن کو یروشلم کا بادشاہ بنا کر اس کے ہاتھ میں فوجی کمان دی جائے تاکہ وہ یروشلم کی بازیابی کی جنگ جاری رکھے۔"

اس بات کو سب نے تسلیم کر لیا۔ مارکوئیس کونریڈ

کے قتل اور شاہ انگلستان کے فوجی کیمپ چھوڑ دینے سے صلیبیوں کے مختلف گروہوں میں صلح ہو گئی۔ وہ سب قلعہ صور میں آئندہ منصوبہ بندی کے لیے جمع ہوئے۔ ہنری کاؤنٹ آف شیمپین بھی وہاں پہنچ گیا۔ شہزادی ازابیل جس سے کونریڈ نے شاہ یروشلم بننے کی خاطر شادی کی تھی۔ وہ کونریڈ کے مرنے سے بیوہ ہو گئی تھی۔ صلیبیوں نے ہنری کاؤنٹ آف شیمپین سے ازابیل سے شادی کرنے کی درخواست کی جس نے اسے قبول کر لیا۔ شاہ سگتان سکائی جسے شاہ رچرڈ نے شاہ فرانس آگسٹس فلپ کی مخالفت مول لے کر یروشلم کا آئندہ بادشاہ بنا دیا تھا۔ اسے خوش کرنے کے لئے رچرڈ نے اسے قبرص کی بادشاہی عطا کر دی۔

شاہ رچرڈ کو فرانس کے اندر چھوٹی چھوٹی جنگوں کا تجربہ تھا مگر بیت المقدس کی جنگ میں لاکھوں کے لشکر شریک تھے۔ کھلے میدان میں اتنے بڑے لشکر کو لڑانے کا رچرڈ کو کوئی تجربہ نہ — اسی لئے کہ وہ اس ذمہ داری سے ہی سبکدوش ہو گیا مگر اسے معلوم تھا کہ یروشلم کو سلطان صلاح الدین کے قبضہ سے کوئی طاقت واپس نہیں لے سکتی ہے۔ اس لئے اس نے اپنی سفارتی کوششیں جاری رکھیں۔

رچرڈ نے سلطان کے پاس ایک بار پھر ایک سفارت بھیجی۔ سفیر نے سلطان کے سامنے رچرڈ کی ترجمانی کرتے ہوئے کہا۔

"شاہ انگلستان نے سلطان کی خدمت میں سلام عرض کیا ہے اور کہا ہے کہ مسلمانوں اور فرنگیوں کے لشکروں کی حالت بہت خستہ ہو گئی ہے۔ فریقین کے ہزاروں لشکری میدان جنگ میں کام آئے ہیں۔ پھر بھی ہم تمام عمر یروشلم کی حصول کی کوشش سے دستبردار نہیں ہوں گے۔ سلطان براہ کرم اردن سے پیچھے تک اپنا لشکر ہٹا لے جائیں۔ دوسری یہ کہ صلیب الصلبوت سلطان کے لئے ایک لکڑی کے ٹکڑے سے زیادہ وقعت نہیں رکھتی مگر عیسائیوں کے لئے وہ ایک انتہائی مقدس چیز ہے اس لیے سلطان اسے واپس فرمائیں۔"

سلطان نے سفارت کو دوسرے کمرے میں بھیج کے اپنے سرداروں سے مشورہ کیا پھر سفارت کو واپس بلا کر سلطان صلاح الدین نے فرمایا۔ "ہماری طرف سے شاہ انگلستان رچرڈ کو پیغام دیا جائے کہ بیت المقدس کو ہم عیسائیوں سے زیادہ مقدس سمجھتے ہیں۔ ہمارے رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم نے معراج کا سفر بیت المقدس ہی سے شروع کیا تھا اور قیامت کے دن مخلوق خدا کا اسی جگہ حساب ہو گا اس لیے شاہ اس خیال کو دل سے نکال دیں کہ ہم بیت المقدس کو کبھی ان کے حوالے کریں گے۔ رہا صلیب الصلبوت کا مسئلہ تو اس کا ہمارے پاس رہنا مسلمانوں کے مفاد میں ہے۔ بیت المقدس کی جنگ جب تک جاری رہے گی ہم آپ کو یہاں سے ایک پتھر بھی ہلانے نہیں دیں گے۔"

سفارت واپس ہو گئی۔ شاہ رچرڈ کی یہ کوشش بھی رائیگاں گئی۔

سفارت کی واپسی پر سلطان نے اپنے سرداروں سے خطاب کیا۔ "اگر ہم ان سے کسی شرط پر بھی صلح کر لیں تو ان بدعہدوں کی کیا ضمانت ہے۔ قلعہ عکہ کے بے خطیوں کو اسی شاہ رچرڈ کے حکم سے تہ تیغ کیا گیا تھا۔ اس لئے ہمارے لئے ضروری ہے کہ ہم جہاد کو جاری رکھیں اور جب تک ان کو سمندر میں دھکیل نہ دیں ہاتھ نہ روکیں یا پھر جنگ کرتے کرتے شہید ہو جائیں۔"

پھر ایک دن شاہ رچرڈ نے عسقلان کی نواحی فصیلوں کے پاس لشکر کو جمع کیا اور اپنا ایک فرمان پڑھنے کو بھیجا۔ رچرڈ کے نقیب نے شاہی فرمان پڑھا۔

"صلیبی لشکر اس اعلان پر کان نہ دھریں کہ ہم کسی

ڈگری

○۔۔۔ مرزا غالب کی بہن بیمار ہوئیں تو مرزا مزاج پرسی کو گئے اور پوچھا۔ کیا حال ہے؟"

بہن نے کہا۔ "مرتی ہوں قرض کی فکر ہے۔"

مرزا نے یہ سنا تو کہا۔ "واہ بہن یہ بھی کوئی فکر ہے۔ کیا خدا کے ہاں مفتی صدر الدین صدر الصدور دہلی بیٹھے ہیں جو پکڑ کر ڈگری کروا دیں۔"

دنیاوی ترغیب کی بنا پر انگلستان واپس چلے جائیں گے۔ وہ یقین رکھیں کہ ہم دسمبر اس میدان جنگ میں منائیں گے لشکریوں کو چاہیئے کہ وہ یروشلم پر یلغار کے لئے مرتب ہو جائیں۔

بارہ کرسمس میں ایک بار پھر ابال آیا۔ نصرانی فوجیں گرد و غبار میں لپٹی ہوئی درہ سفید (اس ماقیبا) سے گزر کر دامن کوہ کی طرف بڑھیں۔ یہاں سے سڑک گہری گھاٹی میں بل کھاتی یروشلم کی طرف جاتی تھی۔ مگر اب ان کا آگے بڑھنا رک گیا۔ سلطان صلاح الدین کو معلوم ہو گیا کہ فرنگی فوجیں حرکت میں آئی ہیں۔ چنانچہ ان کے چھاپہ مار دستوں نے فرنگیوں کے سامان رسد کی گاڑیوں پر حملہ کر کے انہیں تہ و بالا کر ڈالا۔ سامان کے محافظ فوجی سلطانی دستوں کے ہاتھوں سے مارے گئے اور پورے لشکر میں چیخ پکار پڑ گئی۔ فرنگی فوجوں کو رکنا پڑا۔ رچرڈ نے ارل آف لیسٹر کو چھاپہ ماروں کے مقابلہ پر بھیجا اور باقی لشکر آلات محاصرہ تیار کرنے میں مصروف ہو گیا۔

اس دوران شاہ رچرڈ کو اطلاع ملی کہ یہ مصر سے ایک بڑا تجارتی قافلہ قریب پڑاؤ ڈالے ہوئے ہے۔ رچرڈ کو شاید "شیر دل" رچرڈ بننے کا یہی موقعہ ہاتھ آیا تھا۔ وہ کئی ہزار سواروں کے ساتھ تجارتی قافلہ پر حملہ آور ہوا۔ اس قافلہ میں بچے اور عورتیں بھی تھیں لیکن رچرڈ کی فطری سفاکی عود کر آئی اور اس نے بے دریغ قافلے والوں کو قتل کر کے تجارتی سامان لوٹ لیا۔ اس کامیاب چھاپے پر رچرڈ کو "شیر دل" کا خطاب ملا اور اس کے نام کے نعرے لگائے گئے اور خوب خوشیاں منائی گئیں۔

ادھر سلطان کو نصرانی لشکر کے متحرک ہونے کی خبریں برابر مل رہی تھیں۔ انہوں نے ایک طرف تو اپنے چھاپہ مار دستوں کو متحرک کر دیا جس نے فرنگی لشکر کو آگے بڑھنے سے روک دیا اور دوسری طرف سلطان نے یروشلم کے گرد بننے والی فصیل کو فوراً مکمل کرنے کا حکم دیا۔

سلطان نماز فجر کے بعد طلوع آفتاب سے پہلے ہی گھوڑے پر سوار ہو کر معماروں کے کام کی نگرانی کے لئے پہنچ جاتا تھا۔ سلطان نے فصیل کو کئی حصوں میں تقسیم کر کے کئی امیروں کو اس کی نگرانی پر مامور کر دیا تھا۔ سلطان خود پوری تندہی سے کام کرتے اور مزدوروں کے گروہ کے گروہ بھاری پتھر اٹھا اٹھا کے لاتے۔ بعض اوقات سلطان گھوڑے سے اتر کر مزدوروں کے گروہ میں شامل ہو جاتا اور بذات خود پتھر ڈھونے لگتا۔

یہ بات سب کو معلوم تھی کہ یروشلم کے گرد زمین سنگلاخ ہے اور ان میں کنویں کھودنا ناممکن ہے۔ سلطان صلاح الدین نے اس سے فائدہ اٹھایا۔ اس نے بیت المقدس کے گرد آب رسانی کے جتنے وسائل تھے انہیں مسدود کر دیا۔ چشمے بند کرا دیے گئے۔ حوض پاٹ دیے گئے اور کنوؤں کو توڑ دیا گیا۔ اس طرح بیت المقدس کے باہر بیس بیس میل تک پانی کا نشان باقی نہیں رہ گیا۔

یہ خبر فوراً فرنگی لشکر میں پہنچی۔ ایک جاسوس نے اطلاع دی۔

"عالیجاہ۔ سلطان نے یروشلم کے ارد گرد کے تمام چشموں کو بند کرا دیا۔ کنوؤں کو تڑوا دیا اور حوضوں کو پٹوا دیا ہے۔ دور دور تک پانی کا پتا نہیں۔"

رچرڈ کا رنگ فق ہو گیا۔ لشکریوں اور خصوصاً سوار فوج کے ہاتھ پیر ٹھنڈے ہو گئے۔

اس خبر سے فرنگیوں میں کھلبلی مچ گئی اور لشکریوں میں اختلاف پیدا ہو گیا۔ فرانسیسی فوج یروشلم پر حملہ کرنے کے لیے بضد تھی مگر دوسری فوجوں نے وطن واپس جانے کا فیصلہ کر لیا۔ یہ اختلافی مسئلہ پھر شاہ انگلستان کے سامنے پیش ہوا۔ رچرڈ، یروشلم سے پہلے ہی ناامید ہو چکا تھا۔ اس نے فرانسیسیوں کو جواب دیا۔

"اس مقام سے آگے پانی کے تمام ذرائع سلطان کے لشکریوں نے بند کر دیئے ہیں یا انہیں برباد کر دیا ہے۔ شہر کے قریب پانی مفقود ہے۔ ہم اپنے گھوڑوں کو پانی کہاں سے پلائیں گے۔"

اس پر ایک فرانسیسی سردار نے کہا۔ "ہمیں تکواندی سے پانی مل سکتا ہے جو شہر سے چند میل کے فاصلے پر ہے۔"

شاہ رچرڈ نے دریافت کیا۔ "ہم گھوڑوں کو وہاں سے

کیسے پانی پلا سکتے ہیں؟"

منحرف فرانسیسی سردار نے جواب دیا۔ "ہم اپنے لشکر کو دو حصوں میں تقسیم کر دیں گے۔ محاصرہ کے دوران فوج کا ایک حصہ گھوڑوں کو پانی پلانے ندی پر جائے گا اور دوسرا حصہ محاصرہ جاری رکھے گا۔ اس طرح دن میں ایک بار لشکر کے دونوں حصے باری باری ندی پر جا کر گھوڑوں کو پانی پلا سکتے ہیں۔"

شاہ رچرڈ چڑ گیا۔ اس نے چیخ کے کہا۔ "جب ایک حصہ فوج کا گھوڑوں کو پانی پلانے گیا ہوگا اس وقت سلطان کی فوج شہر سے نکل کر ہماری آدھی فوج کو فنا کر دے گی۔ اس کے علاوہ ہم اس وقت سمندر سے بہت دور ہیں اگر ہم اور آگے بڑھے تو ترک (فرنگی سلطانی لشکریوں کو ترک کہتے تھے حالانکہ لشکر میں کرد اور عربی لشکری بھی کافی تعداد میں تھے) ہماری رسد کی لائن کو کاٹ دیں گے۔ پھر شہر کا محیط اتنا بڑا ہے کہ محاصرے کے لئے ہمیں کافی لشکر درکار ہوگا۔ اس کے باوجود ہم ترکوں کے حملے کو نہیں روک سکیں گے۔ ہم شکست کھا کر بدنام نہیں ہونا چاہتے۔"

فرنگیوں کا یہ جھگڑا صبح تک ہوتا رہا۔ مختلف گروہوں نے مختلف انداز میں اس پر گفتگو کی پھر صبح کو سلطانی جاسوس نے اطلاع دی۔

"عالیجاہ۔ فرنگیوں نے پڑاؤ چھوڑ دیا ہے اور رملہ کی طرف لوٹ گئے ہیں۔"

اس طرح نصرانیوں کے متحدہ لشکر جس میں پورے یورپ کی فوجیں شامل تھیں ان پر سلطان صلاح الدین کو فتح حاصل ہوئی اور رچرڈ جسے دروغ گو یورپین مؤرخوں نے شیر دل کا خطاب دیا تھا اس نے بغیر مقابلہ کے شکست تسلیم کر لی اور میدان چھوڑ کر بھاگ گیا۔

سلطان صلاح الدین ایوبی نے بیس ہزار سواروں کو پسپا ہوتے ہوئے فرنگی لشکر پر آخری وار کرنے کے لئے روانہ کیا۔ فرنگیوں کا لشکر منتشر ہو کر بھاگ رہا تھا۔ سلطان کے سوار دستوں نے ان پر طوفانی حملہ کیا۔ پہلے ان کے تمام رسد کو برباد کیا پھر انہیں گاجر مولی کی طرح کاٹ کے رکھ دیا۔ فرنگیوں کی پسپائی میں جس قدر ان کا جانی نقصان ہوا اس کا اندازہ ایک لاکھ سے زیادہ کیا گیا ہے۔ اس طرح اس تیسری صلیبی جنگ میں نصرانی لشکر کے مرنے والوں کی مجموعی تعداد تین لاکھ تک پہنچ گئی تھی۔ اس کے باوجود وہ بیت المقدس کی ایک اینٹ بھی اپنے ساتھ نہ لے جا سکے۔

شاہ انگلستان رچرڈ چاہتا تھا کہ اس کے فلسطین چھوڑنے سے پہلے کوئی ایسا معاہدہ ہو جائے کہ ملک شام میں عیسائیوں کے مقبوضات محفوظ ہو جائیں۔ اس نے سلطان سے پھر معاہدہ کی درخواست کی مگر سلطان نے انکار کر دیا۔ اب اس نے ملک العادل کی خوشامد کی وہ درمیان میں پڑ کر معاہدہ کرا دے۔ آخر ملک العادل کے زور دینے پر سلطان نے اپنی رضامندی ظاہر کی۔

یہ معاہدہ یورپ کے صلیبیوں جن میں شام کے تمام بڑے بڑے نصرانی سردار شامل تھے اور سلطان صلاح الدین کے درمیان ۲۰ شعبان ۵۸۸ ہجری مطابق ۲ ستمبر ۱۱۹۲ء بروز چہارم شنبہ کو ہوا۔ معاہدہ کے میعاد چوالیس مہینے تھی۔ اس کے ساتھ نصرانیوں کو بیت المقدس کی زیارت کی عام اجازت دے دی گئی۔

معاہدہ کے فوراً بعد شاہ انگلستان ناکام و نامراد اپنے ملک روانہ ہو گیا۔ ادھر قدرت نے شاید سلطان کو بیت المقدس کے حصول کے لئے ہی دنیا میں بھیجا تھا۔ کیوں کہ اس معاہدہ کے صرف چھ ماہ بعد یعنی ماہ صفر ۵۸۹ ہجری مطابق تین مارچ ۱۱۹۳ء کو مسلمانوں کے اس عظیم فاتح، اسلام کے سچے پرستار اور نیک دل، بلند کردار سلطان الناصر صلاح الدین ایوبی نے اس دار فانی کو خیر باد کہا اور اپنے خالق حقیقی کے پاس چلے گئے۔

سلطان کی وفات کا غم چالیس دن، چالیس سال، چار سو سال بلکہ ساڑھے سو سال تک مسلمانوں نے منایا اور پھر یہ غم اس دن اور بڑھ گیا جب بیت المقدس پر برطانیہ اور دیگر یورپی ممالک کی سازش سے یہودیوں نے قبضہ کر لیا۔

ختم شد